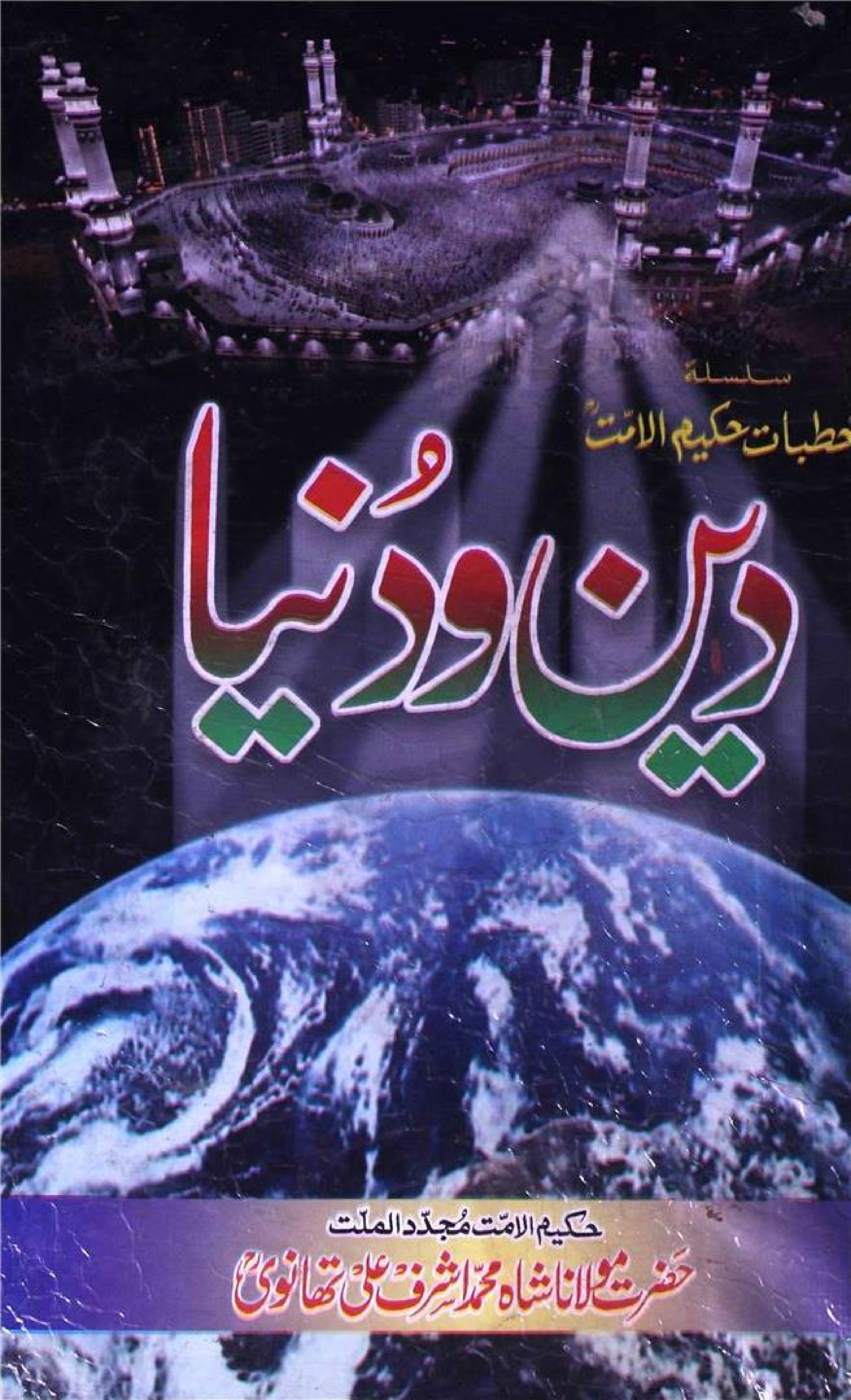


سلسلہ

خطبات حکیم الامتؒ

دین و دنیا

حکیم الامت مجدد الملت

حضرت مولانا شاہ محمد اشرف علی تھانویؒ

سلسلۂ مواعظ اشرفیہ جلد ۳۰

دین و دنیا

جنید وقت حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہ

ترتیب مواعظ

منشی عبد الرحمن خاںؒ

فرید بک ڈپو (پرائیویٹ) لمیٹڈ
FARID BOOK DEPOT (Pvt.) Ltd.
2158, M.P. Street, Pataudi House, Darya Ganj, New Delhi-2
Phone : 23289786, 23289159 Fax : 23279998 Res. : 23262486
e_mail : farid@ndf.vsnl.net.in • farid_export@hotmail.com
Website: www.faridexport.com • www.faridbook.com

Rs. 175/-

نام کتاب	:	دین ودنیا
مصنف	:	مولانا محمد اشرف علی تھانویؒ
باہتمام	:	الحاج محمد ناصر خاں
ناشر	:	فرید بک ڈپو پرائیویٹ لمیٹڈ، نئی دہلی
طابع	:	فرید انٹر پرائزز، دہلی
سرورق	:	محبوب احمد / کفیل احمد
صفحات	:	708
قیمت	:	175/-
سنہ اشاعت	:	2003
سائز	:	23X36/16

فرید بکڈپو (پرائیویٹ) لمیٹڈ

FARID BOOK DEPOT (Pvt.) Ltd.

2158, M.P. Street, Pataudi House, Darya Ganj, New Delhi-2
Phone : 23289786, 23289159 Fax : 23279998 Res. : 23262486
e_mail : farid@ndf.vsnl.net.in • farid_export@hotmail.com
Website: www.faridexport.com • www.faridbook.com

هُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَہٗ بِالۡہُدٰی
وَ دِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡہِرَہٗ عَلَی الدِّیۡنِ
کُلِّہٖ ـــــــــ (الآیۃ)

اسی نے اپنے رسولؐ کو ہدایت اور
سچا دین دے کر بھیجا تاکہ اس کو
(دنیا میں) ہر دین پر غالب کرے۔

ترتیب

تفصیل

ضرورۃ الاعتناء بالدین

۸۔ مظاہر الآمال

۹۔ سبیل النجاح

الدین الخالص

اخلاص کے متعلق یہ وعظ ۹۔ ذیقعد ۱۳۲۹ھ کو چٹائی محال، کانپور میں ہوا۔ ۱۲۰۰ کا مجمع تھا اور تین گھنٹے میں وعظ ختم ہوا۔

اخلاص یہ ہے کہ کوئی غرض نفسانی اپنی
نہ ہو۔ صرف رضاءِ حق مطلوب ہو اور اس
کے حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ جب
کوئی کام کرنا ہو تو پہلے یہ دیکھ لیجیئے کہ میں
یہ کام کیوں کرتا ہوں! اگر کوئی بات فاسد نظر
آئے تو اسے قلب سے نکال ڈالئے۔ اور
نیّت خالص خدا کے لئے کرنی چاہیئے۔

خطبۂ ماثورہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونومن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا و من سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ و من یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمد عبدہ ورسولہ صلے اللہ تعالےٰ علیہ وعلیٰ الہ و اصحابہ وبارک وسلم۔ اما بعد فقد قال اللہ تبارک وتعالیٰ قُلۡ اِنِّیۡۤ اُمِرۡتُ اَنۡ اَعۡبُدَ اللّٰہَ مُخۡلِصًا لَّہُ الدِّیۡنَ ــــــــ،

عوام و خواص کی غلطی

(ایک آیت سے سورۂ زمر کی جس کے شروع میں بھی اجمالاً اس
کی طرف اشارہ تھا فی قولہ تعالیٰ الا للہ الدین الخالص (یعنی یاد رکھو، جو
عبادت شرک سے خالی ہو وہ خدا تعالیٰ ہی کے لئے سزاوار ہے) اس میں
ایک ضروری مضمون مذکور ہے جو کسی حالت میں قابلِ فروگذاشت نہیں۔
کیونکہ اوّل تو خود اُس کا مامور بہ ہونا اُس کے ضروری ہونے کی قطعی دلیل
ہے۔ ایک تو یہ وجہ ہے اس کے ضروری ہونے کی۔

دوسری یہ کہ دو قسم کے امور ہوتے ہیں۔ ایک وہ کہ اُن کا اہتمام اکثر
طبائع میں ہوتا ہے دوسرے وہ کہ اُن کا اہتمام نہیں ہوتا اور ہیں واقع میں
قابلِ اہتمام۔ تو جس کا اس آیت میں بیان ہے وہ ایسا امر ہے۔ جس کا
اہتمام باوجود اس کے مہتم بالشان ہونے کے لوگوں میں کم ہے یا نہیں ہے،
اور نیز وہ تمام اجزاء دین کو عام ہے بعض کے ساتھ خاص نہیں! اس حیثیت

سے بھی ضروری ہوا۔ چنانچہ عموم ترجمہ سے معلوم ہو جاوے گا۔ فرماتے ہیں کہ

اے محمد! صلے اللہ علیہ وسلم، آپ کہہ دیجیئے کہ مجھ کو یہی
حکم ہوا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کی اس طرح عبادت کروں کہ
دین کو اُس کے لئے خالص رکھوں۔

یہ ترجمہ ہے۔ اس سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ اس میں مضمون اخلاص کا ہے اور اخلاص کے معنی ہیں خالص کرنے کے اور یہ لفظ کوئی نیا نہیں ہے بارہا دفعہ کا سُنا سُنایا ہے۔ ہاں عوام نے اس کے معنی میں غلطی کر رکھی ہے۔ کہ پیار محبت کے معنی لیتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ بعض جگہ یہ رسم ہے کہ قل ہو اللہ دُلہن کی پیشانی پر لکھتے ہیں۔ تو قل ہو اللہ میں تو اخلاص کا مضمون ہے دُلہن سے اس کو کوئی مناسبت نہیں معلوم ہوتی۔ مگر اسی خیال سے لکھتے ہیں کہ میاں بیوی میں محبّت و اخلاص رہے۔ پس اخلاص کے معنی محبّت کے سمجھے ورنہ آیاتِ حُب لکھتے۔ سو اوّل تو اخلاص کے یہ معنی (محبّت) ہی غلط ہیں۔ دوسرے تعویذ لکھنا اصل میں پڑھنے کا نائب ہے۔ یہ دوسرے درجہ کی چیز ہے۔ مگر عام مذاق یہ ہے کہ پڑھنے کی اتنی وقعت نہیں ہے جتنی تعویذوں کی وقعت ہے۔

حدیث سے تعویذوں کی جو حالت معلوم ہوتی ہے اُس پر وہ عبداللہ بن عمرؓ کی عادت دال ہے جو حصن حصین میں مذکور ہے کہ وہ اپنے بچوں کو ایک دُعا اَعُوْذُ بِکَلِمَاتِ اللّٰہِ (یعنی میں اللہ تعالےٰ کے کلمات کے ساتھ پناہ لیتا ہوں) پڑھاتے تھے اور جو سیانے نہ تھے اُن کو برکت پہنچانے کا یہ طریقہ تھا کہ دعا لکھ کر گلے میں ڈال دیتے تھے۔ یہ حدیث ہے ماخذ تعویذ کا۔ اس

سے تصریحاً معلوم ہوا کہ اصل مقصود پڑھانا تھا مگر جو سیانے نہ تھے ان کو برکت پہنچانے کا یہ طریقہ تھا کہ دعا لکھ کر گلے میں ڈال دیتے۔ تو تعویذ باندھنے کا دوسرا درجہ ہے۔ مگر بوجہ ناحقیقت شناسی کے عکس ہو گیا۔ کہ تعویذ کا اثر زیادہ سمجھنے لگے اور پڑھنے کا کم۔ غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ اکثر لوگ اس زمانہ میں جاہل ہوتے ہیں اس لئے ہمارے بزرگوں نے تعویذ کا طریق اختیار کیا۔ دوسرے پڑھنے میں دقت ہے اور نفس ہمیشہ اپنی آسانی کی صورت نکال لیتا ہے۔ بہرحال اسماء الٰہیہ میں برکت ضرور ہے۔ مگر جب کہ مناسبت بھی ہو۔ تو قل ہو اللہ کو اس واقعہ سے کوئی مناسبت نہیں۔ کوئی دوسری آیات مناسبہ پڑھ لی جائیں نیز اگر لکھنا ہی تجویز ہو تو آیات مناسبہ لکھوالی جائیں۔ پھر دُلہن کی پیشانی پر لکھوانے کے لئے محرم بھی شرط ہے نامحرم سے لکھوانے میں یہ ہرگز جائز نہیں۔ اس کی اصلاح بھی ضروری ہے۔ یہ ایک جملہ معترضہ یاد آگیا بوجہ لفظ اخلاص کے۔

غرض بعض الفاظ کے معنی غلط مشہور ہو جاتے ہیں۔ یہ تو عوام کی غلطی ہے بعض الفاظ کے معانی میں خواص بھی غلطی کرتے ہیں مثلاً خوش خلقی کے معنی خواص میں بھی غلط مشہور ہیں۔ چنانچہ دیکھ لیں کہ خوش اخلاق اُس کو سمجھتے ہیں کہ ذرا نرم ہو غصہ نہ کرتا ہو حالانکہ یہ اخلاق نہیں بلکہ آثار ہیں اخلاق کے۔ اور اخلاق ایک ملکۂ باطنی ہے یعنی صفاتِ حمیدہ میں درجہ ملکہ کا حاصل ہو جائے تو اُس شخص کو صاحب اخلاق کہیں گے۔

مثلاً تواضع اُس کو کہتے ہیں کہ اپنے کو سب سے چھوٹا سمجھے۔ یہ نہیں کہ ظاہراً منکسر ہو کر ملے۔ یہ اُس کا ایک اثر ہے اور اس کے محمود

ہونے کی شرط اُس کا موقع پر ہونا ہے چنانچہ اُس کے آثار محمودہ کی مدح قرآن سے بھی ثابت ہے۔

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا

یعنی خدا تعالیٰ کے خاص بندے وہ ہیں جو زمین پر عاجزی کے ساتھ چلتے ہیں۔

تو اس آیت میں تواضع کا ایک اثر بتلایا ہے کیونکہ کبھی کسی شے کو ماہیت سے بتلایا جاتا ہے اور کبھی اثر سے۔ تو نرمی و خشوع سے چلنا حقیقت میں اثر ہے تواضع کا۔

چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ ایک شخص نماز پڑھتے ہوئے داڑھی سے کھیل رہا تھا جیسے اکثر لوگوں کی عادت ہے کہ نماز کے اندر کپڑوں سے یا بالوں سے شغل کیا کرتے ہیں۔ حضور نے فرمایا کہ اگر اس کے قلب میں خشوع ہوتا تو داڑھی سے نہ کھیلتا۔ تو اس حدیث سے بھی یہ بات ثابت ہوئی کہ خوف و خشیت قلب میں ہے اور اس کا یہ اثر ہے کہ نماز میں لہو ولعب نہ ہو۔

غرض نرمی سے چلنا آثار میں سے ہے اس کو تواضع سمجھنے میں دو غلطیاں ہوئیں۔ ایک تو یہ کہ اخلاق بالمعنی الحقیقی کو غیر ضروری الحصول سمجھے کیونکہ اُن کے معنی بدل کر اپنے کو اس کا عامل سمجھے اور فارغ ہو گئے اب حالت یہ ہے کہ دل میں تو سمجھتے ہیں کہ ہم بہت بڑے ہیں اور زبان سے کہتے ہیں کہ ہم کچھ بھی نہیں۔ حالانکہ دل میں کچھ بھی نہیں ہوتا۔

اس کا امتحان یہ ہے کہ جب بتکلّف متواضع بننے والا کہے کہ میں تو کچھ بھی نہیں کوئی شخص جرأت کر کے یہ کہہ دے کہ واقعی میں سخت غلطی میں

مبتلا رہا۔ آج مجھے معلوم ہوا کہ آپ تو کچھ بھی نہیں۔ محض ناکارہ ہیں پھر دیکھئے کتنے خفا ہوتے ہیں۔ صاحبو، اگر حقیقت میں ایسا سمجھتے تھے تو ناراض کیوں ہوئے۔ معلوم ہوا کہ ہرگز اپنے کو ایسا نہیں سمجھتے بلکہ اس لئے ایسے الفاظ کہتے ہیں کہ یہ عادت عرفاً محمود ہے۔ دوسرے لوگ اس پر اور مدح کرتے ہیں گویا اور مدح کرانے کے لئے نفس نے یہ طریقہ نکال لیا ہے۔ اُن کی یہ تواضع بھی لغرض تکبر ہے۔ جس کا امتحان یہی ہے جو عرض کیا گیا۔ اس طریقہ سے اصلی متواضع اور تصنع کرنے والے کا خوب پتہ چل جاتا ہے۔

دوسری غلطی یہ کہ جب نرمی کو تواضع سمجھا گیا تو سختی کو بدخلقی پر محمول کیا جائے گا۔ چنانچہ بعض مرتبہ اہل اللہ اپنے متعلقین پر سختی کرتے ہیں اور یہ دیکھنے والے اُن پر تہمت لگاتے ہیں کہ بدخلق ہیں۔ صاحبو، اصلاح کا نام بد خلقی اسی وجہ سے ہوا کہ اخلاق کے معنی بدل دیئے۔ بلکہ سختی کے موقعہ پہ نرمی کرنا یہ بدخلقی ہے۔

صاحبو۔۔۔۔ اگر بچہ سنکھیا یا افیون کھانے لگے اور معلوم ہو کہ ابھی نگل جائے گا۔ اُس وقت کیا اخلاق یہی ہے کہ دل شکنی نہ کرو یا یہ کہ اُس کے منہ میں انگلی ڈال کر اُس کو نکال لو اور سزا دو۔ اب بتلائیے۔ اس میں سے کون برتاؤ خوش خلقی ہے۔ حقیقت میں اُس کو ہلاکت سے نہ روکنا یہ بدخلقی ہے اور راحت رسانی یہ خوش خلقی ہے۔ یا مثلاً ایک اندھا جا رہا ہے اور کنواں آگیا اور کہنے سے رک نہیں سکتا۔ تو کیا خوش خلقی یہی ہے کہ نہایت متانت سے کہے حافظ صاحب آپ کے آگے کنواں ہے ذرا بچ کر چلیئے یا ہاتھ پکڑ کر جھٹکا دینا خلق ہے ؟

اگر بینم کہ نابینا و چاہ است
اگر خاموش بنشینم گناہ است

(یعنی اگر دیکھیں اندھا جا رہا ہے اور اس کے سامنے کنواں ہے اس وقت خاموش بیٹھنا اور اس کو نہ بچانا گناہ ہے)

مشہور ہے کہ ایک قاری صاحب جو اینٹھ مروڑ کر پڑھتے تھے، انہوں نے شاگردوں سے کہہ رکھا تھا کہ گفتگو بھی قرأت سے کیا کرو۔ ایک مرتبہ حافظ صاحب حقہ پی رہے تھے۔ ایک چنگاری پگڑی میں جا لگی، تو ایک شاگرد نے بڑی دیر میں قرأت سے یہ مضمون ادا کیا کہ جناب حافظ صاحب آپ کی دستار مبارک میں ایک چنگاری لگ گئی ہے۔ اتنی دیر میں حافظ صاحب کی دستار بہت سی جل گئی۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ قرأت کا موقع ہے۔ اس نے بڑی غلطی کی کہ غیر موقعہ قرأت میں قرأت استعمال کی۔

اسی طرح جو نرمی غیر موقع میں ہو گی وہ بھی مذموم ہو گی اور اخلاق میں شمار نہ ہو گی۔ یہاں سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ بزرگوں سے جو سختی صادر ہوتی ہے اس کو سختی کہنا عجب ہے۔ وہ صرف اپنے لوگوں سے سختی کرتے ہیں جس سے اصلاح مقصود ہوتی ہے

مقامِ مسلم

حضورؐ کے سامنے ایک واقعہ ایسا ہوا کہ اس میں آپؐ نے بہت نرمی فرمائی۔ اس کے بتلانے سے معلوم ہو گا کہ نرمی کے موقع پر نرمی کرنے والا حضورؐ سے بڑھ کر کوئی نہیں ہو سکتا۔ اسی کے ساتھ ایک دوسرا سختی کا واقعہ بھی بتلاؤں گا کہ سختی کے موقع میں آپؐ نے کس درجہ سختی فرمائی ہے ــــــ،

ایک مرتبہ ایک اعرابی نے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے مسجد نبوی میں پیشاب کرنا شروع کر دیا۔ صحابہؓ نے اُس کو گھورا اور دھمکانا چاہا حضورؐ نے فرمایا اس کا پیشاب قطع نہ کرو۔ سبحان اللہ کیسی حکمت کی بات ہے۔ اس لئے کہ یا تو وہ نہ رکتا یا بھاگتا۔ روکنے میں تو اُس کو سخت تکلیف ہوتی اور بھاگنے سے مسجد اور زیادہ خراب ہوتی۔ جب وہ باطمینان پیشاب کر چکا تو آپ نے ایک ڈول اس جگہ بہا دینے کا حکم فرمایا۔ اس کے بعد اعرابی کو بلا کر نرمی سے فرما دیا کہ یہ مسجد اللہ کا گھر ہے۔ اس میں عبادت کی جاتی ہے۔ اس کو ناپاکی سے ملوث نہیں کرنا چاہئے۔

اس حدیث سے یہ بات بھی سمجھنی چاہیے کہ مسلمان کی وقعت خدا و رسولؐ کے نزدیک مسجد سے زیادہ ہے کہ آپؐ نے اس مسلمان کی رعایت مسجد سے زیادہ فرمائی۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ آپؐ نے خانہ کعبہ کو خطاب کر کے فرمایا کہ تو بہت عظمت والا ہے مگر مومن اللہ کے نزدیک تجھ سے بھی زیادہ اکرم ہے۔ اسی کو کہا ہے ؎

دل بدست آور کہ حج اکبر است

از ہزاراں کعبہ یک دل بہتر است

(یعنی کسی کا دل خوش کرنا حج اکبر ہے۔ ہزاروں کعبوں سے ایک دل بہتر ہے)

اس شعر کا مطلب سمجھنے میں بھی لوگوں کو غلطی ہوئی ہے۔ بعض اپنے یار دوستوں کے کہنے سے ناچ میں بھی جاتے ہوئے کہتے ہیں کہ ؏

دل بدست آور کہ حج اکبر است

یعنی ایک مسلمان کا جی خوش کرنا حج سے افضل ہے تو ناچ میں شریک ہونے

سے بھی ایک دوست کا جی خوش ہوتا ہے ـــــ ایک دوسرے شخص نے اس کا کیا خوب جواب دیا کہ مطلب یہ ہے کہ دوسرے کا دل مراد نہیں اپنا دل مراد ہے یعنی اپنے دل کو قبضہ میں لاؤ۔ اور اُس کو احکام الٰہیہ کا تابع بنا دو۔ یہ توجیہ نہایت لطیف ہے۔ گو شاعر کا یہ مطلب نہیں بلکہ دوسرے ہی کا دل مراد ہے مگر مواقع مخالفت نصوص شرعاً و عقلاً اس سے مخصوص نہیں۔ بہر حال یہ شعر اس حدیث کا ترجمہ ہے۔ حدیث سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ مومن کعبہ سے افضل ہے اور اس کی ایک وجہ ہے کہ ع

دل گزرگاہِ جلیل اکبر است

(یعنی دل اللہ تعالیٰ کی گزرگاہ ہے) تو جب مومن کعبہ سے افضل ہے تو دوسری مساجد سے تو یقیناً افضل ہے چونکہ پیشاب روکنے میں حضورؐ کو اُس کی بیماری اور تکلیف کا اندیشہ تھا اس لئے مسجد کے ملوّث ہونے کی پروا نہ فرمائی۔

آج یہ حالت ہے کہ مومن کی تذلیل کرتے ہیں اور افسوس تو یہ ہے کہ غیر قومیں مومن کی اتنی تذلیل نہیں کرتیں جتنی یہ نئی روشنی والے غریب مسلمانوں کی تحقیر کرتے ہیں۔ خاص ہماری قوم میں جو ایک طبقہ ذرا کھاتے پیتے لوگوں کا ہے وہ لوگوں کو بدتہذیب کہتے ہیں اور ان کو چوپاؤں سے بدتر سمجھتے ہیں اور پھر مسلمان کہلاتے ہیں اور اپنے کو خیر خواہِ قوم کہتے ہیں۔ بس ان کا یہی جواب ہے۔

قُلْ بِئْسَمَا يَأْمُرُكُمْ بِهٖٓ اِيْمَانُكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝

آپ فرما دیجئے کہ یہ افعال بہت بُرے ہیں جن کی تعلیم تمہارا ایمان تم کو کر رہا ہے۔

ہر کس از دستِ غیر نالہ کند
سعدی از دستِ خویشتن فریاد

(ہر شخص غیروں کا شاکی ہے اور اُن سے نالاں مگر سعدی کو اپنوں ہی کی شکایت ہے)

مسلمانوں کو آپس میں متحد ہو کر رہنا چاہیئے۔ اگر کسی کی غیبت ہوتی ہو تو غیبت کرنے والے کو روکنا چاہیئے۔ اگر وہ نہ مانے تو خود اٹھ جانا چاہیئے اسی طرح ہر شخص کو ضروری ہے کہ اپنے کو سب سے کم سمجھے۔ اس طرح سے انشاء اللہ تعالیٰ مخالفتیں بہت کم ہوں گی۔ کیونکہ اکثر جو عداوتیں ہو جاتی ہیں اُن کا بڑا سبب ہی تکبر ہے جس سے غیبت بھی پیدا ہوتی ہے علیٰ ہذا ہر مسلمان کو اپنے دوسرے بھائی مسلمان کے لئے دعائے خیر کرنی چاہیئے۔ غرض ہر مسلمان سے اگر وہ مبتلائے معاصی بھی ہو وہ برتاؤ کرو، جو اپنے بیمار بھائی سے کرتے ہو کیونکہ مسلمان سب بھائی بھائی ہیں۔ حدیث میں ارشاد ہے وکونوا عباد اللہ اخوانًا (یعنی تم اللہ تعالیٰ کے بندے آپس میں بھائی بھائی ہو جاؤ۔) غرض ایک تو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ واقعہ ہے جو اس اعرابی کے قصے میں سُنا۔

واقف و ناواقف سے سلوک

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ حضورؐ ایک مرتبہ مسجد شریف میں تشریف لائے اور دیوارِ مسجد پر تھوک لگا دیکھا تو حضورؐ کا چہرہ سُرخ ہو گیا اور آپ نے اُس کو لکڑی سے کھُرچ دیا۔ ایک صحابی خوشبو لائے اور اُس جگہ مل دی اب دیکھئے کہ وہی ذات بابرکات جنہوں نے وہاں سختی نہیں کی جب کہ ایک شخص نے مسجد میں پیشاب کر دیا تھا یہاں صرف تھوکنے پر آپ کا چہرہ سُرخ ہو گیا تو فرق یہ تھا کہ پہلا آدمی دیہاتی تھا اور یہ دوسرے شخص آپ

کی صحبت کے فیض یافتہ تھے۔ تو معلوم ہوا کہ غیر واقف سے دوسرا برتاؤ ہوتا ہے اور واقف سے دوسرا۔ پس اگر ہر سختی بدخلقی ہوتی تو حضورؐ سے کبھی صادر نہ ہوتی جن کے بارہ میں ارشاد باری تعالیٰ کا ہے اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِیْمٍ (بلاشک آپ اخلاق حسنہ کے اعلیٰ پیمانہ پر ہیں)

اور لیجیے ایک مرتبہ ایک صحابی لقطہ کے بارہ میں حضورؐ سے سوال کر رہے تھے کہ اگر بکری جنگل میں ملے تو اُس کو حفاظت کے لئے اپنے قبضہ میں کر لیا جاوے یا نہیں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ ہاں اُس کو لے آنا چاہیئے ورنہ درندے اُس کو ہلاک کر دیں گے ——— پھر کسی نے پوچھا کہ اگر اونٹ ملے تو اس کو بھی ایسا ہی کیا جائے۔ اس پر آپؐ کو غصہ آ گیا اور چہرہ مبارک سُرخ ہو گیا۔ فرمایا کہ اس کی حفاظت کی کیا ضرورت ہے وہ خود موذی جانوروں کے دفع کرنے پر قادر ہے۔ درختوں سے پتے کھاتا ہوا اپنے مالک سے آملے گا۔

اس بات پر حضورؐ کو غصہ اس لئے آیا کہ اس سوال سے حرص اور طمع مترشح ہو رہی تھی۔ کیا اب بھی یہ کہا جائے گا کہ بدخلقی مطلق سختی اور غصہ کا نام ہے۔ آج علماء پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ ذرا سی بات میں خفا ہو جاتے ہیں۔ اُن کے اخلاق عمدہ نہیں۔ سو بحمداللہ ان واقعات کے معلوم کرنے کے بعد یہ الزام رفع ہو گیا ہو گا۔

اس سے ایک اور بات بھی نکل آئی۔ وہ یہ کہ بعض طلباء استادوں کی شکایت کیا کرتے ہیں کہ بڑے سخت ہیں تو معلوم ہو گیا کہ یہ سنت ہے کہ بے موقع بات پر غصہ کیا جائے اور بعض طالب علم بھی بہت بکھیڑے نکالا کرتے ہیں اور اُستاد کو تنگ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ بڑی گستاخی اور بے ادبی

ہے۔ اگر اُستاد سے غلطی بھی ہو جائے تو اس وقت خاموش ہو جانا چاہیے دوسرے وقت ادب سے عرض کیا جا سکتا ہے۔ اور اگر اپنی غلطی ہو تو فوراً رجوع کرنا چاہیئے۔ اب تو طالب علم ایسی حرکتیں کرتے ہیں جس سے خواہ مخواہ غصہ ہی آوے۔ اور سچ یہ ہے کہ طالب علم ہی کم رہ گئے ہیں۔ چنانچہ بعضے طالب علم اُستاد کی تقریر بہت بے پروائی سے سُنا کرتے ہیں اور جب مطلب سمجھ میں نہیں آتا تو اُستاد سے جھگڑتے ہیں۔ اُس کو غصہ کیسے نہیں آئے گا ـــــ!

میں ایک لکھنؤ کا واقعہ بتلاتا ہوں کہ ایک جگہ صدرا ہوا کرتا تھا۔ کسی مقام میں نسخہ کی غلطی کا احتمال ہوا۔ طالب علموں کے سب نسخوں میں دیکھا گیا۔ ایک طالب علم اُن میں ایسے تھے کہ اُن سے جو پوچھا کہ تمہاری کتاب میں کیا ہے تو وہ ڈھونڈھنے لگے۔ اُستاد جو برہم ہوئے تو کہنے لگے کہ ابھی نظر سے نکل گیا ہے بتلاتا ہوں۔ جب زیادہ دیر ہوئی اُستاد نے کتاب اُن کے ہاتھ سے لے کر خود دیکھنا چاہا تو معلوم ہوا کہ کتاب شمس بازغہ ہے۔ پوچھا کہ تم روزانہ اس نسخہ میں پڑھتے ہو کہنے لگے جی ہاں ـــــ سو اُن بزرگ کو اب تک یہ خبر بھی نہیں کہ یہ کون سی کتاب ہے۔ کچھ حد ہے اس بے پروائی کی ـــــ!

اسی طرح ایک طالب علم فارغین کی نسبت کہتے تھے کہ یہ لوگ بڑے بے وقوف ہیں جو فارغ ہو کر چلے جاتے ہیں کیونکہ پھر روٹی موقوف ہو جاتی ہے۔ ہم تو کئی سال سے نورالانوار پڑھ رہے ہیں اور اب بھی اسی کے حل کرنے کا قصد ہے۔

ہمارے دیوبند میں ایک طالب علم تھے بڈھے۔ اُن کی تمام عمر پڑھنے

ہی میں گزر گئی تھی۔ جب دیوبند میں آئے تو ہر جگہ شریک ہوتے تھے۔ اُن کا بے ڈھنگا پن آپ کو بتلاتا ہوں کہ اُنہوں نے ایک بار استاد سے سوال کیا کہ اس میں تو ایک خرابی لازم آتی ہے۔ اُستاد نے فرمایا کہ دلیل، تو آپ فرماتے ہیں۔ سبحان اللہ دعویٰ بھی ہم ہی کریں۔ دلیل بھی ہم ہی بیان کریں۔ ہم نے دعویٰ کر دیا۔ آپ دلیل بیان کیجئے۔ بھلا بتلایئے ایسی بے ڈھنگی بات کا کیا جواب ہو سکتا ہے۔ تو ایسی باتوں پر سختی کرنے میں کچھ مضائقہ نہیں۔

دیکھئے ــــ جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کون خوش خلق ہوگا مگر آپؐ نے بھی بعض باتوں پر سختی اور غصہ کا اظہار فرمایا ہے۔ تو بزرگوں کی نسبت یہ خیال کرنا کہ یہ بد اخلاق ہیں بالکل بے جا ہے۔ بعض بزرگوں نے ایسا کیا ہے کہ ایک چھوٹی سی بات سے بہت بڑی بات پر استدلال کرتے تھے اور اس کے مقتضاء پر عمل کرتے تھے۔

ایک بزرگ کا واقعہ ہے کہ جب کوئی اُن کے پاس بیعت ہونے آتا تو وہ اس کے لئے کھانا کچھ زیادہ بھیجتے۔ اور جب وہاں سے بچ کر آتا تو یہ دیکھتے کہ روٹی اور سالن تناسب سے بچا ہے یا بلا تناسب۔ اوّل صورت میں بیعت کرتے دوسری صورت میں انکار کر دیتے۔ تو ظاہر میں معلوم ہوتا ہے کہ بہت چھوٹی سی بات پر وہ ایسی سختی کرتے تھے۔ مگر حقیقت میں وہ اس سے استدلال کرتے تھے اُس کی بے انتظامی پر۔ اور بد انتظام شخص کو وہ اپنی خدمت میں نہیں رکھتے تھے۔ کیونکہ کوئی کام بدون انتظام کے نہیں ہو سکتا۔ اور واقعی جس میں انتظام کا مادہ نہ ہو وہ کسی کام کو نباہ نہیں سکتا۔ کچھ دن کیا پھر چھوڑ دیا۔

تشبہ بالکفار کی صورت

تو بعض بات ظاہر میں چھوٹی معلوم ہوتی ہے مگر اُس کا منشاء بڑا ہوتا ہے۔ عوام اُس کو نہیں سمجھتے۔ اسی لئے خدا تعالےٰ کے معاملات میں بھی ایسے لوگوں سے سخت غلطی ہوتی ہے کہ بعض امور عظیمہ کو چھوٹا سمجھ کر اُن پر دلیر ہو جاتے ہیں اور یوں کہتے ہیں کہ خدا کی ذات بہت بے پرواہ ہے اُن کے یہاں چھوٹی چھوٹی باتوں پر گرفت نہیں ہوتی۔ سو یہ سخت غلطی ہے جس کو تم چھوٹی سمجھتے ہو وہ ممکن ہے کہ واقعہ میں بہت بڑی ہو۔

صاحبو — اوّل تو خدا تعالیٰ کے بہت حقوق ہیں اُس کے اعتبار سے وہاں کوئی مخالفت چھوٹی نہیں ہوتی اور اس پر اگر یہ شبہ ہو کہ پھر کیا صغیرہ پر بھی عذاب ہوگا تو صغیرہ و کبیرہ میں کیا فرق رہا ——— جواب یہ ہے کہ اہل سنّت نے اس حقیقت کو سمجھا ہے۔ صغیرہ پر بھی تعذیب کو جائز رکھا ہے۔ اور صغیرہ کو جو صغیرہ کہتے ہیں، وہ دوسرے اُس سے بڑے گناہ کے اعتبار سے نہ یہ کہ واقع میں چھوٹا ہے۔ پس یہ فرق اعتباری ہے ورنہ حقیقت میں عظمتِ خداوندی پر نظر کرنے کے بعد تو ہر گناہ کبیرہ ہے۔

دوسرے اُس سے قطع نظر کر کے بھی بعض گناہ کی حقیقت شدید ہوتی ہے گو صورتاً کسی نظر سے بوجہ عدم تامّل خفیف معلوم ہو۔

چنانچہ ایک بزرگ کا قصّہ ہے کہ وہ ایک دن جا رہے تھے۔ ہولی کا دن تھا۔ ہندو آپس میں ایک دوسرے پر رنگ ڈال رہے تھے۔ بازار میں ہر شے رنگین نظر آتی تھی۔ انہوں نے ایک گدھے کو دیکھا کہ اُس پر رنگ نہیں تو ہنس کر کہا۔ تجھے کسی نے نہیں رنگا۔ لا تجھ کو میں رنگ دوں اور پان کی پیک اُس پر ڈال دی۔ جب مر گئے تو کسی کو مکشوف ہوا کہ اُن

کی نسبت حکم ہوا کہ اُن کو ہولی والوں میں لے جاؤ۔ کیونکہ اُنہوں نے گدھے پر پان کی پیک ڈال کر ہولی والوں کی شرکت کی تھی۔

صاحبو۔۔۔ پان کی پیک ڈالنا چھوٹی بات نہیں۔ اس میں تشبہ بالکفار تھا جو بڑی بات ہے۔ تو گناہ کو چھوٹا سمجھنے سے اور اُس پر مواخذہ سننے سے کبھی خدا پر بھی لوگوں کا یہ گمان ہو جاتا ہے کہ اللہ میاں بہت غصہ فرماتے ہیں۔ ذراسی بات پر خفا ہو جاتے ہیں۔۔۔ استغفر اللہ۔ غرض اخلاق کی تفسیر میں ایسا ہی لوگوں کو دھوکا ہو گیا ہے۔ جس میں خواص تک مبتلا ہیں۔ یہ بات بھی جملہ معترضہ کے طور پر بیان ہو گئی۔

اخلاص کی اہمیت

اب سمجھ لینا چاہیئے کہ اخلاص کے جو معنی مشہور ہیں۔ عنایت و محبت وہ صحیح نہیں۔ اس لئے میں نے کہا تھا کہ اخلاص کا لفظ تو سب نے سُنا ہو گا مگر اُس کو اپنے اندر پیدا کرنے کی کسی نے فکر نہیں کی سو بعض تو معنی ہی غلط سمجھے اور بعض نے گو معنی صحیح سمجھے مگر اُس کو ضروری الحصول نہ سمجھا میں اسی کی شکایت کرتا ہوں کہ ہم لوگ کبھی اپنی حالت کو غور کر کے نہیں دیکھتے کہ ہم میں کیا کمی ہے۔ اس لئے میں نے اس آیت کو اس وقت اختیار کیا ہے تاکہ لوگ سن لیں اور معلوم کر لیں کہ یہ کتنی ضروری بات ہے اور اس کے نہ ہونے سے دین میں کتنی کمی ہے۔ اس کو اوّل تو قرآن سے پھر نظائر و امثلہ سے ثابت کروں گا۔

قرآن سے تو اس کا اہتمام بالشان ہونا یوں معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالٰی نے اوّل قُل فرمایا جس میں حضورؐ کو حکم ہے کہ یہ بات کہہ دیجئے۔ اور یقینی

ہے کہ اگر قُل نہ بھی فرماتے جب بھی تو حضورؐ بیان فرماتے ہی۔ جہاں اور احکام کی تبلیغ آپ نے فرمائی اُس کی بھی تبلیغ فرماتے ہی۔ اس کے لیئے لفظ قل کا زیادہ فرمانا بتلا رہا ہے کہ کوئی مہتم بالشان حکم ہے۔ دوسرے اِنّی اُمِرْتُ (بتحقیق مجھ کو حکم ہوا ہے) فرمایا۔ اِنّی میں دوسری تاکید ہے پھر اُمِرْتُ (مجھ کو حکم ہوا ہے) تیسری تاکید اس طرح ہے کہ جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے برابر کوئی محبوبیت میں نہیں۔ تو ظاہر ہے کہ اگر احکام میں رعایت ہوتی تو حضورؐ کی سب سے بڑھ کر رعایت ہونی چاہیئے اور رعایت یہ ہوتی کہ بعض احکام سب پر واجب ہوتے اور آپؐ پر نہ ہوتے چنانچہ اس خصوصیت کو اس آیت میں ظاہر بھی فرمایا ہے۔

لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ

یعنے تاکہ اللہ تعالےٰ آپ کے اگلے پچھلے گناہ بخش دیں۔

تو باوجود اس کے جب اِنّی اُمِرْتُ فرمایا کہ مجھ کو حکم کیا گیا ہے۔ اب یہ احتمال نہیں ہو سکتا کہ دوسروں پر واجب نہ ہو البتہ اگر تخصیص کی دلیل موجود ہو تو وہ دوسری بات ہے اور یہاں مقتضی تخصیص کی کوئی چیز نہیں تو جب ایسی ذات بابرکات کو بھی یہ فرمایا گیا کہ سُنا دو مجھ کو حکم ہوا ہے اس بات کا، تو سمجھ لیجیئے کہ دوسرے لوگ تو کس حساب میں ہیں۔ ان پر تو یقیناً یہ فرض ہو گا۔

نیز ایک اور بھی تاکید ہے۔ وہ یہ کہ فرماتے ہیں امرت ان اعبد اللہ مخلصا لہ الدین۔ کہ مجھ کو ایسی طرح عبادت کرنے کا حکم ہوا ہے کہ جس میں اخلاص ہو۔ تو عبادت گو فی نفسہ خود بھی ایک امر مقصود ہے۔ مگر اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی اُس وقت معتبر ہے جب کہ اخلاص

کے ساتھ ہو کیونکہ ان اعبد اللہ امرت کا معمول ہے اور مخلصا قید ہے اور کلام مقید میں محط۔ فائدہ قید ہوا کرتی ہے تو اس آیت سے مقصود بالامر اخلاص ہوا یعنے مطلق عبادت کا حکم نہیں بلکہ عبادت مع الاخلاص کا حکم کیا گیا ہے۔ اسی لئے امرت ان اعبد اللہ مخلصا (مجھ کو اللہ تعالٰے کی جانب سے حکم ہوا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کی اس طرح عبادت کروں کہ عبادت کو اسی ہی کے لئے خالص رکھوں) فرمایا۔ امرت ان اخلص (مجھ کو حکم ہوا ہے کہ میں اخلاص کروں) نہیں فرمایا۔ کیونکہ اگر امرت ان اخلص فرماتے تو اس سے یہ نہ معلوم ہوتا کہ اخلاص اتنی ضروری شے ہے کہ عبادت تک اس کے بغیر معتبر نہیں۔ جب عبادت کے ساتھ بھی (حالانکہ وہ خود ایک عمدہ و مقصود شے ہے) اخلاص کا ہونا ضروری ہے۔ تو اس سے اخلاص کی عظمتِ شان اور زیادہ معلوم ہو گئی کہ عبادت جیسی چیز بھی بدون اس کے ہیچ ہے۔

اور جس طرح مخلصاً کی قید واقع ہونے سے اخلاص کا مہتم بالشان ہونا معلوم ہوا۔ اسی طرح ان اعبد اللہ کے اُمِرتُ کے لئے مفعول بہ واقع ہونے سے ایک اور بات بھی ثابت ہوئی کہ جیسے عبادت کے لئے اخلاص ضروری ہے ایسے ہی اخلاص کے لئے عبادت بھی ضروری ہے کیونکہ صرف اخلاص ہی مامور بہ نہیں اُمِرتُ اَنْ اُخلِصَ (مجھ کو حکم ہوا ہے کہ میں اخلاص کروں) نہیں فرمایا گیا۔ عبادت اور اخلاص دونوں مامور بہ ہیں۔ اس سے اُن لوگوں کی غلطی ثابت ہو گئی جو عبادت کو ضروری نہیں سمجھتے مگر چونکہ یہاں محط فائدہ اخلاص ہے اس لئے یہ زیادہ مامور بہ ہوا۔ حتیٰ کہ عبادت کے ہونے پر بھی اس سے چھٹکارا نہیں۔

اس آیت میں ایک اور نکتہ ہے وہ یہ کہ مُخْلِصًا لَّهُ الْعِبَادَةَ (اس طرح کہ اللہ تعالیٰ ہی کے لیے عبادت کو خالص کروں) نہیں فرمایا جیسا کہ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰہَ (یہ کہ عبادت کروں میں اللہ تعالیٰ کی) کے مناسب ظاہراً یہی تھا۔ حالانکہ مراد یہی ہے کہ خدا کی عبادت اس طرح کروں کہ عبادت اُس کے لئے خالص ہو بلکہ یہ فرمایا کہ مخلصا لہ الدین (اس طرح کہ اُس ہی کے لئے دین کو خالص رکھوں) جس سے معلوم ہوا کہ عبادت دینی جب ہی ہے کہ اُس میں اخلاص بھی ہو۔ تو مسئلہ یہ ثابت ہوا کہ صورت عبادت جب تک اُس میں اخلاص نہ ہو دین نہیں اور جب روح یعنے اخلاص بھی ہو تب البتہ یہ عبادتِ دین اور خدا کے یہاں قابلِ قبول ہے ـــــ افسوس اتنے بڑے اہتمام کی چیز اور ہماری اُس سے اتنی غفلت۔ یہ تو نقلی طور پر ضرورتِ اخلاص ثابت ہوئی۔

اخلاص کی ضرورت

اب عقلی طور پر سمجھئے۔ اخلاص کی ضرورت اُس کے ترجمہ سے سمجھ میں آوے گی۔ اخلاص کا ترجمہ ہے خالص کردن۔ خالص اُسے کہتے ہیں جس میں کسی چیز کی آمیزش نہ ہو جسے عوام نخالص کہتے ہیں۔ مثلاً خالص گھی وہ ہے جس میں تیل کا ملاؤ نہ ہو۔ تو اخلاص کے لغوی معنی خالص کرنے کے ہوئے۔ اب اپنے برتاؤ کو دیکھئے۔ آپ کے ساتھ جب کوئی محبت ظاہر کرتا ہے تو آپ اُس کی نیّت کو بھی دیکھتے ہیں یا نہیں دیکھتے۔ اگر ایک شخص نذر بھی دے اور پھر کہے کہ میری سفارش کر دیجئے تو آپ یہی سمجھیں گے کہ یہ نذر اپنی غرض کے لئے تھی یا مثلاً کوئی آپ کی دعوت کرے اور چلتے وقت کہے کہ میرے ذمہ قرضہ ہے۔ کیا آپ کو یہ دعوت

ناگوار نہ گزرے گی۔

غرض صبح سے شام تک اپنے معاملات پر نظر کر لیجیے کہ جو محبت خالص ہوتی ہے اُسی کی قدر ہوتی ہے۔ آپ بھی اُسی دوستی کو پسند کرتے ہیں جس میں آمیزش نہ ہو۔ تو خدا تعالیٰ جو کہ طیّب ہے آمیزش دار عبادت و محبت کی کیوں کر قدر کریں گے ـــــ افسوس محبوبانِ دنیا کے واسطے تو کوشش کی جاتی ہے کہ ہدیہ خالص ہو، اس میں کسی چیز کا میل نہ ہو اور خدائی دربار میں جو عبادت پیش کی جاتی ہے، اُس کے خالص ہونے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ غرض نقلی اور عقلی طور پر اخلاص کی ضرورت ثابت ہو گئی ــــ،

اب دیکھنے کی بات یہ ہے کہ ہمارے اعمال میں اخلاص بھی ہے یا نہیں کیونکہ جب وہ ضروری چیز ہے تو اُس کا دیکھنا ضروری ہے جب قرآن میں اس کا بتاکید حکم ہے تو کیا وجہ ہے کہ اُس کو فرض نہ سمجھے ؎

فَاِنْ كُنْتَ لَا تَدْرِیْ فَتِلْكَ مُصِیْبَةٌ
وَاِنْ كُنْتَ تَدْرِیْ فَالْمُصِیْبَةُ اَعْظَمُ

یعنی اگر جانتے نہ ہو تو یہ ایک ہی مصیبت ہے اور اگر جانتے ہو اور پھر عمل نہیں کرتے تو یہ دوہری مصیبت ہے۔ اس کا کوئی بھی تدارک نہیں۔ کیونکہ جتنے افعال اختیاریہ ہیں سب قصد پر مبنی ہیں۔ بدون قصد و ارادہ کے متحقق نہیں ہوتے۔ اخلاص بھی اُنہی میں سے ہے۔ اگر ارادہ ہی نہ کرو گے تو اخلاص کیسے حاصل ہو جائے گا۔

یہ غلطی بعض طالبانِ باطن کو بھی پیش آتی ہے کہ درخواست کیا کرتے ہیں کوئی دعا کر دیجیے کہ ہماری اصلاح ہو جائے۔ کوئی ایسا تعویذ دے

دیجئے کہ دل سے خطرات دور ہو جاویں۔ ان حضرات سے کوئی پوچھے کہ فقط درخواست ہی کرنی آتی ہے یا کبھی اس کی فکر بھی ہوئی ہے اصلاح کا قصد بھی کیا ہے۔ حالت دیکھو تو سبحان اللہ کسی ادا سے معلوم نہیں ہوتا کہ ان کو اپنی اصلاح کا خیال ہے۔ اگر اپنی اصلاح کا خیال ہو تو اوّل پختہ ارادہ کر کے اُس کے ذرائع بہم پہنچاؤ تاکہ تصفیہ میسّر ہو ؎

صوفی نہ شود صافی تا در نہ کشد جامی
بسیار سفر باید تا پختہ شود خامی

(جب تک جامِ الفت نوش کر کے بہت سا مجاہدہ اور ریاضت نہ کرے اُس وقت تک تصفیہ میسّر نہیں ہو سکتا) میری یہ مراد نہیں کہ کم کھاؤ کم سوؤ۔ جیسا کہ آپ نے سُنا ہو گا کہ بڑی محنت کرنی پڑتی ہے میں زیادہ محنت آپ سے نہیں لیتا۔ آپ کو اجازت ہے کہ کھائیے اور سوئیے اور اگر کسی دن عین اوراد و اذکار میں نیند آجائے سو بھی رہئے اور پریشان نہ ہوجئے مگر اصلاح کی دُھن میں لگے رہیے۔ مولانا کا قول ہے ؎

اندریں رہ می تراش و می خراش
تا دمِ آخر دمے فارغ مباش

(اسی اصلاح کی ادھیڑ بن میں لگے رہو اور اخیر وقت تک ایک لحظہ بھی فارغ مت ہو۔)

تکلفات کا اثر

اور میں نے جو کہا ہے آپ سے محنت نہیں لیتا، وجہ اس کی یہ ہے کہ آج کل کے قویٰ زیادہ محنت کے قابل ہی نہیں۔ اور سبب اس کا ہجوم افکار ہے۔ سو جس کا دماغ فکر میں زیادہ منہمک ہو گا وہ ضعیف

ہو جائے گا۔ پہلے لوگوں کے دماغ افکار فضول سے خالی ہوتے تھے اس لئے قوی بھی ہوتے تھے۔ آج کل تو آدمی بچپن سے اُبھرا اور فکر میں مبتلا ہوا کچھ تو اس زمانہ میں افکار پہلے کی نسبت زیادہ ہی ہیں۔ کچھ لوگ خود اپنے سر تھوپ لیتے ہیں۔ خصوص بعضے آدمی وضع اور فیشن ہی کے فکر میں رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض لوگوں کی حالت دیکھی گئی ہے کہ ہر کام کے لئے الگ لباس مقرر ہے۔ کھانے کا الگ، سواری کا الگ، سونے کا الگ، کچہری میں جانے کا الگ، پاخانہ میں جانے کا الگ لباس کیا ہوا ہے۔ ایک وبالِ جان ہو گیا۔

ایک شخص کی یہ حالت تھی کہ جب کوئی اُن کو پکارتا تو آئینہ دیکھ کر بناؤ سنگار کر کے گھر سے باہر نکلتے تھے۔ اس پر مجھے ایک لطیفہ یاد آ گیا کہ ایک شخص کچہری میں ملازم تھے۔ وہ پُرانے زمانے کے سیدھے سادھے مسلمان تھے۔ عمامہ جلدی جلدی باندھ لیا کرتے تھے تو وہ خراب بندھتا تھا اور جتنے کچہری والے تھے وہ آئینہ سامنے رکھ کر پہر دل میں باندھ کر آتے تھے۔ تو اُن کے عمامے خوبصورت بندھے ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ حاکم نے اُن سے کہا کہ منشی جی آپ کو عمامہ باندھنا نہیں آتا۔ دیکھئے اور سب کیا خوبصورت عمامہ باندھتے ہیں۔ تو اُنہوں نے کہا جناب یہ لوگ اپنی بیبیوں سے بندھوا کر آتے ہیں میں خود باندھ لیتا ہوں۔ اگر یقین نہ آئے تو سب سے کہئے کہ عمامے اتار کر پھر باندھیں۔ اگر خراب باندھیں تو سمجھئے کہ یہ خود نہیں باندھتے۔ حاکم نے سب کے عمامے کھلوا کر از سرِ نو باندھنے کا حکم دیا۔ اُن صاحب نے تو ویسا ہی باندھا جیسا ہمیشہ باندھتے تھے اور لوگوں کا بہت ہی خراب بندھا کیونکہ آئینہ تو سامنے تھا ہی نہیں۔ حاکم

نے کہا تم سچ کہتے ہو۔ واقعی یہ لوگ اپنی بیبیوں سے بندھوا کر آتے ہیں سب لوگوں کو بڑی شرمندگی ہوئی۔

غرض بعض آدمی بناؤ سنگار میں ہی کھپے رہتے ہیں۔ جس کی وجہ سے بہت سے افکار لاحق ہو جاتے ہیں کیونکہ اوّل تو اس کے لئے آمدنی بہت چاہیئے، اس کی فکر۔ پھر خود بھی ہر وقت کا جنجال، غرض فکر ہی فکر ہے۔ میں نے ایک عہدہ دار کو دیکھا۔ ایک سفر میں جہاں میں مہمان تھا وہاں ہی وہ بھی مہمان تھے۔ اُن کا ہر وقت کا لباس الگ تھا جس سے وہ سخت مصیبت میں تھے۔ ہر وقت یہی فکر سوار تھی کہ اب کیا پہنوں۔ افسوس یہ لوگ آزادی کا دعویٰ کرتے ہیں مگر آزادی کا نام ہی نام ہے ورنہ ان کو آزادی کہاں نصیب۔ یہ تو ہر وقت افکار کے شکنجے میں جکڑے ہوئے ہیں۔ آزادی اہل اللہ کو ہے ؎

نے غمِ دزد نے غمِ کالا   بالا ننگلے زیر و ننگلے

(یعنے ایک معمولی تہبند ایک معمولی چادر ہے نہ چور کا کھٹکا نہ مال و اسباب کا غم ہے)

غرض تکلف حد سے بڑھ گیا۔ اس لئے دیکھا جاتا ہے کہ دماغ پریشان و ضعیف ہو گئے ہیں بلکہ ان کی وجہ سے اہل اللہ کو بھی کچھ فکریں لگ گئیں کہ اُن کی خاطر و مدارات کے لئے اُن کو کچھ نہ کچھ کرنا پڑتا ہی ہے۔ مثلاً اگر ان لوگوں میں سے کوئی اُن کے یہاں مہمان ہو تو اُس کے لئے ریل پر گاڑی بھیجنے کی فکر ہوتی ہے کیونکہ یہ بے چارے پیادہ پا چلنے کے عادی نہیں۔ اگر سواری نہ بھیجی جائے تو کئی روز تک اُن کی تھکن بھی نہ اُترے۔ یہ تکلیف دیکھ کر اللہ والوں کا بھی جی دکھتا ہے۔

اہل اللہ کا تو اپنے نفس کے لئے یہ برتاؤ ہوتا ہے۔

نانوتہ میں ایک طبیب ہیں۔ اُن کے یہاں ایک بزرگ مہمان ہوئے تو وہ میزبان مہمان سے کیا کہتے ہیں کہ میرے پاس تو کچھ ہے نہیں۔ آج میرے گھر فاقہ ہے اگر اجازت ہو تو کسی اور کو خدمت کی اجازت دوں۔ چونکہ ان حضرات میں بے تکلفی ہوتی ہے اس لئے مہمان بزرگ نے کہا بہت اچھا جب آپ کے یہاں فاقہ ہے تو ہم بھی آپ ہی کی طرح ہیں۔ کبھی بھوکا بھی رہنا چاہیئے۔ چنانچہ دونوں بھوکے بیٹھے رہے حتیٰ کہ مغرب کے وقت ایک شخص نے حکیم صاحب کی خدمت میں کچھ روپے نذر کیئے اور کھانا پکا کر کھایا گیا۔

غرض اللہ والے بڑی راحت میں ہیں۔ سو وہ ضعف کے اس سبب سے تو مبرّا ہیں۔ لیکن دوسرے عوارض مثل اثر آب وہوا وغیرہ کے سبب ضعیف ہیں جس سے زیادہ مشقت کے متحمل نہیں ہو سکتے۔

مجاہدہ کے طریقے

ایک تو یہ سبب ہے زیادہ محنت کا مشورہ نہ دینے کا۔ دوسرے طبیعت بھی اکتا جاتی ہے۔ اور گھبرا کر کام چھوڑ دیتا ہے۔ اور آرام سے رہنے میں طبیعت میں نشاط رہتا ہے اور نشاط میں کام سہل ہوتا ہے اسی واسطے ہمارے حضرت کی رائے یہ تھی کہ نفس کو خوب خوش رکھو، مگر کام بھی بہت لو اور چکی پسواؤ۔ اور جب کام نہ کرو تب بھی یہ سزا نہ دو کہ غذا کم کر دو بلکہ کثرتِ نوافل سے اس کا تدارک کرو۔ چنانچہ نماز کی نشان ہے انہا لکبیرۃ (وہ نماز گراں ہے) وہ اس سے گھبراتا ہے۔ پس اس طور پر وہ معمول روزانہ میں سستی نہ کرے گا

اکثر لوگ مجھ سے کہا کرتے ہیں کہ ایسی ترکیب بتلا دو کہ کھانا کم کھانے کی عادت ہو جائے۔ میں کہا کرتا ہوں کہ اگر کھانا کم ہو گیا اور کمزور اور لاغر ہو گئے تو اتنا کام بھی نہ کر سکو گے جتنا اب کر رہے ہو۔ اس کے علاوہ مجاہدہ کے اور طریقے بھی تو ہیں۔ حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ کی عادت تھی کہ جس روز تہجد کے لئے آنکھ نہ کھلتی تھی تو اپنے بدن پر قمچیاں مار مار کر توڑ دیتے تھے اور فرماتے کہ وَإِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا ـــــ اگر اس کے بعد پھر ایسا ہوا تو ہم پھر ایسا ہی کریں گے تو کھانا کم کرنا کیا ضروری ہے؟ مجاہدے اور بھی تو ہیں ـــــ،

خلاصہ یہ کہ ایسی محنت میرا مقصود نہیں۔ میرا مقصود یہ ہے کہ اصلاح کی دھن میں لگ جاؤ باقی کھانا پینا چھوڑنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ دین میں کچھ دشواری نہیں۔ جو کچھ تم کو دشواری معلوم ہو رہی ہے سبب اس کا صرف یہ ہے کہ تم نے ارادہ نہیں کیا۔ اور ارادہ نہ کرنے سے ہر کام گو وہ کتنا ہی آسان ہو مشکل ہو جاتا ہے۔

چنانچہ ایک حکایت یاد آئی کہ زمانہ شاہی میں دو احدی آدمی تھے ایک پڑا تھا دوسرا اس کے پاس بیٹھا تھا۔ راستہ میں ایک شخص گھوڑے پر سوار جا رہا تھا۔ ایک احدی نے اس کو آواز دی کہ اے میاں گھوڑے سوار ذرا میری ایک بات سنتا جا۔ وہ اس کے پاس آیا کہ کہو کیا کہتا ہے۔ اس نے کہا کہ یہ جو بیر میرے سینہ پر پڑا ہے۔ ذرا میرے منہ میں ڈال دے۔ اس نے ایک کوڑا مارا کہ بلا ضرورت مجھ چلتے ہوئے کو راستہ سے بلایا اور اتنا نہ ہوا کہ خود کھا لے یا اس سے کہہ دے جو پاس بیٹھا ہے۔ اس نے کہا صاحب میں کبھی اس کام کو نہ کروں گا کیونکہ

صبح کتا میرے منہ میں موتتا رہا اور یہ پاس بیٹھا تھا مگر اس نے ہٹایا نہیں سوار نے ایک کوڑا اس کے بھی مارا اور برا بھلا کہتا ہوا چلا گیا۔

غرض یہ ہے کہ ارادہ وہ چیز ہے کہ اگر یہ نہ ہو تو آسان سے آسان کام بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ اب بھی ہم لوگوں کے پاس سے کچھ نہیں گیا۔ صرف ایک چیز گئی ہے وہ یہ کہ ہم اپنی دولت سے کہ اس میں ارادہ بھی ہے کام نہیں لیتے۔ باوجود دولت مند ہونے کے ہماری وہ حالت ہے کہ ؎

یک سبد پُر ناں ترا بر فرقِ سر
تو ہمی جوئی لبِ ناں در بدر

جیسے ایک شخص کے سر پر روٹیوں کا بھرا ٹوکرا رکھا ہو اور وہ در بدر بھیک مانگتا پھرتا ہے۔ حضرات آپ کے پاس بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے اور پھر اجنبیانہ ڈھونڈھتے پھرتے ہو کہ کچھ بتلا دیجئے مگر آپ چاہتے ہی نہیں اور بغیر آپ کے چاہے اور کام کئے کچھ نہیں ہو سکتا۔ اور یہ جو حکائتیں مشہور ہیں کہ بعض اولیاء کو ایک دن میں سب کچھ مل گیا تو اس کی حقیقت سُن لیجئے۔

حضرت شاہ ابوالمعالی رحمۃ اللہ علیہ کی اس قسم کی حکایت ہے کہ انہوں نے شاہ بھیک رحمۃ اللہ علیہ کو ایک دن میں سب کچھ دے دیا مگر یہ غلطی ہے کہ ایک دن میں سب ہو گیا۔ بات یہ ہے کہ علتِ تامہ کا جزوِ اخیر اُس ایک دن میں پایا گیا۔ یہ نہیں کہ تمام اجزاء اسی دن میں پائے گئے لوگ اس کو تو دیکھتے ہیں کہ ایک دن میں کامل کر دیا یہ نہیں دیکھتے کہ اس ایک دن سے پہلے انہوں نے کتنی مشقت برداشت کی تھی۔ شاہ بھیک

صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی یہ کیفیت تھی کہ ایک مدت دراز تک شیخ کی خدمت میں تکلیفیں اٹھائیں۔

ایک واقعہ اُن کا یہ ہے کہ ایک مرتبہ شیخ اُن پر خفا ہو گئے اور فرمایا کہ ہمارے سامنے نہ آنا۔ چنانچہ یہ حیران و پریشان انبہٹہ کے چاروں طرف پھرتے تھے اور انتثالِ امر کے سبب سامنے نہ آتے تھے۔ اس میں یہ حال تھا ؎

اُرِیْدُ وِصَالَہٗ وَیُرِیْدُ ھِجْرِیْ
فَاَتْرُکُ مَا اُرِیْدُ لِمَا یُرِیْدُ

یعنے میں ملنا چاہتا ہوں محبوب ملنا نہیں چاہتا۔ تو میں اپنی مرضی کو اُس کی مرضی کے سامنے چھوڑ دیتا ہوں۔ عشق اسی کو کہتے ہیں۔ چنانچہ مدت تک سامنے نہ آئے۔ برسات کا موسم آیا اور کثرتِ بارش سے شیخ کا مکان گر گیا۔ اب مکان بنانے کو مزدور کہاں سے آئے۔ کیونکہ ناداری اس قدر تھی کہ اکثر فاقہ کی نوبت آتی تھی۔ سہارنپور کے لوگ دعوت کیا کرتے تھے تو حضرت شاہ بھیک صاحبؒ اس قدر جاں نثار خادم تھے کہ اہل وعیال کے لئے بعد عشا کے پیادہ پا انبہٹہ کھانا پہنچا کر تہجد کے وقت آکر شیخ کو وضو کراتے۔ تو بیوی صاحبہ بولیں کہ یہ جتنے خادم یہاں پڑے ہیں سب اپنی غرض کے ہیں۔ ایک بے چارہ گنوار سائل گیا تھا۔ وہ کام کاج کر دیا کرتا تھا۔ اسی کو آپ نے نکال باہر کیا۔ آپ نے فرمایا کہ میں نے ہی تو نکالا ہے تم نے تو نہیں نکالا، تم بلا لو۔ میں کب منع کرتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ دل سے تو نفرت نہیں تھی۔ چنانچہ انہوں نے کہلا بھیجا کہ مکان گر گیا ہے اُس کے بنانے کے لئے حضرت نے تمہارے بلانے کی مجھ کو اجازت دے دی

ہے۔ یہ تو مشتاق تھے ہی فوراً حاضر ہوئے مگر خوف کے مارے حضرت کے سامنے نہیں گئے۔

ایک دن چھت کوٹ رہے تھے کہ حضرت شاہ ابوالمعالی صاحبؒ گھر میں کھانا کھانے تشریف لائے۔ کھانا کھاتے ہوئے ایک لقمہ ہاتھ میں لے کر حضرت شاہ بھیکؒ کو دکھایا کہ لے بھیک۔ یہ ایسے بے تاب ہوئے کہ فوراً چھت پر سے کود پڑے اور حاضر ہوئے۔ شیخ نے منہ میں لقمہ دیا اور گلے سے لگا لیا اور خلعتِ خلافت عطا کیا۔

اس **حکایت کو سن** کر لوگ کہتے ہیں کہ ایک نظر میں کام ہو گیا۔ ایک دن میں کامل بنا دیا۔ مگر دیکھئے وہ ایک نظر کتنے دنوں میں ہوئی۔ ایک دیا سلائی میں لکڑی جل جاتی ہے مگر خشک لکڑی ہو تو جل جاتی ہے تو دیکھو اس کے خشک ہونے میں کتنا زمانہ صرف ہوتا ہے۔ اور اگر ایک موٹا تازہ درخت یہ سوچنے لگے کہ مجھ میں تو آگ لگتی ہی نہیں، دیا سلائی جلاتی ہی نہیں تو کوئی کہہ سکتا ہے کہ اس کا یہ خیال صحیح ہے ــــ ہرگز نہیں۔ یہی کہا جائے گا کہ وہ لکڑی تو سوکھ چکی تھی۔ اس میں رطوبت کم ہو گئی تھی۔ اس لئے ایک دیا سلائی سے جل گئی۔ درخت میں رطوبتیں بہت ہیں نیز موٹا بہت ہے، اس لئے ایک دیا سلائی کافی نہیں۔

ایسے ہی جن کو ایک نظر کافی ہو گئی ہے خبر بھی ہے ان کے نفس پہلے سے کتنے صاف ہو چکے تھے۔ تمہارے نفوس موٹے ہو رہے ہیں۔ ان میں مادہ فاسد بہت بھر رہا ہے۔ اس لئے ایک نظر کافی نہیں ہو سکتی ہے۔ تو لوگوں کو یہ دھوکے ہو گئے ہیں ــــ ایک دوسری غلطی اس کے مقابل یہ ہے کہ کوئی اس کو بہت مشکل سمجھ رہا ہے اس لئے اپنی اصلاح سے ہاتھ دھو

بیٹھا اور کوئی اتنا آسان سمجھے ہوئے ہے کہ صرف ایک نگاہ کا کام سمجھتا ہے حالانکہ ؎

صوفی نہ شود صافی تا در نہ کشد جامی
بسیار سفر باید تا پختہ شود خامی

(یعنے جب تک جام الفت نوش کر کے خوب مجاہدات اور ریاضات کرے۔ اس وقت تک اصلاح اور تصفیہ حاصل نہیں ہو سکتا ہے)

اور فرماتے ہیں ؎

شنیدم رہروے در سر زمینے
ہمیں گفت ایں معما با قرینے

(ایک سالک کو سُنا کہ اپنے ہم نشین سے یہ نکتہ بیان کر رہا تھا)

کہ اے صوفی شراب آنگہ شود صاف
کہ در شیشہ بماند اربعینے

(کہ اے صوفی شراب اس وقت صاف اور عمدہ ہوتی ہے کہ چالیس دن تک شیشہ میں رکھی رہے)

اور فرماتے ہیں ؎

عاشقی چیست بگو بندۂ جاناں بودن
دل بدستِ دیگرے دادن و حیراں بودن

(یعنے عاشقی کیا ہے؟ محبوب کا بندہ ہو جانا۔ دل دوسرے کے ہاتھ میں دے کر خود حیران ہو جانا)

سوئے زلفش نظرے کردن و رُویش دیدن
گاہ کافر شدن و گاہ مسلماں بودن

(اُس کے زلف کی طرف نظر کرنا اور اُس کے چہرہ کو دیکھنا۔ کبھی فانی ہونا ہے اور کبھی باقی رہنا)

کافر و مسلمان ایک اصطلاح ہے (فنا کو کفر اور اسلام کو بقاء سے تعبیر کرتے ہیں اور فنا کی تجلی کو زلف اور بقاء کی تجلّی کو رُخ سے تعبیر کرتے ہیں) بہر حال اس سے معلوم ہوا کہ یہ کام نہ اتنا آسان ہے جتنا لوگ سمجھتے ہیں کہ کچھ کرنا ہی نہ پڑے اور ایسا مشکل بھی نہیں جس سے ڈر کر ہاتھ دھو کر بیٹھ جاویں

تصوّف کی حقیقت

وجہ ان غلطیوں کی یہ ہے کہ لوگوں کو اس کی حقیقت کی خبر نہیں اس لئے کوئی بہت مشکل سمجھ رہا ہے اور کوئی بہت آسان خیال کر رہا ہے تو سنئے تصوّف کی حقیقت یہ ہے ——— تعمیر الظاہر والباطن۔ سو یہ اختیاری امر ہے اس لئے تو اس قدر دشوار نہیں اور بوجہ اختیاری ہونے کے موقوف ہے قصد پر اس لئے اس قدر سہل نہیں کہ قصد و ارادہ بھی نہ کرنا پڑے۔ اور گو حقیقت میں یہ فضل خدا ہی پر موقوف ہے مگر تاہم صرف ایک چیز اپنے اختیار میں بھی ہے، ارادہ اور سعی۔ اور سعی بھی ارادہ ہی سے ہوتی ہے۔ مگر اب لوگ یہ چاہتے ہیں کہ ارادہ بھی کچھ نہ کرنا پڑا اور کام ہو جائے۔ مگر صاحبو! بدون ارادہ تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔

دیکھئے کھانا کتنا آسان کام ہے مگر وہ بھی جب تک ارادہ نہ ہو نہیں ہو سکتا۔ غلہ خریدنا پڑے گا۔ پھر پسوانا پکوانا، برتن میں نکالنا، پھر کہیں جا کر کھانا نصیب ہو گا۔ اور اگر کوئی پکا ہوا بھی دے جائے تب بھی منہ چلانا تو پڑے ہی گا۔ بعض لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ اگر سعی کریں تو جانے کیا کیا کرنا پڑے گا۔ بیوی چھوڑنی پڑے گی۔ کھانا پینا کم کرنا ہو گا۔ غرض بہت مشکل

ہے۔ تو انہوں نے یہ تدبیر نکالی کہ کسی بزرگ کے پاس چلو۔ ایک ہی نظر میں کامل بنا دیں گے۔

چنانچہ ایک ڈپٹی کلکٹر پنشنر اسی خیال سے ایک بزرگ کے پاس گئے اور کہا کہ خدا تک پہنچنے کی کوئی آسان ترکیب بتلا دیجئے کہ جلدی کامیاب ہو جاؤں۔ تھوڑی دیر وہ بزرگ چپ ہو رہے۔ پھر کہا کہ آپ کی کیا عمر ہے؟ انہوں نے عمر بتلائی۔ پوچھا کہ پڑھنا کب شروع کیا تھا۔ معلوم ہوا کہ بسم اللہ چوتھے برس ہوئی تھی۔ آج کل بسم اللہ کے لئے چار برس کی رسم بھی مسلمانوں میں بہت رائج ہے۔ حدیث و قرآن میں اس کی کوئی اصل نہیں ملتی۔ غرض انہوں نے بیان کیا کہ اردو اتنے برس میں ہوئی۔ فارسی اتنے دنوں میں ہوئی۔ پھر انگریزی شروع ہوئی۔ پھر انگریزی میں پاس حاصل کیا۔ اتنی عمر میں ملازمت ملی۔ اس وقت سے ترقی پا کر ڈپٹی کلکٹر ہوا۔ اب پنشن ملی ہے انہوں نے فرمایا کہ اتنی مدت میں آپ کو ترقی ہوئی۔ انہوں نے کہا ہاں۔ کہا کہ قاعدہ ہے کہ ایک چیز حاصل شدہ کے بعد جب دوسری چیز حاصل کرتے ہیں تو اس کو پہلے سے افضل سمجھتے ہیں۔ آپ نے دنیاوی ترقی کے لئے کس کو ادنیٰ بھی سمجھتے ہو اتنی مدت صرف کی اور خدا سے ملنے کے لئے کہتے ہو کہ ایک قدم میں پہنچ جاؤں۔ کچھ تو شرم کرنی چاہیے۔ تو وہ ڈپٹی صاحب کہتے تھے کہ واقعی ایسا جواب دیا کہ میں بالکل چپ ہو گیا۔ یہ فرمائش تو بہت اچھی ہے کہ خدا تک پہنچنے کی ترکیب بتلا دو مگر آسانی کی فرمائش نازیبا ہے طالب کو تو ایسا ہونا چاہیئے کہ ؎

دست از طلب ندارم تا کام من بر آید
یا تن رسد بجاناں یا جاں ز تن بر آید

(یعنے جب تک مقصد برآری نہ ہو گی، اُس وقت تک طلب سے باز نہ رہوں گا یا تو تن محبوب کے پاس پہنچ جائے یا جان تن سے نکل جائے)
اپنی طرف سے ارادہ اور طلب کرو اُس طرف سے بہت فضل ہو گا حدیث قدسی میں باری تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں من تقرب الیّ شبرا تقربت الیہ ذراعا ــــــ الخ کہ جو میری طرف ایک بالشت آتا ہے میں اُس کی طرف ایک ہاتھ جاتا ہوں۔ جو میری طرف ایک ہاتھ آتا ہے میں اس کی طرف مقدار باع (دونوں ہاتھ لمبا کرنے کی مقدار) جاتا ہوں۔ جو میری طرف آہستہ چل کر آتا ہے میں اُس کی طرف دوڑ کر جاتا ہوں۔ غرض تمہاری تھوڑی سی توجہ پر اُس طرف سے عنایت ہی عنایت ہوتی ہے۔ اسی کو فرماتے ہیں ؎

آب کم جو تشنگی آور بدست تا بجوشد آبت از بالا و پست
تشنگاں گر آب جویند از جہاں آب ہم جوید بعالم تشنگاں

(پانی مت تلاش کرو پیاس پیدا کرو تاکہ پستی و بلندی سے تمہارے لئے پانی جوش مارے یعنی اپنے اندر طلب پیدا کرو عنایت حق خود بخود متوجہ ہو گی۔ اگر پانی کے، پیاسے طالب ہیں تو پانی بھی پیاسوں کا طالب ہے) اس میں راز یہ ہے کہ جیسے پیاسے پانی کو ڈھونڈھتے ہیں پانی بھی پیاسوں کا طالب ہے۔ اسی طرح جیسے تم طالب عنایاتِ حق ہو، عنایاتِ حق بھی تمہاری طالب ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ذرا سی توجہ پر بے حد عنایات ہوتی ہیں۔ تم اندر طلب پیدا کرلو محبوب خود بخود متوجہ ہو گا۔ کہتے ہیں ؎

عاشق کہ شد کہ یار بحالش نظر نہ کرد
اے خواجہ درد نیست وگرنہ طبیب ہست

(جو بھی عاشق ہوا ہے محبوب نے ضرور اُس کے حال پر نظر کی ہے حق یہ ہے کہ درد یعنی طلب ہی نہیں ورنہ طبیب یعنے عنایت حق تو ہر وقت موجود ہے) حقیقت میں طلب ہی نہیں ورنہ خدا کے یہاں سے کوئی کمی نہیں۔ غرض اس بھروسے نہ رہنا کہ بدون کچھ کئے ایک نظر پڑجاوے گی اور کامل ہو جاؤ گے۔ نظر بھی جب ہی پڑے گی جب طلب ہو گی۔ دیکھو بعض مرتبہ اساتذہ حساب وغیرہ کا کوئی آسان قاعدہ بھی بتلا دیتے ہیں۔ مگر ہر ایک کو نہیں بتاتے۔ جس میں شوق و طلب دیکھتے ہیں اسی کو بتلاتے ہیں ——— حاصل یہ کہ اخلاص بھی کچھ مشکل نہیں آسان ہے مگر بلا طلب حاصل نہیں ہوتا۔

اب اپنی حالت میں غور کرو۔ ہم لوگ نماز پڑھتے ہیں مگر کبھی اس طرف توجہ نہ ہوئی کہ نیت خالص ہے یا نہیں۔ اور اگر کسی کے کہنے سے توجہ ہوئی بھی تو یوں چاہتے ہیں کہ خود کچھ نہ کریں اپنے آپ اخلاص ہونے لگے جب اس قدر بے توجہی ہے تو انلزمکموھا وانتم لھا کارھون کیا اپنی رحمت تمہارے سر چپکا دیں حالانکہ تم کو اس کی پروا بھی نہیں۔ تو اخلاص اتنا آسان نہیں کہ بلا طلب بھی مل جاوے۔

علم میں اخلاص کی ضرورت

چونکہ دین کے دو شعبے ہیں ایک علم دوسرا عمل۔ تو جیسے عمل میں اخلاص ضروری ہے ایسے ہی علم میں بھی ضروری ہے۔ اب دیکھئے کہ تحصیل علم میں تمہاری کیا نیت ہوتی ہے۔ ایسے بہت کم ہیں کہ جن کی یہ نیت ہو کہ غیر مرضیات حق سے بچیں اور خدا تعالیٰ اس سے خوش ہو گا۔ جب علم میں اخلاص نہیں تو عمل میں کہاں سے آئے۔ اوّل علم میں اخلاص پیدا کرنا ضروری ہے

میں یہ نہیں کہتا کہ اگر نیت خالص نہ ہو تو تحصیل علم ہی چھوڑ دو۔ نہیں، پڑھنا تو بہر حال ضروری ہے کیونکہ اگر تحصیل کے وقت اخلاص نہیں ہے تاہم امید ہے کہ علم حاصل کر لینے سے پھر کبھی پیدا ہو جائے گا اور اگر علم بھی حاصل نہ کیا تو یہ امید بھی نہ رہے گی۔ اسی طرح اگر عمل میں اخلاص نہ ہو، تاہم عمل نہ چھوڑو کہ کبھی عمل کرتے کرتے اُس کی برکت سے بھی اخلاص پیدا ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ان دونوں میں تجاذب بھی ہے۔ کبھی عمل سے بھی نیت درست ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ علم سے اکثر یہ بات ہو جاتی ہے۔ تو اگر نیت خالص نہ ہوئی ہو تب بھی چھوڑ نہ دے۔ کیونکہ آئندہ حاصل ہو جانے کی تو امید ہے بزرگوں کا قول ہے۔

تَعَلَّمْنَا الْعِلْمَ لِغَيْرِ اللّٰهِ فَاَبَى الْعِلْمُ اِلَّا اَنْ يَّكُوْنَ لِلّٰهِ (علم ہم نے غیر اللہ کے لئے پڑھا تھا مگر وہ مانا ہی نہیں کہ وہ غیر اللہ کا ہو کر رہے لہٰذا وہ اللہ ہی کا ہو کر رہا) ہم نے فقہ اس لئے سیکھی تھی کہ فتوے لکھیں گے مفتی کہلائیں گے۔ یا حدیث پڑھتے ہیں تا کہ وعظ کہیں گے۔ لوگ ہم کو نذرانے دیں گے۔ دانت گھسائی دیں گے۔ یا بعضوں نے مباحثہ کے لئے پڑھا تھا کہ بڑی عزت ہو گی مگر علم خدا ہی کا ہو کر رہا۔ علم نے مانا ہی نہیں کہ وہ غیر کا ہو کر رہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ مثلاً قرآن میں کوئی آیت وعید پڑھی جس میں علم سے دنیا کمانے کی مذمت تھی اور قلب میں ایک کھٹکا پیدا ہوا کہ میں بھی تو کسی مرض میں مبتلا ہوں۔ تو اپنے کو ملامت کرتا ہے اور روتا ہے۔ پس اس طرح عالم باعمل ہو گیا۔ یہ ہے اَبَى الْعِلْمُ اِلَّا اَنْ يَّكُوْنَ لِلّٰهِ (یعنے علم مانا ہی نہیں بجز اس کے کہ وہ اللہ ہی کا ہو کر رہے) کہ علم سے کبھی نہ کبھی اخلاص ہو ہی جاتا ہے۔

اس سے اُن لوگوں کا جواب بھی سمجھ میں آ گیا ہوگا جو کہتے ہیں کہ اگر انگریزی سیکھنا بُرا ہے تو آج کل کے طالب علموں کا عربی سیکھنا بھی اچھا نہیں کیونکہ اسی میں اُن کی کون سی نیت اچھی ہے۔ دونوں سے مقصود دنیا ہے۔ پس دونوں بُرے ہوئے۔ اور اگر یہ کہو کہ انگریزی میں عقائد خراب ہوتے ہیں تو عربی کے ساتھ بھی تو فلسفہ ہے، اُس کے ساتھ بھی عقائد خراب ہو سکتے ہیں۔ یہ ہیں اقوال اہل شبہات کے مگر یہ سب تلبیسات ہیں دونوں ہرگز برابر نہیں کیونکہ علوم محمودہ حدیث و قرآن جب عربی پڑھنے والے کی زبان سے ادا ہوں گے کان سے بھی سُنے گا۔ اُس میں غور و فکر بھی کرے گا تو اُس کے ساتھ ایک ہادی تو موجود ہے کبھی تو اثر پڑے گا اور اصلاح ہو جاوے گی۔ انگریزی میں کوئی اُمید بھی اصلاح کی نہیں۔ بڑا کھلا فرق ہے غرض اَبَی الْعِلْمُ اِلَّا اَنْ یَّکُوْنَ لِلّٰہِ کے یہ معنی ہیں کہ علم خدا کا کرکے رہتا ہے۔ اس لئے اوّل تو اس کی کوشش کرنا چاہئے کہ پہلے ہی سے تحصیل علم میں نیت خالص ہو۔ اور اگر کسی کی نیت ابھی خالص نہ ہو تو اُس کو چھوڑنا ہرگز نہیں چاہئے۔ امید ہے کہ کبھی اخلاص حاصل ہو جائے گا۔ اسی لئے اہل اللہ کہتے ہیں کہ اگر ایک شخص کام کرتا ہے گو ریاء ہی سے ہو، اُس شخص سے اچھا ہے جو کام کرتا ہی نہیں۔ کیونکہ کبھی نہ کبھی ریاء بھی جاتی رہے گی اور عمل رہ جاوے گا۔ مثلاً کوئی شخص ذکر کرتا ہے تو دوسرا آدمی اُس کو ریاء کار کہے تو اُس سے کہا جائے گا کہ میاں تم نے تو ریاء کے لئے بھی نہ کیا تم کس منہ سے طعن کرتے ہو۔ سوداؔ نے کیا خوب کہا ہے ؎

سوداؔ قمارِ عشق میں شیریں سے کوہکن
بازی اگرچہ پا نہ سکا سر تو کھو سکا

کس منہ سے اپنے آپ کو کہتا ہے عشقباز
اے رُوسیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

تو کرنے والا نہ کرنے والے سے پھر بھی اچھا ہے البتہ اگر کرنے والوں کی یہ شکایت ہے کہ نیت کو خالص کرنا بھی تو فرض ہے اُسے کیوں چھوڑ رکھا ہے۔ مثلاً ایک شخص بے چبائے کھانا کھاتا ہے تو اُس سے یہ نہ کہا جائے گا کہ کھاتے کیوں ہو۔ ہاں یہ ضرور کہا جائے گا کہ اچھی طرح چبا کر کیوں نہیں کھاتے۔ بعض لوگ نماز نہیں پڑھتے کہ جیسی پڑھنی چاہیئے ویسی تو ادا ہوتی نہیں پھر پڑھنے سے کیا فائدہ۔ سو یہ لوگ سخت غلطی میں مبتلا ہیں۔ کیا اگر کوئی کام اچھی طرح نہ ہو سکے تو اُس کو بالکل بھی نہ کرنا چاہیئے؟ اگر ایک لڑکا تختی لکھنا چھوڑ دے کہ اچھا تو لکھا نہیں جاتا، کیا کوئی اس عذر کو مانے گا ہرگز نہیں۔ بلکہ اُس سے کہا جائے گا کہ تو خراب ہی لکھتا رہ کبھی نہ کبھی خط عمدہ ہو ہی جائے گا۔ ویسے ہی یہاں بھی سمجھ لو۔

رہا یہ کہنا کہ جیسی ہونی چاہیئے ویسی ادا نہیں ہو سکتی یعنی ناممکن ہے، یہ بھی غلط ہے ضرور ہو سکتی ہے۔ شریعت میں کوئی ایسا کام نہیں کہ نہ ہو سکے ہاں ارادہ اور طلب پہلی شرط ہے۔ اب میں ایسے لوگوں کو جو اس لئے کام نہیں کرتے کہ عمل کامل تو ہوتا نہیں پھر کیا کام کریں، ایک بات سناتا ہوں کہ جس کو آپ کامل سمجھتے ہیں اُس کی توفیق کے بعد بھی چونکہ اُس وقت نظر صحیح ہو گی۔ اب اُس کو ناقص ہی دیکھئے گا۔ بہرحال کام کئے جاؤ کامل ہو خواہ ناقص ہو۔ انشاء اللہ ناقص ہی سے کامل ہو جائے گا۔

دیکھو ایک شخص نے لکھنا شروع کیا اور خراب جیم لکھی گئی اور میر پنجہ کش کی جیم دیکھ کر مایوس ہو گیا تو اُس سے یہی کہا جائے گا کہ ابتداء میں

انتہا پر نظر نہیں کیا کرتے۔ جیسا کچھ ہے کیے جاوٴ۔ ہوتے ہوتے کام ہوتا ہے ایک دم سے نہیں ہوجاتا ؎

اندریں رہ می تراش و می خراش
تا دمِ آخر دمے فارغ مباش

(اسی ادھیڑ بن میں لگے رہو۔ آخر دم تک فارغ ہوکر مت بیٹھو)

تا دمِ آخر دمے آخر بود
کہ عنایت با تو صاحب سر بود

(آخری وقت تک تو کوئی گھڑی آخر ایسی ضرور ہوگی جس میں عنایت ربانی تمہاری ہم راز و رفیق بن جاوے گی) کام کئے جاوٴ کسی نہ کسی روز انشاء اللہ فضل ہوجاوے گا۔ حافظ علیہ الرحمۃ کہتے ہیں ؎

یوسفِ گم گشتہ باز آید بکنعاں غم مخور
کلبۂ احزاں شود روزے گلستاں غم مخور

(یعنی یوسف گم شدہ کنعاں میں واپس آجائیں گے غم مت کرو فکر نہ کرو کسی روز رنج والم کی کوٹھڑی چمن ہوجائے گی۔ یعنی کام اور طلب میں لگے رہو۔ غمگین نہ ہو انشاء اللہ تعالےٰ کسی روز فضلِ ایزدی بھی ہوجائے گا ــــ)

عبدیّت کا تقاضا

باقی تقاضا اور جلدی خرابی کی بات ہے اور وجہ مایوسی کی یہ ہوتی ہے کہ آج کل لوگ کسی ایک خاص شے کو اپنا مطلوب قرار دے لیتے ہیں جب وہ حاصل نہ ہوئی تو سمجھتے ہیں کہ کچھ حاصل نہ ہوا۔ سو خوب سمجھ لو کہ

لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَہَا

وسعت سے زیادہ کسی کو تکلیف نہیں دی جاتی۔ انسان جتنی اصلاح پر اس وقت قادر ہے اُس وقت میں اُسی قدر کا مکلّف ہے۔ اور جیسے سو برس کا مجاہدہ کرنے والا خدا کا محبوب ہے ایسے ہی یہ بھی محبوب ہے جس نے ابھی کام شروع کیا اگرچہ درجۂ تکمیل کو نہیں پہنچا۔ محبوب دونوں ہیں اگرچہ مراتب کا فرق ہے ـــــ دیکھئے، اگر طالب علموں کو شیرینی تقسیم ہو تو الف بے پڑھنے والے کو بھی اتنا ہی حصہ ملے گا جتنا شمس بازغہ پڑھنے والے کو۔ تو پڑھتے رہیئے اور ارادہ نہ توڑیئے۔ مشکل وہی ہے کہ اپنے نزدیک ایک خاص مطلوب تراش لیا ہے اور یوں چاہتے ہیں کہ ہم آج ہی جنیدؒ کے برابر ہو جائیں۔ پھر اپنے اندر جب کمی دیکھتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ کچھ بھی حاصل نہیں ہوا اور نہ ہونے کی امید ہے۔ بعضے اس سے ناامید ہو جاتے ہیں کہ کامل تو وہی ہے جو جنیدؒ کے برابر ہو اور اُن کی برابری ممکن نہیں۔ سو اوّل تو کمال منحصر نہیں مماثلت جنیدؒ میں۔ دوسرے تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ جنیدؒ کے برابر نہیں ہو سکتے۔ خداوند تعالیٰ کا فیض ہر وقت اور ہر زمانہ میں یکساں ہے۔ اُن کی رحمت سے کچھ بعید نہیں کہ اب بھی جنیدؒ و شبلیؒ جیسے بنا دیں ؎

ہنوز آں ابرِ رحمت دُر فشان است
خُم و خُم خانہ با مہر و نشان است

(یعنے اب بھی وہ ابرِ رحمت دُر فشاں ہے۔ خُم اور خُم خانہ اب بھی مُہر و نشان کے ساتھ ہے۔ رحمتِ الٰہی اب بھی ایسی ہی ہے جیسے پہلے تھی) البتہ یہ ضروری نہیں کہ تم کو بھی اپنا جنید ہونا معلوم ہو جائے۔ اور کیا خبر ہے کہ اگر تم کو یہ مساوات معلوم بھی ہو جائے تو تم عُجب میں مبتلا ہو کر فاسق

سے بھی بدتر ہو جاوے۔ تو اس کا طالب ہونا کہ ہم کو بھی معلوم ہو جاوے کہ ہم کس مرتبے کے ہیں اپنے تنزّل کا طالب ہونا ہے۔ اس راہ میں ترقی یہی ہے کہ اپنے کو سب سے حقیر سمجھے اور کسی درجہ کا مستحق نہ سمجھے جو کچھ مل جائے وہ محض انعامِ خداوندی ہے اور یہ کوئی ضروری نہیں کہ ہر شخص کو اپنی ترقی محسوس ہو جایا کرے۔

مثلاً اگر ایک شخص مرے اور نابالغ بچہ چھوڑے اور جائیداد کورٹ ہو جائے تو یہ بچہ زمین کا مالک ہے اور زمیندار ہے اگرچہ اُس کو اس کی خبر بھی نہیں کہ میں کتنے کا مالک ہوں۔ تو ایسی خبر کا طالب ہونا یہ اپنے کو گرانا ہے اُس اعلیٰ درجہ سے جو اُس کو حاصل ہے۔ آپ کو کام کے لئے کہا گیا ہے اپنا کام کئے جاؤ۔ ع

کارِ خود کُن کارِ بیگانہ مکُن

آپ کا کام امتثال امر ہے وہ کیجئے۔ پھر جس مرتبہ کا ارادہ واستعداد ہو گی۔ اُس کے مطابق کامیابی ہو گی۔ پھر تشویش کیوں کی جاوے۔ اکثر کام کرنے والوں سے ایسی غلطی سرزد ہو جاتی ہے کہ وہ اس کے درپے ہو جاتے ہیں کہ ہمیں کچھ حاصل ہوا یا نہیں۔ اس کا وسوسہ بھی دل میں نہ لانا چاہیئے۔ اب لوگوں میں یہ عیب ہے کہ جو چیزیں اُن کے اختیار میں نہیں ہیں (جیسے ثمرات مخصوصہ کا مرتب ہونا) اُن کی طلب میں پڑ جاتے ہیں۔ یاد رکھو جو شخص غیر اختیاری امور کی طلب کرے گا وہ ہمیشہ پریشانی میں مبتلا رہے گا۔ بعض ثمرات تو موعود بھی نہیں۔ اُن کا ترتب تو یقینی بھی نہیں۔ اُن کی فکر میں پڑنا تو پوری پریشانی ہے۔ باقی جو موعود بھی ہیں جیسے اجر و ثواب اُن کا وعدہ آخرت میں ہے۔ یہاں اُن کا انتظار کرنا بھی ظاہر ہے کہ

پریشانی ہی پریشانی ہے۔ خدا تعالٰے نے ہم کو ایک کام بتلایا ہے اور ایک شے کا وعدہ کیا ہے۔ ہمارا کام عبادت ہے وہ اپنا وعدہ آخرت میں خود پورا کر دیں گے۔ ہمارا طالب ثمرات ہونا خلافِ عبدیت ہے اور اسی طرح یہ دیکھنا کہ میں اتنے دنوں سے کام کر رہا ہوں کچھ ملا بھی یا نہیں خلافِ اخلاص بھی ہے۔ کیونکہ ثمرات عاجلہ کا طالب ہوتا ہے۔ حالانکہ اب بھی جو اس کو ملا ہے یعنی اصلاح کے تدریجی مراتب اُس کا اس کو پتہ بھی نہیں چلتا۔

ایسی مثال ہے جیسے بچہ پڑھتا ہے اور آج اور کل میں کچھ فرق نہیں معلوم ہوتا حالانکہ بالکل اوّل اور بہت آخر کو ملا کر دیکھو تو معلوم ہوگا کہ کتنا بڑا فرق ہو گیا ہے۔ صاحبو۔ ایسے ہی مومن کے اوّل و آخر کو دیکھو تو معلوم ہوگا کہ پہلے کیا تھا اب کیا ہو گیا۔ تو فرق یقیناً ہوتا ہے۔ مگر یہ بات کہ کرنے والے کو بھی معلوم ہو سو یہ ضروری نہیں۔ اوّل تو ثمراتِ عاجلہ کا ہونا ہی ضروری نہیں اور ہوں بھی تو خبر ہونا ضروری نہیں۔ اس کو خوب سمجھ لینا ورنہ اس سے بہت سے وساوس و خطرات پیدا ہوتے ہیں۔ حق تعالٰی کسی کو بسط عنایت کرتے ہیں کسی کو حزن و غم عطا فرماتے ہیں۔ اور یہ ہر ایک کے حال کے موافق ہوتا ہے۔ کیونکہ اگر بسط والے کو حزن و غم دے تو وہ عمل ہی چھوڑ بیٹھے یا اگر حزن والے کو بسط دے تو وہ اپنے کو بڑا سمجھنے لگے۔ تو ہر ایک کے لئے وہی مناسب ہے جو اُس کو ملے۔ اسی کو کہتے ہیں ؎

بدرد و صاف ترا حکم نیست دم درکش
کہ آنچہ ساقی ما ریخت عین الطاف ست

قبض و بسط کی خواہش یا انکار کا تم کو حق نہیں ہے جو کچھ عطا ہو جائے وہی

تربیت باطنی کے لئے مصلحت اور وہی عین لطف ہے)

نیک نیتی کی ضرورت

تو ارادہ کرنے کے بعد یہ غلطیاں ہوتی ہیں۔ ان کی وجہ سے ارادہ میں سستی ہو جاتی ہے۔ غرض بعض تو سرے سے ارادہ ہی نہیں کرتے اور بعض شروع کرتے ہیں مگر ان وساوس کی وجہ سے اُن کو تعطل ہو جاتا ہے۔ اس لئے میں نے اس کی شرح کر دی کہ ارادہ کرو اور ان قصوں کو چھوڑ دو۔ تم ارادہ کئے جاؤ اور جس کے مکلّف ہو اُس کے درپے رہو۔ اور وہ مکلّف بہ یہ ہے کہ نیّت کو خالص کرو علوم میں بھی اور اعمال میں بھی۔ تحصیل علوم میں جو خرابیاں لوگوں نے کر رکھی ہیں اُس کی تفصیل کی مجھ کو اس وقت اس لئے ضرورت ہوئی کہ اس وقت مخاطب اہل علم ہیں۔ تو اُن کو یہ نیّت کرنا چاہیئے کہ علم حاصل کر کے ہم احکامِ الٰہی پر خود کاربند ہوں گے اور لوگوں کو ہدایت کریں گے اور میں وصیّت کرتا ہوں کہ نوکری کی نیّت نہ کرو گو انشاء اللہ وہ ملے گی ضرور۔ مگر نیت اس کی مت رکھو اور بعد میں جب مل جاوے تو کر لو اور پڑھانے پر تنخواہ لینا بھی جائز ہے۔ یہ غلطی ہے کہ تعلیم پر تنخواہ لینا جائز نہیں۔ اور یہ جواز حنفیہ کے اصول پر بھی ہے کیونکہ جو شخص کسی کے کام میں محبوس ہوتا ہے اُس کا نفقہ اسی کے ذمہ واجب ہوتا ہے یا نہیں دیکھو قضاۃ کو وظیفہ اس لئے دیا جاتا ہے کہ وہ محبوس ہیں۔

دوسرے دیکھو بیت المال کیا ہے وہ مجموعہ ہے مسلمانوں کے مال کا جس کو سلطان حسب ضرورت مختلف مقاموں میں صرف کرتا ہے۔ علماء کو بھی اُس میں سے وظائف دیئے جاتے تھے اور کسی نے اس کو حرام نہیں کہا۔ تو چندہ کی بھی تو یہی حقیقت ہے کہ مسلمانوں کے مال کا مجموعہ ہے جو صرف

اتنا فرق ہے کہ بیت المال سلطان کی طرف منسوب ہوتا ہے اس لئے لوگوں کی نظروں میں اس کی وقعت ہے چندہ کی وقعت نہیں ورنہ اصل میں دونوں یکساں ہیں۔ پھر چندہ میں سے علماء کو وظائف لینا کیوں حرام ہونے لگا ہے اور تعین مقدار سے اس کے اُجرت ہونے کا شبہ نہ کیا جائے۔ تعیین تو اس لیئے کی جاتی ہے تاکہ بعد میں نزاع نہ ہو۔ ورنہ اگر تعیین نہ کی جائے اور موافق ضرورت دیا جائے تو اس میں اختلاف و نزاع کا بڑا اندیشہ ہے تم کہو کہ مجھے اتنی مقدار ناکافی ہے دوسرا کہے کہ کافی ہے۔ اس نزاع کے رفع کرنے کو پہلے ہی سے مقدار معین کر دی جاتی ہے۔ غرض تنخواہ کے جواز میں کوئی شبہ نہیں۔ لیکن اس کا انتظام کرنا تو یہ مسلمانوں کا کام ہے آپ اس کی فکر میں کیوں پڑیں۔ آپ کے ذمہ جو کام ہے خدمت دین آپ اس کی نیت رکھیں اور اسے بلا تنخواہ شروع کر دیں۔ مسلمان اپنا کام کریں گے ــــ یہ تو ایسا ہوا کہ امام مصلے پر پہنچ کر یہ قصد کرے کہ میں اس وقت نیت باندھوں۔ جب پہلے مقتدی نیت باندھ چکیں تو تم اپنا کام کرو لوگ اپنا کام کریں گے اور میں وعدہ بلکہ دعوے کرتا ہوں کہ اگر تم اپنا کام شروع کر دو گے تو لوگ زبردستی تمہاری خدمت کریں گے۔ تم اُن کو دھکیلو گے اور وہ ہاتھ جوڑ کر دیں گے۔ اسی لیئے میں اکثر اپنے دوستوں کو کہا کرتا ہوں کہ میاں تنخواہ میں جھگڑا نہ کیا کرو۔

صاحبو ــــ خدمتِ دین تو خود ہمارا کام ہے اس میں بھاؤ تاؤ کیسا کیا وہ کرنا چاہتے ہو جیسا ہندوؤں کے ساتھ برہمن کیا کرتے ہیں کہ جب اُن کی دعوت کرتے ہیں تو کچھ کھا کر ہاتھ کھینچ لیتے ہیں۔ ہندو اُن کی خوشامدیں کرتے ہیں کہ اور کھاؤ۔ وہ پوچھتے ہیں کہ کیا دو گے تو وہ کہتے ہیں کہ ایک

لڈو پر ایک روپیہ۔ وہ ایک دو لقمے کھا کر پھر ہاتھ روک لیتے ہیں، پھر وہ ایک لڈو پر دو روپے دیتے ہیں۔

میں تو یہ کہتا ہوں کہ تنخواہ پر کبھی جھگڑا مت کرو۔ جو خدمت کریں خوشی سے قبول کر لو۔ جب لوگوں کو معلوم ہوگا کہ تمہارا کام نہیں چلتا، وہ خود بخود تمہاری امداد کریں گے۔ آپ اللہ کے واسطے اپنا کام کیجیے۔ یہ تو مضمون تھا اخلاص فی العلم کا۔

عدم اخلاص کی خرابیاں

اب رہے اعمال سو اُن میں عدم اخلاص کے سبب جو خرابیاں ہیں اُن میں عوام بھی شریک ہیں کیونکہ علوم میں تو عوام بہت اچھے ہیں۔ وہ کوئی مسئلہ اس نیت سے نہیں پوچھتے کہ اس سے نوکری ملے گی البتہ بعض اوقات ایک فعل عبث میں تو مبتلا ہو جاتے ہیں کہ بلا ضرورت مسئلے پوچھتے ہیں۔ اور بعض دوسری اغراض فاسدہ میں بھی مبتلا ہو جاتے ہیں کہ اس لیے مسئلے پوچھتے ہیں تاکہ جھگڑا کریں مگر ایسے لوگ کم ہیں۔ زیادہ یہی حالت ہے کہ پوچھ لیا اور عمل کر لیا۔ ہاں عمل کی خرابی میں خواص و عام دونوں شریک ہیں۔ گو خواص کا محل ریا دوسرا ہے ان کا دوسرا۔ مثلاً بعض خواص غور کر کے دیکھیں کہ وہ ذکر و تلاوت کس غرض سے کرتے ہیں محض اس لیے کہ نام ہو نمود ہو جاہ ہو جلسے اس واسطے کرتے ہیں کہ ہمارا گزر ہو، آمدنی ہو، شہرت ہو۔ پیری مریدی کرتے ہیں تو نیت یہ ہوتی ہے کہ آمدنی بڑھے بعض پیر ایسے بھی ہیں کہ مال نہیں لیتے، نذرانے قبول نہیں کرتے۔ مگر وہاں بھی نیت خالص نہیں ہوتی۔ نہ لینے کے اندر بھی دنیاوی غرض ہوتی ہے کہ وقعت ہو عزت ہو لوگ مستغنی سمجھیں۔ چونکہ اخلاص نہیں اس لیے

ایسوں کے لینے میں بھی خرابی اور نہ لینے میں بھی خرابی۔ وہ حال ہے کہ ؎

چوں گرسنہ می شوی سگ می شوی!
چونکہ خوردی تند و بدرگ می شوی

(جب بھوکے ہوتے ہو تو سگ ہو جاتے ہو اور جب کھا لیتے ہو تو تند خو اور بدرگ ہو جاتے ہو)

عوام کی یہ حالت ہے کہ مسجد بناتے ہیں فخر و مباحات کے لئے تاکہ سب کو معلوم ہو جائے کہ یہ مسجد فلاں کی بنوائی ہوئی ہے اور اسی لئے آج کل لوگ کثرت سے مسجدیں بناتے ہیں باوجودیکہ ضرورت بھی نہیں۔ صاحبو۔ مسجدیں تو پیچھے بنائیے گا پہلے مسجد والے تو بناؤ۔ بہت سی مسجدیں آج کل ویران نظر آتی ہیں جن میں نہ اذان ہو نہ جماعت۔

اسی طرح اکثر لوگ وعظ کے بعد مٹھائی تقسیم کرتے ہیں جس سے صرف نام ہی مقصود ہوتا ہے۔ قیمتی کپڑے پہنتے ہیں لوگوں کی آنکھوں میں بڑا بننے کے لئے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ قیمتی کپڑے نہ پہنو۔ نہیں خوب پہنو مگر نیت یہ ہو کہ اس سے ہمارا جی خوش ہوگا۔ خدا تعالیٰ کی نعمت پر شکر کی توفیق ہوگی دوسروں کو دکھانے کی نیت نہ ہو۔ یہ ناجائز ہے اور اس کی پہچان یہ ہے کہ اگر ہم تنہا ہوں تو دیکھ لیں کہ اسی زینت کے ساتھ اس وقت بھی ہوتے ہیں یا نہیں۔ ہم نے تو دیکھا ہے کہ تکلف والے گھر میں معمولی حالت سے بھی کمتر ہوتے ہیں۔ ہاں باہر جانے کے لئے ساری زینت کی جاتی ہے پھر یہ کیسے کہیں کہ دکھلاوا مقصود نہیں۔

دیکھو اگر عمدہ غذا کھانے کی عادت ہو تو تنہائی میں بھی عمدہ کھاؤ گے اور سب کے سامنے بھی۔ تو اگر عمدہ کپڑا پہننا اپنا جی خوش کرنے کے

لئے ہے تو تنہائی میں اُس کو کیوں اتارا جاتا ہے۔ بعض لوگ اس نمائش کی بدولت ایسے کپڑے پہنتے ہیں کہ جس سے تکلیف ہوتی ہے۔ مثلاً گرمی کے وقت گرم اچکن۔ تو ریا میں آخرت اور دنیا دونوں کا زیاں ہی ہے۔ باقی اگر قیمتی لباس پہننے کے ساتھ اُس طرف التفات نہ ہو اور مالی گنجائش بھی ہو تو عمدہ لباس پہننے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اور اکثر ایسا ہی دیکھا ہے کہ گنجائش والے کو لباس کی طرف زیادہ مشغولی نہیں ہوتی۔

بھوپال کی حکایت سنی ہے کہ ایک مرتبہ نماز کے وقت بارش آگئی فرض تو ہو چکے تھے لوگ سنتیں پڑھ رہے تھے اور تو سب جلدی جلدی نماز ختم کر کے اندر چلے گئے مگر ایک رئیس جو قیمتی کپڑے پہنے ہوئے تھے انہوں نے جلدی نہیں کی بلکہ بہت خشوع و خضوع سے نماز پڑھتے رہے جب نماز ختم کر کے اندر گئے تو بعض لوگوں نے اُن سے کہا کہ آپ نے نماز میں اختصار کیوں نہ کر لیا۔ بارش سے آپ کے تمام کپڑے خراب ہو گئے۔ انہوں نے کہا کہ کپڑے تو میرے پاس اور بہت ہیں۔ میں ان کو اتار کر دوسرے پہن سکتا ہوں مگر جلدی سے جو نماز میں خرابی آتی اس کا کوئی تدارک نہیں ہو سکتا تھا ــــــ سبحان اللہ! ایسے شخص کا البتہ حق ہے کہ اچھے کپڑے پہنے جس کو پہن کر اُس کو نماز پر ترجیح نہیں دی۔

جیسے ایک خبطی شاعر کی حکایت ہے کہ نماز میں ایک مصرع یاد آیا تو فوراً نماز توڑ کر مصرع کو قلمبند کر کے پھر نماز شروع کر دی۔ لوگوں نے پوچھا کہ یہ کیا حرکت تھی۔ نماز کے بعد شعر لکھ لیا ہوتا۔ تو اُس نے کہا کہ نماز کی تو قضا بھی ہے مصرع اگر بھول جاتا تو اس کی کوئی قضا نہ تھی۔

مگر یہ اُن لوگوں کی حکایت ہے جو بودے شاعر نہ تھے۔ کاملین تو

ایسے ہوتے ہیں کہ ذوق کہا کرتا تھا کہ یہ کیا شاعری ہے کہ ایک کوٹھڑی میں بند ہو کر شعر لکھے جائیں۔ شاعری اسے کہتے ہیں کہ میرے اور میرے کسی معاصر کی کمر میں رسی باندھ کر کنوئیں میں لٹکا دو اور رسی کاٹ دو۔ پانی کی سطح پر پہنچتے پہنچتے جو شخص زیادہ شعر لکھ لائے وہی شاعر ہے تو جو صاحب کمال ہوتا ہے اس کو زیادہ اہتمام کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اسی طرح جس کے پاس کپڑا گنجائش کا ہوگا اس کو زیادہ پروا بھی نہیں ہوتی۔ اور جن کے پاس گنجائش نہیں وہ اگر اس میں مشغول ہو جاتے ہیں تو ان کو انہماک ہو جاتا ہے کہ اگر یہ لوگ گبرون کا بھی کپڑا لیں گے تو ایسا کہ ذرا لینا معلوم ہو۔

ایک بزرگ بیان کرتے تھے کہ ایکدفعہ ریل میں ایک جنٹلمین گبرون کا کوٹ پہنے ہوئے تھے۔ جاڑوں کا موسم تھا نہ اس کے پاس رزائی نہ کوئی گرم کپڑا۔ یہ بھی آج کل تہذیب ہے کہ جاڑوں میں روئی کا کپڑا نہیں پہنتے ایک اسٹیشن پر انگریزوں نے ہوٹل میں جاکر برف پیا تو ان کی بھی شامت آئی۔ برف پی کر آئے تو کانپنے لگے۔ غرض جو شخص اپنی وسعت سے زیادہ کام کرتا ہے ہمیشہ تکلیف اٹھاتا ہے۔ بعضوں کو وسعت نہیں مگر تشبہ کے پیچھے مرے جاتے ہیں۔ تو ان بزرگ نے ان سے کہا کہ میرے پاس کپڑے تو بہت ہیں مگر روئی کے ہیں شاید آپ کو ناپسند ہوں مگر انہوں نے اس وقت یہی کہا کہ آپ کا بڑا احسان ہوگا روئی کا ہی کپڑا دے دیجئے۔

ایک اور حکایت یاد آئی۔ ایک صاحب گرمیوں کے موسم میں صراحی لے کر ریل میں سوار ہوئے۔ تو ایک جنٹلمین نے کہا کہ یہ کیا بھنگیوں کے سے برتن لئے پھرتے ہیں۔ یہ چپ ہو رہے۔ اتفاق سے مہذب صاحب کو لگی پیاس۔ اسٹیشن پر پانی ملا نہیں۔ تو اب بار بار صراحی کو دیکھتے ہیں۔ یہ صاحب

قصداً آنکھیں بند کرکے لیٹ رہے۔ جب دیر ہوگئی تو جنٹلمین صاحب سوتا ہوا سمجھ کر اٹھے اور صراحی سے پانی پی لیا۔ جب پانی پی چکے تو ان حضرت نے ہاتھ پکڑ لیا کہ صاحب آپ نے بھنگی کے برتن سے کیوں پانی پیا؟ چُپ ہو گیا، معافی چاہنے لگا۔

یہ ذکر تھا نمائش لباس کا جس میں اکثر عوام مبتلا ہیں۔ علیٰ ہذا دعوت کرتے ہیں برادری کی اور اس میں حد سے زیادہ اسراف کرتے ہیں جس سے صرف نام و نمود ہی مقصود ہوتا ہے۔ اور جب علماء اس کو منع کرتے ہیں، تو کہتے ہیں کہ علماء مباحات سے منع کرتے ہیں حالانکہ وہ مباحات سے روکتے نہیں۔ جہیز میں بے حد اسراف کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ صلہ رحمی ہے حالانکہ اگر صلہ رحمی ہے تو چھپا کر کیوں نہ دے دیا۔ اگر صلہ رحمی میں اعلان ضروری ہے تو روزانہ سب کو دکھلا کر اپنے بچوں کو کیوں نہ کھلایا پہنایا کرو۔ یہ سب بہانے ہیں بلکہ یوں سننا چاہتے ہو کہ فلانے نے اپنی بیٹی کا جہیز بساط سے زیادہ دیا۔ حالانکہ یہ حماقت ہے اور ہجو ملیح ہے مگر لوگوں کے مذاق کچھ ایسے بدل گئے ہیں کہ مذمت کو بھی تعریف سمجھتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں۔ برادری کا کھانا فقط اسی واسطے ہوتا ہے کہ یہ دیکھتے ہیں کہ فلانے نے کیا کھلایا تھا۔

غمی میں دیکھئے کہ زبان سے تو یہ کہا جاتا ہے کہ ثواب کے لئے کھانا کھلاتے ہیں مگر امتحان یہ ہے کہ اگر اس شخص سے خلوت میں یہ کہا جائے کہ قاعدہ یہ ہے کہ جس مصرف میں زیادہ ضرورت ہوتی ہے اس میں روپیہ دینے سے زیادہ ثواب ملتا ہے اور جن کی تم دعوت کرتے ہو، یہ سب کھاتے پیتے غنی ہیں۔ تم یہ دعوت کا روپیہ فلاں مدرسے یا مسجد

میں دے دو یا فلاں آبرودار غریب آدمی کو چپکے سے دے دو اور اس کا ثواب میت کو بخش دو۔ تو اب دیکھئے کہ اس شخص کے دل پر کیا گزرتی ہے۔ کہے گا کہ سبحان اللہ اور روپیہ بھی خرچ ہو اور کسی کو خبر بھی نہ ہو۔ تو بتلائیے کہ یہ صاف ریا ہے یا نہیں۔

معلوم ہوا کہ یہ سب دکھلاوے کے لیئے کیا جاتا ہے۔ جب یہ حال ہے تو ثواب کہاں سے ہوگا۔ اور جب اس کو ثواب نہ ملا تو میت کو کیا بخشے گا۔ کیونکہ ثواب پہنچانے کا خلاصہ تو یہ ہے کہ تم نے ایک نیک کام کیا اور جو ثواب تم کو اس کا ملتا وہ تم نے کسی دوسرے کو بخش دیا۔ اور جب یہاں ہی صفر ہے تو وہاں کیا بخشو گے۔

اس پر مجھے ایک حکایت یاد آئی کہ رام پور کے ایک شخص کسی جھوٹے پیر سے مرید ہو گئے۔ کچھ دنوں کے بعد کسی نے ان سے پوچھا کہ کچھ پیر صاحب سے کیا فیض پہنچا۔ یہ تھے صاف آدمی۔ کہا جب سفا وہی میں نہ ہو تو بدھنے میں کہاں سے آوے۔

تو یہی صورت ہے ثواب ملنے کی پہلے کرنے والے کو ملتا ہے۔ پھر وہ دوسرے کو دیتا ہے۔ تو جب اسی کو نہ ملا تو یہ کسی کو کیا دے گا۔ گویا سارا روپیہ ضائع گیا۔ اور یہ تو سب دعوے ہی دعوے ہیں کہ ثواب کے لئے کھانا کھلاتے ہیں۔ صرف برادری سے شرما کر کیا جاتا ہے۔ اور لوگ اس کا زبان سے اقرار بھی کر لیتے ہیں۔

کیرانہ میں ایک گوجر بیمار تھا۔ اس کا لڑکا حکیم صاحب کے پاس گیا اور کہنے لگا کہ حکیم جی اس مرتبہ تو میرے باپ کو کسی طرح اچھا ہی کر دو مجھے اس بڈھے کے مرنے کا تو غم نہیں مگر آج کل چاول بہت گراں ہیں

برادری کو کھانا کھلانا بہت مشکل ہوگا۔

وہ بے چارہ سیدھا تھا۔ اُس نے سچی بات کہہ دی۔ ہم باوضع ہیں زبان سے ظاہر نہیں کرتے مگر دل میں سب کے یہی ہے۔ یہ تو کھلانے والوں کی حالت ہے۔ باقی کھانے والے وہ تو پورے ہی بے حیا ہیں کہ ایسے غم میں بجائے ہمدردی کے الٹا اُن پر بار ڈالتے ہیں۔

اس باب میں ایک صاحب حکایت بیان کرتے تھے کہ ضلع بلند شہر میں ایک رئیس کا انتقال ہو گیا۔ چالیسویں دن رسم ادا کرنے کو اُن کے تمام عزیز و اقارب، دوست احباب ہاتھی گھوڑے لے کر جمع ہوئے رئیس زادے نے سب کی خاطر و مدارات کی اور عمدہ عمدہ کھانے پکوائے جب کھانے کا وقت آیا اور تمام لوگ دستر خوان پر جمع ہو گئے اور سب کے آگے کھانے چن دیئے گئے، رئیس زادے نے کھڑے ہو کر تقریر کی کہ صاحبو۔ کھانے سے پہلے میری ایک بات سُن لیجئے پھر کھانا شروع کیجئے گا۔ آپ کو معلوم ہے کہ آپ لوگ اس وقت کس لئے جمع ہوئے ہیں۔ چونکہ مجھ پر ایک بڑا حادثہ گزرا ہے کہ میرے والد کا سایہ میرے سر پر سے اٹھ گیا ہے۔ اس لئے آپ لوگ میرے ساتھ ہمدردی ظاہر کرنے کے لئے جمع ہوئے ہیں۔ تو کیا ہمدردی اسی کا نام ہے کہ میں تو غم میں مبتلا ہوں اور اس کی وجہ سے نہ کھانے کا رہا نہ پینے کا اور آپ لوگ آستینیں چڑھا کر عمدہ عمدہ کھانے کھانے بیٹھ گئے۔ غم کو شرم نہیں آتی۔ بس اب کھانا شروع کیجئے۔

مگر اب کون کھاتا۔ تمام شرما کر مجلس سے اٹھ کھڑے ہوئے اور ایک جگہ جمع ہو کر مشورہ کیا کہ واقعی یہ چالیسویں کی رسم اٹھا دینے کے

قابل ہے۔ چنانچہ سب نے متفق ہو کر اس رائے پر دستخط کر دیئے اور وہ تمام کھانا غربا کو تقسیم کرا دیا گیا۔

حقیقت میں اگر غور کرو تو یہ سارے کھانے جو برادری کو کھلائے جاتے ہیں اسی قسم کے ہیں جن سے کھلانے والے کو بجز تکلیف کے اور کھانے والے کو بجز بے حیائی کے اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اب بھی لوگ مولویوں ہی کو بدنام کرتے ہیں کہ یہ ایصالِ ثواب سے منع کرتے ہیں۔ صاحبو۔ ایصالِ ثواب سے کوئی منع نہیں کرتا البتہ بے ڈھنگے پن سے منع کیا جاتا ہے۔ دیکھو اگر کوئی قبلہ کی طرف پشت کر کے نماز پڑھے تو اس کو منع کریں گے یا نہیں۔ اگر شریعت کے موافق عمل ہو، تو پھر دیکھو کون منع کرتا ہے۔ جس کی بڑی شرط یہ ہے کہ اخلاص کے ساتھ ہو یعنے ثواب کی نیت سے کیا جائے۔

اہلِ باطن کا اخلاص

یہ سب اہل ظاہر کے اخلاص کا ذکر تھا اور اہل باطن کا اخلاص یہ ہے کہ اصلی غرض ذکر وغیرہ سے محض رضائے حق ہو یعنے صرف یہ نیت ہو کہ اس سے خدا راضی ہو گا۔ اس کے خلاف جب کوئی نیت ہو گی گو وہ امر دنیوی نہ ہو مثلاً ثمرات باطنہ وہ اخلاص کے خلاف ہو گی۔

حضرت حافظ ضامن صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ حق تعالٰے فرماتے ہیں۔ فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ کہ تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا۔ تو ہماری تو نیت ذکر کرنے سے یہ ہوتی ہے کہ حق تعالٰے کے دربار میں ہمارا ذکر ہو گا۔ یہ وہ غرض ہے کہ شیطان اس میں کسی قسم کا وسوسہ بھی نہیں ڈال سکتا کہ شاید حق تعالٰے تم کو یاد نہ کریں۔ کیونکہ اس کا تو قرآن

میں صریح وعدہ ہے۔ میں اسی تقریر کو دوسری طرح کہتا ہوں کہ ثمرات دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جو موعود ہیں جیسے تمہارے ذکر اللہ کرنے سے اللہ تعالیٰ کا تم کو یاد فرمانا۔ اس کا طالب ہونا تو مذموم نہیں بلکہ مطلوب ہے۔ دوسرے وہ جو موعود نہیں جیسے کیفیات و احوال اس کے طلب کرنے میں یہ کوتاہی ہے کہ جو موعود نہیں تو اُس کا طالب کیوں ہے اور جب مطلوب نہیں تو مقصود کیوں بنایا جائے۔ حاصل یہ کہ اور غرضوں کا مل جانا یہ بھی اخلاص کے خلاف ہے۔ طالب کا مذہب تو یہ ہونا چاہئے کہ ؎

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو
دل شدہ مبتلائے تو ہرچہ کنی رضائے تو

(یعنی زندہ رکھیں آپ کی عنایت ہے۔ اگر قتل کریں آپ پر قربان ہیں۔ دل آپ پر فریفتہ ہو گیا جو کچھ ہمارے ساتھ تصرف کریں ہم راضی ہیں۔) اُس کی تو یہ شان اور یہ کیفیت ہونی چاہئے جو حضرت سرمد فرماتے ہیں ؎

سرمد گلہ اختصار می باید کرد یک کار ازیں دو کار می باید کرد
یا تن برضائے دوست می باید داد یا قطع نظر زیار می باید کرد

(یعنی سرمد! گلہ و شکوہ چھوڑنا چاہیے۔ دو کاموں میں سے ایک کام کرنا چاہیے۔ یا تو اُس کی رضا جوئی میں جان دے دو نہیں تو یاری کو چھوڑ دینا چاہیے)

بے شک صاحب باطن کو ایسا ہی ہونا چاہئے ؎

تو بندگی چو گدایاں بشرط مزد مکن
کہ خواجہ خود روشِ بندہ پروری داند

(نم بندگی مزدوروں کی طرح بشرط اجرت مت کرو۔ اس لئے کہ آقا بندہ پروری کی روش کو خود جانتے ہیں۔ یعنی کیفیات واحوال کیلئے طاعت مت کرو خدا کی رضا جوئی کے لئے کرو)

غرض کیفیات واحوال سب خدا کے قبضہ میں ہیں۔ تم اپنا کام کئے جاؤ اور غیر اختیاری امور کی فکر میں نہ پڑو۔ اور اس وقت ان باتوں کا یعنی اخلاص کے متعلق جزئیات کا استیعاب (احاطہ) مقصود نہیں۔ صرف نمونہ کے طور پر چند باتیں بیان کر دی ہیں اور یہ بھی بتلا دیا کہ ان کا علاج یہ ہے۔ بہرحال اخلاص کی حقیقت تو سمجھ میں آگئی کہ کوئی غرض نفسانی اپنی نہ ہو صرف رضائے حق مطلوب ہو۔

خلوص کے طریقے

اب اس کے حاصل کرنے کا طریقہ اور علاج سمجھئے۔ وہ یہ کہ جب کوئی کام کرنا ہو تو پہلے یہ دیکھ لیجئے کہ میں یہ کام کیوں کرتا ہوں۔ اگر کوئی نیت فاسد ہو تو اس کو قلب سے نکال ڈالیے۔ اور نیت خالص خدا کے لئے کرنی چاہئے۔ اس علاج کی آسانی کے لئے بہتر یہ ہے کہ مخلصین کی حکایات دیکھا کریں۔ اس سے بہت اثر ہوتا ہے۔ چنانچہ مولانا نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ایک حکایت بیان فرمائی ہے ؎

او خدو انداخت بر روئے علیؓ
افتخار ہر نبی و ہر ولی

(اس نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے چہرہ مبارک پر جن پر انبیاء و اولیاء کو افتخار ہے تھوک دیا) اور افتخار ہر نبی سے یہ شبہ نہ کیا جائے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نبی سے بڑھ کر ہیں کیونکہ فخر ہمیشہ بڑے ہی

سے نہیں ہوا کرتا۔ کبھی بڑے چھوٹوں سے بھی فخر کیا کرتے ہیں۔ جیسا کہ استاد فخر کرتے ہیں اپنے لائق شاگردوں پر۔

واقعہ یہ ہے کہ حضرت علیؓ نے ایک یہودی کو لڑائی میں زیر کیا اور سینہ پر بیٹھ کر قصد کیا کہ خنجر سے ذبح کر دیں۔ یہودی نے چہرۂ مبارک پر تھوک دیا۔ آپ نے فوراً چھوڑ دیا۔ یہودی نے حیران ہو کر پوچھا کہ آپ نے چھوڑ کیوں دیا۔ اب تو میں اور زیادہ قابل قتل تھا۔ فرمایا میں پہلے خالصاً للہ قتل کرتا تھا اور اب نفس کی بھی آمیزش ہو جاتی اس لیے میں نے چھوڑ دیا۔ یہودی فوراً مسلمان ہو گیا ——— حقیقت میں یہ ہے اخلاص اگر اسی حکایت کو یاد رکھیں تو کافی ہے۔

دوسرے اہل اخلاص کی محبت اختیار کیجیے۔ اُن کے اقوال اور افعال پر نظر کیجیے تو آنکھیں کھل جاویں گی۔ مجھے دو حکایتیں یاد آ گئیں ایک بلگرام کی کہ وہاں ایک بزرگ تھے۔ اُن سے ایک شخص کچھ پڑھتے تھے۔ ایک دن جو پڑھنے آئے تو دیکھا کہ اُستاد کچھ مضمحل ہو رہے ہیں اُس روز اُن کے گھر میں فاقہ تھا۔ یہ شخص باادب تھے اُستاد پر فاقہ کا اثر دیکھ کر پڑھنے سے عذر کر دیا اور اپنے گھر جا کر کچھ کھانا اُن کے لئے لائے اُن بزرگ نے فرمایا کہ یہ کھانا ایسے وقت آیا کہ مجھے اس کی ضرورت ہے مگر مجھے اس کے لینے سے معاف کرو۔ کیونکہ اس وقت اس کا قبول کرنا حدیث کے خلاف ہے کیونکہ حدیث میں آیا ہے۔

مَا اَتَاكَ مِنْ غَيْرِ اِشْرَافِ نَفْسٍ فَخُذْهُ ——— یعنی جو چیز تمہارے پاس بلا انتظار نفس آ جائے اُس کو لے لو۔

تو جب تم میرے پاس سے گئے ہو اُس وقت میرے دل میں یہ خطرہ گزرا

تھا کہ تم کچھ لاؤ گے۔ یہ آدمی سلیقہ مند تھے کچھ بھی اصرار نہیں کیا اور کھانا
لے کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ جب اُن کی نگاہ سے دور ہو گئے تو پھر لوٹے
اور آ کر عرض کیا کہ اب تو یہ کھانا لینا آپ کو حدیث کے خلاف نہ ہوگا۔
کیونکہ جب میں لے کر چلا ہوں اُس وقت تو آپ کو مایوسی ہو چکی تھی۔ وہ
بزرگ بہت خوش ہوئے اور اُن کو دعائیں دیں۔

ہم اگر ہوتے تو کہتے اجی حضرت خدا کے لئے لے لو۔ آج کل یہ
بات بھی عمدہ خصلتوں میں شمار ہوتی ہے کہ بزرگوں پر ہدیہ قبول کرنے میں
زور ڈالا جائے۔ اور خوب اصرار کیا جائے۔ یہ بالکل نامناسب ہے
یہ عادت محمود نہیں۔ خدمت کے پچاس طریقے ہیں۔ ہدیہ دینے ہی میں خدمت
منحصر نہیں۔ آپ نے دیکھا کہ ان بزرگ کی کیسی خالص نیت تھی۔ اتنی
آمیزش بھی نہ ہونے دی۔ اس حکایت سے معلوم ہوا کہ بعض اوقات
جو بزرگ لوگ کسی کا ہدیہ نہیں لیتے اُس کی کبھی یہ وجہ بھی ہوتی ہے۔ اس
لئے ہدیہ دینے والے کو یہ سمجھ کر ناخوش نہ ہونا چاہیئے کہ میرے ہدیہ کو
حقیر سمجھا۔

دوسری حکایت حضرت حاتم اصم رحؒ کی ہے کہ ایک شخص آپ کی
خدمت میں ایک روپیہ لایا۔ آپ نے پہلے تو انکار کر دیا اور نہ لیا مگر جب
اُس نے اصرار کیا تو لے لیا۔ لوگوں نے پوچھا کہ اگر آپ کو لینا حرام تھا
تو پھر کیوں لیا اور حلال تھا تو پہلے انکار کیوں کیا۔ فرمایا فتوے کے موافق
تھا اور تقوے کے خلاف۔ پہلے میں نے انکار کیا۔ مگر جب میں نے دیکھا
کہ نہ لینے میں اُس کی ذلت ہے اور میری عزت اور لینے میں اُس کی عزت
ہے میری ذلت۔ تو میں نے اپنے بھائی کی عزت کو اپنی عزت پر ترجیح

دی اور لے لیا۔

حضرات ــ اگر بزرگانِ دین کبھی لیتے ہیں تو اُس میں اُن کی یہ نیت ہوتی ہے۔ نہ اُن کے لینے پر اعتراض کرو نہ انکار پر۔ مگر بشرطیکہ بزرگ ہوں بُزرگ نہ ہوں، ورنہ ؎

اینکہ می بینی خلافِ آدم اند
نیستند آدم غلافِ آدم اند

(یعنی جن لوگوں میں آدمیت کے خلاف باتیں دیکھتے ہو واقع میں آدمی نہیں بلکہ صورت میں آدمیوں کے مشابہ ہیں) بہت سے آدمی کے مشابہ ہوتے ہیں مگر واقع میں آدمی نہیں ہوتے در پردہ شیطان ہوتے ہیں تو جو شخص بزرگ ہو یعنی متبع شریعت ہو، طالبوں پر شفیق ہو، منکرات سے بچتا ہو، اُس کی صحبت سے دنیا کی محبت کم ہوتی ہو، اُس کے سب افعال خلوص پر مبنی ہوتے ہیں۔ تو میں نے یہ چند حکائتیں بیان کر دی ہیں۔ ان کو یاد رکھئے اور اگر ایسے لوگوں کی صحبت میّسر ہو جائے تو اُس کو غنیمت سمجھ کر حاصل کیجئے۔ اُس وقت دیکھئے گا کہ آپ کو خود ایسے امور کی تمیز ہو جائے گی۔

بہرحال میں نے اخلاص کی ماہیت بھی بتلا دی اور طریقہ بھی بتلا دیا اور علاج بھی بتلا دیا۔ اب آگے کرنا آپ کا کام ہے۔ خدا تعالیٰ سے دُعا کیجئے کہ توفیق عمل عطا فرماویں ــــــ آمین!

وَصَلَّے اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰے خَیْرِ خَلْقِہٖ سَیِّدِنَا
مُحَمَّدٍ وَّعَلٰے آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ۔

تفصیل الدّین

ایمان وعمل کے متعلق یہ وعظ ۲۳ر محرم ۱۳۳۱ھ کو جامع مسجد
غازی پور میں اہل شہر کی درخواست پر ہوا۔ ۳ گھنٹے ۴۰ منٹ
میں ختم ہوا اور مولانا سعید احمد صاحب تھانوی نے قلمبند کیا
اور مولانا ظفر احمد صاحب نے تسوید و تفصیل کی۔

جس طرح ہر قوت محدود ہے اسی طرح انسان کی عقل بھی محدود ہے۔ عقل سے اس وقت تک کام لو جب تک وہ کام دے سکے۔ اور جہاں اس کا کام نہیں وہاں اس کو چھوڑ دو اور حکم کا اتباع کرو۔ شریعت کے معاملہ میں اصول تک تو عقل کام دیتی ہے اور فروع میں یہ تنہا بیکار ہے آگے وحی سے کام لو ورنہ یاد رکھو عمر بھر رستہ نہ ملے گا کیوں کہ سمعیات میں عقل کا کام نہیں وہاں تو اتباع رسولؐ کی ضرورت ہے ——— !

خطبۂ ماثورہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ نحمدہٗ ونستعینہٗ ونستغفرہٗ ونؤمن
بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا و
من سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہٗ
ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا اللہ
وحدہٗ لاشریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا
محمدًا عبدہٗ ورسولہ صلی اللہ تعالی علیہ وعلی
اٰلہ واصحابہ وبارک وسلم امابعد فاعوذ باللہ من
الشیطان الرجیم ۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم ۔
ان الذین اٰمنوا وعملوا الصالحات سیجعل لھم الرحمٰن ودًّا

تمہید

صاحبو ——— یہ وہی آیت ہے جس کے متعلق کل ایک ضروری بیان کیا گیا تھا۔ چونکہ وہ دو اجزاء سے مرکب تھا اور کل ایک ہی جزو کا تفصیلاً ذکر ہوا تھا اور دوسرا جزو تفصیل سے رہ گیا تھا۔ گو مجملاً اس کا ذکر بھی ہو چکا تھا۔ اور وہ اجمال گو شافی نہ تھا مگر کافی ضرور تھا۔ حتیٰ کہ اگر آج کا بیان نہ بھی ہوتا تب بھی کچھ ضرر نہ تھا۔ کیونکہ ایک جزو کی تو تفصیل بھی ہو چکی تھی اور دوسرے جزو کے متعلق ایک قاعدہ کلیہ بیان کر دیا گیا تھا۔ جس کے پیش نظر رکھنے کے بعد تفصیل کا نہ ہونا مضر نہ تھا مگر جب تفصیل کا موقع مل گیا تو میں نے چاہا کہ اس کی بھی کسی قدر تفصیل کر دی جائے۔

کسی قدر کی قید اس لئے بڑھا دی کہ تفصیل علیٰ قدر اتم کے لئے ایک جلسہ کافی نہیں ہو سکتا۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے ۲۳ برس تک اس کی تفصیل فرمائی پھر بھی اس کے لئے توضیح کی ضرورت ہوئی۔ اور اس کے لئے حق تعالٰے نے حضورؐ کے بعد ہر زمانہ میں حاملانِ دین کو پیدا فرمایا

جو برابر اس کی توضیح کرتے رہے۔ حتیٰ کہ خیر القرون کے ختم تک (یعنی قرن ثالث پر جو تبع تابعین کا زمانہ ہے اور جملہ ائمہ مجتہدین اسی زمانہ میں ہوئے ہیں) وہ توضیح بھی علی وجہ الکمال ہو گئی (تو جس مضمون کی تفصیل اتنے عرصہ دراز میں ہوئی ہو اُس کو علیٰ قدر اتم ایک جلسہ میں کیونکر بیان کیا جا سکتا ہے اب سمجھئے کہ اس مضمون کی تفصیل و توضیح تو خیر القرون کے ختم تک پوری ہو گئی)

درجہ تفریع و تجدید

لیکن اب دو مرتبے باقی رہ گئے۔ ایک تفریع کہ قیامت تک انہی اصول پر حوادث جزئیہ کے احکام کی تفریع کرتے رہنا۔ یہ کام علم و فہم کا ہے۔ اگرچہ حق تعالیٰ نے اجتہاد مطلق کو ختم کر دیا ہے۔ نہ اس وجہ سے کہ خداوند کریم کی رحمت (معاذ اللہ) ختم ہو گئی بلکہ اس لیے کہ خداوند تعالیٰ کا قاعدہ اور اُن کی عادت مستمرہ یہ ہے کہ جب کسی چیز کی ضرورت نہیں رہتی اس وقت اس کو ختم کر دیتے ہیں۔ اس عادت کے موافق چونکہ حضرات مجتہدین کے بعد اجتہاد کی ضرورت نہ رہی تھی۔ اس لئے اس کو ختم کر دیا البتہ تفریع کی ضرورت قیامت تک رہے گی۔ اس لئے اتنا اجتہاد اور اتنا فہم قیامت تک کے لیے باقی ہے جس سے مجتہدین کے اصول پر علماء جزئیات کو متفرع کرتے رہیں۔ چنانچہ ہر زمانہ میں ایسے لوگ پیدا ہوتے ہیں جو نئے نئے جزئیات میں حکم شرعی بتلاتے رہتے ہیں اور مجتہدین کے اصول ہی پر جزئیات حادثہ کو متفرع کرتے رہتے ہیں۔

دوسرے اس کی ضرورت بھی باقی ہے کہ ہر زمانہ میں حق کو باطل سے ممتاز کر دیا جائے کیونکہ زمانہ نبوت سے بُعد ہو جانے کی وجہ سے

بعض دفعہ حق و باطل مختلط ہو جاتا ہے خواہ عوام کی بے تمیزی سے یا اہل غرض علماء کی وجہ سے۔ تو ایسے وقت میں حق تعالےٰ کسی ایسے مقبول بندے کو پیدا فرماتے ہیں جو حق کو باطل سے ممتاز کر کے صراط مستقیم کو واضح کر دیتا ہے یہ درجۂ تجدید ہے۔ اس کے متعلق حدیث میں پیشین گوئی ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ یَبْعَثُ فِیْ اُمَّتِیْ عَلٰی رَأْسِ کُلِّ مِائَۃٍ مَنْ یُّجَدِّدُ لَھَا دِیْنَھَا۔

کہ حق تعالےٰ میری اُمت میں ہر سَو برس کے بعد ایک ایسے شخص کو مبعوث فرماتے ہیں جو دین کی تجدید کر دیتا ہے۔

یعنی حق کو باطل سے ممتاز کر دیتا ہے۔ چنانچہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد ہر صدی پر کوئی نہ کوئی مجدّد ضرور ہوا ہے۔

تو یہ دو درجے اب بھی باقی ہیں اور قیامت تک رہیں گے۔ ایک تفریع ایک تجدید —— اور یہ دونوں خدمتیں الگ الگ ہیں اور اگر کوئی اللہ کا بندہ دونوں کا جامع ہو تو یہ خدا تعالےٰ کی رحمت ہے۔

درجۂ توضیح و تفصیل

تو اب توضیح و تفصیل کا جو درجہ ہے اس کا ابہام کے ساتھ بیان ہو سکتا ہے مگر یہ بیکار ہے کیونکہ جس تفصیل کو کوئی نہ سمجھے وہ فضول ہے اور پوری طرح بیان کیا جائے تو بتلائیے اس کے لئے ایک جلسہ کیسے کافی ہو سکتا ہے۔ اس لئے میں نے کسی قدر کی قید لگائی یعنے یہ تفصیل اضافی

نہ قلت و من الجامعین لھما سیدی حکیم الامۃ مجدد الملۃ ادام اللہ فیوضہم وبرکاتہم سالت العارف باللہ سیدی مولانا محمد یحییٰ (بقیہ بر صفحہ ۷۵)

ہو گی جو تفصیل اتم کے مقابلہ میں تو اجمال ہے اور اجمال سابق کے مقابلہ میں تفصیل ہے تو یہ وہ تفصیل اضافی کا باقی رہ گیا تھا اس کو میں آج بیان کرنا چاہتا ہوں اور اسی لیے اسی آیت کو اختیار کیا گیا جس کو کل بیان کیا گیا تھا باقی یہ جو میں نے کہا ہے کہ کل جزو ثانی کو بھی اجمالاً بیان کر چکا ہوں تو شاید کسی کے ذہن میں وہ اجمال نہ رہا ہو اس لیے میں اس کو بھی یاد دلاتا ہوں کہ میں نے اخیر مضمون میں کہا تھا کہ حق تعالیٰ نے وُدّ (اور محبوبیت) کا مدار ایمان اور عمل صالح پر رکھا ہے۔ اس کے متعلق میں نے کہا تھا کہ اس کا طریقہ علوم دین ہیں جو دو طرح حاصل ہو سکتے ہیں یا تعلیم و تعلم سے یا علماء کی مخالطت اور ان کے اقوال و مواعظ سننے سے۔ پس کل گو اس مضمون کی تفصیل نہ کی گئی تھی مگر وہ طریقہ بتلا دیا گیا تھا جس سے عمر بھر تفصیل ہو سکتی تھی۔ تو وہ بیان بھی مکمل تھا۔ اس میں ابہام نہ تھا۔ کیونکہ ابہام کی

(بقیہ حاشیہ از صـ۷۴) رحمۃ اللہ علیہ الخادم الخاص لسیدی قطب زمانہ الشیخ مولانا رشید احمد گنگوہی عن مجدد ہذہ السنۃ الحاضرۃ فقال کنت اظن اولاً انہ شیخی مولانا رشید احمد قدس سرہ ثم رأیتہ قد انتقل الی ربہ علی راس المائۃ والآن مجدد ہذہ المائۃ عندی خالک مولانا اشرف علی ادام اللہ فیوضہ اھ قلت وقد اذعن بہذا القول طائفۃ من المقبولین و ایدہ عموم فیضہ اطال اللہ بقاءہ وانتشار صیتہ فی العالم وامتیازہ من بین العلماء بکثرۃ الرحلۃ الیہ من الطالبین وبزیادت ایضاح الحق علے یدیہ بالتصانیف المفیدہ فی کل علم من علوم الدین وبالمواعظ المتکثرۃ الممتازۃ بشانہا وبتسہیلہ طریق الباطن وتوضیحہ بحیث ابدی القشر من اللباب واللہ اعلم ۱۲ ظ

صورت یہ ہوتی ہے کہ کلام مفہم مراد نہ ہو۔ اور یہ اجمالی بیان غیر مفہم نہ تھا بلکہ کافی تھا۔ اگر آج کا بیان نہ ہوتا تب بھی کوئی جزو سمجھنے سے باقی نہ رہا تھا البتہ ایک جزو کی تفصیل پہلے جزو کے برابر نہ ہوئی تھی۔ تو اس کے بیان کے لئے خدا تعالےٰ نے اس وقت موقعہ دے دیا ہے، تو اس وقت میں اس کی بھی تفصیل کرنا چاہتا ہوں۔ یہ حاصل ہے آج کے بیان کا۔ توضیح اس کی یہ ہے کہ ہر مقصود میں دو چیزیں ہوتی ہیں ایک نفس مقصود اور ایک اس کا ذریعہ۔

اب سمجھو کہ حق تعالےٰ نے اس آیت میں ایمان وعمل صالح پر وُدّ کا مدار رکھا ہے۔ اس میں بھی دو چیزیں ہیں۔ ایک مقصود جس کا بیان سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا میں ہے۔ اور ایک طریق یعنی ایمان وعمل صالح جس کا بیان اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ میں ہے۔ تو کل کے بیان کا حاصل مقصود کی تفصیل تھی اور آج طریق کی تفصیل ہے اور مقصود بہت ہی مختصر ہے اور اس کی تفصیل بھی کچھ طویل نہیں ہے یعنے محبوبیت۔ اس کی بہت سی اقسام بیان کرنے کی حاجت نہیں۔ بس یہ سمجھ لینا کافی ہے کہ ہم حق تعالیٰ کے محبوب بن جاویں گے۔ اور اس کے فروع میں سے یہ بھی بتلا دیا گیا تھا کہ یہ شخص خلق کا بھی محبوب ہو جاوے گا۔ تو یہ مضمون زیادہ تفصیل کا محتاج نہ تھا مگر اس کی تفصیل اس لئے بیان کی گئی تھی کہ آج کل لوگ ثمراتِ آخرت کو بہت ہی بے وقعت سمجھتے ہیں۔

دین کی بے قدری

بس ان کے نزدیک بڑا ثمرہ یہ ہے کہ کچھ روپیہ مل جاوے چنانچہ

ایک عہدہ دار کی بیوی نماز پڑھتی تھی تو اُس سے وہ پوچھا کرتے تھے کہ تجھ کو نماز پڑھ کر کیا ملا۔

اسی طرح سوداؔ کی حکایت ہے کہ وہ اپنی بیوی سے ایک دن پوچھنے لگا کہ تو نماز کس واسطے پڑھا کرتی ہے۔ اُس نے کہا ہمیں جنت ملے گی۔ تو سوداؔ کیا کہتا ہے کہ جا باؤلی! تو وہاں بھی غریبوں، ملّانوں طالب علموں اور جلاہوں کے ساتھ رہے گی۔ اور دیکھ ہم جہنم میں جائیں گے جہاں بڑے بڑے بادشاہ اور وزراء اور امراء ہوں گے۔ فرعون، ہامان، نمرود، شداد، قارون وغیرہ۔

یہ تو سوداؔ کا قصہ ہے مگر آج کل بھی قلوب کو ٹٹولا جائے تو معلوم ہوگا کہ جتنی وقعت لوگوں کے قلوب میں ایک ہزار روپیہ کی ہے، اس سے نصف بھی دین کی وقعت نہیں ہے نہ ثمراتِ آخرت کی۔ حالانکہ ان کی وہ قیمت ہے کہ ؎

قیمتِ خود ہر دو عالم گفتۂ
نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز!

دونوں جہاں بھی بخدا اس کی قیمت میں کم ہیں۔

اور یہیں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جو لوگ قرآن کو تراویح میں اُجرت لے کر سناتے ہیں۔ اس میں علاوہ فقہی گناہ کے بے غیرتی بھی کس قدر ہے کہ قرآن کو جو خدا تعالیٰ کا کلام ہے ادنیٰ اسی اُجرت کے معاوضہ میں سناتے پھریں۔ اور یہ ساری بے قدری اس لئے ہے کہ قرآن سستا مل گیا ہے۔ اس دولت کے حصول میں ہم کو کچھ خرچ کرنا نہیں پڑا۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

اے گراں جاں خوار دیدستی مرا
زانکہ بس ارزاں خریدستی مرا

یعنی قرآن زبانِ حال سے کہہ رہا ہے کہ مجھے اس واسطے بے قدر کر رکھا ہے کہ میرے حاصل کرنے میں تمہارے کچھ دام نہیں لگے۔

حضرت ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ جب کسی فقیر کو فقر و فاقہ کی شکایت کرتے ہوئے دیکھتے تو فرمایا کرتے کہ تم اس کی قدر کیا جانو تم کو گھر بیٹھے یہ دولت مل گئی ہے۔ اس کی قدر ابراہیم بن ادھم سے پوچھو جس نے سلطنت بیچ کر اس کو خریدا ہے۔

اسی طرح ہم نے ایمان کی دولت کو ماں باپ سے لیا ہے۔ بے محنت و مشقت ہم کو مل گئی ہے اس لئے اس کی بے قدری ہے ورنہ خدا کا نام وہ چیز ہے جس کے مقابلہ میں تمام دنیا ہیچ ہے کیونکہ جنت کی سلطنت اسی کے عوض میں ملے گی۔ جس کے سامنے دنیا کی ہزار سلطنتیں بھی گرد ہیں۔ مگر افسوس آج کل دو پیسہ کے برابر بھی خدا کے نام کی قدر نہیں۔ چنانچہ وہ عہدہ دار اپنی بیوی سے پوچھتے ہی تھے کہ تجھ کو نماز سے کیا ملا۔ وہ تو ملنا اس کو سمجھتے تھے جیسے ایک شخص کو ملا کرتا تھا۔

قصہ یہ ہے کہ ایک عہدہ دار رشوت لیا کرتے تھے اور نماز کے بھی بہت پابند تھے۔ حتیٰ کہ فجر کی نماز کے بعد اشراق تک وظیفہ بھی پڑھا کرتے تھے اور یہی وقت مقدمہ والوں سے رشوت طے کرنے کا تھا مقدمہ والے آتے اور اشاروں سے رشوت کی رقم طے ہوتی تھی کیونکہ پیر نے وظیفہ میں بولنے سے منع کر رکھا تھا۔ بس وہ اشاروں سے سو کہتا اور یہ دو انگلیاں اٹھا دیتے کہ دو سو لوں گا۔ پھر اشاروں ہی سے

کوئی رقم طے ہو جاتی تو یہ مصلے کا کونہ پکڑ کر اٹھا دیتے کہ یہاں روپیہ رکھ دو۔ پھر کوئی دوسرا آتا اور اس سے بھی یوں ہی گفتگو ہوتی۔ غرض یہ ظالم اشراق پڑھ کر کئی سو روپیہ لے کر اٹھتا۔

تو آج کل تو ملنا اسے کہتے ہیں اور اسی واسطے وظیفے بھی پڑھے جاتے ہیں۔ پھر غضب ہے کہ بعض لوگ قرآن پڑھنے میں تو بول پڑتے ہیں اور وظیفے میں نہیں بولتے گویا نعوذ باللہ قرآن کی وقعت وظیفوں کے بھی برابر نہیں۔ یہ کیسی بے قدری ہے۔

اسی جہل کا ایک یہ اثر ہے کہ حدیث و قرآن کی دعاؤں کا لوگوں کے ذہن میں وہ درجہ نہیں جو پیرزادوں کی گھڑی ہوئی دعاؤں کا درجہ ہے۔ چنانچہ جب میں حج کو گیا تھا تو اس وقت میرے ابتدائی کتابوں کے استاد کانپور میں میری جگہ تدریس کے لئے تشریف لے آئے تھے وہاں ان سے ایک شخص نے اپنے قرض کے لئے وظیفہ پوچھا! انہوں نے ایک دعا بتلا دی۔ اس نے بڑی رغبت سے یاد کی۔ اور انہوں نے زیادہ رغبت دلانے کے لئے یہ بھی فرما دیا کہ یہ دعا حدیث میں آئی ہے اور اس کی یہ فضیلت ہے۔ بس یہ سن کر اس شخص کا منہ پھیکا سا ہو گیا اور کہنے لگے حضرت میں تو کوئی ایسا وظیفہ چاہتا ہوں جو آپ کے پاس سینہ بسینہ چلا آرہا ہو۔ حدیث کی دعا تو عام ہے سبھی پڑھ لیتے ہیں۔ سو لوگ آج کل ایسی ہی بے قدری کرتے ہیں۔

ایک شخص مجھ سے خود کہتے تھے کہ میری نماز تو قضا ہو جاتی ہے مگر پیر نے جو وظیفہ بتلایا ہے وہ کبھی قضا نہیں ہوتا۔ عجیب حالت ہے کہ اول تو دین کی طرف توجہ ہی نہیں اور جو توجہ بھی ہے تو اس خوبصورتی

کے ساتھ۔

اسی طرح ان عہدہ دار صاحب کو پیر نے منع کر دیا تھا کہ وظیفہ میں بولنا نہیں۔ اس لیے اُن کو بولنا تو ناجائز تھا مگر رشوت لینا جائز تھا۔ بلکہ شاید وظیفہ بھی وہ اسی واسطے پڑھتے ہوں کہ رشوت خوب ملے۔ اور رشوت کے لیے بھی نہ سہی تو اس میں تو شک نہیں کہ آج کل وظائف زیادہ تر دنیا کے واسطے پڑھے جاتے ہیں کہ مال میں برکت ہو۔ نوکری مل جائے، قرض اتر جائے۔ رضاء حق کے واسطے بہت ہی کم پڑھے جاتے ہیں۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ دنیا کے کاموں کے لیے وظیفہ پڑھنا ناجائز ہے مگر یہ ضرور کہوں گا کہ دنیا کے لیے اگر چالیس بار پڑھتے ہو تو آخرت کے لیے کم سے کم چار بار تو کوئی وظیفہ پڑھو مگر اس کی ذرا بھی فکر نہیں۔

دُعا اور وظیفہ کا فرق

جب آپ کو دین کی فہم کامل حاصل ہو گی اس وقت میں یہ کہوں گا کہ ؎

از خدا غیر خدا را خواستن
ظن افزونی ست کلی کاستن

خدا تعالیٰ سے غیر خدا کو چاہنا حقیقت میں پستی ہے۔ یہ سلطنت نہیں ہے کہ خدا سے دنیا مانگو بلکہ یہ پست ہمتی اور دنائت ہے مگر اس کے دو طریقے ہیں۔ ایک تو دنیا کے واسطے خدا تعالیٰ سے دعا کرنا اور دُعا کے ذریعے سے مانگنا یہ مذموم نہیں ہے بلکہ یہ تو شانِ عبدیت ہے اور ایک وظیفہ پڑھ کر مانگنا یہ مذموم ہے۔ اور ان دونوں

میں بڑا فرق ہے۔ وہ یہ کہ دعا کر کے مانگنے میں ایک ذلت کی شان ہے اور یہ اس مقصود کے موافق ہے جو بندوں کے پیدا کرنے سے اصل مقصود ہے جس کو حق تعالیٰ نے اس آیت میں بیان فرمایا ہے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنَ ـــــــ

(اسی لئے حدیث میں ہے اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَۃِ کہ دعا عبادت کا مغز ہے) اور میں نے عبادت کو جو اصل مقصود کہا ہے اس میں اصل کی قید اس واسطے لگائی کہ کوئی یوں نہ سمجھے کہ کھانا کمانا اور دنیا کے کاروبار کرنا ناجائز ہے۔ سو خوب سمجھ لو کہ یہ ناجائز نہیں بلکہ جائز ہے بلکہ ایک درجہ میں مطلوب بھی ہے مگر اصل مقصود نہیں بلکہ تابع مقصود ہے۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک شخص کھانا پکوائے جس میں پانچ روپے صرف ہوں۔ تو گو اصل مقصود کی لاگت اس سے کم ہے مگر جب کوئی پوچھتا ہے کہ اس کھانے کی تیاری میں کیا خرچ ہوا ہے تو جواب یہی دیا جاتا ہے کہ پانچ روپے صرف ہوئے ہیں اور جب وہ تفصیل پوچھے تو آپ کہتے ہیں کہ ایک روپیہ کا گھی اور ایک روپیہ کا آٹا اور ایک روپیہ کا گوشت اور آٹھ آنے کا مسالہ وغیرہ اور آٹھ آنے کی لکڑیاں کوئلے۔ اور چار آنے پکانے والے کی مزدوری وعلیٰ ہذا۔ اس جواب کو سن کر وہ سائل کہنے لگے کہ کیا آپ لکڑیاں اور کوئلے بھی کھایا کرتے ہیں جو اس کو کھانے کے حساب میں شمار کیا۔ تو بتلائیے کہ آپ کیا جواب دیں گے۔ یقیناً یہی کہیں گے کہ لکڑیاں گو مقصود نہیں مگر مقصود کے تابع ضرور ہے۔ اس لئے ان کو بھی مقصود کے ساتھ شمار کیا جائے گا۔ تو بعینہٖ یہی تعلق دنیا کو آخرت سے ہے کہ گو وہ بھی کسی درجہ

ہیں مطلوب ہے مگر اصل مقصود نہیں بلکہ تابع مقصود ہے۔

اب اگر کوئی شخص صرف دنیا ہی کے جمع کرنے میں لگا رہے، اُس کو ایسا سمجھا جاوے گا جیسے کوئی کھانا تو تیار کرے نہیں نہ کھانے کی چیزیں خریدے صرف لکڑیاں گھر میں بھر لے تو تبلائیے اگر کوئی اپنے گھر میں لکڑیاں ہی بھر لے تو اُس کو کوئی شخص عاقل کہے گا۔ ہرگز نہیں اسی طرح محض دنیا طلبی میں رہنا بھی عاقل کا کام نہیں اور اگر کوئی کھانے کا سارا سامان کر لے مگر ایندھن نہ خریدے تو اُس کو بھی کھانا میسر نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح محض دین میں لگے رہنا اور باوجود حاجت دنیا کی مطلق فکر نہ کرنا بھی غیر مطلوب ہے۔ بلکہ اصل مقصود دین کو سمجھے اور اس میں زیادہ مشغول ہو اور کچھ فکر دنیا کی بھی رکھے۔ مگر اس میں منہمک نہ ہو۔ بلکہ اتنا سامان کر لینا چاہیئے کہ مثلاً ایک سال کے لئے علی اختلاف الاحوال کافی ہو جائے۔ کیونکہ الضرورۃ یقدر بقدر الضرورۃ اور رفع ضرورت کے لئے اتنا سامان کافی ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ مولوی دنیا چھڑاتے ہیں یہ غلط ہے چھڑاتے کہاں ہیں بلکہ وہ تو دنیا کو دین کا ذریعہ بتاتے ہیں۔ اتنا فرق ہے کہ آپ اسی کو مقصود سمجھتے ہیں اور میں اس کو بقدر ضرورت ضروری کہتا ہوں۔ پس دنیا تابع ہے اور اصل مقصود آخرت ہے۔ اس لئے میں نے اصل کا لفظ بڑھا دیا تھا کہ خلقت عالم سے اصل مقصود عبادت ہے۔

اب سمجھئے کہ دُعا میں ایک خاصہ ہے جس کی وجہ سے دُعا کر کے دنیا مانگنا جائز ہے اور وظیفہ میں وہ بات نہیں اس لئے مذموم ہے۔ دُعا کی حقیقت وہ ہے جو عبادت کی روح ہے یعنی تذلل و اظہار

احتیاج اور یہ وہ چیز ہے کہ اگر کوئی سادہ طبیعت آدمی کسی بادشاہ یا امیر کو دعا کرتے دیکھے اور دعا کے وقت جو عاجزی کے الفاظ وہ کہہ رہا ہے وہ سُنے تو اس کو حیرت ہو جائے گی کہ اللہ یہ شخص بھی اتنا محتاج ہے جو اس عاجزی سے اپنی احتیاج کو ظاہر کر رہا ہے۔

اکبر بادشاہ کی حکایت ہے کہ ایک دفعہ شکار میں وہ کسی طرف رستہ بھول کر جا نکلا۔ وہاں ایک دیہاتی زمیندار تھا۔ اُس نے بادشاہ کو پہچانا تو نہیں مگر اپنی کریم النفسی سے اُس کی خوب خاطر مدارات کی۔ اکبر بہت خوش ہوا۔ تھوڑی دیر میں لشکر بھی آملا۔ تب دیہاتی کو معلوم ہوا کہ یہ تو بادشاہ تھا۔ اکبر نے چلتے وقت کچھ دیا بھی اور کہہ دیا کہ جب یہ ختم ہو جاوے ہمارے پاس پھر آنا۔ اور دربانوں سے کہہ دیا کہ یہ جب آوے روکنا نہیں۔

چنانچہ ایک بار وہ آپہنچا اور اُس کو محل میں پہنچا دیا گیا۔ اتفاق سے اکبر اس وقت نماز پڑھ رہے تھے۔ اس دیہاتی کو بڑی حیرت ہوئی کہ یہ بادشاہ ہو کر کسی کے سامنے جھک رہا ہے۔ جب اکبر نماز سے فارغ ہوئے اور ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے لگے تو دیہاتی کو اور بھی حیرت ہوئی کہ یہ کس سے مانگ رہا ہے۔ آخر جب وہ دعا سے فارغ ہو کر اُس کی طرف متوجہ ہوئے تو دیہاتی نے پوچھا کہ تم کس کے سامنے جھکتے اور کس سے ہاتھ پسار کر مانگ رہے تھے۔ اکبر نے کہا کہ میں خدا تعالیٰ کی عبادت کر رہا تھا اور اُس سے اپنی حاجتیں مانگ رہا تھا۔ یہ سُن کر دیہاتی پر ایک حالت طاری ہوئی اور کہنے لگا کہ جب خدا تمہاری حاجت پوری کر سکتا ہے تو کیا میری حاجت پوری نہ کرے گا۔ بس

میں اب تم سے کچھ نہیں مانگتا میں بھی خدا ہی سے مانگوں گا۔

تو صاحبو —— دعا کا یہ رنگ ہے جس سے سراسر احتیاج اور عاجزی ٹپکتی ہے۔ اور وظیفہ میں یہ بات نہیں (بلکہ اکثر تو یہ ہے کہ وظیفہ پڑھ کر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وظیفہ کے زور سے ہمارا مقصود ضرور حاصل ہو گا۔ تو اس حالت میں عجز و احتیاج کہاں۔ پس دنیا کے واسطے وظیفہ پڑھنا اور دنیا کے لئے دعا کرنا برابر نہیں)

دعا کا طریق

اسی لئے اگر کوئی دنیا کے واسطے دعا مانگے اور یوں کہے کہ اے خدا، مجھے سو روپے دے دیجئے تو یہ جائز ہے بلکہ اس میں بھی وہی ثواب ہے جو آخرت کے لئے دعا کرنے میں ہے بشرطیکہ دعا ناجائز کام کیلئے نہ ہو۔ کیونکہ دنیا کے لئے ہر دعا جائز نہیں بلکہ جو شریعت کے موافق ہو وہی جائز ہے۔ مثلاً کوئی شخص ناجائز ملازمت کے لئے دعا مانگے تو یہ جائز نہیں۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے حاکم کے یہاں ایک تو تحصیلداری کی درخواست دینا اور ایک ڈکیتی کی درخواست دینا۔ ظاہر ہے کہ جس کام کو حاکم نے ممنوع قرار دے دیا ہے۔ اس کی درخواست حاکم سے کرنا اور حاکم کو اس کے حصول کا ذریعہ بنانا بھی ممنوع ہو گا۔ تو جو دعا حدود شرعیہ سے باہر ہو وہ تو پسندیدہ ہے ہی نہیں پھر اس کو پیش کرنا کیونکر جائز ہو سکتا ہے۔ آج کل لوگ اس کی بھی رعایت نہیں کرتے کہ دعا شریعت کے موافق ہو۔

واقعی بات یہ ہے کہ ہم لوگ بڑی غفلت میں ہیں جس کی وجہ زیادہ

تر بے علمی ہے۔ ہم لوگ بعض دفعہ خدا تعالےٰ سے ایسی چیزیں مانگتے ہیں جو خدا تعالےٰ کو ناپسند ہیں۔ چنانچہ اُس وقت بہت سی ایسی نوکریاں ہیں جو ناجائز ہیں۔ اور ان کے لئے دُعا کرائی جاتی ہے اور اگر وہ مل جائے تو مبارک باد دی جاتی ہے ـــــــ افسوس! کس کس بات کی اصلاح کی جائے۔ ع

تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

اور غضب یہ ہے کہ ایسی ناجائز ملازمتوں کے لئے اہل اللہ سے جا کر دُعا کرائی جاتی ہے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ مردوں کے پاس جا کر کہتے ہیں کہ آپ ہمارا یہ کام کر دیجئے۔ گویا سارا اختیار اُن کے ہاتھوں میں ہے۔

حضرت مولانا شاہ فضل الرحمٰن صاحبؒ کے پاس ایک شخص آیا اور کہنے لگا کہ حضرت میرا یہ کام کر دیجئے۔ شاہ صاحب نے فوراً حکم دیا کہ نکالو اس مشرک کو یہ مجھ سے کہتا ہے کہ میرا کام کر دیجئے۔ ارے کیا تیرا کام کر دینا میرے اختیار میں ہے۔

بس آج کل لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ یہ تسبیح چلانے والے خدا تعالیٰ کے رشتہ دار ہو گئے کہ جو یہ کہہ دیں گے ضرور ہو جائے گا۔ خدا تعالےٰ فرماتے ہیں یَا اَھْلَ الْکِتَابِ لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِکُمْ اس میں غلو فی الدین سے منع فرمایا گیا ہے۔ پس گو حضرات اولیاء کی تعظیم ضروری ہے اور دین میں داخل ہے مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ ان کی ایسی تعظیم کی جائے کہ خدا تعالےٰ کی توہین ہونے لگے اور شرک لازم آجائے۔

دیکھو اگر کوئی حاکم کے پاس جا کر سر رشتہ دار کو بھی سلام کر لے تو

اس کا مضائقہ نہیں۔ لیکن اگر اُس سے وہ باتیں کہنے لگے جو حاکم سے کہنا چاہئیں۔ مثلاً یوں کہے کہ سررشتہ دار صاحب! بس سارا معاملہ آپ ہی کے ہاتھ میں ہے آپ جو چاہیں کر سکتے ہیں اور اس کی ویسی ہی تعظیم کرنے لگے جیسے حاکم کی کی جاتی ہے تو کیا حاکم اس سے خوش ہو گا۔ یقیناً حاکم اس شخص کو دربار سے نکال دے گا اور یقیناً سررشتہ دار بھی ایسی تعظیم گوارا نہیں کر سکتا اور جو گوارا کرے گا تو وہ بھی دربار سے نکالا جائے گا۔

اب بتلاؤ کہ جو معاملہ خدا تعالیٰ سے کیا جاتا ہے وہ غیر خدا کے ساتھ کیوں کر پسندیدہ ہو سکتا ہے۔ یقیناً اس سے حق تعالیٰ ناخوش ہوتے ہی ہیں وہ بزرگ بھی ناراض اور ناخوش ہوتے ہیں جن کی ایسی تعظیم کی جاتی ہے۔ پھر حیرت ہے کہ لوگ بزرگوں کے مزارات پر جا کر ایسے بیہودہ کلمات سے اُن کا دل دکھاتے ہیں۔ غرض ناجائز ملازمتوں کے لئے زندوں اور مردوں دونوں کو جا کر دق کرتے ہیں۔ پھر زندوں میں بعض تو صاف ہوتے ہیں جو اُن کے منہ ہی پر کہہ دیتے ہیں کہ ہم ناجائز کام کے لئے دُعا نہ کریں گے اُن کو تو بدمزاج اور سخت کہہ کر بدنام کیا جاتا ہے اور اکثر اپنے اخلاق سے کہہ دیتے ہیں کہ ہاں دُعا کریں گے یہ بہت خوش اخلاق شمار ہوتے ہیں۔ اور اس وقت اہل الرائے کی رائے یہی ہے کہ علماء کو ایسے ہی اخلاق چاہئیں جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ حق بات کو ظاہر نہ کیا کریں۔

غرض بعض اہل اللہ اپنے اخلاق سے مجمل وعدہ بھی کر لیتے ہیں، مگر لوگوں کو یہ معلوم نہیں کہ وہ دُعا کس طرح کرتے ہیں۔ ذرا خلوت میں کبھی اُن

کی دُعاؤں کو سنو تو معلوم ہو۔ اور بعض تو خلوت میں خدا تعالیٰ کے سامنے بھی اخلاق برتتے ہیں مگر یہ غیر محقق ہیں۔ اکثر اہل اللہ خلوت میں یوں دُعا کرتے ہیں کہ یا اللہ! اگر یہ ملازمت شریعت کے موافق ہو اور اس شخص کے دین کو مضر نہ ہو تو اُسے نصیب کر دیجیے ورنہ ہرگز نہ دیجیے۔

مولانا شاہ فضل الرحمٰن صاحب سے ایک شخص نے آکر عرض کیا کہ حضرت میرے مقدمہ کے واسطے دُعا کیجیے۔ اُسی وقت دوسرا فریق بھی آیا اُس نے بھی دُعا چاہی۔ اس مقام پر اس گتھی کو سلجھانا ہر ایک کا کام نہیں۔ اب یا تو دوسرے فریق سے انکار کریں تو ترجیح بلا مرجح لازم آتی ہے اور اس کو بھی وعدہ کریں تو کس طرح کریں۔ ہاں جس کو خدا تعالیٰ نور باطن عطا فرماویں وہ اس گتھی کو سلجھا سکتا ہے۔ چنانچہ شاہ صاحب نے اسی وقت اس طرح دُعا کی کہ اے اللہ! جس کا حق ہو اُسے مل جاوے۔ بس دونوں کا حق پورا ہو گیا۔

سو مولانا نے تو جلوت ہی میں یہ دُعا کر دی باقی اور بزرگ بھی گو جلوت میں تم سے کیسا ہی وعدہ کر لیں خلوت میں وہ بھی اسی طرح دُعا کرتے ہیں کہ اگر یہ کام خلافِ شریعت نہ ہو تو پورا ہو جائے ورنہ ہرگز پورا نہ ہو۔ وجہ یہ ہے کہ وہ خدا کے مقرب ہیں پھر وہ خدا تعالیٰ کی مرضی کے خلاف کوئی دُعا کیسے کر سکتے ہیں۔ بلکہ عوام الناس تو خدا تعالیٰ سے کچھ کھلے ہوئے بھی ہوتے ہیں (جیسے بعض دیہاتی حکام کے سامنے بے تکلف باتیں کر لیتے ہیں) اور یہ حضرات نہایت ہیبت زدہ ہوتے ہیں۔ وہ ناجائز امور کے لئے تو کیا دُعا کرتے مباح امور میں بھی دُعا کرتے ہوئے اُن کی یہ حالت ہوتی ہے ؎

اُحِبُّ مُنَاجَاۃَ الْحَبِیْبِ بِاَوْجُہٖ
وَلٰکِنَّ لِسَانَ الْمُذْنِبِیْنَ کَلِیْلٗ

بعض دفعہ وہ بہت کچھ مانگنا چاہتے ہیں لیکن اپنی خطاؤں کے استغفار سے زبان سے کچھ نکلتا نہیں۔ حضرات! مغفرت کی دعا کس قدر محبوب اور سراپا محمود ہے مگر اس میں بھی بعض دفعہ استغفار ذنوب کے سبب ان کی زبان رک جاتی ہے۔ گو پھر امر کی وجہ سے دعا کرتے ہیں اور کرنا چاہئے کیونکہ وہ صاحب حال ہونے کے ساتھ صاحب عرفان بھی ہوتے ہیں۔ اس لئے امر کی وجہ سے دعا کرتے ہیں۔ اور اپنے جی کو سمجھاتے ہیں کہ شرماویں کس سے۔ اور شرم کی وجہ تو یہی ہے کہ ہم اپنے کو ناپاک سمجھتے ہیں کہ اس وجہ سے اُس دربار میں کچھ عرض کرنے کے قابل اپنے کو نہیں سمجھتے مگر پھر دُور دُور رہ کر پاک کیسے ہوں گے۔ پاک ہونا بھی تو حاضری دربار ہی پر موقوف ہے۔ اب اگر حاضری اس پر موقوف ہو کہ پہلے پاک ہولیں تو دور لازم آتا ہے۔ اس لئے وہ شرم کو بالائے طاق رکھ کر طبیعت پر جبر کر کے دعا کرتے ہیں۔

مولانا نے ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک آلودۂ نجاست دریا پر سے گزرا۔ دریا نے کہا کہ آمیرے اندر چلا آ۔ اُس نے جواب دیا کہ میں ناپاک اور تو پاک وصاف، میں تجھ تک کیسے آؤں، پاک ہو کر آؤں گا۔ دریا نے ہنس کر کہا کہ اے بے وقوف، پاک ہونے کا بھی طریقہ یہی ہے کہ تو اسی حالت میں میرے پاس چلا آ۔ مجھ سے دُور رہ کر تو پاک ہی نہیں ہو سکتا۔ ایک بار تو ناپاکی کی حالت ہی میں چلا آ نا پھر پاک ہو کر بھی آنا نصیب ہوگا۔ اور جو اُس انتظار میں رہا کہ پہلے پاک ہولوں پھر پانی

کے پاس جاؤں گا تو عمر بھر نہ تجھے پاکی نصیب ہوگی نہ پانی کا قرب نصیب ہوگا۔

شیطانی اغوا

صاحبو۔۔۔ اسی طرح خدا تعالیٰ کے دربار میں آنے کے لئے تم اس کا انتظار نہ کرو کہ پہلے دنیا کے جھگڑوں سے فارغ ہولیں پھر یکسو ہو کر خدا کی یاد میں لگیں گے۔ کیونکہ یوں تو ساری عمر گزر جائے گی اور تم کو خدا کے ساتھ علاقہ نصیب نہ ہوگا۔ یہ شیطانی اغوا ہے کہ اس نے علم کے پیرایہ میں جہل کے اندر مبتلا کر رکھا ہے کہ عام لوگوں کو یہ پٹی پڑھادی ہے کہ بیٹے بیٹیوں کی شادی کر کے، بہت سی جائیداد اور روپیہ حاصل کر کے پھر اللہ کی یاد میں لگنا۔ اس وقت تو دل دنیا کی گندگیوں سے ملوث ہے ان سے پاک ہو کر آتا۔ مگر ان لوگوں کو عمر بھر بھی خدا کی یاد نصیب نہیں ہوتی۔ کیونکہ دنیا کے تعلقات بدون خدا سے علاقہ پیدا کئے قطع ہو ہی نہیں سکتے۔ دنیا کے کاموں کی یہ حالت ہے کہ ؎

لَا یَنْتَھِیْ اِرْجَبٌ اِلَّا اِلٰی اِرْبٍ

ان کی انتہا ہی کہیں نہیں ہے۔ ایک کام کے بعد دوسرا کام نکلتا چلا جاتا ہے۔ بس ان لوگوں کی ہمیشہ وہ حالت رہتی ہے ؎

ہر شبے گویم کہ فردا ترک ایں سودا کنم
باز چوں فردا شود امروز را فردا کنم

روزانہ یہی کہتے رہتے ہیں کہ کل کو یہ کام چھوڑ دیں گے مگر جب کل ہوتی ہے پھر وہی حال ہو جاتا ہے۔ تو صاحبو۔ اس کا انتظار نہ کیجئے آپ جس حال میں ہیں اسی حال سے چلے آئیے۔ دور رہ کر پاک ہونے کا

انتظار نہ کیجیے۔ پاک ہونے کا بھی طریقہ یہی ہے کہ ایک بار ناپاکی کی حالت ہی میں آجائیے۔ اس لئے فرماتے ہیں ؎

باز آ باز آ ہر آنچہ ہستی باز آ گر کافر و گبر و بت پرستی باز آ

ایں درگہ ما درگہ نومیدی نیست صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

انشاء اللہ خدا کے دربار میں حاضر ہونے سے بہت جلد یہ دلدار وصل جاوے گا اور ایک دن یوں ہی بیڑا پار ہو جائے گا۔ بہت لوگ بزرگوں کے پاس اسی خیال سے نہیں جاتے کہ یہ دنیا کا پاخانہ لے کر ان کے پاس کیا جاویں۔ وہ اپنے دل میں کیا کہیں گے۔

صاحبو۔ — اس کا وسوسہ ہرگز نہ لاؤ۔ وہ حضرات تخلقوا باخلاق اللہ سے متصف ہوتے ہیں۔ وہ کسی آنے والے کو حقیر نہیں سمجھتے۔ وہ عیب پوش اور کریم النفس ہوتے ہیں بلکہ بخدا ان کی نظر میں اپنے سے زیادہ کوئی بھی ذلیل نہیں ہوتا۔ پھر وہ کسی کو نظر حقارت سے کیا دیکھنے اس لئے تم اس ناپاکی سمیت ہی ان کے پاس چلے آؤ۔

مجھے ایک صاحب کی حالت تو نہیں مگر اس کی بناء بہت ہی پسند آئی۔ وہ جونپور سے میرے پاس بیعت ہونے آئے تھے۔ اور اس حال سے آئے کہ پاجامہ ٹخنوں سے نیچے اور ڈاڑھی منڈی ہوئی، مونچھیں خوب بڑھی ہوئیں اور آکر مجھ سے اپنے سب حالات کہہ دیئے۔ پھر بیعت کی درخواست کی۔ میں نے بعد مغرب کا وقت مقرر کر دیا۔ وہ دن جمعہ کا تھا۔ بھلے مانس نے اس دن بھی حجامت بنوائی تو جو کچھ بال داڑھی کے نکل آئے تھے۔ وہ بھی منڈوا دیئے۔ یہ حرکت مجھے بہت ناگوار ہوئی کہ یہاں آکر بھی انہوں نے اس گناہ کو نہ چھوڑا۔ مگر بعد نماز جمعہ کے انہوں

نے اپنے اس فعل کی جو بنا ربیان کی اس پر مجھے وجد آگیا۔ کہنے لگے کہ غالباً آپ کو آج میرا داڑھی منڈانا ناگوار ہوا ہوگا۔ میں نے کہا بے شک۔! کہنے لگے کہ خیال مجھے بھی ہوا تھا کہ آپ کو ناگوار ہوگا۔ مگر میں نے چاہا کہ طبیب کے سامنے اپنے مرض کی اصلی حالت صاف صاف ظاہر کر دوں۔ اس لئے میں نے اس شکل سے اپنے آپ کو پیش کر دیا۔ اب آپ جو تصرف چاہیں مجھ میں فرمائیں میں سب کے لئے حاضر ہوں۔

استقلال کی ضرورت

گو وہ فعل مجھے ناگوار ہوا مگر اس بناء کی قدر ہوئی اور معلوم ہو گیا کہ اس شخص پر صدق کا حال غالب ہے گو بوجہ جہل کے بڑی طرح ظاہر ہوا مگر واقعی میں اس کے صدق کی قدر کرتا ہوں۔ اور یہ ایسی قدر ہے جیسے حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک چور کی قدر کی تھی۔

اُنہوں نے ایک شخص کو سولی پر لٹکا ہوا دیکھا تھا۔ ساتھ والوں سے پوچھا کہ اس کو سولی کیوں دی گئی۔ لوگوں نے کہا کہ حضرت یہ بڑا پکا چور تھا۔ ایک بار اس نے چوری کی تو دایاں ہاتھ کاٹا گیا۔ پھر باز نہ آیا اور دوبارہ چوری کی تو بایاں پیر کاٹا گیا۔ پھر باز نہ آیا تو قید کر دیا گیا۔ اس نے قید خانہ میں بھی چوری کی تو حاکم نے سولی کا حکم دیا۔ یہ سُن کر حضرت جنید نے دوڑ کر اس کے قدم چوم لئے۔ اہل ظاہر نے اعتراض کیا کہ آپ ایک ایسے پکے چور کے قدم چومتے ہیں۔ فرمایا میں نے چور کے قدم نہیں چومے بلکہ اس کے استقلال کے قدم چومے ہیں۔ کہ وہ جیسا بھی کچھ تھا اپنی طلب کا پکا تھا۔ اس کا محبوب گو کیسا ہی بُرا تھا مگر اس نے اس کے پیچھے جان دے دی۔ اس کا یہ حال تھا کہ ؎

دست از طلب ندارم تا کام من برآید
یا تن رسد بجاناں یا جاں ز تن برآید

میں اس کے استقلال کی قدر کرتا ہوں۔

اے لوگو ــــ اگر ہم کو حق پر ثابت قدم رہنے میں ایسا استقلال حاصل ہو جائے تو ہمارا کام بن جائے۔ دیکھئے حضرت جنیدؒ نے اس شخص کے استقلال کی قدر کی گو اس استقلال کی صورت بری تھی۔ اسی طرح گو ان صاحب نے ایک بری حرکت کی کہ داڑھی منڈائی مگر یہ حرکت چونکہ صدق پر مبنی تھی اس لئے مجھے اس کی قدر ہوئی۔ (کیونکہ ایسے سچے اور صاف دل آدمی سے یہ امید قوی ہوتی ہے کہ وہ بیعت کے وقت جو کچھ اقرار کرے گا سچے دل سے کرے گا پھر اس کے خلاف نہ کرے گا) چنانچہ ان صاحب نے تھانہ بھون سے جا کر پھر عمر بھر داڑھی نہیں منڈائی۔ بلکہ ایک وقت میں ان کی اتنی بڑی داڑھی ہو گئی تھی کہ دیکھنے والے پہچانتے بھی نہ تھے کہ یہ وہی شخص ہے جو پہلے بالکل آزاد رند تھا۔ غرض وہ پورے نیک صالح بن گئے۔ (بات یہ ہے کہ صفات حمیدہ ہر حال میں حمیدہ ہیں جس میں کوئی صفت حمیدہ ہوتی ہے گو ایک وقت میں بری صورت سے اس کا ظہور ہو رہا ہو مگر جب اصلاح ہو گی تو کامل ہو گی۔ خوب سمجھ لو)

تو میں کہتا ہوں کہ آپ کو اس شخص کی طرح گندگی اور بدحالی ہی میں اپنے کو کسی بزرگ کے سپرد کر دینا چاہیئے۔ اس کا خیال نہ کیجئے کہ اس صورت سے ہم بزرگوں کے پاس کیسے جائیں۔

مقامِ دعا

یہ گفتگو اس پر چلی تھی کہ گو بعض دفعہ اہل اللہ کو دعائے مغفرت سے

بھی شرم آتی ہے مگر وہ اس سے رکتے نہیں بلکہ وہ دل کو سمجھاتے ہیں نہ شرم کس سے کریں اگر اسی شرم میں رہے اور خدا تعالٰے سے دعا نہ کی تو یہ ناپاکی کیوں کر دُھلے گی۔ تو جب وہ حضرات امور مباح کی دعا سے بھی شرماتے ہیں (گو اس پر عمل نہ کریں) تو آپ کے ناجائز کاموں کے لیے تو کیوں دعا کی ہمت کریں گے۔ اس لیئے زندہ یا مردہ بزرگوں سے ایسی دعائیں کرانا محض بے سود اور صرف اُن کو تکلیف دینا ہے۔

پس ناجائز دعائیں تو مستثنٰے ہیں۔ رہی جائز دعا سو چاہے دنیا ہی کی کیوں نہ ہو وہ تو عبادت ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے الدُّعاء مخ العبادة دُعا عبادت کا مغز ہے۔ کیونکہ دعا میں تذلل اور عاجزی کی شان ہوتی ہے۔ دُعا کرنے والا اپنے کو ذلیل و محتاج سمجھ کر دُعا کرتا ہے۔

بخلاف اس کے جو وظیفہ پڑھتا ہے اُس کی حالت تذلل کی نہیں ہوتی بلکہ اُس کی حالت دعوے کی ہوتی ہے۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ وظیفہ سے کامیابی ضروری ہے۔ ان کے مکالمات سے یہ بات ظاہر ہے۔ چنانچہ وہ کہا کرتے ہیں کہ حضرت ایسا وظیفہ بتلایئے کہ تیر بہدف ہو اور اگر کسی وظیفہ کی نسبت یہ لکھ دیا جائے کہ یہ مجرّب ہے تو اس پر ایسا بھروسہ ہو جاتا ہے کہ گویا تخلف ہو گا ہی نہیں۔ تو چونکہ اس میں دعوی کی شان ہے اس لیئے یہ ناپسند ہے مگر آج کل اکثر لوگ دعا کو چھوڑ کر وظائف پڑھتے ہیں گو اُن کا پڑھنا جائز تو ہے (اگر ان میں کوئی بات خلاف شریعت نہ ہو) مگر اس میں ثواب کچھ نہ ہو گا کیونکہ ثواب کے لئے یہ قاعدہ ہے ــــــ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَات ــــــ اور وظائف میں ثواب کی نیت نہیں ہوتی بلکہ محض دنیا ملنے کی نیت ہوتی ہے اس لئے

ثواب کچھ نہ ہوگا۔ بخلاف دعا کے کہ وہ اپنی ذات سے عبادت ہے۔ حتیٰ کہ اس میں اگر دنیا مانگی جائے تب بھی شریعت اس کو عبادت کہتی ہے۔ چنانچہ خود شریعت نے اس کو دنیا مانگنے کا طریق تجویز فرمایا ہے پس دنیا کی نیت کرنا دعا کے منافی نہیں کیونکہ احادیث میں دنیا کی نیت سے بھی دعا کرنے کا حکم ہے۔

مثلاً ایک حدیث میں ہے وَسَلُوا اللہ العافیۃ کہ اللہ تعالےٰ سے عافیت کی دعا مانگو۔ اسی طرح حصول رزق وحصول غنا واداء دین وغیرہ کے لئے بھی حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے دعائیں تعلیم فرمائی ہیں اور اگر احادیث میں غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے کسی دنیوی راحت کو نہیں چھوڑا جس کے لئے کوئی دعا نہ بتلائی ہو اور کسی مصیبت کو نہیں چھوڑا جس سے پناہ مانگنے کا طریقہ نہ بتلایا ہو بلکہ راحت ومصیبت کے علاوہ بھی ہر حالت کے متعلق ایک نہ ایک دعا آپؐ نے مقرر فرمائی ہے۔

مثلاً گھر میں آنا۔ گھر سے باہر جانا۔ سونا، جاگنا، اٹھنا، بیٹھنا، بیمار کی عیادت کرنا مسجد میں جانا اور نکلنا۔ بازار میں جانا۔ سفر شروع کرنا، سفر میں کسی جگہ اترنا پھر وطن کو واپس آنا۔ بیت الخلاء میں جانا۔ وہاں سے نکلنا۔ خوشی ورنج کی بات دیکھنا۔ چاند دیکھنا وغیرہ وغیرہ سب کے لئے احادیث میں الگ الگ دعائیں وارد ہیں۔ تو دنیا کے لئے دعا مانگنا بھی عبادت اور طاعت ہے بخلاف عملیات کے کہ وہ دین کے لئے ہوں تو طاعت ہیں ورنہ نہیں۔

اس سے آپ کو معلوم ہوا ہوگا کہ دُعا زیادہ قابل توجہ ہے مگر اس وقت بالکل برعکس معاملہ ہو رہا ہے کہ وظیفے کی قدر دُعا سے زیادہ ہے بلکہ قرآن سے بھی زیادہ کہ قرآن پڑھتے ہوئے تو بات چیت کر لیتے ہیں مگر وظیفے میں بولنا حرام سمجھتے ہیں۔ جیسے وہ عہدہ دار صاحب وظیفہ میں ہوں ہوں کیا کرتے اور اشاروں سے رشوت کی مقدار طے کیا کرتے تھے اور جب اشراق کی نماز کو کھڑے ہوتے تو اس سے پہلے کئی سو روپے مصلّے کے نیچے آجاتے تھے۔ یہ قیمت تھی اُن کی نماز کی۔ آج کل تو اس کو ملنا کہتے ہیں۔ اور اسی اصطلاح کے موافق وہ دوسرے عہدہ دار اپنی بیوی سے پوچھتے تھے کہ تجھے نماز پڑھنے سے کیا ملتا ہے ---؟

چونکہ لوگ آج کل دینی ثمرات کو ثمرات ہی نہیں سمجھتے اس لئے ضرورت ہوتی ہے ان ثمرات کو تفصیل سے بیان کرنے کی۔ چنانچہ میں نے اسی واسطے کل کے بیان میں ان کو ذرا تفصیل سے بیان کر دیا تھا ورنہ اصلی مقصود محتاج تفصیل نہ تھا۔ اس کا حاصل تو صرف اتنا ہے کہ ہم دین کو اختیار کر کے خدا تعالےٰ کے محبوب ہو جاویں گے۔ یہ اس آیت کا جزو تھا جس کو مقصود کہنا چاہیے اور اس کا بیان کل ہو چکا۔ اب اس کا ایک دوسرا جزو ہے یعنی طریق کی تفصیل اس کو آج بیان کیا جاوے گا اور ممکن ہے کہ آج کا بیان کل کے برابر مفصل و مطول نہ ہو کیونکہ اس وقت کچھ طبیعت مضمحل ہے مگر ضروری اجزاء انشاء اللہ ضرور بیان ہو جاویں گے اور ایسی تفصیل ہو جاوے گی جس سے کچھ بے خبری دُور ہو جائے۔

یہ تو آپ کو معلوم ہو چکا کہ یہ آیت دو جزو پر مشتمل ہے۔ ایک مقصود، دوسرے طریق مقصود کا بیان وعظ سابق میں ہو چکا۔ اب سمجھئے کہ طریق مقصود کیا ہے۔ وہ دو چیزیں ہیں ـــــ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کیونکہ حق تعالٰے یہی تو فرماتے ہیں کہ جو لوگ ایمان لائیں اور نیک کام کریں ان کے لئے حق تعالٰے محبوبیت پیدا کر دیں گے جس میں محبوبیت کو ایمان وعمل صالح پر مرتب کیا گیا ہے تو مقصود اور نتیجہ تو وہ ہے اور ایمان وعمل صالح اس کے ترتب کی شرط ہے۔ یہی حاصل ہے طریق ہونے کا۔ اس سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ جو محبوب ومقبول بننا چاہے اُس کو پہلے ایمان لانا اور عمل صالح اختیار کرنا چاہیئے۔ اور یہاں سے یہ ثابت ہو گیا کہ جب ایمان وعمل صالح مقبولیت ونجات کا طریق ہے تو بدون اس کے تمام نسبتیں نجات کے لئے ناکافی ہیں مثلاً کسی بزرگ کی اولاد ہونا یا اپنے پاس کسی بزرگ کا تبرک ہونا یہ تنہا نجات کے لئے کافی نہیں۔

تبرکات کا مسئلہ

صاحبو ـــ ہمیں بزرگوں کے تبرکات سے انکار نہیں مگر اُن کی اصل اتنی ہے جیسے ایک مثال سے واضح ہو گا۔ اور مجھے مثال دیتے ہوئے شرم بھی آتی ہے کہ ایک دینی مسئلہ کے لئے دنیا کی مثال دوں مگر کیا کیا جائے کہ آج کل لوگوں کے ذہن میں خدائی معاملات کی اتنی قدر نہیں جتنی دنیوی معاملات کی قدر ہے۔ اس لئے جب کسی خدائی معاملہ کو دنیوی معاملہ سے مطابق کر دیا جاتا ہے تو وہ جلدی لوگوں کے ذہن میں آ جاتا ہے۔ اس لئے میں شرماتا ہوا مثال دیتا ہوں کہ ان تبرکات

کا اتنا اثر ہے۔

جیسے دو شخصوں نے بی اے کا امتحان پاس کیا ہو اور نوکری کی درخواست دی ہو مگر ان میں ایک تو ایسا ہے جس کا خاندان خیر خواہ سرکار ہونے میں مشہور ہے اور دوسرا ایسا نہیں تو ان دونوں میں اوّل ملازمت سے وہ کامیاب ہوگا جس کا خاندان خیر خواہ سرکار ہے اور اگر دونوں ساتھ ہی ملازم ہو جائیں تو اس شخص کو بڑا عہدہ ملے گا اور دوسرے کو اس سے کم۔ غرض معزز خاندان والے کا ضرور لحاظ ہوتا ہے خواہ جلدی کامیاب ہونے میں یا بڑا عہدہ ملنے میں۔ کیونکہ وہ ایسے خاندان کی طرف منسوب ہے جو خیر خواہ سرکار ہے۔ لیکن اگر یہ نرا صاحب انتساب ہی ہو اور کوئی امتحان اُس نے پاس نہ کیا ہو بلکہ خود جاہل اور بدمعاش ہو تو اس صورت میں اُس کو یہ کہنا مفید نہ ہوگا کہ پدرم سلطان بود بلکہ اُس کے جرائم پر دوسروں سے زیادہ قوی مقدمہ قائم ہوگا اور اُس سے کہا جائے گا کہ افسوس تم باوجود حقوق سلطنت سے واقف ہونے کے سلطنت کی مخالفت کرتے ہو تم تو حکومت کے آشنا تھے اور تمہارے تو بچہ بچہ کی زبان پر حکومت کے حقوق و احسانات کا تذکرہ تھا تجھ پر کیا مار آئی جو مخالفت قانون پر پیش قدمی کرنے لگا۔ تو عجب نہیں کہ اس شخص کے جرم پر ایسا سنگین مقدمہ قائم ہو جو ایک جلاہے دھوبی کے جرم پر نہ قائم ہو۔ اور یہ حکومت کی نظر میں زیادہ مبغوض و قابل نفرین قرار پائے۔ چنانچہ واقعات اس پر شاہد ہیں۔

اسی طرح بزرگوں کی طرف انتساب سے یہ نفع ضرور ہوتا ہے کہ یہ شخص اگر ایمان و عمل صالح اختیار کرے تو دوسروں سے جلدی کامیاب

ہوتا یا بڑے درجہ میں پہنچ جاتا ہے۔ لیکن اگر یہ سرکشی سے پیش آوے، تو اس وقت نرا انتساب کافی نہ ہوگا۔

اس وقت مجھے اپنے اُستاد علیہ الرحمۃ کا ایک ارشاد یاد آیا جو ایک حدیث کی شرح میں اُنہوں نے فرمایا تھا۔ اوّل میں حدیث سُناؤں ـــــــ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک منافق تھا عبداللہ بن ابی۔ یہ رئیس المنافقین تھا مگر اس کے لڑکے صحابی اور مومنِ مخلص تھے۔ جب اس منافق کا انتقال ہوا تو اُس کے لڑکے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ! میرے باپ کا انتقال ہو گیا ہے۔ اُس کے کفن کے لئے اپنا کرتہ عطا فرما دیجئے (شاید اس کی برکت سے خدا اُس کی مغفرت فرمائے) حضورؐ نے اپنا کرتہ دے دیا اور تجہیز و تکفین میں بھی شریک ہوئے حتیٰ کہ نماز جنازہ بھی پڑھانا چاہی۔

اس وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جوش آگیا۔ اُنہوں نے حضورؐ کی چادر مبارک پکڑ لی کہ آپ کس کی نماز پڑھنا چاہتے ہیں ایک منافق کی جن کے بارہ میں حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ۔

یعنے چاہے آپ منافقین کے لئے ستّر دفعہ بھی دعا و استغفار فرمائیں خدا تعالیٰ ان کو نہ بخشیں گے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ حق تعالیٰ نے مجھ کو استغفار سے منع نہیں فرمایا اور اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ ستّر دفعہ سے زیادہ استغفار کرنے سے اُن کی مغفرت ہو جائے گی تو میں زیادہ استغفار کر لوں گا۔ یہ

سُن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ خاموش ہو گئے اور حضورؐ نے جنازہ کی نماز پڑھا دی۔

واقعی حضورؐ کی بھی کیا عجیب شفقت و رحمت تھی کہ دشمنوں سے بھی رحمت میں آپ کو دریغ نہ تھا۔ حاجو! ہم بڑے خوش قسمت ہیں کہ ہم کو ایسے رحیم و کریم پیغمبر (صلے اللہ علی سیدی و روحی وسلم) نصیب ہوئے۔ ہمیں تو آپؐ سے بہت کچھ امیدیں ہیں ؎

نماند بعصیاں کسے در گرو
کہ دارد چنیں سیدؐ پیشرو

جب دشمنوں پر بھی آپ کی یہ رحمت ہے تو اپنے غلاموں پر تو کیا کچھ ہو گی ـــــــ۔

غرض آپ نماز پڑھ چکے اور دفن میں بھی شریک ہوئے اور اس منافق کے قبر میں رکھے جانے کے بعد حضورؐ نے اپنا لعاب مبارک بھی اُس کے منہ میں ڈال دیا۔ اس کے بعد آیت نازل ہوئی۔

وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ
اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَمَاتُوْا وَهُمْ فٰسِقُوْنَ

جس میں منافقین پر نماز جنازہ پڑھنے اور ان کے دفن وغیرہ میں شرکت کرنے کی صاف صاف ممانعت ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھے بعد میں بڑی ندامت و شرمندگی ہوئی کہ میں نے حضورؐ کے ساتھ کیسی جرائت کی۔ آپ کو ایک کام سے روکنے لگا (میرا کیا منصب تھا۔ حضورؐ تو سب سے زیادہ ہر ایک بات کو جاننے والے ہیں)

خیر یہ تو واقعہ تھا۔ اس میں بہت گفتگو اور کلام ہے کہ آپؐ نے باوجود لن یغفر اللہ لھم وارد ہو چکنے کے پھر اس منافق کی نماز کیوں پڑھی مگر یہ تو طالب علمانہ مباحث ہیں۔ طالب علم ان کو خود حل کر لیں گے مگر اس میں اس بات کا بتلانا مقصود ہے کہ حضورؐ نے اس منافق کو اپنا کرتہ کیوں پہنایا اور اُس کے منہ میں لعاب دہن مبارک کیوں ڈالا۔

شراح حدیث نے تو یہ لکھا ہے کہ حضورؐ نے اُس کے بیٹے کی خاطر سے جو مخلص مومن تھے یہ سب کچھ کیا (تاکہ اُن کو معلوم ہو جائے کہ حضورؐ کی طرف سے اس کی نجات کی سعی میں کوئی کوتاہی نہیں رہی۔ آپ نے دعا بھی کر دی، نماز بھی پڑھ دی، اپنے تبرکات بھی عطا فرما دیئے۔ اب بھی اگر اس کی مغفرت نہ ہو تو یہ خود اُسی کا قصور ہے) اور بعض نے کہا ہے کہ اس منافق نے جنگ بدر کے موقع پر حضرت عباس رضی اللہ عنہ (عم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کو ایک کرتہ پہنایا تھا۔ آپ نے اُس کی مکافات میں مرنے کے بعد اُسے کرتہ پہنا دیا (بلکہ مع شے زائد)

یہ سب توجیہات شراح نے کی ہیں مگر ان باتوں سے ہم کو شفا نہیں ہوئی۔ ہمیں تو اپنے استاد علیہ الرحمۃ کی بات پسند آئی کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے اس منافق کے ساتھ یہ معاملہ اس لئے فرمایا تاکہ اُمت کو یہ ضروری مسئلہ بتلا دیں کہ اگر کسی میں ایمان نہ ہو تو پھر چاہے اُس کے پاس لاکھ تبرکات ہوں اور چاہے رسولؐ جیسا شخص اُس کے جنازہ کی نماز بھی پڑھ دے اور رسولؐ ہی کا قمیص اُس کا کفن ہو جائے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا لعاب مبارک بھی اُسؐ کے منہ میں پڑ جائے جب بھی نجات نہیں ہو سکتی۔ اس لئے تنہا ان تبرکات کے بھروسہ پر کوئی نہ رہے

چنانچہ عبداللہ بن ابی کے پاس اصل سرمایہ ایمان کا نہ تھا۔ اس لئے اس کے بارہ میں کہا گیا۔

اِنَّ الْمُنَافِقِیْنَ فِی الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ـــــ

کہ منافقین جہنم کے سب سے نیچے کے طبقہ میں ہیں جس کا عذاب سب سے زیادہ سخت ہے۔

نسبت کا اثر

تو اب معلوم ہو گیا کہ بعض لوگوں کا یہ کہنا کہ ہم فلاں بزرگ کی اولاد یا سلسلہ میں ہیں اور ہمارے بزرگوں نے اللہ تعالےٰ سے یہ عہد کر لیا تھا کہ ہماری اولاد میں سے یا اتباع میں سے کوئی دوزخ میں نہ جائے کیا کارآمد ہو سکتا ہے جب تک اپنے پاس کچھ سرمایہ نہ ہو۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر جب یہ آیت نازل ہوئی۔

وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَكَ الْاَقْرَبِیْنَ۔

تو حضورؐ نے اپنے سب خاندان کو جمع کیا اور سب کے ساتھ صاحبزادی صاحبہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو خطاب کر کے فرمایا۔ یَا فَاطِمَۃُ بِنْتُ مُحَمَّدٍ اَنْقِذِیْ نَفْسَكِ مِنَ النَّارِ لَا اُغْنِیْ عَنْكِ مِنَ اللّٰہِ شَیْئًا۔

اور اپنی پھوپی صاحبہ کو خطاب کر کے فرمایا۔ یَا صَفِیَّۃُ عَمَّۃُ رَسُوْلِ اللّٰہِ اَنْقِذِیْ نَفْسَكِ مِنَ النَّارِ لَا اُغْنِیْ عَنْكِ مِنَ اللّٰہِ شَیْئًا۔

اسی طرح سب اعزہ سے فرمایا کہ اپنے آپ کو جہنم سے بچا لو۔ میں تمہارے کام نہ آسکوں گا۔ یعنی اگر نرے میرے بھروسہ پر رہو گے۔ تو اس صورت میں میں کچھ کام نہ آؤں گا۔ ہاں خود بھی کچھ سرمایہ جمع کر لو تو بے شک آپ کام آئیں گے۔

بس یہ درجہ ہے انتساب اور تبرکات کا کہ وہ بدون اپنے عمل کے تنہا کافی نہیں ہوتے۔ باقی اپنے پاس بھی کچھ عمل ہو تو پھر وہ ضرور نافع ہیں۔ ان کی برکت کا انکار نہیں ہو سکتا۔ اگر تبرکات نافع نہ ہوتے تو سلف صالحین اس کا اہتمام نہ کرتے۔ حالانکہ سلف سے اس کا اہتمام منقول ہے۔ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تبرکات دیئے ہیں۔ ایک مرتبہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنا چادرہ مبارک ایک صحابی کو عطا فرمایا اور حج کے موقع پر اپنے بال تقسیم فرمائے۔ اور بعض واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ تبرکات واقعی کام بھی آتے ہیں۔ مگر نرے تبرکات کام نہیں آتے بلکہ اصل سرمایہ کے ساتھ یہ بھی مل جائیں تو نفع بڑھ جاتا ہے۔

اس کی تو ایسی مثال ہے جیسے کھانے کے ساتھ چٹنی اور مربہ کہ اس سے کھانے کا لطف بڑھ جاتا ہے۔ اب اگر کوئی شخص دوستوں کی دعوت کرے اور سارا دستر خوان چٹنی اور مربوں ہی سے بھر دے تو کیا یہ دعوت ہو گی۔ یہ تو مسخرا پن ہو گا۔

اسی طرح جو چیزیں زوائد میں سے ہیں وہ سب ایسی ہی ہیں کہ ان پر حصول مقصود موقوف نہیں ہوتا اور وہ تنہا مقصود سے مغنی نہیں ہوتیں۔ ہاں ضروریات کے ساتھ جمع ہو جائیں تو مفید ہوتی ہیں۔ دیکھو اگر دستر خوان پر چٹنی مربے نہ ہوں تو وہ دعوت ضرور ہے۔ اور اگر چٹنی مربا ہی ہو کھانا نہ ہو تو اسے دعوت نہیں کہہ سکتے اور دونوں جمع ہو جائیں تو اعلیٰ درجہ کی اور لذیذ دعوت ہو گی۔

نفع تبرکات کی صورت

اسی طرح تبرکات نافع ضرور ہیں مگر ان کی نافعیت کے لئے کچھ

شرطیں ہیں (یعنی ایمان وعمل صالح) جیسے گورنمنٹ اپنے وفاداروں کی رعایت کرتی ہے بشرطیکہ وہ بغاوت و اقدامِ جرائم نہ کریں بلکہ تعلیم و تہذیب سے آراستہ ہو کر گورنمنٹ کی اطاعت بھی کریں تو اُن کا خیال دوسروں سے زیادہ کیا جاتا ہے۔ اسی لئے سلف نے بزرگوں کی نیک اولاد کا ہمیشہ احترام کیا ہے۔ اور واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بزرگ بھی اپنی اولاد کا خیال رکھتے ہیں۔

میری ایک رشتہ کی پھوپی تھیں جو بچیوں کو پڑھایا کرتی تھیں۔ ہمارے ہاں یہ رسم ہے کہ لڑکیاں گھروں ہی میں تعلیم پاتی ہیں۔ ان کے لئے کوئی زنانہ اسکول نہیں اور نہ یہ مناسب ہے (اس میں بہت مفاسد ہیں جن کا تجربہ رات دن ہوتا جاتا ہے۔) تو اسی طرح میری پھوپی صاحبہ اپنے گھر پر لڑکیوں کو پڑھاتی تھیں اور کسی سے معاوضہ وغیرہ کچھ نہ لیتی تھیں۔ ایک مرتبہ اُن کے یہاں ایک سیّد کی لڑکی پڑھنے آئی۔ وہ فرماتی تھیں کہ اُسی روز رات کو میں نے حضرت فاطمہ زہرہ رضی اللہ عنہا کو خواب میں دیکھا فرماتی تھیں کہ عمدۃ النساء! دیکھو ذرا میری بچّی کو محبّت سے پڑھانا۔

اسی طرح اور بہت سی بشارتیں اور منامات ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اہل اللہ کو اپنی اولاد کا خیال رہتا ہے۔ اور آخرت میں اس نسبت سے یہ نفع ہوگا کہ حق تعالیٰ بزرگوں کی اولاد کو انہی بزرگوں کے درجوں میں پہنچا دیں گے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَا اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ۔

اس میں افراط وتفریط دونوں کا علاج کردیا گیا۔ فرماتے ہیں کہ جو لوگ ایمان لائے اور اُن کی اولاد ایمان کے ساتھ اُن کی پیروی کرتی رہے یعنے کافر و شریر نہ ہو، تو ہم اُن کو بھی اُن ہی کے ساتھ ملادیں گے۔ یعنے گو عمل میں دونوں برابر نہ ہوں مگر پھر بھی سب کو برابر کردیا جائے گا۔ جیسے کوئی بادشاہ کہیں مہمان بن کر جائے اور اُس کا بیٹا بھی اُس کے ہمراہ ہو تو وہ بھی اُسی جگہ ٹھہرے گا جہاں بادشاہ ٹھہرے گا۔

اب یہاں کسی کو شبہ ہوسکتا تھا کہ شاید اس برابری کی صورت یہ ہو کہ اُوپر کے درجہ والوں کو نیچے کردیا جائے یا کچھ اُن کو گھٹایا جائے اور کچھ ان کو بڑھایا جائے اور اوسط پورا کرکے درمیانی درجہ دے دیا جائے تو اس کا جواب دیتے ہیں وَمَا اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ کہ ہم بلند درجہ والوں کے اعمال میں سے کچھ بھی کم نہ کریں گے۔ بس معلوم ہوگیا کہ برابری کی صورت یہ ہوگی کہ ناقص الاعمال کو کامل الاعمال کے درجہ میں بھیج دیا جائے گا۔ کاملین کے درجات میں کمی نہ کی جائے گی ــــــــ !

اب اس کو سُن کر شاید کسی کو ہوس ہوتی کہ پھر ہم کو عمل کی کیا ضرورت ہے تو آگے ایسا فیصلہ فرمایا ہے جس سے اس خیال کا استیصال ہوگیا فرماتے ہیں۔ كُلُّ امْرِئٍ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ کہ ہر شخص اپنے کئے ہوئے (اعمال) کے ساتھ مقید ہوگا۔ معلوم ہوا کہ عمل کی پھر بھی ضرورت ہے بدُون عمل کے یہ دولت نصیب نہیں ہوسکتی۔

شرفِ نصب کی حیثیت

یہاں سے یہ مسئلہ حل ہوگیا کہ شرفِ نسب نافع ہے یا نہیں۔ اس

وقت اس بارہ میں غلو ہو رہا ہے۔ بعض تو اسی کو اصل قرار دیتے ہیں اور بعض اس کو مٹاتے ہیں کہ یہ کوئی چیز نہیں اور دیکھا یہ گیا ہے کہ جو لوگ ذی نسب نہیں ہیں وہی زیادہ تر اس کو مٹاتے ہیں۔ اور دونوں کا منشاء تکبر ہے۔ جو لوگ نسبت کو اصل قرار دیتے ہیں وہ بھی بڑا بننا چاہتے ہیں کہ ہمارے پاس اتنی بڑی چیز ہے۔ ہم کو بڑا سمجھو اور جو اس کو مٹاتے ہیں وہ بھی بڑا بننا چاہتے ہیں کہ ہم شرفاء سے کسی بات میں کم نہیں ہیں۔ کیونکہ شرافت نسب کوئی چیز نہیں۔ بعض نے تو یہ کیا کہ نسبت ہی کا استیصال کر دیا اور بعض نے یہ کیا کہ اپنے کو کھینچ تان کر شرفاء میں داخل کر دیا۔

میں ایک مقام پر گیا۔ وہاں کی چھوٹی قوموں نے اپنی چار قسمیں کر لیں۔ شیخ، سید، مغل، پٹھان اور اپنے محلہ کا نام بھی بدل دیا۔ میں اس جگہ کا نام نہیں لینا چاہتا۔ جب میں وہاں گیا تو مجھ سے بیان کی درخواست کی گئی تو اتفاقاً میں نے نسب ہی کا بیان کیا (حالانکہ مجھے اس واقعہ کی اطلاع نہ تھی نہ کسی نے مجھ سے کچھ کہا تھا) تو وہ لوگ بہت ناراض ہوئے جنہوں نے اپنے کو شرفاء میں داخل کیا تھا۔ اور کہنے لگے کہ بھلا یہی مضمون بیان کے لیے رہ گئے تھے۔ وہ یہ سمجھے کہ وہاں کے شیخ زادوں نے یہ مضمون فرمائش کر کے بیان کرایا ہے۔ اس لئے وہ شیخ زادوں سے بھی بہت خفا ہوئے (حالانکہ میری یہ بالکل عادت نہیں کہ فرمائشی مضمون بیان کروں۔ بس وقت پر جو بات دل میں آجاتی ہے بیان کر دیتا ہوں)

غرض نسبت کے بارہ میں یہ غلو ہو رہا ہے اور منشاء اس کا محض تکبر ہے۔ جنہیں قدرت ہوتی ہے ان کا تکبر زیادہ ظاہر ہوتا ہے اور

جن کو قدرت نہیں اُن کے بھی برتاؤ سے پتہ چل جاتا ہے کہ یہ اپنے کو بڑا بنانا چاہتے ہیں۔

چنانچہ میں ایک قصبہ میں جس کا نام کاندھلہ ہے گیا ہوا تھا۔ وہاں ایک نائی نے مجھ سے مسئلہ پوچھا کہ جو شخص السلام علیکم کہنے سے چڑھے وہ کیسا ہے۔ یہ سوال اُس نے بھرے مجمع میں کیا تھا جہاں وہ رؤسار بھی موجود تھے جو اس شخص کے زعم میں السلام علیکم سے چڑتے تھے۔ وہ بڑے متفکر ہوئے کہ دیکھئے کیا فتوےٰ لگتا ہے۔ میں نے کہا کہ جو السلام علیکم سے چڑے وہ بہت بُرا۔ اور جو السلام علیکم مساوات اور برابری جتلانے کے لئے تان کر اور لٹھ سا مار دے وہ اس سے بھی بُرا چھوٹا آدمی بڑوں کو سلام کرے تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ چھوٹا بن کر نرمی سے السلام علیکم کہے لٹھ سا نہ مار دے۔ بس اس طرح کہے، جیسے بیٹا باپ کو السلام علیکم کہا کرتا ہے۔ اس سے کوئی نہ چڑے گا نہ کسی کو ناگواری ہوگی۔ تم کہو السلام علیکم ہی مگر اس طرح کہو۔

جب سائل چلا گیا تو سارے رؤسا ہنسنے لگے اور کہا کہ صاحب بس تم نے اس مرض کو سمجھا۔ واقعی یہ جب سلام کرتا ہے لٹھ سا مارتا ہے جیسے کوئی برابری جتلاتا ہو۔ اسی سے ہم کو ناگواری ہوتی ہے۔ ورنہ آدمیت سے سلام کرے تو کون چڑتا ہے۔ غرض شرفاء کو تو متکبر کہا ہی جاتا ہے مگر یہ غریب بھی کچھ کم نہیں ہوتے۔

ایک قصہ اس کے مقابل مجھ کو یاد آگیا کہ ایک نائی کسی کا خط لے کر ایک قصبہ میں گیا۔ وہاں جا کر اُس نے السلام علیکم کہا تو شیخ زادوں نے اُسے خوب پیٹا۔ اُس نے پوچھا کہ حضور پھر کیا کہوں۔ لوگوں نے کہا کہ حضرت

سلامت کہا کرو۔ اس کے بعد نماز جمعہ کا وقت آیا تو جب امام نے السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہا تو اس نائی نے پکار کر کہا۔ حضرت سلامت ورحمۃ اللہ۔ حضرت سلامت ورحمۃ اللہ۔

امام نے اس کو بلا کر پوچھا کہ یہ کیا حرکت ہے۔ اس نے کہا کہ حضرت میرا قصہ سن لیجئے۔ بات یہ ہے کہ میں نے یہاں کے رئیسوں کو السلام علیکم کہہ کر سلام کیا تھا تو انہوں نے مجھے بہت مارا اور یہ کہا کہ حضرت سلامت کہنا چاہیئے۔ مجھے ڈر ہوا کہ اگر کہیں فرشتے بھی السلام علیکم سے خفا ہو گئے تو ان میں ایک فرشتہ ملک الموت بھی ہے۔ وہ تو میری جان ہی نکال لیں گے۔ اس لئے میں نے نماز میں بھی حضرت سلامت ہی کہا۔ اس پر امام صاحب نے وعظ میں ان رئیسوں کی خبر لی کہ یہ کیا واہیات ہے تم لوگوں کو طریق سنت سے منع کرتے ہو۔ سو کچھ لوگ ایسے بھی ہیں۔

ایک اور قصہ یاد آیا۔ کانپور میں ایک دفعہ میرے پاس دیہات کے ایک قاضی صاحب تشریف لائے اور السلام علیکم کہہ کر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر میں کہنے لگے کہ کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا فرمایئے۔ کہنے لگے کہ اس عملداری میں شرفاء اور غرباء میں بالکل مساوات ہو گئی البتہ صرف ایک فرق السلام علیکم کا رہ گیا تھا، ہمارے مولویوں نے یہ بھی اٹھا دیا سب کے لئے وہی السلام علیکم۔ میں نے کہا، قاضی صاحب شرفاء اور غرباء میں جو فرق ہے تو یہ دینی امور میں ہے یا دنیوی امور میں۔ اگر دینی امور میں ہے تو جا کر اپنے شہر میں غرباء سے کہہ دیجئے کہ ظہر و عصر و عشاء کی تین رکعت پڑھا کرو (اور مغرب کی دو اور صبح کی ایک) اور اگر وہ نہ مانیں

تو تم چار کی پانچ اور تین کی چار اور دو کی تین پڑھا کر دو تا کہ برابری نہ ہو جاوے۔ وہ بہت ہی چپ ہوئے۔

پھر میں نے کہا کہ اب بتلایئے کہ السلام علیکم دین کا کام ہے یا دنیا کا۔ ظاہر ہے کہ دین کا کام ہے۔ پھر اس میں امیر و غریب کا فرق کیوں ہو باقی دنیوی امور میں فرق کرنے سے ہم منع نہیں کرتے۔ یہی فرق بہت ہے کہ تم سرہانے بیٹھتے ہو اور غرباء پائینتی پر بیٹھتے ہیں (اگر کوئی غریب آدمی امیر کے برابر سرہانے پر چڑھ کر بیٹھے گا تو ہم اس کو ضرور منع کریں گے) ـــــــ ا

غرض نسبت کے باب میں جانبین سے یہ غلو ہو رہا ہے کہ بعض نے اسی کو اصل قرار دے لیا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ یہ بالکل کوئی چیز نہیں۔ اس لئے میں اس کا فیصلہ کرتا ہوں جو اسی آیت کے مضمون سے اور اسی مقام سے مستنبط ہوتا ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ اس وقت جو لوگ شریف ہیں اور اپنے کو صدیقی یا فاروقی یا سیّد کہتے ہیں تو وہ بتلائیں کہ اُن کے اسلاف میں شرف کہاں سے آیا۔ ظاہر ہے کہ یہ حضرات منتسب الیہم چونکہ دین میں کامل تھے اس لئے ان کی طرف انتساب سبب شرف ہو گیا۔ تو اصل وجہ شرف دین و ایمان ٹھہرا۔ یہی سبب ہے ہمارے اسلاف کے شرف کا اور اسی وجہ سے اُن کی طرف انتساب بھی سبب شرف ہو گیا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اس کے ساتھ وہ حضرات عالی خاندان بھی تھے مگر تنہا یہی سبب شرف نہیں (کیونکہ عالی خاندان تو ابو جہل و ابو لہب بھی تھے مگر ان کی طرف انتساب کسی کو بھی گوارا نہیں) بلکہ اس کے ساتھ چونکہ ان حضرات کا کمالِ دین بھی مل گیا ہے اس لئے انتساب میں شرف آگیا۔ تو

یہ بالکل بے اصل چیز نہیں ہے بلکہ شریعت نے اس شرف کا اعتبار کیا ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

چنانچہ دنیا میں تو اس طرح اعتبار کیا گیا ہے کہ حدیث میں حکم ہے کہ نکاح اکفاء میں کیا کرو۔ اور شریعت نے کسی شریف زادی کا کفو غیر شریف کو نہیں مانا۔ اور آخرت میں بھی اتنا نفع ہے کہ جو شخص ان شرفاء کی اولاد میں ہو گا۔ وہ اگر ایمان و عمل صالح کو اختیار کرے تو اس کو دوسروں سے کچھ زیادہ ملے گا اور جنت میں وہ اپنے اسلاف کے درجہ میں ہو گا گو اعمال اس درجہ کے نہ ہوں۔ لیکن یہ نفع کچھ عرفی شرفاء ہی کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ اگر کوئی جولاہا بھی ولی ہو تو اس کے بیٹے کو بھی وہی نفع حاصل ہو گا جو ان شرفاء کے بیٹوں کو ہو گا۔ غرض شرافت میں آخرت کا بھی نفع ہے۔ مگر اصطلاحی شریف کے ساتھ خاص نہیں بلکہ جو بھی مقبول عند اللہ ہو گا اس کی طرف انتساب نافع ہو گا۔

پس یہ کہنا غلط ہے کہ شرفِ نسب نافع نہیں۔ نافع ضرور ہے مگر وہ شرف انتسابی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ جو شریف عند اللہ ہو۔ اس کی طرف انتساب نافع ہے خواہ وہ تمہاری اصطلاح کے موافق شریف ہوں یا نہ ہوں۔ پس آخرت میں تو شریف اور غیر شریف میں اس طرح تفاوت ہو گا باقی دنیا میں تو تفاوت ہے ہی کہ غیر شریف کو شریف زادی کا کفو نہیں مانا گیا (نیز عقل و فہم، تہذیب و اخلاق وغیرہ میں بھی شریف و غیر شریف کا تفاوت ظاہر ہو جاتا ہے)

مگر اس کا یہ اثر نہ ہونا چاہیے کہ تم دوسروں کو ذلیل سمجھو۔ بس ایسا تفاوت سمجھنا چاہیے جیسے چھوٹے بھائی اور بڑے بھائی یا باپ اور

بیٹے میں اور حاکم و محکوم میں ہوا کرتا ہے۔ اس تفاوت کا یہ اثر نہیں ہوا کرتا کہ بڑا بھائی چھوٹے کو یا باپ بیٹے کو حقیر سمجھنے لگے۔ یہ فیصلہ ہوا اس اختلاف کا۔

یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ اصل میں میں یہ ذکر کر رہا تھا کہ نرا انتساب کافی نہیں بلکہ اس کے ساتھ ایمان و عمل صالح بھی ضروری ہے۔ چنانچہ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّیَّتُهُمْ بِاِیْمَانٍ سے یہ مضمون صاف طور سے نکل آیا۔ پس اب کسی کو اس پر قناعت نہ کرنا چاہیے کہ ہم بزرگوں کی اولاد یا سلسلہ میں ہیں یا ہمارے پاس ان کے تبرکات ہیں بلکہ ایمان و عمل کا اہتمام کرنا چاہیے۔ اس کے ساتھ اس انتساب کی برکت بھی کام دے گی ورنہ بیکار ہے۔

یہی مضمون اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَیَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا۔ سے بھی مستفاد ہوتا ہے کیونکہ اس میں مقبولیت کا مدار ایمان و عمل صالح ہی کو ٹھہرایا گیا ہے۔ معلوم ہوا کہ ان کے سوا اور کوئی شے مدار کار نہیں بلکہ زوائد کی قبیل سے ہیں۔ بہر حال مقصود مقام یہ ہے کہ اس آیت کے اوّل جزو میں طریق حصول مقصود مذکور ہے۔ اور اس کی فہرست بتلائی گئی ہے جس کے دو جزو ہیں۔ ایک ایمان، ایک عمل صالح اور اس وقت میں اسی طریق کی تفصیل کرنا چاہتا ہوں سو ایمان کی تفصیل کے لئے تو باب العقائد دیکھنے کی ضرورت ہے۔ اگر میں تمام عقائد کی تفصیل کروں تو اس کے لئے ایک جلسہ ناکافی ہے اس لئے میں اس وقت پوری تفصیل تو ذکر کرنا نہیں چاہتا صرف اقسام اولیہ ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ جن میں آج کل لوگوں نے غلطی کر رکھی ہے۔

عقائد کی غلطیاں

تو سمجھئے کہ آج کل لوگوں کو عقائد کے باب میں دو قسم کی غلطیاں واقع ہو رہی ہیں۔ ایک تو وہ لوگ ہیں جو عقائد کو ضروری سمجھتے ہیں مگر ضرورت کو اسی میں منحصر کرتے ہیں یعنی اعمال کی ضرورت نہیں سمجھتے چنانچہ عام طور سے یہ عقیدہ ہے کہ مَنْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ کہ جو توحید و رسالت کا قائل ہو اور لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا معتقد ہو بس وہ جنتی ہے۔ اب اُسے کسی عمل کی ضرورت نہیں۔

پھر بعض نے اور انتخاب کیا ہے کہ ایمان کا بھی اختصار کر لیا کیونکہ ایمان کی حقیقت تو یہ ہے اَلتَّصْدِیْقُ بِمَا جَاءَ بِهِ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یعنے حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے جو جو خبریں دی ہیں کہ اللہ واحد ہے۔ قیامت آنے والی ہے۔ وزن حق ہے۔ حساب کتاب حق ہے دوزخ جنت حق ہے۔ تقدیر کا مسئلہ حق ہے۔ فرشتوں کا وجود حق ہے۔ پلصراط پر چلنا حق ہے۔ نماز کی فرضیت حق ہے۔ زکوٰۃ اور روزہ و حج سب کی فرضیت حق ہے۔ کیونکہ یہ طاعات گو اعمال ہیں مگر ان کی فرضیت کا اقرار کرنا ایمان میں داخل ہے یعنی ایک تو نماز کا پڑھنا ہے اور روزہ رکھنا، زکوٰۃ دینا، حج کرنا یہ تو عمل ہے اور ایک ان کی فرضیت کا اعتقاد رکھنا یہ ایمان کا جزو ہے۔ بدون اس اعتقاد فرضیت کے ایمان کا تحقق نہیں ہو سکتا۔

تو ایمان نام تھا ان سب چیزوں کی تصدیق کا مگر آج کل لوگوں نے اس میں بھی انتخاب کر لیا ہے۔ بعضے وزن اعمال کی تصدیق کو ضروری نہیں سمجھتے۔ بعضے صراط کی تصدیق کو ایمان میں داخل نہیں سمجھتے۔ کوئی تقدیر

کے مسئلہ کا انکار کرنا ہے وعلیٰ ہذا ۔ اور پھر بھی وہ اپنے کو مسلمان سمجھتے ہیں ـــــ ،

تھوڑے دنوں پہلے یہ حالت تھی کہ ان عقائد میں کسی کو اختلاف نہ تھا گو فروع میں اختلاف تھا کیونکہ اختلاف کی دو قسمیں ہیں ۔ ایک تو ایسے امور میں اختلاف جن میں اختلاف کی گنجائش ہے ۔ یہ تو فروع ظنیہ میں ہوتا ہے جیسا کہ مجتہدین میں اختلاف ہوا ہے یا ان کے بعد ان کے اتباع میں ہوا ہے ۔ یہ تو سب اعمال کے درجہ میں اختلاف ہے عقائد میں کسی کو اختلاف نہ تھا ۔ اور اگر عقائد میں بھی کسی نے اختلاف کیا ہے تو وہ عقائد مہمہ مقصودہ میں نہ تھا بلکہ عقائد مہمہ کی فروع میں تھا ۔ مگر کچھ دنوں سے ایک ایسا اختلاف پیدا ہوا ہے جس کے ذکر کرنے کو بھی جی نہیں چاہتا یعنے اب ان امور میں بھی اختلاف ہونے لگا ہے جن میں کچھ دن پہلے کسی کو شبہ بھی نہ تھا ۔ مگر اس وقت اس نئی تعلیم کی بدولت بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ علم دین نہ ہونے یا دین سے محبت اور علماء کی صحبت نہ ہونے کی بدولت عقائد مہمہ میں بھی اختلاف ہونے لگا ہے ۔

خرابی کی وجہ

ہمارے بزرگوں میں گو علم دین تو عام طور پر کامل نہ ہوتا تھا ۔ عالم دو چار، دس پانچ ہی ہوتے تھے مگر یہ دو چیزیں ان کے پاس بڑی کام کی تھیں یعنے دین کی محبت اور علماء کی صحبت ۔ مگر اس وقت ہمارے بھائیوں نے علم دین کو تو چھوڑا ہی تھا ساتھ میں ان دونوں کو بھی چھوڑ دیا اور یہی وجہ ہے ہماری خرابیوں کی ۔ کیونکہ جو شخص طبیب کے پاس نہ جائے گا اس کو صحت نہیں ہو سکتی ۔ اور طبیب کے پاس وہ جائے گا جس کو صحت مطلوب

ہو۔ تو آج کل ہمارے بھائیوں کو دراصل دین ہی سے محبت نہیں۔ اسی لیئے اطبادِ دین کے پاس بھی نہیں جاتے۔ اسی لیئے اُن کے ایمان و دین کو قسم قسم کے روگ لگ جاتے ہیں جن کی اُن کو خبر بھی نہیں ہوتی اور سب سے بڑی بیماری یہ ہے کہ بیمار کو بیماری کی اطلاع بھی نہ ہو اور اس سے سخت یہ ہے کہ وہ تندرستوں کو بیمار سمجھنے لگے۔ جیسے ایک نکٹا ناک والوں کو ناکو کہتا تھا یہی حالت ہمارے بھائیوں کی ہے کہ وہ پرانے لوگوں کو جو ایمان میں کامل ہیں، تندرست تو کیا سمجھتے اُن کے لئے ایسے ایسے لقب تجویز کرتے ہیں کہ وہ اپنے جواب ہی کی فکر میں پڑ جاویں۔ عجیب الٹا زمانہ آگیا ہے۔

صاحبو! پرانے لوگوں میں بھی گنہگار تو ہیں فاسق بھی ہیں مگر اُن کی حالت یہ ہے کہ اہل علم کے سامنے جھک جاتے ہیں۔ اگر اُن کو عذاب آخرت سے ڈرایا جائے تو ڈر جاتے ہیں۔ وہ اپنے کو اہل الرائے نہیں سمجھتے۔ اسی لیئے اُن کا ایمان سلامت ہے۔ باقی جہاں نئی تعلیم ہے اور نری تعلیم ہی تعلیم ہے وہاں تو ایمان کی خیر صلاّ ہے۔ نہ ان میں دین کی محبت ہے نہ اہل دین کی عظمت ہے۔ ہر شخص اپنے کو صاحب رائے سمجھتا ہے اور علماء سے مسائل دینیہ میں مزاحمت کرتا ہے باقی جہاں نئی تعلیم کے ساتھ یہ دونوں دولتیں بھی ہوں یعنے دین کی محبت اور اہل اللہ کی صحبت، تو وہاں اس سے دین کا کچھ ضرر نہیں ہوتا بلکہ وہاں دنیا کے ساتھ دین بھی جمع ہو جاتا ہے۔ اسی محبت و علم دین کی نسبت کہتے ہیں ؎

دریں زمانہ رفیقے کہ خالی از خلل است

صراحیٔ مے ناب و سفینۂ غزل است

صراحی سے ناب سے محبت مراد ہے یہ اُن کی خاص اصطلاح ہے اور سفینہ غزل سے علم دین مراد ہے۔ جس کا ایک طریق تو تعلم ہے۔ اگر یہ میّسر نہ ہو تو صحبت اہل اللہ ہے۔ اگر یہ بھی نہ ہو تو دین کی کتابوں کا مطالعہ ہے۔ مگر کتاب کے لئے بھی صحبت کی ضرورت ہے۔ نری کتب بینی سے دین کا صحیح علم حاصل نہیں ہو سکتا جب تک کسی عالم سے سبقاً سبقاً نہ پڑھا جاوے خواہ وہ کتاب اردو زبان ہی میں کیوں نہ ہو۔ جیسے اردو میں طب کی کتابیں دیکھ کر کوئی شخص طبیب نہیں بن سکتا جب تک کسی طبیب کے پاس رہ کر نہ پڑھے۔

پھر اس زمانہ میں تو لوگ کتابیں بھی ایسی مختلف دیکھتے ہیں کہ خدا کی پناہ۔ بس جو کتاب سامنے آئی دیکھنے لگے جانے اس کا مصنف محقق ہو یا غیر محقق۔ پھر مختلف لوگوں کی کتابیں دیکھ کر خود ہی فیصلہ بھی کرتے ہیں کہ فلاں شخص نے اس مسئلہ کو دوسرے سے اچھا لکھا ہے اور غضب یہ کہ اپنے فیصلہ کو معتبر بھی سمجھتے ہیں۔ بھلا اگر کوئی ایسا شخص جو قانون گورنمنٹ سے ناواقف ہو کر کسی مقدمہ کا فیصلہ کرنے لگے تو کیا اس کا فیصلہ معتبر ہو گا؟ ہرگز نہیں۔ پھر حیرت ہے کہ جو شخص خدا کے قانون سے ناواقف ہے اس کے فیصلہ کو معتبر مانا جائے۔ اگر ایسا ہے تو پھر وکلا اور بیرسٹروں کی کیا حاجت ہے بس ہر شخص قانون کو دیکھ کر فیصلہ کر لیا کرے۔ مگر یہاں سب اس پر متفق ہیں کہ قانون سلطنت کا سمجھنا ہر ایک کا کام نہیں بلکہ جس نے اس کو باقاعدہ پڑھا ہو اور اس میں امتحان دے کر پاس ہو گیا ہو، اسی کی رائے معتبر ہے۔ مگر حیرت ہے کہ قانون الٰہی کے سمجھنے کے لئے کسی امتحان اور پاس کی ضرورت نہیں بلکہ ہر شخص اس میں رائے زنی کرنے

کے لئے تیار ہے اور دو چار اردو کی کتابیں دیکھ کر فیصلہ کرنے کو آمادہ ہے اور فیصلہ بھی کیسے صحیح اصول پر مبنی کہ جو سمجھ میں نہیں آیا اس کی نفی کردی۔ بس ہمارے بھائیوں نے یہی ایک سبق یاد کر لیا ہے جیسے ایک استاد نے اپنے ایک بے وقوف شاگرد کو سکھلا دیا تھا کہ جو مسئلہ تجھ سے پوچھا جاوے اگر معلوم ہو تو بتلا دیا اور جو معلوم نہ ہو تو یہ کہہ دیا کہ اس میں اختلاف ہے (اس سے جہالت کا عیب چھپا رہے گا۔ لوگ سمجھیں گے کہ ان کو معلوم تو ہے مگر اختلاف کی وجہ سے ایک شق کو معین نہیں کرتے اور مختلف فیہ مسائل بکثرت ہیں۔ اس لئے اکثر مواقع میں یہ جواب صحیح ہوگا۔ مگر وہ بے وقوف تو تھا ہی اس نے بعض متفق علیہ مسائل میں بھی کہہ دیا کہ اس میں اختلاف ہے بالآخر اس کی حماقت ظاہر ہو کر رہی)

خودرائی کا مرض

اسی طرح ہمارے بھائیوں نے ایک سبق پڑھ لیا ہے کہ جو بات ان کی سمجھ میں نہ آئی کہہ دیا کہ یہ عقل کے خلاف ہے اس لئے قابل قبول نہیں۔ اور لگے نصوص میں تحریف و تاویل کرنے۔ چنانچہ ان کے نزدیک صراط بھی خلافِ عقل ہے اور ساری معادیات اور معجزات خلاف عقل ہیں۔ تو اس طرح انہوں نے عقائد میں بھی اختصار و انتخاب کرنا شروع کیا (اب ایمان کے معنے وہ نہ رہے جو پہلے تھے یعنے تصدیق بما جاء بہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم بلکہ یہ معنے ہوگئے کہ تَصْدِیْقُ بِمَا وَافَقَ الْعَقْلَ مِمَّا جَاءَ بِہٖ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یعنی ان کے نزدیک ایمان کہتے ہیں اس چیز کے ماننے کو جو حضورؐ کی بیان کردہ باتوں میں سے ان کی عقل کے

مطابق ہو)

میں کہتا ہوں کہ یہاں دو مقدمے ہیں۔ ایک یہ کہ جو بات شریعت میں عقل کے خلاف ہے تو وہ کس کی عقل کے خلاف ہے۔ تمہاری عقل کے یا سب عقلاء کی عقل کے۔ دوسری شق تو مسلّم نہیں کیونکہ علماء راسخین جن کی عقل کے سامنے اہل دنیا کی عقل کچھ حقیقت نہیں رکھتی۔ اُن کو خلافِ عقل نہیں کہتے اور ہر زمانہ میں ان مسائل کو اسی صورت پر تسلیم کرتے چلے آئے ہیں۔ جس صورت سے شریعت میں تعلیم دی گئی ہے۔ چنانچہ حضرات صحابہ و تابعین و علماء و صلحاء اُمت سب ان کا اعتقاد ظاہر کے مطابق رکھتے آئے ہیں۔ اگر یہ کہو کہ تمہاری عقل کے خلاف ہے تو اس صورت میں صغریٰ تو مسلّم مگر یہ کبریٰ مسلّم نہیں کہ جو تمہاری عقل کے خلاف ہو وہ غلط اور ناقابلِ قبول ہے۔ کیونکہ قوانین سلطنت میں بہت سی باتیں تمہاری عقل میں نہیں آتیں مگر تم قانون دانوں کی عقل پر اعتماد کر کے اُن کو تسلیم کرتے ہو۔

اس کو بھی جانے دو۔ میں تمہیں سے پوچھتا ہوں کہ ماں کے پیٹ سے تم جس طرح پیدا ہوئے ہو کیا یہ تمہاری عقل میں آتا ہے۔ واللہ! ہم کو اس پر حیرت اس لئے نہیں ہوتی کہ رات دن اس کا مشاہدہ ہو رہا ہے اگر اس کا مشاہدہ نہ ہوتا اور صرف بیان سے یہ طریقہ معلوم ہوتا تو ہرگز عقل میں نہ آتا۔

اس کا امتحان اس طرح ہو سکتا ہے کہ تم ایک نوزائیدہ بچہ کی اس طرح نگرانی کرو کہ وہ یہ بات سننے یا دیکھنے نہ پائے کہ بچہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا کرتا ہے۔ اس کے بعد آپ اُس کو فلسفہ اور سائنس اور طب سب کچھ پڑھا دیں مگر یہ مسئلہ نہ پڑھائیں جس میں طریقِ ولادت کا ذکر ہو

پھر جب وہ بی اے اور ایم اے اور ایل ایل بی ہو جائے اس وقت اس سے کہو کہ خبر بھی ہے تو کیوں کر پیدا ہوا تھا۔ اور اس سے بیان کرو کہ اول تیرا باپ تیری ماں کے پاس گیا تھا جس سے منی کے کچھ قطرے تیری ماں کے پیٹ کے اندر جو رحم ہے اس میں گرے تھے پھر رحم کے اندر اس کی پرورش ہوئی کہ خون بنا اور خون سے علقہ پھر مضغہ بنا۔ پھر گوشت میں ہڈیاں بنیں۔ پھر جسم کامل تیار ہو گیا تو اس میں روح پڑی جس کی پرورش عرصہ تک خونِ رحم سے ہوتی رہی۔ پھر نو ماہ کے بعد تو شرم گاہِ مادر سے نکلا۔ اور اب وہی خونِ رحم دودھ کی شکل میں ماں کے پستان میں آگیا جس سے دو برس تک پرورش پاتا رہا الیٰ آخرہ ـــــ تو میں سچ کہتا ہوں کہ واللہ العظیم وہ نہایت سختی سے آپ کی مخالفت کرے گا اور کہے گا کہ ایک قطرہ سے ایسے حسین جسم کا بننا، پھر اس کا شرم گاہ سے جو نہایت تنگ راستہ ہے نکل آنا عقل کے بالکل خلاف ہے۔

اب بتلائیے کہ اگر یہ قاعدہ مان لیا جائے کہ جو بات جس کی عقل میں نہ آئے وہ غلط ہوا کرے تو پھر آپ کا ماں کے پیٹ سے پیدا ہونا بھی غلط ہے ـــــ بات یہ ہے کہ آپ خلافِ عادت کو خلافِ عقل کہتے ہیں۔ جیسے وہ نوزائیدہ بچہ جس کی ایسی نگرانی کی گئی ہو جس کا اوپر ذکر ہوا ماں کے پیٹ سے پیدا ہونے کو خلافِ عقل کہے گا کیونکہ اس نے یہ بات کبھی دیکھی یا سُنی نہ تھی۔ اور آپ اس کو خلافِ عقل اس لئے نہیں کہتے کہ آپ کو اس کی عادت ہو گئی۔ ورنہ آپ بھی وہی کہتے جو وہ کہتا ہے اور ظاہر ہے کہ خلافِ عقل کا وقوع نہیں ہو سکتا۔ تو معلوم ہوا کہ

آپ خلافِ عقل ایسی باتوں کو بھی کہتے ہیں جن کا وقوع مشاہد ہو جائے تو وہ خلافِ عقل نہ رہیں۔

خلافِ عادت اور خلافِ عقل کا فرق

معلوم ہوا کہ آپ دراصل خلافِ عادت کو خلافِ عقل کہہ رہے ہیں اور کسی بات کو صحیح ہونے کے لئے خلافِ عادت ہونا مضر نہیں اور نہ یہ غلط ہونے کی دلیل ہے۔ ورنہ پھر اس لڑکے کے قول کو بھی مان لینا چاہئے جو ماں کے پیٹ سے انسان کے پیدا ہونے کو غلط کہتا تھا اور نیز بہت سی باتوں کو جنہیں آپ چار دن پہلے مستبعد اور محال سمجھتے تھے اور آج ان کا مشاہدہ ہو رہا ہے غلط کہنا چاہئے (جیسے ریل کا ایک گھنٹہ میں ساٹھ میل طے کرنا اور پانچ منٹ میں لندن سے تار کے ذریعہ سے خبر آجانا وغیرہ وغیرہ)

اس کے علاوہ دنیا میں بہت سے امور عادت کے خلاف ہوتے رہتے ہیں۔ میں نے ایک مرغی کا بچہ دیکھا ہے جس کے چار پیر تھے (اور آج کل دہلی میں دو لڑکیاں جڑی ہوئی نمائش میں آئی تھیں جن کے تمام اعضا جدا جدا تھے مگر کمر جڑی ہوئی تھی اور پیشاب گاہ الگ الگ تھی مگر پیشاب نکلتا ایک کے رستہ سے تھا۔) تو بتلائیے کیا خلاف عادت کے لئے بھی کوئی ضابطہ ہو سکتا ہے جس کے اوپر بنا کر کے بعض امور کو مانا جائے۔ کسی بات کے متعلق یہ کہا جائے کہ چونکہ یہ خلافِ عادت ہے اس لئے ہم نہیں مانتے۔ صاحب آپ کا عدم سے وجود میں آنا ہی عادت کے خلاف ہے کیونکہ عادت کا مقتضا تو یہ ہے کہ ہر شے اپنی اصلی حالت پر رہے جو معدوم ہے معدوم رہے اور

جو موجود ہے وہ کبھی فنا نہ ہو مگر رات دن اس کے خلاف مشاہدہ ہو رہا ہے۔ ہزارہا معدوم وجود میں آتے اور لاکھوں موجود معدوم ہو جاتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ کسی بات کا خلاف عادت ہونا اس کے غلط ہونے کو مستلزم نہیں۔

اب دوسرا مقدمہ یہ سمجھ لیجئے کہ آپ خلاف عادت کو خلاف عقل کہتے ہیں اور ان دونوں میں فرق نہیں کرتے حالانکہ یہ بڑی سخت غلطی ہے۔ سنیئے میں اس کا فرق بتلاتا ہوں۔ خلافِ عادت تو وہ ہے جو عقلاً ممکن ہو مگر مشاہدہ نہ ہونے کی وجہ سے دشوار و مستبعد معلوم ہوتا ہو (اور خلاف عقل وہ ہے جو عقلاً ناممکن ہے یعنے عقل اس کے استحالہ پر دلیل قائم کر سکے۔ اور استحالہ کہتے ہیں اجتماع نقیضین کو۔ تو خلافِ عقل وہ ہے جس کے ماننے سے نقیضین کا ایک محل میں ایک آن میں ایک جہت سے مجتمع ہونا لازم آجائے)

اب جو لوگ معادیات کو اور صراط و وزن اعمال وغیرہ کو خلاف عقل کہتے ہیں وہ مہربانی کر کے ان کے استحالہ پر دلیل عقلی قائم کریں (اور بتلائیں کہ ان کے ماننے سے اجتماع نقیضین کیوں کر لازم آتا ہے) یقیناً وہ ہرگز کوئی دلیل عقلی ان کے استحالہ پر نہیں قائم کر سکتے۔ بس بہت سے بہت یہی کہیں گے کہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیونکر ہو جائے گا۔ اس کی نظیر دکھلاؤ۔ بس آج کل تمام شبہات کا حاصل یہ ہے کہ اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی اس لئے یہ محال ہے اور جو دعوئ امکان کا کرتا ہے وہ اس کی نظیر دکھلائے۔ عجب اندھیر ہے کہ نظیر پر ثبوت شے کو موقوف بتلایا جاتا ہے اور جس چیز کی نظیر نہ

ملے اس کو خلافِ عقل اور محال کہا جاتا ہے۔ لوگوں کو ثبوت کی حقیقت ہی معلوم نہیں نظیر پر ثبوت کو موقوف سمجھتے ہیں (میں کہتا ہوں کہ جو صنائع اور عجائبات اس زمانہ میں ایجاد یا مشاہد ہوئی ہیں کیا اس زمانہ سے پہلے کسی کے پاس ان کی نظیر تھی اور اگر نہ تھی تو کیا اس وقت یہ خلافِ عقل اور محال تھیں۔ اور اگر محال تھیں تو پھر آج ان کا وقوع کیوں کر ہوا معلوم ہوا کہ کسی شے کا امکان نظیر کے ملنے پر موقوف نہیں) تو خوب سمجھئے کہ کسی دعوے کا ثبوت نظیر کے ملنے پر موقوف نہیں بلکہ نظیر تو محض توضیح اور تنویر کے لیئے ہوا کرتی ہے۔ مدعی ثبوت کے ذمہ نظیر کا پیش کرنا ہرگز لازم نہیں۔ خصوصاً ایسے مدعی کے ذمہ جو کسی امر کے ثبوت کا دعوے یہ کہہ کر کرتا ہو کہ یہ امر خلاف عادت بطور معجزہ کے واقع ہوا یا قیامت میں خلافِ عادت یوں ہوگا۔ اس کے ذمہ تو کسی قاعدہ سے بھی نظیر کا پیش کرنا لازم نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ تو اپنے دعوے میں تصریح کر رہا ہے کہ مدعی بے نظیری کی صفت کے ساتھ متصف ہے (اگر نظیر کا پیش کرنا مدعی کے ذمہ کسی درجہ میں لازم بھی ہو سکتا ہے تو صرف اس مدعی کے ذمہ ہو سکتا ہے جو اپنے دعویٰ کو موافق عادت بتلائے اور جو خرق عادت کا مدعی ہو اس سے نظیر کا مطالبہ کرنا عجیب ہے)

ثبوت کی حقیقت

اب میں آپ کو ثبوت کی حقیقت بتلاتا ہوں جس کے نہ جاننے کی وجہ سے لوگوں کا مذاق ایسا بگڑ گیا ہے کہ آج علماء سے معراج کی نظیر کا سوال ہوتا ہے۔ شق القمر کی نظیر کا مطالبہ ہوتا ہے۔ تو سنئے یہ

عقلی مسئلہ ہے کہ کسی خبر کا صحیح ہونا یا کسی امر کا واقع ہونا نظیر پر ہرگز موقوف نہیں۔ چنانچہ جن کو عقلیات سے کچھ بھی مس ہے وہ اس کو مانتے ہیں۔ مدعی اگر نظیر بیان کر دے تو یہ اُس کا تبرع ہے بلکہ ثبوت خبر کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ ایک مخبر بہ کا ممکن ہونا، دوسرے مخبر کا صادق ہونا۔ پس ہمارے ذمہ تمام معجزات اور معادیات کے متعلق دو باتوں کا ثابت کرنا ہے۔ ایک یہ کہ وہ فی نفسہٖ ممکن ہوں، دوسرے مخبر صادق نے اُن کے وقوع کی خبر دی ہو۔ ان دو باتوں کے ثابت کرنے کے بعد کسی کو انکار کا حق نہ ہوگا۔

اب ہم معراج وغیرہ اور صراط و وزن اعمال وغیرہ کے ثبوت پر دلیل قائم کرتے ہیں کہ یہ معجزات اور معادیات فی نفسہ ممکن ہیں۔ یہ تو دلیل کا پہلا مقدمہ ہے۔ اگر کسی کو اس مقدمہ میں کلام ہو تو اُس پر لازم ہے کہ ان کے امتناع پر دلیل قائم کرے اور ہم کو امکان پر دلیل قائم کرنے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ امکان کی کوئی علت نہیں ہوتی بلکہ امتناع پر دلیل نہ ہونا ہی امکان کی دلیل ہے (اور اوپر معلوم ہو چکا کہ امتناع کہتے ہیں اجتماع نقیضین کو محل واحد میں آن واحد میں جہت واحدہ سے، تو جس کو ان امور کے امکان میں کلام ہو وہ ثابت کرے کہ ان میں اجتماع نقیضین کس طرح لازم آتا ہے)

دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ جس امر ممکن کے وقوع کی کوئی مخبر صادق خبر دے وہ ثابت ہے (اور ان معجزات و معادیات کے وقوع کی خبر مخبر صادق نے دی ہے) پس یہ امور واقع و ثابت ہیں۔ اب ان مقدمات میں اگر کوئی کلام کرے تو اس کا جواب ہمارے ذمہ ہے باقی نظیر کا

پیش کرنا ہمارے ذمہ نہیں۔

مثلاً اگر کوئی کہے پلصراط پر چلنا عقل کے خلاف ہے سمجھ میں نہیں آتا، تو میں کہوں گا کہ بتلاؤ کیوں سمجھ میں نہیں آتا۔ اس میں کیا استحالہ ہے کہ ایک باریک چیز پر پیرا آجائے جب یہ محال نہیں اور مخبر صادق اس کے وقوع کی خبر دے رہا ہے تو پھر انکار کی کیا وجہ۔ اگر کوئی انکار کرے تو اُس کا یہ حق تو ہے کہ امکان کو رد کرے اور امتناع کو ثابت کرے یا دوسرے مقدمہ میں کلام کرے کہ یہ مخبر صادق کی خبر نہیں تو ہم دلیل امتناع سننے کے لئے تیار ہیں۔ اور کلام اللہ کو کلام اللہ ثابت کرنا بھی ہمارے ذمہ ہے۔ اور جب یہ دونوں باتیں ثابت ہو جائیں پھر ہم نظیر پیش کرنے کے ذمہ دار نہیں۔ اور اگر نظیر ہم کو معلوم بھی ہو تب بھی نہ بتلائیں گے کیونکہ یہ ہمارے ذمہ نہیں ہے کہ ہم سب معاملات آپ کو بتلا دیا کریں۔ ہاں اگر تم یہ ثابت کر دو کہ مستدل کے ذمہ نظیر کا پیش کرنا ضروری ہے تو جب ثابت کر دو گے اس وقت دیکھا جائے گا۔ بدون اس کے ہم زوائد کے ساتھ جواب نہ دیں گے یہ عوام کو زیادہ تر جواب دینے والوں ہی نے خراب کیا ہے کہ وہ ہر بات میں تبرعاً نظیریں بیان کرنے لگے۔ عوام سمجھے کہ یہ بھی مجیب کے ذمہ ہے تو میں اس کا فیصلہ کرتا ہوں کہ مستدل کے ذمہ یہ ہرگز نہیں اور جو دعویٰ لزوم کا کرے وہ دلیل قائم کرے۔ یہ ہے دلیل مطرد جو تمام معجزات و معادیات میں برابر چل سکتی ہے اور جو دلیلیں آج کل بیان کی جاتی ہیں جن میں زیادہ تر نظیر سے جواب دیا جاتا ہے وہ مطرد نہیں ہیں۔

اب میں عقلاً یہ ثابت کرتا ہوں کہ کسی واقعہ کا ثبوت نظیر پر موقوف نہیں۔ تقریر اس کی یہ ہے کہ یہ ظاہر ہے کہ نظیر بھی ایک واقعہ ہے میں پوچھتا ہوں کہ اس کے لئے بھی نظیر کی ضرورت ہے یا نہیں ہے وعلیٰ ہذا۔ اگر ہر نظیر کے لئے نظیر کی ضرورت رہی تو مستحیل مسلسل لازم آئے گا۔ اور نظیر سے ایک دعوئے بھی ثابت نہ ہو سکے گا اور اگر کہیں جاکر ٹھہروگے کہ اس نظیر کے لئے کسی نظیر کی ضرورت نہیں تو معلوم ہوا کہ کسی واقعہ کا ثبوت بدون نظیر کے بھی ہو گیا تو پھر پہلے ہی کے لئے نظیر کی کیوں ضرورت ہے اور جس طرح تم نے اخیر میں ایک واقعہ کو بلانظیر مان لیا تو پہلے ہی کو بلا نظیر کیوں نہیں مان لیتے۔

غرض کسی دلیل سے مستدل کے ذمہ نظیر کا بیان کرنا نہیں ہے ہاں اگر بیان کر دے تو یہ اس کی شفقت ہے۔ اور اس کا موقع اس وقت ہے جب کہ سائل دلیل کے مقدمات پر کلام کرنے سے عاجز ہو جاوے اور تسلیم کرلے کہ واقعی دلیل سے یہ دعوئے ثابت ہو گیا اور مجھے اب انکار کا کوئی حق نہیں۔ اس وقت اگر مجیب تقریب فہم کے لئے کوئی نظیر دے دے تو اس کا احسان ہے (اور اگر وہ نظیر پر ثبوت دعوی کو موقوف بتلا رہا ہے تو مستدل نظیر ہرگز نہ بتلائے بلکہ اس سے اس توقف علی النظیر کی دلیل مانگے)

چنانچہ اس وقت میں ثبوت پلصراط پر دلیل قائم کرکے اس کی ایک نظیر تبرعاً بتلاتا ہوں۔

پل صراط کی حقیقت

اول پلصراط کی حقیقت سمجھئے مگر یہ کہے دیتا ہوں کہ یہ مضمون ظنی

ہے۔ اس طور پر پلصراط کو سمجھنا واجب نہیں۔ اصل تو یہی ہے کہ آدمی عملاً پختہ عقیدہ رکھے باقی بعض طبائع ضعیف ہوتی ہیں۔ ان کے لئے میں یہ مضمون بیان کرتا ہوں۔ اگر وہ اس طرح بھی پلصراط کو سمجھ لیں تو کچھ حرج نہیں مگر لازم بھی نہیں۔ لازم تو وہی اجمالاً مان لینا ہے۔

اس تنبیہ کے بعد کہتا ہوں کہ اوّل اس کی حقیقت سمجھو جس کے لئے اوّل یہ مقدمہ سنو کہ اس عالم کے سوا ایک عالم اور بھی ہے (مسلمان تو اس کا انکار نہیں کر سکتے اور مخالفین اگر انکار کریں تو ہمارے پاس ان کے جواب کے لئے وہی دلیل مطرد ہے جو اوپر مذکور ہوئی کہ دوسرے عالم کا ہونا ممکن ہے۔ کسی کو امکان پر کلام ہو تو دلیل امتناع قائم کرے اور جس ممکن کی خبر مخبر صادق نے دی ہو وہ ثابت ہے۔ پس دوسرا عالم ثابت ہے اور مخبر کے صادق ہونے کو ہم دلائل سے ثابت کر سکتے ہیں)

دوسرا مقدمہ یہ سنئے کہ عالم کے اختلاف سے بعض احکام اور حالات بدل جاتے ہیں (اس کی بھی دلیل تو وہی ہے جو مذکور ہوئی اور تقریب فہم کے لئے ایک نظیر بھی بتلاتا ہوں) جیسے اقالیم کے بدلنے سے بھی دنیا ہی میں حالات بدل جاتے ہیں (مثلاً یہاں اس وقت رات ہے اور ایک اقلیم میں اس وقت دن ہے۔ یہاں آج کل گرمی ہے اور کسی اقلیم میں اس وقت سردی ہے وعلیٰ ہذا) یہاں ۲۴ گھنٹے کا دن ہے اور بعض اقالیم میں چھ مہینے کا دن اور چھ مہینے کی رات ہے اور یہیں سے معلوم ہوا ہوگا کہ قرآن میں جو آیا ہے کہ عالمِ آخرت کا ایک دن ہزار برس کے برابر ہے اور اس پر بعض لوگ ہنستے ہیں تو یہ ان کی حماقت

ہے۔ اس میں استبعاد کیا ہے۔ جب عالم دنیا ہی میں اقلیم کے بدلنے سے یہ بات مشاہد ہے کہ بعض جگہ چھ ماہ کا دن ہوتا ہے تو اختلاف عالم کے بعد عالم آخرت میں اگر ہزار برس کے برابر ایک دن ہو تو کیا تعجب ہے۔

تیسرا مقدمہ یہ ہے کہ اختلاف کی کوئی حد نہیں ہے نہ یہ منضبط ہو سکتا ہے (یہ مقدمہ بدیہی ہے محتاج دلیل نہیں اور جو شخص کسی حد پر انتہاء اختلاف کا دعوے کرے اور اس سے آگے اختلاف ہونے کو ممتنع کہے وہ اس پر دلیل قائم کرے)

چوتھا مقدمہ یہ ہے کہ ممکن ہے جو چیز یہاں عرض ہو اس عالم میں جاکر جوہر ہو جائے (اس کا ممکن ہونا بھی ظاہر ہے۔ یہ تو مسلم ہے کہ ایک آن اور ایک محل میں شئے واحد عرض و جوہر نہیں ہو سکتی۔ مگر یہ ہو سکتا ہے کہ ایک شئے یہاں عرض ہو اور دوسری جگہ جوہر ہو جائے اس کے امتناع پر کوئی دلیل قائم نہیں ہو سکتی اگر کسی کے پاس دلیل ہو پیش کرے) اور استیناس کے طور پر اس کو یوں سمجھئے کہ اس زمانہ میں بعض آلات کے ذریعہ سے حرارت و برودت وغیرہ کا وزن ہوتا ہے حالانکہ پہلے حکماء ان کو مقولہ کیف سے سمجھتے تھے جس کے لئے وزن و مقدار نہیں ہو سکتی مگر اس زمانہ میں ان کے لئے وزن ہونا ثابت ہو گیا۔

اسی لئے میں تو کہا کرتا ہوں کہ جتنی یہ نئی نئی ایجادات ہیں سب معادیات کے سمجھنے کے لئے معین و ممد ہیں۔ چنانچہ گراموفون ہاتھ پیر کے بولنے پر بڑی دلیل ہے کیونکہ گراموفون میں نہ روح بھی نہیں اور

کلام کرتا ہے تو اعضاء انسانی کے بولنے میں کیا تعجب ہے جن میں حیات کا تلبس ہے۔

اسی طرح ایک حدیث میں ہے جو نسائی میں موجود ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے صلوٰۃ کسوف کے موقع پر فرمایا کہ میں نے مسجد کی دیوار کے قریب جنّت و دوزخ کو دیکھا۔ بعض لوگ اس پر ہنستے ہیں کہ جنّت و دوزخ تو آسمان زمین سے بھی بڑی بتلائی جاتی ہیں، حضورؐ نے ان کو دیوار پر کیوں کر دیکھ لیا اور اصلی حالت پر کیسے دیکھ لیا۔ مگر خدا تعالیٰ نے فوٹو اور خوردبین کو ایجاد کرا کے اس استبعاد کو دور کر دیا۔ فوٹو میں بڑی سے بڑی شے کو چھوٹا کر کے دکھایا جا سکتا ہے اور خوردبین سے چھوٹی سے چھوٹی چیز پہاڑ بنا کر دکھائی جا سکتی ہے تو کیا خدا تعالیٰ کو یہ قدرت نہیں کہ اس نے جنّت و دوزخ کا فوٹو مسجد کی دیوار پر اتار دیا ہو اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی شعاع میں خوردبین کی قوت رکھ دی ہو جس سے فوٹو کی چھوٹی چیزیں آپ کو اصلی حالت پر نظر آ گئی ہوں اور حدیث میں یہی لفظ وارد ہے مثلت لی الجنة والنار۔ یہ نہیں فرمایا کہ جنت و دوزخ زمین میں آئی تھیں بلکہ آپ نے فرمایا کہ وہ میرے لئے ممثل ہو گئیں۔

اسی لئے جب کوئی نئی ایجاد ہوتی ہے تو میں خوش ہوتا ہوں۔ کیونکہ ان سے شرعیات کا استبعاد دور ہوتا جاتا ہے۔ چنانچہ ایک عجیب بات اس زمانہ میں یہ ہے کہ آج کل حرارت و برودت کا بھی وزن ہونے لگا۔ کہ اس مکان میں کس وزن کی حرارت ہے اور کس درجہ کی برودت ہے (اور بخار میں تھرمامیٹر سے مریض کی حرارت

کا وزن کیا جاتا ہے، اب اگر کسی گنوار سے کہئے کہ گرمی بھی تلتی ہے تو اُس کو کتنا تعجب ہوگا۔ تو جب دنیا ہی میں بعض اعراض کا وزن ہونے لگا جس کی حقیقت ہے مابہ الوزن کے انخفاض وارتفاع سے مقدار کا معلوم ہو جانا جو کہ سرسری نظر میں خواص جوہر سے ہے تو اگر دوسرے عالم میں جا کر وہ جوہر ہی بن جاوے تو کیا تعجب ہے۔

اور لیجئے ـــــ اگر ایک برتن میں ٹھنڈا پانی بھر کر وزن کرو تو اور وزن ہوگا اور اسی میں گرم پانی بھر کر وزن کرو تو اور وزن ہوگا۔ آخر کمی بیشی کیوں ہے۔ پانی کی مقدار تو دونوں حالتوں میں یکساں تھی۔ معلوم ہوا کہ برودت وحرارت کا بھی کچھ وزن ہے۔ اب خواہ اُس کو یوں تعبیر کر لیجئے کہ وزن پانی ہی کا ہے مگر بشرط برودت وحرارت کے مگر آخر ان کو وزن میں دخل تو ہوا۔ تو اُس عالم میں اگر یہی دخل درجہ موزونیت میں اس طرح ہو جاوے کہ یہ عرض جوہر بن جاوے تو کیا تعجب ہے۔

اور سنیئے ـــــ اطباء کہتے ہیں کہ جس شخص میں صفراء کا غلبہ زیادہ ہو وہ خواب میں آگ بہت دیکھتا ہے۔ دیکھئے جو چیز یہاں عرض تھی یعنی حرارت صفراوی وہ عالم خیال میں آگ بن گئی جو کہ جوہر ہے پس اس عالم میں عرض کا جوہر بن جانا کچھ بعید نہیں۔

اب پلصراط کی حقیقت سمجھئے گو اُس کے بیان کی ضرورت نہیں کیونکہ مسلمان کا مذاق تو یہ ہونا چاہئے ؎

حدیث مطرب و مے گو وراز دہر کمتر جو
کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معمارا

اور میں کہہ چکا ہوں کہ میرے ذمہ اس کا بیان کرنا لازم نہیں۔

میرے ذمہ تو وہی تھا جو میں بیان کر چکا ہوں مگر اس میں حظ نہ آیا تھا اس لئے تبرعاً بیان کرتا ہوں کہ خیر جس طرح بھی کام چلے اچھا ہے، تو سنیئے پلصراط کی حقیقت شریعت ہے دکما قال اصحاب الکشف من العرفاء) پس دنیا میں پلصراط کی نظیر شریعت موجود ہے۔ اتنا فرق ہے کہ یہاں یہ عرض ہے اور وہاں جاکر جوہر بن جائے گی۔ باقی اور تمام صفات میں یہ اس کی نظیر ہے جیسے وہ بال سے باریک اور تلوار سے تیز ہے جس پر چلنا دشوار ہے۔

طریق شریعت

اسی طرح طریق شریعت نہایت باریک اور نازک ہے جس پر استقامت سے چل لینا ہر اک کا کام نہیں۔ کیونکہ شریعت مقدسہ مرکب ہے علم وعمل سے۔ تو اس پر چلنے کے لئے دو قوتوں کی ضرورت ہے۔ ایک قوت علمیہ کی دوسرے قوتِ عملیہ کی۔ قوت علمیہ کا تعلق عقل سے ہے اور قوت عملیہ کا ارادہ سے۔ پھر عمل بعض مفید ہیں اور بعض مضر۔ تو اس میں کہیں تو جلب منفعت کی ضرورت ہے اور کہیں دفع مضرت کی اور جو ارادہ جلب منفعت سے متعلق ہو، اس کو قوتِ شہویہ کہتے ہیں اور جو دفع مضرت کے متعلق ہو اس کو قوتِ غضبیہ کہتے ہیں۔ تو شریعت پر چلنے کے لئے تین قوتوں کی ضرورت ہوئی۔

۱۔ قوتِ عقلیہ ۲۔ قوتِ شہویہ ۳۔ قوت غضبیہ

یہی اصولِ اخلاق کہلاتے ہیں۔ پھر ان میں سے ہر ایک کے تین درجے ہیں —— افراط۔ تفریط۔ توسط۔ اور شریعت نام ہے توسط کا۔ شریعت میں افراطِ عقل سے بھی کام نہیں چلتا نہ تفریط سے کام چلتا

ہے بلکہ توسط کی ضرورت ہے جس کا نام حکمت ہے۔ اور قوتِ عقلیہ کے افراط کا نام جزبزہ ہے۔ یہ نہایت مضر ہے۔ جب عقل بہت بڑھ جاتی ہے تو ہر چیز میں احتمالاتِ عقلیہ پیدا ہونے لگتے ہیں جس سے آدمی وہمی ہو جاتا ہے۔

جیسے اہل فلسفہ میں ایک فرقہ لاادریہ مشہور ہے وہ کسی حقیقت کا وجود تسلیم نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ بہت دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ ہم ایک چیز کو دُور سے دیکھ کر آدمی سمجھتے ہیں اور وہ گدھا نکلتا ہے۔ بہت لوگ ایک شخص کو حسین سمجھتے ہیں اور بہت سے اُس کو بدصورت سمجھتے ہیں۔ بعض لوگ ایک چیز کو میٹھا بتلاتے ہیں اور بخار والا اُسے کڑوی بتلاتا ہے۔ اسی طرح مسائل عقلیہ میں کوئی ایک دلیل کو صحیح کہتا ہے کوئی غلط تو جب ہمارے حواس ظاہرہ اور باطنہ میں اتنا خلاف ہے اور کبھی ان سے غلطی بھی ہو جاتی ہے تو یہ کیا اطمینان ہے کہ جس کو ہم نے آدمی سمجھا ہے وہ آدمی ہی ہے گدھا نہیں۔ اور جس کو ہم زمین کہتے ہیں، وہ زمین ہی ہے آسمان نہیں۔ ممکن ہے ہماری نظر نے غلطی کی ہو اور جس بات کو ہم حق سمجھتے ہیں ممکن ہے وہاں ہماری فہم نے غلطی کی ہو۔ بس اب ان کا حال یہ ہو گیا کہ ہر بات میں ان کو شک ہے اور شک میں بھی شک ہے فھو شاك وشاك فی انه شاك۔

عقل کی حد

تو حضرت یہ عقل جب بڑھتی ہے تو اتنا پریشان کرتی ہے کہ زندگی تباہ کر دیتی ہے۔ اور یہی وجہ ہے بہت سے عقلاء کے تباہ ہونے کی کہ انہوں نے عقل سے وہ کام لیا جو اس کی حد سے آگے تھا

اور ہر چیز کا اپنی حد سے نکل جانا مضر ہے۔

میں تو عقل کے متعلق ایک مثال دیا کرتا ہوں کہ یہ ایسی ہے جیسے گھوڑا پہاڑ پر چڑھنے والے کے لئے۔ اب تین قسم کے لوگ ہیں۔ ایک تو وہ جو گھوڑے پر سوار ہو کر پہاڑ تک پہنچے اور پھر پہاڑ پر بھی اسی پر سوار ہو کر چڑھنے لگے۔ یہ غلطی پر ہیں۔ ضرور کسی سیدھی چڑھائی پر سوار اور گھوڑا دونوں گریں گے۔ اور ایک وہ ہیں جو یہ سمجھ کر کہ گھوڑا پہاڑ پر تو کام دیتا ہی نہیں تو اس سے صاف سڑک پر بھی کام لینے کی کیا ضرورت ہے وہ گھر ہی سے پیدل چل پڑے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پہاڑ پر پہنچ کر تھک گئے۔ یہ بھی نہ چڑھ سکے۔ تو ان دونوں کی رائے غلط تھی۔ پہلی جماعت نے گھوڑے کو ایسا باکار سمجھا کہ اخیر تک اسی سے راستہ طے کرنا چاہا اور دوسرے نے ایسا بیکار سمجھا کہ پہاڑ تک بھی اس سے کام نہ لیا۔ صحیح بات تو یہ ہے کہ گھوڑا پہاڑ تک تو کار آمد ہے اور پہاڑ پر چڑھنے کے لئے بیکار۔ اس کے لئے کسی اور سواری کی ضرورت ہے۔

یہی حال عقل کا ہے کہ عقل سے بالکل کام نہ لینا بھی حماقت ہے اور اخیر تک کام لینا بھی غلطی ہے۔ بس عقل سے اتنا کام تو لو کہ توحید و رسالت کو سمجھو اور کلام اللہ کا کلام اللہ ہونا معلوم کر لو۔ اس سے آگے فروع میں عقل سے کام نہ لینا چاہیئے بلکہ اب خدا و رسول کے آگے گردن جھکا دینی چاہیئے۔ چاہے ان کی حکمت عقل میں آوے یا نہ آوے۔

دیکھیئے قانون سلطنت کے منوانے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک

کہ پہلے یہ سمجھا دیا جائے کہ جارج پنجم بادشاہ ہیں۔ اس کے بعد تمام احکام کے متعلق یہ کہہ دیا جائے کہ یہ بادشاہ کے احکام ہیں اس لئے ماننا پڑیں گے۔ تو یہ صورت آسان ہے اور تمام عقلاء ایسا ہی کرتے ہیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ایک شخص جارج پنجم کو بادشاہ مان کر پھر بھی ہر قانون میں الجھنے لگے کہ میں اس دفعہ کو نہیں مانتا تو بتلایئے اس شخص کا کیا حال ہو گا۔ ظاہر ہے کہ ہر جگہ ذلیل ہو گا اور عقلاء کہیں گے کہ جب بادشاہ کا بادشاہ ہونا مسلم اور اس قانون کا قانونِ سلطنت ہونا معلوم تو پھر انکار کی کیا وجہ؟ ضرور ماننا پڑے گا چاہے سمجھ میں آئے یا نہ آئے ——!

معلوم ہوا کہ صاحبِ سلطنت کے پہچاننے کے لئے تو عقل سے کام لینے کی اجازت ہے۔ اس کے بعد عقل سے کام لینے کی اجازت نہیں۔ پھر کیا وجہ کہ آپ دین کے معاملہ میں اخیر تک عقل سے کام لینا چاہتے ہیں یہ سخت غلطی ہے جس سے بجز ذلت کے اور کچھ حاصل نہ ہو گا۔ جب خدا کا ہونا مسلم تو رسول کا رسول ہونا مسلم، کلام اللہ کا کلام اللہ ہونا معلوم، پھر ہر حکم میں الجھنے کا آپ کو کیا حق ہے اور ہر شخص آپ کو بے وقوف بنائے گا اور تمام عقلاء کی نظروں میں آپ ذلیل ہوں گے۔ سچ یہ ہے ؎

عزیزیکہ از درگہش سر بتافت
بہر در کہ شد ہیچ عزت نیافت

غرض عقل سے اُس وقت تک کام لو جب تک وہ کام دے سکے اور جہاں اس کا کام نہیں وہاں اس کو چھوڑ دو اور حکم کا اتباع کرو۔ تو عقل

کی بھی ایک حد ہوئی۔ اور کیوں نہ ہو وہ بھی تو ایک قوت ہے جیسے آنکھ کی ایک قوت ہے اور اس کی ایک حد ہے۔ اس سے آگے دُور بین لگانے کی ضرورت ہے ایسے ہی شریعت کے معاملہ میں اصول تک تو عقل کام دیتی ہے اور فروع میں یہ تنہا بیکار ہے دُوربین وحی سے کام لینا ضروری ہے۔ ایسے ہی کان کی ایک قوت ہے جس کے لیئے ایک حد ہے کہ اس سے آگے ٹیلیفون سے مدد لینے کی ضرورت ہے۔ پیروں کی ایک قوت ہے جس سے آگے سواری سے مدد لینے کی ضرورت ہے تو جب ہر قوت محدود ہے تو عقل کیسے محدود نہ ہو گی۔ ضرور ہو گی۔ اس سے آگے وحی سے کام لو ورنہ یاد رکھو کہ عمر بھر رستہ نہ ملے گا۔ کیونکہ سمعیات میں عقل کا کام نہیں وہاں تو اتباع رسُول کی ضرورت ہے اور

خلاف پیمبر کسے رہ گزید
کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید

تقلید کی ضرورت

صاحبو دنیا میں بھی تو آپ بہت جگہ عقل کو چھوڑ کر کسی نہ کسی کا اتباع کرتے ہیں۔ جب آپ بیمار ہوتے ہیں تو عقل سے اتنا کام تو لیتے ہیں کہ اطبا موجودین میں سے کون زیادہ حاذق و تجربہ کار ہے۔ اور جب ایک طبیب کا حاذق ہونا معلوم ہو گیا تو پھر آپ اس کے پاس جاتے ہیں اور وہ نبض دیکھ کر نسخہ تجویز کرتا ہے۔ پھر آپ اس سے یہ نہیں پوچھتے کہ اس نسخہ میں فلاں دوا کیوں لکھی اور فلاں کیوں نہیں لکھی۔ اور اس دوا کا وزن چار ماشہ کیوں لکھا چھ ماشہ کیوں نہ لکھا۔ ہم نے کسی کو طبیب سے ان باتوں میں الجھتا ہوا نہیں دیکھا اور

اگر کوئی اس سے الجھنے لگے تو سب عقلاء اس کو بے وقوف بناتے ہیں اور طبیب بھی صاف کہہ دیتا ہے کہ اگر تم میرے پاس مجھ کو طبیب سمجھ کر آئے ہو تو جو نسخہ میں تجویز کر دوں اس میں تم کو چون وچرا کا کوئی حق نہیں۔ اور اگر چون وچرا کرتے ہو تو اس کے معنے یہ ہیں کہ تم مجھ کو طبیب نہیں سمجھتے۔ پھر میرے پاس کیوں آئے تھے اور اس کے اس جواب کو تمام عقلاء صحیح کہتے ہیں۔

پھر حیرت ہے کہ رسول کو رسول تسلیم کرنے اور کلام اللہ کو کلام اللہ مان لینے کے بعد عقل کو اُن کے تابع نہ کیا جاوے اور بات بات میں اُلجھا جائے کہ یہ تو خلافِ عقل ہے ہم اسے کیوں کر مان لیں صاحب اگر تم نے رسول کو رسول مان لیا ہے تو پھر ہر بات کو بلا چون وچرا ماننا پڑے گا اور یہ کہنے کا حق نہ ہو گا کہ ہماری عقل میں یہ بات نہیں آتی۔ ورنہ اس کے معنے یہ ہیں کہ تم نے اب تک رسول کو رسول ہی نہیں سمجھا اور کلام اللہ کو کلام اللہ ہی نہیں مانا۔ افسوس! دنیا کے کاموں میں تو عقل کی ایک حد ہو اور طبیب کو طبیب مان لینے کے بعد اس کی تجویز میں عقل کو دخل نہ دیا جاوے اور امورِ آخرت میں اس کی کوئی بھی حد نہ ہو۔

صاحبو۔۔۔ جب دنیا کے کام بدون اس کے نہیں چل سکتے کہ عقل کو ایک حد پر چھوڑ دیا جائے اور بلا چون وچرا دوسرے کا اتباع کیا جائے تو آخرت کا کام بدون اس کے کیوں کر چلے گا۔ کیونکہ دنیا کی چیزیں تو دیکھی ہوئی بھی ہیں ان میں کسی قدر عقل چل سکتی ہے پھر بھی اس کو چھوڑ کر کاملین وماہرین کی تقلید کی جاتی ہے اور آخرت سے

تو ہم سب اندھے ہیں وہاں بدون تقلید وحی کے کیسے کام چلے گا۔ اور اگر اس میں عقل سے کام لیا گیا تو وہی مثال ہو گی جیسے ایک اندھے نے کہا تھا کہ یہ تو بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔

شان ورود اس کا یہ ہے کہ ایک لڑکا اپنے اندھے حافظ کے لیئے گھر سے کھیر کی دعوت کرنے آیا۔ حافظ جی نے پوچھا کہ کھیر کیسی ہوتی ہے۔ کہا سفید ہوتی ہے۔ حافظ جی نے سفید سیاہ میں کیوں فرق کیا تھا۔ اُن کے نزدیک تو نہ کوئی چیز سفید تھی نہ سیاہ۔ کیوں کہ آنکھیں ہی نہ تھیں۔ تو آپ پوچھتے ہیں کہ سفید کیسا ہوتا ہے۔ اس نے کہا جیسے بگلا۔ حافظ جی نے پوچھا کہ بگلا کیسے ہوتا ہے۔ لڑکے نے ہاتھ کو اس طرح (ک) موڑ کر کہا کہ ایسا ہوتا ہے۔ حافظ جی نے جو اپنا ہاتھ پھیر کر اس شکل سے تصور کیا تو کہنے لگے بھائی یہ تو بڑی ٹیڑھی کھیر ہے میرے گلے سے کیوں کر اُترے گی۔

تو دیکھیئے جو چیز آنکھ سے دیکھی نہ ہو اس میں عقل سے کام لینے کا یہ نتیجہ ہوا کہ معمولی سی کھیر کا کیا سے کیا بن گیا جس میں چبانے اور نگلنے کی بھی مشقت نہ تھی اب وہ گلے میں پھنسنے لگی۔ تو واقعی اندھے کو کوئی کیوں کر سمجھائے کہ سفید رنگ کیسا ہوتا ہے۔ اگر حافظ جی ساری عمر بھی اسی سبق میں رہیں تب بھی نہیں سمجھ سکتے۔ بس اس کا طریقہ تو یہ ہے کہ کسی نہیر خواہ سوانکھے کی تقلید کر لی جائے۔

اسی طرح اگر تم کسی ولایتی کو جس نے آم کبھی نہ کھایا ہو، آم کا مزہ سمجھانا چاہو تو کیا وہ سمجھ جائے گا۔۔۔ ہرگز نہیں۔ تم کہو گے کہ آم میٹھا ہوتا ہے وہ کہے گا کہ ہم تو روز گڑ کھاتے ہیں بس آم ایسا ہی

ہونا ہوگا۔ صاحب اس کو سمجھانے کا طریقہ یہ ہے کہ ایک آم لاکر اُسے کھلا دو اور اگر یہ نہیں تو پھر اُس کو تقلیداً مان لینا چاہیے اور اپنی عقل سے اس کی نظیریں نہ نکالنا چاہئیں۔

اسی طرح امورِ آخرت کو اگر پوری طرح سمجھنے کا شوق ہے تو اس کی صورت یہ ہے کہ موت کے منتظر رہو۔ مرنے کے بعد صراط اور وزنِ اعمال وغیرہ سب کی حقیقت سامنے آ جائے گی۔ اور اگر دنیا ہی میں سمجھنا ہے تو اس کے سوا چارہ نہیں کہ قرآن و رسول ؐ نے جو کہہ دیا ہے ان کی تقلید کرو۔ اور ان کی نظیریں دریافت کرنے کے درپے نہ ہو۔ ورنہ تم آخرت کی حقیقت ایسی ہی سمجھو گے جیسے حافظ جی نے کھیر کو ٹیڑھا بتلایا تھا ——— پس خوب سمجھ لو کہ عقل کی ایک حد ہے جس سے بڑھ جانا مضر ہے۔

نتیجہ افراط و تفریط

اطباء نے بھی تو اس کو مضر لکھا ہے اور امراض میں سے شمار کیا ہے کیونکہ افراطِ عقل کا نتیجہ اوہام و شکوک میں ابتلاء ہے جس سے قلب و دماغ دونوں ضعیف ہو جاتے ہیں۔

فارابی کی حکایت ہے کہ ایک شخص حلوا بیچتا پھرتا تھا اس سے پوچھا کیف تبیع الحلواء۔ تو حلوا کس طرح بیچتا ہے؟ اس نے جواب دیا کذا بدانق کہ ایک دانگ میں اتنا دیتا ہوں۔ تو آپ کہتے ہیں اسئلک عن الکیفیۃ وتجیبنی عن الکمیۃ میں تو کیفیت سے سوال کرتا ہوں اور تو کمیت سے جواب دیتا ہے۔ آپ حلوائی سے الجھ گئے۔

اس کو عقل کا ہیضہ کہتے ہیں کہ ہر وقت اسی کے چکر میں رہے چنانچہ

افراطِ عقل ہی کا یہ نتیجہ تھا کہ فلاسفہ نے انبیاء علیہم السلام کا مقابلہ کیا اور جب عاجز ہوگئے تو ان کی نبوت کا تو اقرار کیا مگر کہنے لگے کہ یہ جاہلوں کے واسطے نبی ہیں ہم کو نبی کی ضرورت نہیں نحن قوم قد هذبنا نفوسنا بالحکمة۔ ہم نے تو اپنے کو حکمت سے مہذب بنا لیا ہے۔ حق تعالیٰ ایسے ہی لوگوں کے حق میں فرماتے ہیں۔

فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَ هُمْ مِنَ الْعِلْمِ۔

یہ لوگ اپنے علم پر نازاں ہو گئے اور یہ نہ سمجھے کہ علوم نبوت عقل سے باہر ہیں۔ چنانچہ الٰہیات میں فلاسفہ نے جو تحقیقات بیان کی ہیں ان میں اتنی ٹھوکریں کھائی ہیں کہ آج مسلمان کا ایک ادنیٰ طالب علم بھی ان پر ہنستا ہے —— یہ تو افراط فی العقل ہے۔ اور ایک ہے تفریط کا درجہ یعنی عقل کی کمی، اس کو حماقت کہتے ہیں۔ شریعت میں یہ دونوں درجے بیکار اور مذموم ہیں۔

رُوحِ شریعت

بلکہ مطلوب توسط ہے جس کو حکمت کہتے ہیں۔ دوسری قوتِ شہویہ ہے۔ اس میں بھی تین درجے ہیں۔ ایک افراط جس کا نام فجور ہے شریعت میں یہ بھی مطلوب نہیں۔ کیونکہ اس کا انجام فسق ہے اور ایک تفریط ہے کہ آدمی نامرد بن جائے کہ ضروری انتفاعات سے بھی محروم ہو۔ یہ بھی مطلوب نہیں (کیونکہ اس سے ہمت اور حوصلہ پست ہو جاتا ہے اور اولوالعزمی اور اخلاق عالیہ مفقود ہو جاتا ہے جو بڑا نقص ہے) اور ایک ہے توسط جس کا نام عفت ہے یہ مطلوب ہے۔

تیسری چیز قوت غضبیہ ہے۔ اس میں بھی تین درجے ہیں۔ ایک افراط

جس کو تہور کہتے ہیں کہ موقع بے موقع کچھ نہ دیکھے اندھا دھند جوش دکھلانے لگے جیسا آج کل ہو رہا ہے کہ جس طرف چلتے ہیں جوش میں اندھے بن کر چلتے ہیں۔ یہ بھی نہیں دیکھتے کہ اس جوش سے نفع ہو گا یا نقصان۔ یہ بھی شریعت میں مطلوب نہیں۔ اور ایک ہے تفریط جس کو جبن اور بزدلی کہتے ہیں کہ موقع اور ضرورت کے وقت بھی ہمت سے کام نہ لیا جائے جیسے بعض لوگ ایسے ڈرپوک ہوتے ہیں کہ حکام کے سامنے ادب اور تہذیب سے بھی اپنی حاجات ظاہر نہیں کر سکتے۔ یہ بھی مطلوب نہیں۔ اور ایک درجہ توسط کا ہے جس کا نام شجاعت ہے یہ مطلوب ہے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ ضرورت اور موقع پر جوش ظاہر کیا جائے جہاں نفع کا ظن غالب ہو۔ اور بے موقع جوش سے کام نہ لیا جائے جہاں نفع کی کچھ امید نہیں محض نقصان ہی نقصان ہے۔

غرض اخلاق پسندیدہ کے اصول تین ہیں:-

۱۔ حکمت ۲۔ عفت ۳۔ شجاعت

اور ان کے مجموعہ کا نام عدل ہے اور یہی شریعت کا حاصل ہے۔ اور قرآن میں جو فرمایا ہے وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا۔ اس سے بھی عدل مراد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے (ایک ایسی شریعت دے کر جو کہ سراپا عدل ہے) امت وسط یعنی امت عادلہ بنایا۔

ایک مقدمہ اور لیجئے کہ وسط دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک وسطِ حقیقی ایک وسطِ عرفی۔ وسطِ حقیقی وہ خط ہے جو بالکل بیچوں بیچ ہو۔ وہ قابل تقسیم نہیں ہوتا۔ اور ایک وسطِ عرفی ہے جیسے کہا کرتے ہیں کہ یہ ستون مکان کا وسط ہے تو وہ وسط حقیقی نہیں کیونکہ وہ تو منقسم ہے اس

کے اندر بھی ایک جزو دائیں اور ایک بائیں اور ایک بیچ میں نکل سکتا ہے پھر وہ وسطِ حقیقی کہاں سے ہوا۔ حقیقی وسط تو وہ ہے جس میں دایاں بایاں کچھ نہ نکل سکے۔ سو ایسا وسط ہمیشہ غیر منقسم ہوگا۔ پس سمجھ لو کہ شریعت اس وسط کا نام ہے جس میں افراط تفریط کا ذرا بھی نام نہ ہو بلکہ عین توسط ہو۔ یہی وسطِ حقیقی روحِ شریعت ہے اور یہی کمال ہے اور اوپر معلوم ہو چکا کہ وسطِ حقیقی ہمیشہ غیر منقسم ہوتا ہے تو شریعت کی روح بھی غیر منقسم ہے۔ چنانچہ جن اصول اخلاق کو میں نے بیان کیا ہے ان میں افراط تفریط کو چھوڑ کر جو ایک وسط نکلے گا جس کو نہ افراط کی طرف میلان ہوگا نہ تفریط کی طرف وہ ہمیشہ غیر منقسم ہوگا۔ اور ایسے وسط پر رہنا ضرور دشوار ہے۔

پس شریعت ان دونوں جانبوں پر نظر کر کے اپنی دشواری کی وجہ سے تلوار سے تیز اور بوجہ غیر منقسم ہونے کے بال سے باریک ہوگی۔ کیونکہ بال بھی منقسم ہے اور وسطِ حقیقی غیر منقسم ہے پس قیامت میں یہی روحِ شریعت یعنی وسطِ حقیقی جو سر بن کر پل صراط کی شکل میں ظاہر ہوگا جس پر سے مسلمانوں کو چلایا جائے گا۔ پس جو شخص دنیا میں شریعت پر تیزی و سہولت کے ساتھ چلا ہوگا وہ وہاں بھی تیزی کے ساتھ چلے گا کیونکہ وہ یہی شریعت تو ہوگی جس پر دنیا میں چل چکا ہے اور جو یہاں نہیں چلا یا کم چلا ہے وہ پلصراط پر بھی نہ چل سکے گا یا سستی کے ساتھ چلے گا۔

لیجئے میں نے آپ کو پلصراط کی نظیر بھی دکھلا دی۔ اب تو کوئی اشکال نہیں رہا۔ اسی طرح ہمارے پاس تمام شرعیات کے لئے عقلی نظائر

موجود ہیں۔ یہ نہ سمجھئے کہ یہ پل صراط ہی کی خصوصیت ہے لیکن ہم ان تحقیقات کو مقصود نہیں سمجھتے ہمارا اصلی مذہب تو یہ ہے کہ ؎

ما قصۂ سکندر و دارا نخواندہ ایم
از ما بجز حکایتِ مہر و وفا مپرس

انکشافِ اسرار و حقایق

باقی میں نے نمونہ کے طور پہ یہ تحقیق اس لئے بیان کر دی تاکہ معلوم ہو جائے کہ ہمارے پاس ہر مسئلہ میں ایسی ہی تحقیقات موجود ہیں اور سمجھ میں آ جائے کہ علوم شرعیہ کے سامنے علوم فلسفہ کی کچھ بھی وقعت نہیں جس میں سے نمونہ کے طور پہ اس وقت میں نے کچھ بیان کر دیا ہے تاکہ آپ علماء اسلام کو تحقیقات سے خالی نہ سمجھیں۔ بحمد اللہ ہمارے پاس ان تحقیقات کا ذخیرہ بھی بہت زیادہ ہے لیکن ؎

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز
ورنہ در مجلسِ رنداں خبرے نیست کہ نیست

مصلحت اس واسطے نہیں کہ ہر شخص اس قسم کی تحقیقات بتلانے کے قابل نہیں اور جو قابل ہوں اُن کو بھی ہم نہیں بتلاتے کیونکہ اُن کا بتلانا ہمارے ذمہ نہیں (کیونکہ طبیب کے ذمہ صرف نسخہ بتلانا ہے اس کی رعایت اور ترکیب کے اسرار اور وزن کی علت بتلانا اُس کے ذمہ نہیں) ہاں بعض قابلوں کو بتلا بھی دیتے ہیں جو ہمارے پاس آ کر رہیں اور ہمارے کہنے کے موافق عمل کریں۔ اطاعت میں پختگی ظاہر کریں۔ ایسے شخص کو کبھی نشاط میں آ کر خود ہی بتلا دیتے ہیں اور پوچھنے پر اُسے بھی نہیں بتلاتے کیونکہ یہ اسرار ہیں جن کو نشاط کے وقت خود ہی بیان کر دیا جاتا ہے اور

ان کا از خود کسی کا پوچھنا ناگوار گزرتا ہے (جیسے طبیب بعض دفعہ خوشی میں آکر مریض سے خود اپنے نسخہ کی تعریف اور حقیقت بیان کر دیتا ہے اور اگر مریض پوچھے تو اُسے ناگوار ہوتا ہے)

جیسے کوئی شخص بادشاہ کا مطیع و محبوب ہو تو بادشاہ اُسے کبھی اپنے محل کی سیر بھی کرا دیتا ہے کہ دیکھو یہ خزانہ ہے اور یہ چور دروازہ ہے اور یہ ہماری بیگمات کے رہنے کی جگہ ہے۔ یہ آرام گاہ ہے لیکن اگر وہ از خود پوچھنے لگے کہ حضور کی بیگم کہاں رہتی ہیں اور خزانہ کہاں ہے تو ایسی بے نقط سنائی جائیں گی کہ حواس باختہ ہو جائیں گے۔ پس اسرار کے دریافت کرنے کی درخواست بھی ایسی ہی درخواست کے مشابہ ہے۔ تو میں نے اسرار کی حقیقت بھی بتلا دی۔ اُن کے معلوم کرنے کا طریقہ بھی بتلا دیا۔ اگر کسی کو شوق ہو تو اس طریقے سے عمل شروع کر دے یعنی اطاعت میں لگ جائیے۔ میں سچ کہتا ہوں کہ تم ہمارے اس کہنے پر عمل کرنے لگو تو پھر تم کو دریافت کی بھی ضرورت نہ ہوگی۔ خود ہی سب حقائق منکشف ہو جائیں گے اور یہ حال ہوگا ؎

بینی اندر خود علوم انبیاء بے کتاب و بے معید و اوستا

اور جن کو یہ حقائق حاصل ہوئے ہیں محض عمل اور اطاعت ہی سے حاصل ہوئے ہیں ؎ فہم و خاطر تیز کردن نیست راہ
جز شکستہ می نگیرد فضلِ شاہ

یہ اسرار عقل پرستی اور فہم کے تیز کرنے سے معلوم نہیں ہوتے بلکہ شکستگی اور انقیاد سے خدا کا فضل متوجہ ہو جاتا ہے۔ آگے بتلاتے ہیں کہ اس شکستگی پر فضل کس طرح ہو جاتا ہے ؎

ہر کجا پستی ست آب آنجا رود　　ہر کجا مشکل جواب آنجا رود
ہر کجا درد ے دوا آنجا رود　　ہر کجا رنجے شفا آنجا رود

پس فضل اطاعت و عبدیت سے ہوتا ہے کہ آدمی اپنے کو فنا کر دے اپنی عقل و فہم کو ناقص سمجھ کر چھوڑ دے۔ فرماتے ہیں ؎

سال ہا تو سنگ بودی دلخراش
آزموں را یک زمانے خاک باش

یعنی عقل کی اطاعت میں سنگ دل بنے ہوئے تو بہت دن ہو گئے اس نے کچھ بھی حقیقت نہ تبلائی۔ اب ذرا کچھ دنوں خاک ہو کر دیکھو پھر کیا ہو گا۔ فرماتے ہیں ؎

در بہاراں کے شود سر سبز رنگ
خاک شو تا گل بروید رنگ رنگ

پھر تمہارے اندر عجیب عجیب علوم القا ہوں گے۔ صاحب یہ ہے طریقہ علوم عالیہ حاصل کرنے کا۔ خوب سمجھ لیجئے۔

عقل کا معارضہ

مگر اس وقت مذاق ایسا فاسد ہوا ہے کہ ہر شخص علوم عالیہ کے درپے ہے اور اپنی عقل سے ان کو دریافت کرنا چاہتا ہے حالانکہ عقل سے تو یہ بھی معلوم نہیں ہو سکتا کہ میں کس کا بیٹا ہوں اور میرا باپ کون ہے۔

کانپور میں ایک جنٹلمین نے اپنے باپ کو لکھا تھا کہ یہ کاہے سے معلوم ہوا کہ آپ میرے باپ ہیں۔ اس کی عقلی دلیل کیا ہے۔ اس نے واقعی درایت پر عمل کیا۔ عقل کا تو مقتضا یہ ہے کہ جاہل کی اولاد بھی جاہل

ہی ہو۔ یہ عقل میں کیوں کر آ سکتا ہے کہ باپ تو جاہل لٹھ ہو اور بیٹا انٹرنس پاس کر کے فلسفی بن جائے۔ دلیل عقلی تو اس کو ثابت کر نہیں سکتی۔ اسی لئے اُس نے کہا کہ بتلاؤ کاہے سے معلوم ہوا کہ تم میرے باپ ہو۔ اس کا جواب اگر ہے تو یہی ہے کہ دایہ سے پوچھ لے جس نے تجھے ماں کے پیٹ سے جنایا تھا اور ماں سے پوچھ لے کہ وہ کیوں کر حاملہ ہوئی تھی تو یہ عقل تو بڑی نکمی چیز نکلی جس سے باپ کا باپ ہونا بھی ثابت نہیں ہو سکتا۔ یہ ہے خرابی عقل کے اتباع میں۔ اسی لئے کہتے ہیں ؎

آزمودم عقلِ دُور اندیش را
بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را

دیوانگی سے مراد اطاعت کاملہ ہے جس میں بلا چون وچرا اتباع ہو اگر کوئی اس حالت پر ہنسے تو اس کے جواب میں فرماتے ہیں ؎

ما اگر قلاش و گر دیوانہ ایم
مست آں ساقی و آں پیمانہ ایم

یعنی جو کوئی ہنسے اُس سے کہہ دو کہ ہماری دیوانگی ہی تمہاری عقل سے اچھی ہے۔ ہمارے نزدیک تو جو ایسا دیوانہ نہیں ہوا وہی دیوانہ ہے ؎

اوست دیوانہ کہ دیوانہ نشد　　مرعسس را دید در خانہ نشد

تو یہ کیسا بھدا مذاق ہے کہ ہر بات کو عقل ہی سے معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ پھر اس کا نتیجہ وہی ہو گا جو اس جنٹلمین میں ظاہر ہوا کہ باپ سے بھی دلیل عقلی مانگتا تھا۔ اس کے باپ ہونے پر۔ اور جب یہ لوگ خدا و رسول کے ساتھ بھی عقل سے معارضہ کرتے ہیں تو باپ کے ساتھ کریں تو کیا

بتب ہے۔ مگر افسوس یہ ہے کہ باپ کے ساتھ ایسا معارضہ کیا جائے تو باپ کو بھی ناگوار ہوتا ہے اور وہ ایسے بیٹے کو نالائق سمجھ کر عاق کر دیتا ہے اور دنیا بھی اس کو برا بھلا کہتی ہے۔ مگر احکامِ خدا اور رسولؐ کے ساتھ کوئی یہ برتاؤ کرے تو نہ باپ اسے کچھ کہتا ہے نہ دنیا والے کچھ کہتے ہیں بلکہ اور الٹا ایسے شخص کو عاقل اور فاضل کا خطاب دیتے ہیں صاحبو۔ کچھ تو انصاف کرو کہ جس عقل کا معارضہ آپ کو اپنے ساتھ بھی گوارا نہیں وہ معارضہ خدا اور رسولؐ کے ساتھ کیونکر گوارا کیا جاتا ہے۔

میں اسی کی شکایت کر رہا تھا کہ بعض لوگوں نے اتباعِ عقل سے عقائد میں اتنا اختصار کر لیا ہے کہ وہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے اعتقاد ہی کو ایمان کے لئے کافی سمجھتے ہیں۔ بقیہ معادیات کی تصدیق کو ایمان کے لئے ضروری نہیں سمجھتے۔ اور بعض نے یہ غضب کیا کہ محمد رسول اللہ کو بھی اڑا دیا۔ کیونکہ حدیث میں تو اتنا ہی آیا ہے من قال لا الہ الا اللہ دخل الجنۃ اس میں محمد رسول اللہ کی قید کہاں ہے۔ چنانچہ انہوں نے کہہ دیا کہ جو شخص موحد ہو خواہ کسی مذہب کا ہو اور گو رسالت محمدیہ کا منکر ہو وہ جنتی اور ناجی ہے۔ میں اس وقت ان لوگوں کا نام نہیں لینا چاہتا مگر ان کے استدلال پر مجھے ایک حکایت یاد آگئی۔

رام پور میں مجھ سے ایک طالب علم نے کسی ضرورت کے لئے وظیفہ پوچھا۔ میں نے کہہ دیا کہ لاحول کثرت سے پڑھا کرو۔ کچھ دنوں کے بعد وہ پھر ملے اور کہنے لگے کہ میں وظیفہ پڑھتا ہوں مگر نفع نہیں ہوا۔ میں نے ویسے ہی اتفاقاً پوچھ لیا کہ تم نے کیا پڑھا تھا تو آپ کہتے ہیں کہ اسی طرح لاحول لاحول لاحول ــــ! میں نے کہا کہ تمہارے اس لاحول پر بھی لاحول

تو اگر اس طالب علم کا یہ سمجھنا صحیح تھا تو ان لوگوں کی دلیل بھی صحیح ہو سکتی ہے مگر کون نہیں جانتا کہ لاحول ایک پوری دعا کا پتہ ہے یعنی لاحول ولاقوۃ الا باللہ العلی العظیم کا۔ جیسے بسم اللہ ایک پوری آیت کا پتہ ہے اور الحمد پوری سورت کا۔ اسی طرح قل ہو اللہ احد اور یٰسین پوری پوری سورت کا پتہ ہے (اور آلمٓ ایک پورے سیپارہ کا پتہ ہے)

پس اگر ہم کسی سے یہ کہیں کہ نماز میں الحمد پڑھنا واجب ہے اور یٰس کا ثواب دس قرآن کے برابر ہے اور وہ اس کا یہ مطلب سمجھے کہ صرف لفظ الحمد نماز میں واجب ہے اور اتنا ہی کافی ہے۔ اور محض یٰس یٰس کہنے کا ثواب دس قرآن کے برابر ہے تو بتلایئے وہ احمق ہے یا نہیں۔ اور کیا ہر شخص یہ نہ کہے گا کہ بے وقوف یہ لفظ تو پتہ کے طور پر تھا۔ اور اس سے مراد پوری سورت ہے۔ اسی طرح حدیث میں لا الہ الا اللہ پورے کلمہ کا پتہ ہے بلکہ پوری شریعت کا پتہ ہے اور مطلب حدیث کا یہ ہے کہ جو شخص مسلمان ہو جائے وہ جنتی ہے۔

اعتقاد رسالت کی ضرورت

اب یہ شریعت کے دوسرے مقامات سے پوچھو کہ مسلمان ہونا کسے کہتے ہیں۔ تو معلوم ہوگا کہ اس کے لئے رسالت محمدیہ کا اعتقاد بھی شرط ہے اور جنت و دوزخ کا بھی اور ملائکہ کے وجود کا بھی اور تقدیر کے حق ہونے کا بھی اور صراط و وزن و حساب و کتاب کا قائل ہونا بھی اور فرضیت صلوٰۃ و زکوٰۃ و صوم و حج کا اقرار بھی ـــــ الخ مگر ان عقلمندوں نے اس طالب علم کی طرح صرف لا الہ الا اللہ کو کافی سمجھ لیا۔

بلند شہر میں بھی ایک بڑے عہدہ دار اس خیال کے تھے کہ وہ

صرف توحید کے قائل ہونے کو نجات کے واسطے کافی سمجھتے تھے۔ میں نے سُن کر ایک تقریر میں کہا کہ جو رسالت کا قائل نہیں وہ توحید کا بھی قائل نہیں بدون اقرار رسالت کے توحید کا تحقق ہی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ توحید کے یہ تو معنے ہیں نہیں کہ خدا تعالےٰ کو صرف ایک مان لے چاہے اس کیساتھ عیوب سے بھی اُس کو متصف مانتا رہے۔ یقیناً اس کو توحید کوئی نہیں کہہ سکتا بلکہ توحید کے معنے یہ ہیں کہ حق تعالےٰ کو تمام عیوب سے منزہ اور تمام کمالات الوہیت کے ساتھ متصف مانے جن میں سے ایک کمال صدق بھی ہے جس سے خدا تعالےٰ کو متصف اور کذب سے منزہ ماننا لازم ہے۔ اور جو شخص منکر رسالت ہے وہ حق تعالےٰ کو کاذب قرار دیتا ہے کیونکہ حق تعالیٰ تو محمد رسول اللہ فرماتے ہیں اور یہ اس میں خدا تعالیٰ کو صادق نہیں مانتا تو ایک عیب سے خدا کو موصوف مانتا ہے اور یہ توحید نہیں۔ پس منکر رسالت موحد نہیں ہو سکتا (اور قرآن کے کلام الٰہی ہونے پر عقلی و نقلی دلائل ہر وقت قائم کر سکتے ہیں)

پھر میں نے کہا کہ اس کے جواب کے لئے میں قائل کو دس برس کی مہلت دیتا ہوں۔ آخر میں وہ سمجھ گئے تھے اور اس عقیدہ سے توبہ کر لی تھی۔ اس کے بعد جو ملاقات ہوئی تو اُس وقت وہ صحیح عقیدہ پر جمے ہوئے تھے۔ اور اب وہ خیال نہ رہا تھا۔ تو ان بعض نے تو عقائد میں سے محمد رسول اللہ کا اختصار کیا تھا جن کی غلطی معلوم ہو گئی۔

بعض نے عقائد میں تو اختصار نہیں کیا مگر وہ اعمال کا اختصار کرتے ہیں۔ اور سمجھتے ہیں کہ نجات کے لئے مسلمان ہونا کافی ہے اور مسلمان توحید و رسالت کے اقرار سے ہو جاتا ہے پھر اور چیزوں کی کیا ضرورت ہے

اور دلیل وہی کہ من قال لا الٰہ الا اللہ ای مع محمد رسول اللہ۔

اجزاءِ دین کی اہمیت

صاحبو ـــــ یوں تو اس کا اصل جواب بہت عمیق ہے مگر میں اس وقت ایک موٹی سی بات عرض کرتا ہوں۔ وہ یہ کہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کو کافی سمجھنا ایسا ہے جیسے ایک شخص نے نکاح کے وقت ایجاب وقبول کیا ہو اور جب بیوی اس سے نفقہ و کپڑا مانگے تو کہنے لگے کہ میں نے تو صرف تجھے قبول کیا تھا۔ کھانا کپڑا کب قبول کیا تھا۔ یہ میرے ذمہ نہیں تو بتلائیے کیا اس کی یہ بات قبول کی جائے گی؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ ہر شخص یہ کہے گا کہ بے وقوف بیوی کا قبول کرنا نکاح کے سب لوازم کو قبول کرنا ہے اور ساری برادری اس کو احمق بنائے گی۔ صاحبو ـــــ اسی طرح لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہنا تو مذہب کو قبول کرنا ہے۔ یہ بھی محض ایجاب وقبول ہے جس میں سارے لوازم مذہب کا قبول داخل ہے۔

حضرات ـــــ یہ سب کم فہمی کی باتیں ہیں جو آج کل کی جاتی ہیں بلکہ کم فہمی بھی نہیں یوں کہنا چاہیے کہ کم فہم بن گئے ورنہ کیا وجہ ہے کہ جو برتاؤ خدا و رسول ؐ کے ساتھ کیا جاتا ہے وہی برتاؤ بیوی اور برادری کے ساتھ کیوں نہیں کیا جاتا۔ اگر آپ ایسے ہی محقق ہیں کہ بدون لم اور کیف کے کوئی بات مانتے ہی نہیں اور آپ کے نزدیک ہر چیز کا لازم ہونا صراحۃً قبول کرنے پر موقوف ہے تو پھر یہاں نکاح کے معاملہ میں لم اور کیف کیوں نہیں کیا جاتا۔ اور نان و نفقہ کو بدون قبول صریح کے کیوں لازم مان لیا جاتا ہے۔ بلکہ ہونا تو یوں چاہیے تھا کہ مخلوق کے ساتھ لم اور کیف ہوتا اور خدا کے ساتھ نہ ہوتا۔ مگر اب الٹا معاملہ ہے اور رسول ؐ کے

احکام میں چون و چرا اور بیوی برادری کے معاملہ میں تسلیم و رضا ہیں
حدیث من قَالَ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ دَخَلَ الْجَنَّۃَ سے عدم ضرورت
اعمال پر استدلال کرنا محض غلط ہے ـــــ یہ تو وہ لوگ تھے جو
عقائد میں اختصار کرتے اور اعمال کو غیر ضروری سمجھتے تھے۔

ایک جماعت ان کے علاوہ اور پیدا ہوئی جنہوں نے عقائد میں تو
اختصار نہیں کیا اور نہ اعمال کو غیر ضروری سمجھا مگر انہوں نے اعمال میں
اختصار کیا۔ کچھ اعمال کو لے لیا اور بہت سے اعمال کو چھوڑ دیا۔ بس
جو چیز آسان معلوم ہوئی وہ تو لے لی۔ اور جس میں ذرا سی بھی دقت معلوم
ہوئی اس کو اڑا دیا۔ اور اس میں طبائع مختلف ہیں۔ بعض کو عبادات بدنیہ
آسان ہیں اور مالیہ مشکل ہیں۔ انہوں نے نماز اور روزہ، تسبیح و نوافل
کو اختیار کیا، مقدس صورت بنا لی۔ مگر وہ ایسے مقدس ہیں کہ نہ حج فرض ادا
کرتے ہیں نہ زکوٰۃ دیتے ہیں نہ معاملات میں احتیاط کرتے ہیں۔ ان کا
لین دین نہایت خراب ہے۔ اور بعضے ایسے ہیں جن کو مال خرچ کرنا
آسان ہے۔ وہ حج بھی کرتے ہیں، زکوٰۃ خیرات بھی دیتے ہیں مگر جان کا
خرچ کرنا ان کو دشوار ہے۔ اس لئے نماز روزہ سے جان چراتے ہیں
اور بعض ایسے ہیں جو طاعات بدنیہ اور مالیہ دونوں کو بجا لاتے ہیں مگر
انہوں نے طاعاتِ قلب کو چھوڑ رکھا ہے۔ ظاہر میں بڑے مقدس
ہیں مگر دل میں تکبر و حسد، ریا و عجب بھرا ہوا ہے۔ محبت و خشیت الٰہی
برائے نام ہے۔ مگر اس کو وہ ضروری نہیں سمجھتے۔ بعض نے ان اخلاق
کا بھی اہتمام کیا مگر ان کی معاشرت گندی ہے۔ ذکر و شغل بھی کرتے ہیں مگر
اس کا اہتمام نہیں کہ ہمارے ہاتھ سے دوسروں کو ایذا نہ پہنچے۔

غرض ہر ایک کو جو بات آسان لگی وہ تو لے لی اور جس میں کچھ محنت کرنا پڑی اس کو چھوڑ دیا۔ میں تو کہا کرتا ہوں کہ آج کل سائنس کی ترقی ہے ہر چیز کا ست نکالا جاتا ہے۔ تو ہمارے بھائیوں نے اعمال کا بھی ست نکال لیا۔ مگر صاحبو، ست کا ست نہیں نکلا کرتا۔ دین تو سارا کا سارا خود ہی ست ہے۔ اس کا ہر جزو ضروری ہے۔ اب آپ دوبارہ اس کا ست نہیں نکال سکتے اور اگر نکالو گے تو وہ ست نہ ہوگا، بلکہ اجزائے ضروریہ کو فوت کرنا ہوگا۔

جیسے کوئی شخص انسان کا ست نکالنا چاہے کہ اس کا ایک ہاتھ کاٹ دے اور ایک پیر اور ایک آنکھ پھوڑ دے اور ایک کان بند کر دے تو کیا اس کو ست کہا جائے گا۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ یہ کہا جائے گا کہ اس نے ضروری اجزا کو حذف کر کے ایک آدمی کو بیکار بنا دیا۔

یہی حال ہمارے بھائیوں نے دین کا بنا رکھا ہے۔ کسی نے یہ کیا کہ اعمال تو بہت اچھے ہیں مگر عقائد میں کتاب و سنت کو چھوڑ کر رسوم بدعت کو داخل کر لیا۔ اور اپنے کو دین دار سمجھتے ہیں۔ بعض نے عقائد کو سنت کے موافق رکھا ہے اور اعمال میں نہایت کوتاہی کی اور ان کو اپنے متبع سنت ہوئے کا ناز ہے۔ غرض یہ مختلف فرقے ہمارے اندر پیدا ہو گئے۔ اور ساری خرابی کا منشا یہ ہے کہ لوگوں نے دین کے اجزاء کو پوری طرح نہیں سمجھا۔

اجزائے دین کی تفصیل

تو غور سے سن لیجئے کہ دین کے پانچ اجزا ہیں۔ ایک جز تو ہے

عقائد کا کہ دل سے اور زبان سے یہ اقرار کرنا کہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس چیز کی جس طور پر خبر دی ہے وہی حق ہے (اس کی تفصیل کتب عقائد سے معلوم ہو گی)

دوسرا جزو عبادات ہیں یعنی نماز روزہ زکوٰۃ و حج وغیرہ۔

تیسرا جزو معاملات ہیں یعنی احکام نکاح و طلاق و حدود و کفارات و بیع و شراء و اجارہ و زراعت وغیرہ! ور ان کے جزو دین ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ شریعت یہ سکھاتی ہے کہ کھیتی یوں بو یا کرو اور تجارت فلاں چیز کی کیا کرو بلکہ ان میں شریعت یہ بتلاتی ہے کہ کسی پر ظلم و زیادتی نہ کرو اور اس طرح معاملہ نہ کرو جس میں نزاع کا اندیشہ ہو غرض جواز و عدم جواز بیان کیا جاتا ہے۔

چوتھا جزو ہے معاشرت یعنی اٹھنا بیٹھنا، ملنا جلنا، مہمان بننا، کسی کے گھر پر جانا کیوں کر چاہیئے اور اس کے کیا آداب ہیں۔ بیوی بچوں عزیزوں اجنبیوں اور نوکروں وغیرہ کے ساتھ کیوں کر برتاؤ کرنا چاہیئے۔

پانچواں جزو جس کا نام ڈراؤنا ہے تصوّف ہے۔ اور ڈراؤنا اس لئے ہے کہ آج کل لوگوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ تصوّف کے لیئے بیوی بچوں کو چھوڑنا پڑتا ہے۔ تو خوب سمجھ لیجئے کہ یہ بالکل غلط ہے۔ یہ جاہل صوفیوں کا مسئلہ ہے جو تصوّف کی حقیقت کو نہیں جانتے۔ غرض یہ پانچواں جزو ہے جس کو شریعت میں اصلاحِ نفس کہتے ہیں۔

تو یہ پانچ اجزاء دین کے ہیں۔ ان پانچوں کے مجموعہ کا نام دین ہے اگر کسی میں ایک جزو بھی ان میں سے کم ہو تو وہ ناقص الدین ہے۔ جیسے کسی کے ایک ہاتھ نہ ہو تو وہ ناقص الخلقت ہے۔ اب دیکھ لیجئے کہ

ہم نے ان پانچوں کا کتنا اہتمام کر رکھا ہے۔ حالت یہ ہے کہ بعض نے تو عقائد و عبادات کو کم کر رکھا ہے اور بعض میں معاملات کی کمی ہے۔ اور معاملات کی تو یہ حالت ہے کہ بڑے بڑے اتقیاء معاملات کو دین ہی نہیں سمجھتے۔ چنانچہ برتاؤ سے یہ بات معلوم ہو جاتی ہے۔

وہ برتاؤ یہ ہے کہ نماز و روزہ کے مسائل تو مولویوں سے پوچھے جاتے ہیں مگر معاملات کو کوئی آکر نہیں پوچھتا۔ مثلاً کوئی گاؤں خریدیں یا کسی مورث کے مرنے کے بعد تقسیم جائداد کا قصہ ہو تو اس میں آپ نے کہیں نہ دیکھا ہوگا کہ دستاویز علماء کو لاکر دکھائی جاتی ہو کہ دیکھئے اس میں کوئی بات خلافِ شرع تو نہیں۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ معاملات کو دین ہی نہیں سمجھتے حالانکہ معاملات کا دین میں داخل ہونا بالکل بدیہی ہے۔

قرآن میں آیت مداینہ کو دیکھئے صرف قرض لینے کے کتنے احکام بیان فرمائے ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے کہ جب تم مدت معلومہ کے لئے ادھار قرض کا معاملہ کیا کرو تو اُسے لکھ لیا کرو اور خود لکھنا نہ جانتے ہو تو کسی سے لکھوا لیا کرو اور کاتب کے لئے حکم ہے۔

وَلَا يَأْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ

کہ لکھنے والا لکھنے سے انکار نہ کرے بلکہ لکھ دیا کرے۔ اگر لکھنے والا کوئی نہ ہو تو حکم ہے کہ دو آدمیوں کو گواہ بنا دو اور گواہوں کو ضرورت کے وقت گواہی دینا لازم ہے۔ کتمان سے گناہ ہوگا جس پر وعید مذکور ہے۔ اسی طرح اور بہت سے معاملات کے احکام قرآن میں موجود ہیں اور احادیث میں تو بہت ہی زیادہ ہیں۔ پھر فقہ میں تو اتنی تفصیل ہے کہ

کوئی قانون بھی اُس سے زیادہ مفصّل نہیں ہو سکتا۔

بُری صحبت کا اثر

اس سے تو ان لوگوں کا جواب نکل آیا جو معاملات کو دین میں داخل تو سمجھتے ہیں مگر وہ علماء پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ اُن کو سوائے لا یجوز کے کچھ نہیں آتا۔ کوئی دستاویز اُن کو دکھلاؤ تو ناجائز۔ کسی ملازمت کو دریافت کرو تو ناجائز۔ بس مولوی صاحب نے تو ایک لایجوز کا سبق پڑھ لیا ہے یہ تو ایک عام الزام ہے بعض نے اس سے بڑھ کر یہ کہا کہ مذہب ہی بڑا سخت ہے (پہلی جماعت تو علماء ہی کو الزام دیتی تھی انہوں نے خدا اور رسولؐ پر بھی الزام لگا دیا)

میں ان لوگوں کے اقوال کی کیا حکایت کروں۔ ڈر بھی لگتا ہے اور غصہ بھی آتا ہے۔ لکھنؤ میں ایک کمیٹی ہوئی تھی جس میں سب مسلمان ہی جمع ہوئے تھے اور اس بات کی تحقیق کی جا رہی تھی کہ مسلمانوں کے تنزل کا کیا سبب ہے۔ بالآخر یہ طے کیا گیا کہ تنزل کا اصل سبب اسلام ہی ہے صاحبو! یہ وہ لوگ ہیں جن کا یہ دعویٰ ہے کہ ٹھیٹ اسلام ہمارا ہی اسلام ہے اور ہم ہی حامی اسلام ہیں۔ ان کی تجویز یہ ہے کہ مذہب اسلام ہی تنزل کا سبب ہے (افسوس وہ اسلام جس کی بدولت حضرات صحابہ کو وہ ترقی حاصل ہوئی تھی کہ عالم میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ آج اس کو تنزل کا سبب کہا جاتا ہے۔ بخدا ان لوگوں نے اسلام کو سمجھا ہی نہیں عمل تو درکنار جن لوگوں نے اسلام کو سمجھا اور اس پر عمل کیا تھا اُن کو تو کبھی تنزل نہ ہوا۔ ہاں جو اس پر عمل ہی نہ کریں اُن کو تنزل ہونے لگے تو اس کا کیا علاج مگر اس کا سبب اسلام ہو گا یا ترکِ اسلام)

ان لوگوں کی صحبت کا یہ اثر ہے کہ میں ایک دفعہ بریلی گیا تھا تو وہاں ایک بوڑھے میاں اپنے پوتے کو میرے پاس لائے کہ یہ نماز نہیں پڑھتا اسے کچھ نصیحت کر دیجئے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ بھائی تم نماز کیوں نہیں پڑھتے تو وہ کہنے لگا کہ مجھے تو خدا کے وجود ہی میں شک ہے نماز کس کی پڑھوں اور یہ کہہ کر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے میں نے بوڑھے میاں سے کہا کہ تم کو نماز کی فکر ہے صاحبزادے کو تو ایمان بھی نصیب نہیں پہلے اس کی فکر کرو۔ وہ مجھ ہی سے اس کی تدبیر پوچھنے لگے۔ میں نے کہا کہ یہ کس جگہ تعلیم پاتا ہے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے ایک کالج میں پڑھتا ہے۔ میں نے کہا کہ آپ اس کو بجائے کالج کے کسی گورنمنٹ کے اسکول میں داخل کر دیجئے۔ اس وقت تو ان کی سمجھ میں یہ علاج نہ آیا مگر انہوں نے اسی کے موافق عمل کیا۔

اگلے سال جو میں گیا تو معلوم ہوا کہ لڑکا بڑا پکا مسلمان ہے اور نماز بھی خوب پڑھتا ہے۔ اس وقت لوگوں نے مجھ سے اس کی وجہ دریافت کی کہ کالج میں رہ کر اس کا اسلام کیوں کمزور ہوا اور گورنمنٹ کے اسکول میں داخل ہو کر کیسے محفوظ ہو گیا حالانکہ اس کالج میں سب لڑکے مسلمان ہی ہیں وہاں تو اسلام کو قوت ہونا چاہیے تھی اور گورنمنٹ اسکول میں ہندو مسلمان سب قسم کے ہوتے ہیں۔

میں نے کہا کہ کالج میں جتنے بھی مسلمان ہیں سب آزاد ہیں اور وہاں رات دن ایسے ہی لوگوں کی صحبت ہے وہی مشغلہ ہے تو حالت بھی وہی ہو جاتی ہے جو سب کی ہے کیونکہ ان سے نفرت کی کوئی وجہ نہیں ہوتی ظاہر میں سب مسلمان ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کے خیالات اور صحبت کا

اثر جلدی ہوتا ہے۔ اور گورنمنٹ اسکول میں چونکہ مسلمان لڑکوں کو ہندوؤں کے مذہب سے دلی نفرت ہے اس لئے اُن کی صحبت کا مذہب پر بُرا اثر نہیں پڑتا اور نفرت کی وجہ سے چونکہ مقابلہ رہتا ہے اس لئے مقابلہ میں آکر یہ اپنے مذہب پر پہلے سے زیادہ مضبوط ہو جاتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا ہوگا کہ مولوی انگریزی پڑھانے سے منع نہیں کرتے بلکہ عقائد کے بگاڑنے سے روکتے ہیں۔

بعض لوگ اس کا جواب دیا کرتے ہیں کہ ہم تو انگریزی کے ساتھ اب دین کی تعلیم بھی دینے لگے ہیں تو اب تو اس سے منع نہ کرنا چاہیئے مگر صاحبو! محض دین کی تعلیم دینا کافی نہیں کیوں کہ دین کی تعلیم دینے والے بھی تو وہی لوگ ہیں جن کے خیالات آزادی کی طرف مائل ہیں بلکہ تعلیم دین کے ساتھ صحبت نیک بھی ضرور تجویز کرنا چاہیئے۔ اگر اور بھی کچھ نہ ہو تو کم از کم تعطیلوں ہی میں ان لڑکوں کو کسی محقق کی صحبت میں بھیج دیا کیجئے

ہماری کوتاہیاں

میں یہ نہیں کہتا کہ آپ دین کے لئے اپنا قیمتی وقت صرف کریں کیونکہ اتنی ہمت کی آپ سے مجھے امید نہیں کیونکہ آج کل ہماری حالت یہ ہے کہ اللہ کے نام کے لئے خراب سے خراب چیزیں تجویز کی جاتی ہیں۔ تو آپ اپنا اچھا وقت خدا کے لئے کیوں صرف کریں گے۔

اس پر مجھے ایک حکایت یاد آئی کہ ایک عورت نے کھیر پکا کر رکابی میں نکال کر رکھ دی۔ اتفاق سے اس رکابی میں کتا منہ ڈال گیا۔ تو اس نے مٹی کی دوسری رکابی میں اسے نکال کر اپنے لڑکے کو دی کہ مسجد کے ملا کو دے آ۔ وہ ملا جی کے پاس لایا تو بڑے خوش ہوئے اور فوراً

ہاتھ مارنے لگے اور اُدھر ہی منہ مارا جدھر سے کُتّے نے کھائی تھی۔ لڑکے نے کہا کہ ادھر سے نہ کھاؤ ادھر سے کتّے کی کھائی ہوئی ہے۔ یہ سُن کے تو ملّاجی جھلّا گئے اور رکابی کو بہت دُور پھینکا وہ پھوٹ گئی تو بچہ رونے لگا کہ ہائے میری ماں مارے گی۔ ملّاجی نے کہا کہ ابے مٹی ہی کی تو تھی۔ کہنے لگا اجی! میری ماں میرے چھوٹے بھائی کو اس میں ہگایا کرتی تھی۔ یہ سُن کر تو ملّاجی کو متلی ہونے لگی۔ (کہ ظرف و مظروف دونوں ہی نور بھرے تھے)

یہ حالت ہے ہم لوگوں کی۔ اللہ کے واسطے خراب سے خراب اور ناپاک چیزیں تجویز کرتے ہیں۔ پھر غضب یہ کہ مسجد کے ملّانوں کے ساتھ خود ہی تو یہ برتاؤ کرتے ہیں اور خود ہی اُن کو ذلیل سمجھتے ہیں۔ ارے بھائی جب تم اپنے آپ اچھا سے اچھا کھاؤ اور اُن کو کبھی نہ پوچھو اور جو پوچھو بھی تو ایسے وقت جب کہ تم خود نہ کھا سکو تو بتلاؤ وہ حریص ہوں گے یا نہیں۔ پھر تنخواہ ان کی ایسی قلیل مقرر کی جاتی ہے جس میں روکھی روٹی بھی وہ نہیں کھا سکتے تو پھر وہ حریص نہ ہوں تو اور کیا ہوں؟

اسی لیے میں تو کہا کرتا ہوں کہ جب محلہ میں کوئی رئیس بیمار ہوتا ہے تو مسجد کے مؤذن تو اُس کی صحت کے لیے ہرگز دُعا نہ کرتے ہوں گے۔ وہ تو چاہتا ہوگا کہ اچھا ہے یہ مرے تو تیجے، دسویں، چالیسویں کو فاتحہ کا کھانا خوب فراغت سے ملے گا کیونکہ خوشی میں اُن کو کون پوچھتا ہے۔ ایسے ہی مواقع میں پوچھا جاتا ہے۔ تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ ان مواقع کے منتظر رہیں گے۔

اس حرص کی یہاں تک نوبت پہنچ گئی ہے کہ کیرانہ میں ایک شخص

کا انتقال ہوا تو کفن کا چادرہ لوگوں نے قبرستان کے تکیہ دار کو نہ دیا کسی دوسرے غریب کو دے دیا۔ وہ تکیہ دار جھگڑنے لگا کہ یہ تو میرا حق ہے۔ لوگوں نے کہا بھائی ہمیشہ تم کو دیا جاتا ہے آج اس غریب کو دینے دو۔ تو وہ تکیہ دار کیا کہتا ہے کہ واہ حضور! خدا خدا کر کے تو یہ دن آتا ہے اسی میں آپ ہمارا حق دوسروں کو دیتے ہیں۔ لوگوں نے کہا، کم بخت! کیا تو اسی دن کا متمنی رہتا ہے کہ کوئی مرے تو تجھے کپڑا ملے جو یہ دن تیرے لئے خدا خدا کر کے آتا ہے۔ وہ بات بنانے لگا مگر دل کی بات زبان پر آ ہی گئی۔ تو صاحبو! اس کی بھی کیا خطا جب تم اس وقت کے سوا کبھی بھی اُسے نہ پوچھو۔ جب اُس کی آمدنی یوں ہی ٹھہری تو وہ تو اسی کا وظیفہ پڑھے گا۔

غرض چونکہ ہماری حالت یہ ہے کہ ہم خدا کی راہ میں نکمّی ہی چیز دیا کرتے ہیں اس لئے میں وقت کے بارہ میں بھی یہی کہتا ہوں کہ یہ تعطیل کا نکما اور فالتو وقت خدا کی راہ میں نکال دو۔ اور اگر سارا وقت نہیں دے سکتے تو کم از کم آدھا ہی دے دو۔ اور اس وقت میں بچوّں کو محقق کی صحبت میں بھیج دیا کرو کیونکہ ع

دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

محض کتابیں پڑھانے سے دین پیدا نہیں ہوتا بلکہ اس کے لئے صحبت صالحین کی بھی بہت ضرورت ہے پس میں انگریزی پڑھانے سے منع نہیں کرتا بلکہ یہ کہتا ہوں کہ تم علماء سے پوچھ کر اپنے لڑکوں کے دین سنبھالنے کا بھی کوئی انتظام کرو۔ چنانچہ میں نے اس لڑکے کی اصلاح کا طریقہ بتلایا اور بحمد اللہ نفع ہوا۔ اب تو لوگ علماء سے اس لئے نہیں

دریافت کرتے کہ یوں سمجھ رکھا ہے کہ وہ سب سے پہلے انگریزی کو حرام بتلائیں گے۔ حالانکہ ان کو دنیا سے کچھ ضد تھوڑا ہی ہے۔ وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ آپ دنیا کمائیں مگر دین برباد نہ ہو۔

جائز و ناجائز کی بحث

رہی یہ بات کہ مولویوں نے لایجوز ہی کا سبق پڑھا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جب آپ ساری باتیں چھانٹ کر ایسی ہی پوچھیں گے جو ناجائز ہوں تو ان کا جواب لایجوز کے سوا کیا ہوگا۔ صاحب اس کے بعد ان سے یہ بھی تو پوچھئے کہ تجارت و زراعت کے جائز طریقے کتنے ہیں اور ملازمتیں جائز کون کون سی ہیں۔ پھر دیکھئے وہ جائز کا کتنا وسیع دفتر آپ کے سامنے کھولتے ہیں۔

وسعتِ قانون کے معنے یہ نہیں ہیں کہ اس میں ممنوعات بالکل نہ ہوں ایسا تو کوئی بھی قانون نہ ہوگا اور اگر کوئی قانون اس شان کا ہو بھی تو وہ قانون کہلانے کا مستحق نہیں بلکہ وسعت قانون کے یہ معنی ہیں کہ اس میں ممنوعات کی فہرست کم ہو اور جائزات کی فہرست زیادہ ہو۔ تو آپ قانون شرع کا بغور مطالعہ کریں تو معلوم ہو جائے گا کہ ہر باب کے اندر اس میں ممنوعات کم اور مباحات زیادہ ہیں۔ لیکن اگر کوئی تمام صورتوں میں سے ممنوعات ہی کا انتخاب کر کے سوال کرنے لگے تو ظاہر ہے کہ سب کے جواب میں لایجوز ہی کہا جائے گا۔

پھر اگر بالفرض یہ مان لیا جائے کہ علماء نے لایجوز ہی کا سبق یاد کر لیا ہے تب بھی ان سے پوچھ لینے میں آپ کا نفع ہی ہے۔ گو ان کے لایجوز کہنے سے اس عمل کو ترک نہ کیا جائے۔ وہ یہ کہ اگر آپ بدون

پوچھے عمل ترک کرتے تو شاید حرام کو جائز سمجھ کر کرتے اور اب ناجائز سمجھ کر کریں گے۔ پہلی صورت میں گناہ کر کے اپنے کو گنہگار بھی نہ سمجھتے اور یہ حالت زیادہ خطرناک ہے اور دوسری صورت میں آپ اپنے کو گنہگار تو سمجھیں گے اور اس میں امید ہے کہ شاید کسی وقت توبہ کی توفیق ہو جاوے۔

یہ تو معاملات کی حالت تھی اور بعض نے اگر لین دین کے اس جزو کو بھی درست کر لیا تو انہوں نے معاشرت کو خراب کر رکھا ہے۔ پھر بعض نے تو یہ کیا کہ گو تہذیب قدیم کو نہیں لیا مگر تہذیب جدید کو بھی نہیں لیا اور بعض نے تہذیب قدیم کو چھوڑ کر تہذیب جدید کو لے لیا۔ میں کہتا ہوں کہ اس میں جواز و ناجواز کی بحث تو الگ رہی اس سے قطع نظر کر کے ایک دوسری خرابی یہ ہے کہ یہ لوگ رات دن جس قومیت کا سبق رٹا کرتے ہیں کہ ہر تقریر و تحریر میں ان کی زبان و قلم پر قوم قوم کا لفظ چڑھا ہوا ہے تہذیب جدید کے اختیار کرنے میں اس قومیت کا ابطال ہے تو عجیب بات ہے کہ زبان سے تو یہ اپنے کو حامی قوم اور ہمدرد قوم ثابت کرتے ہیں اور طرزِ عمل سے قومیت کی جڑیں اکھاڑتے ہیں کہ ان کی صورت سے اور بات سے کوئی اسلامی امتیاز ظاہر ہی نہیں ہوتا بلکہ اپنی قوم سے جدا معلوم ہوتے ہیں۔ بس ان کی وہ حالت ہے ؎

یکے بر سرِ شاخ و بن می برید
خداوند بستاں نگہ کرد و دید

اسلامی تہذیب

علاوہ ازیں دوسری قوم کی معاشرت اختیار کرنا گویا اس بات کا

اقرار ہے کہ (نعوذ باللہ) اسلام میں معاشرت نہیں ہے یا ہے تو عمدہ اور کافی نہیں ہے ورنہ پھر یہ لوگ دوسری قوموں کی معاشرت کیوں اختیار کرتے ہیں۔ واللہ اسلام میں تو معاشرت ایسی ہے کہ کہیں بھی اس کی نظیر نہیں مگر معاشرت اس کو نہیں کہتے کہ باجا بھی ہو اور تکلفات ہوں۔ (اور تکبر کا سامان بھی ہو کیونکہ تکبر اور تکلف تو معاشرت کی جڑیں اکھاڑتا ہے۔ اس لئے کہ متکبر دوسروں سے بڑا بن کر رہتا ہے۔ پھر دوسروں کے ساتھ مساوات اور ہمدردی کہاں رہی۔ اسلام میں معاشرت کی تعلیم اس طرح دی گئی ہے جس سے انسان میں تواضع پیدا ہو۔ اور تجربہ کر لیا جائے کہ بدون تواضع کے ہمدردی اور اتفاق پیدا نہیں ہو سکتا اور یہی معاشرت کی جڑ ہے پس) اچھی معاشرت اسلام ہی میں ہے۔

مثلاً کھانے پینے میں اسلامی معاشرت سنئے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے زبان سے بھی فرمایا ہے اور کر کے بھی دکھلایا ہے اٰکُلُ کَمَا یَاْکُلُ الْعَبْدُ کہ میں تو اس طرح کھاتا ہوں جیسے غلام کھایا کرتا ہے۔ آپ کی عادت تھی کہ جھک کر اکڑوں بیٹھ کر کھانا کھایا کرتے تھے۔ اب ہمارے بھائیوں کی نشست ملاحظہ ہو جو سراسر متکبرانہ ہے۔ اس کے بعد یہ دیکھیے کہ عقل کے قریب کون سا طریقہ ہے۔

اس کو ایک مثال میں سمجھئے۔ میں پوچھتا ہوں کہ اگر آپ جارج پنجم کے دربار میں جاویں اور وہاں آپ کو کوئی چیز کھانے کے لئے دی جائے اور حکم ہو کہ ہمارے سامنے کھاؤ تو بتلائیے اس وقت آپ کس طرح کھائیں گے۔ کیا وہاں بھی آپ میز کے منتظر ہوں گے اور پالتی مار کر بیٹھیں گے یا غلاموں کی طرح جھک کر کھائیں گے۔

اور لیجئے کہ اس وقت جو چیزیں آپ کو دی جائیں اگر ان میں سے کوئی شے مرغوب نہ ہو تو انصاف سے کہئے کہ آپ اس کو بے رغبتی ظاہر کر کے کھائیں گے یا رغبت سے کھائیں گے۔ یقیناً آپ رغبت ظاہر کر کے کھائیں گے۔ بے رغبتی ہرگز ظاہر نہ ہونے دیں گے۔

بس یہی اسلامی تہذیب ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حالت تھی کہ کان یاکل اکلا ذریعا کہ آپ (رغبت ظاہر کر کے) جلدی جلدی کھاتے تھے مگر ہم لوگوں کی یہ حالت ہے کہ نہایت ہی ناز و انداز سے کھاتے ہیں۔ حضرت یہ ساری باتیں اس وقت تک ہیں جب تک حقیقت منکشف نہیں ہوئی۔ اور اگر حقیقت کھل جائے اور معلوم ہو جائے کہ احکم الحاکمین کے دربار سے ہم کو یہ چیز کھانے کے لئے ملی ہے اور وہ ہم کو دیکھ رہے ہیں تو پھر خود بخود وہی طرز اختیار کرنا پڑے جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بتلایا ہے۔ چنانچہ اسی مثال میں غور کر لیجئے کہ آپ جارج پنجم کے عطیہ کو اُن کے سامنے بے رغبتی اور بے پروائی سے کھائیں گے یا نہایت رغبت سے۔

اور لیجئے حدیث میں ہے کہ اگر لقمہ گر پڑے تو اُس کو صاف کر کے کھا لو۔ اس کو بعض متکبر تہذیب کے خلاف سمجھتے ہیں مگر میں اسی مثال میں پوچھتا ہوں کہ اگر جارج پنجم کی دی ہوئی چیز میں سے کچھ گر پڑے تو آپ کیا کریں گے۔ کیا اس کو ویسے ہی چھوڑ دیں گے یا اٹھا کر سر پر دھر لیں گے حضرت سارے مرحلے یہیں طے ہو جاتے ہیں جب کہ قلب میں کسی کی عظمت ہو۔ بس فرق یہ ہے کہ ہم لوگ یہ بات نہیں دیکھتے کہ اللہ تعالےٰ دیکھ رہے ہیں اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم اس کو دیکھتے تھے۔ اگر ہماری بھی آنکھیں

کھل جائیں تو وہی کرنے لگیں جو حضورؐ نے کیا ہے۔ اور جہاں جا کر یہ آنکھیں کھلتی ہیں اور کسی کی عظمت دل میں مستحضر ہوتی ہے وہاں اب بھی آپ کا یہی برتاؤ ہے۔

تو جب کہ اسلام میں معاشرت علیٰ وجہ اتم موجود ہے تو پھر دوسروں سے کیوں لیتے ہو۔ غیرت یا حمیت (اور دعوئے قومیت) کا مقتضا تو یہ تھا کہ اگر اسلامی معاشرت ناتمام بھی ہوتی جب بھی آپ دوسروں کی معاشرت اختیار نہ کرتے۔ چنانچہ کسی نے کہا ہے ؎

کہن خرقۂ خویش پیراستن
بہ از جامۂ عاریت خواستن

اپنا تو پُرانا کمبل بھی دوسروں کی شال سے زیادہ عزیز ہوا کرتا ہے نہ یہ کہ اپنے پاس دوشالہ موجود ہے اور تم اس کو اتار کر دوسروں کا پھٹا ہوا کمبل اوڑھتے ہو۔ اسی طرح لباس میں بھی ہمارے بھائیوں نے دوسروں کی معاشرت اختیار کر لی ہے حالانکہ اسلامی معاشرت کے برابر لباس میں بھی کوئی معاشرت نہیں ہو سکتی۔ کھلی ہوئی بات ہے کہ اسلام میں لباس کے متعلق ماذونات کی فہرست بڑی اور ممنوعات کی چھوٹی ہے اور ہمارے بھائیوں کی معاشرت میں ماذونات کی فہرست تنگ اور ممنوعات کی بڑی ہے۔

حیرت کی بات ہے کہ آپ رات دن وسعت وسعت پکارتے ہیں اور علماء کو رائے دیتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ معاشرت میں تنگی نہ ہونا چاہیے اور طرز عمل یہ ہے کہ آپ نے ایسی معاشرت اختیار کر رکھی ہے جس میں سراسر تنگی ہے۔ بھلا جس میں ماذونات کم اور ممنوعات زیادہ ہوں وہاں وسعت کہاں۔ آپ خود ہی تو ایک قاعدہ بتاتے ہیں کہ وسعت ہونی

چاہئے اور خود ہی اس کو توڑتے ہیں۔

یہاں سے معلوم ہوا ہوگا کہ درحقیقت آزادی شریعت ہی کی معاشرت میں ہے کیونکہ اس میں ماذونات زیادہ اور ممنوعات و قیود کم ہیں برخلاف جدید معاشرت کے کہ اس میں سراسر تنگی ہی تنگی ہے۔ یہ لوگ اس وقت تک کھا نہیں سکتے جب تک کرسی اور میز نہ ہو۔ اور ہم لوگ پلنگ پر کھا لیں، بستر پر کھالیں، بوریئے پر کھالیں بلکہ زمین پر بھی کھالیں ہمارے لئے کوئی قید نہیں۔ بتلایئے آزادی کی حالت میں کون ہے۔

جدید معاشرت

اب جدید معاشرت کو دیکھئے۔ میں ایک مرتبہ اپنے بھائی کے یہاں کھانا کھا رہا تھا۔ تو ہم لوگ فرش پر بیٹھے ہوئے کھا رہے تھے۔ اس وقت ایک جنٹلمین بھی مہمان تھے: وہ کھانے کے لئے اس حلیہ سے آئے کہ کوٹ پتلون میں جکڑے ہوئے تھے۔ بیچارے آکر کھڑے ہو گئے اور اس کے منتظر رہے کہ شاید میرے واسطے کرسی لائی جاوے مگر بھائی نے میری وجہ سے کرسی وغیرہ کا انتظام نہ کیا۔ دیر تک وہ کھڑے رہے مجھے شرم بھی آئی کہ ایسے کھڑے ہیں جیسے کوئی مانگنے آیا ہو بالآخر وہ بہ تکلف اس طرح بیٹھے کہ دونوں پیر ایک طرف لمبے کر دیئے اور دھم سے گر پڑے اور کہنے لگے کہ معاف فرمایئے گا میں پیر لمبے کرنے پر مجبور ہوں۔ میں نے کہا کہ معاف فرمایئے گا میں کرسی پر کھانے سے معذور ہوں۔ ان کو پیر لمبے کرنے سے شرم آتی تھی اور مجھے کرسی پر کھانے سے شرم آتی تھی۔ میری شرم ایسی تھی جیسے علامہ تفتازانی کی شرم تھی اور ان کی شرم تیمور لنگ جیسی تھی۔

واقعہ یہ ہے کہ تیمور لنگ دربار میں پیر پھیلا کر بیٹھا تھا کیونکہ اس کا

ایک پیر بوجہ لنگ کے سیدھا رہتا تھا۔ علامہ تفتازانی اُن کے زمانہ میں بہت بڑے عالم تھے۔ تیمور اُن کی اتنی وقعت کرتا تھا کہ دربار میں اُن کو اپنے پاس تخت پر بٹھلاتا تھا۔ جب پہلی مرتبہ علامہ تفتازانی دربار میں بلائے گئے اور تیمور نے اُن کو تخت پر بٹھلایا تو یہ بھی تیمور کی طرح ایک پیر لمبا کر کے بیٹھے تیمور نے ناگواری سے کہا ــــ "معذورم دار کہ مرا لنگ است" یعنی مجھے معذور سمجھئے کیونکہ میرے پیر میں لنگ ہے۔ میں نے قصداً پیر لمبا نہیں کیا جس کا آپ نے مقابلہ کیا ہے۔ علامہ نے جواب دیا ــــ "معذورم دار کہ مرا ننگ است" یعنے آپ بھی مجھے معذور سمجھئے کیونکہ مجھے ننگ وعار آتا ہے کہ ظاہر میں بادشاہ کی وضع سے کم تر وضع اختیار کروں۔ کیونکہ اس میں دیکھنے والوں کی نظر میں علم کی تحقیر ہے۔ تیمور خاموش ہو گیا۔ پھر ہمیشہ یہی دستور رہا کہ علامہ پاؤں پھیلا کر ہی تخت پر بیٹھتے تھے۔

اسی لئے میں نے بھی ان حضرت کے لئے کرسی نہ منگوائی کیونکہ اس میں اسلامی معاشرت کی توہین تھی۔ میں نے کہا اچھا ہے ذرا آج یہ اپنی معاشرت کا مزا تو چکھیں کہ اس میں کتنی مصیبت ہے تو یہ کیا آزادی ہے کہ انسان بدون کرسی اور میز کے بیٹھ ہی نہ سکے۔

ایک دفعہ میں کانپور کی مسجد میں حدیث شریف پڑھا رہا تھا کہ ایک انسپکٹر پولیس جو کہ جنٹلمین تھے اسی طرح کوٹ پتلون میں جکڑے ہوئے تشریف لائے اور لب فرش میرے منتظر کھڑے رہے کہ یہ اُٹھ کر میرے پاس آئیں اور میں باتیں کروں۔ مگر میں حدیث کو ان کے لئے کیوں چھوڑتا بالآخر تھوڑی دیر کھڑے رہ کر چل دیئے۔ واللہ اس لباس سے زیادہ کیا جیل خانہ ہوگا۔ جس میں کرسی کے آنے تک انسان کو مجرموں کی طرح کھڑا

رہنا پڑے۔

تو میں اس وقت جائز و ناجائز سے بحث نہیں کرتا یہ تو دوسری بات ہے۔ ان سب سے قطع نظر کر کے میں کہتا ہوں کہ دوسری قوموں کی معاشرت اختیار کر کے وہ امتیاز قومی کہاں رہا جس کے یہ لوگ بڑے مدعی ہیں۔ اور اسلام کی وقعت کہاں رہی جس کے حامی اور خادم ہونے کا ان کو دعوے ہے۔ کیا اسلام کی یہی وقعت ہے کہ تم دوسروں کی معاشرت اختیار کر کے زبان حال سے اسلامی معاشرت کا ناکافی ہونا ظاہر کرو نیز اس میں یہ خرابی الگ ہے کہ جس معاشرت کو آپ لے رہے ہیں اس میں تنگی اور قید بہت زیادہ ہے کہ ایک چیز کو دوسری لازم اور اس کو تیسری چیز لازم۔ ان قیود کی پابندی میں وہ آزادی کہاں رہی جس کا آپ سبق پڑھا کرتے ہیں۔

آج کل ہمارے نوجوان آزادی کا سبق پڑھ کر شادی بیاہ کی رسموں کو منع کرنے لگے ہیں مگر میں نے ایک موقع پر کہا تھا کہ یہ ہمارے لئے خوش کن بات نہیں کیونکہ آپ ان رسموں کو اپنی رسموں کے پورا کرنے کے لئے منع کرتے ہیں خدا و رسولؐ کی ممانعت کی وجہ سے منع نہیں کرتے۔ البتہ رسوم کو روکنا علماء کا حق ہے جن کا مذہب ہے تَرَکْتُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰی جَمِیْعًا۔

اور لیجئے سلام و کلام میں بھی ہمارے بھائیوں نے دوسروں کا طریقہ اختیار کر لیا ہے گو بانشریعت کی معاشرت کو بالکل چھوڑ دیا (کوئی ٹوپی اتار کر سلام کرتا ہے، کوئی انگریزی لفظوں میں سلام کرتا ہے، کوئی آداب و تسلیمات کہتا ہے وغیرہ وغیرہ)

مسئلہ استیذان

معاشرت کے بعض اجزاء کے متعلق تو بعض لوگوں کو یہ بھی خبر نہیں ہی کہ یہ شریعت کا حکم ہے بھی یا نہیں بلکہ اکثر لوگ اس کو اسلام سے خارج سمجھتے ہیں جیسے استیذان کا مسئلہ۔ اس کو بہت لوگ نئی بات سمجھتے ہیں اور اگر کوئی شخص یہ قانون مقرر کر دے کہ جب کوئی ملنے آئے تو پہلے اطلاع کر دے تو اس کو بدنام کرتے ہیں کہ اس نے انگریزوں کا طریقہ اختیار کر لیا حالانکہ استیذان کا مسئلہ اسلام ہی سے سب نے سیکھا ہے۔ چنانچہ یہ حکم قرآن میں موجود ہے، حدیث میں موجود ہے اور سلف کا طرز عمل بھی یہی تھا۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے خود اس پر عمل کر کے دکھلایا ہے البتہ اس کی حقیقت سمجھ لیجئے۔ کیونکہ جس طرح آج کل نوجوانوں نے طرز اختیار کیا ہے یہ انہوں نے حکم اسلامی کے اتباع کے لئے نہیں کیا بلکہ اس میں بھی وہ دوسری قوموں کا اتباع کرتے ہیں۔

تو سُن لیجئے کہ اسلام میں استیذان کے لئے کارڈ بھیجنے کی ضرورت نہیں اور نہ ہر جگہ اور ہر مکان کے لئے اجازت مانگنے کی ضرورت ہے، بلکہ جب قرائن سے یہ معلوم ہو جائے کہ کوئی شخص خلوت میں بیٹھا ہے (مثلاً بیٹھک کے کواڑ بند کر رکھے ہیں یا پردے چھوڑ رکھے ہیں یا زنانہ مکان ہے تو اس وقت استیذان کی ضرورت ہے۔ اور اگر مردانہ مکان ہے اور کواڑ بند نہیں نہ پردے چھوڑے ہوئے ہیں تو بلا استیذان کے جانا جائز ہے (مگر یہ کہ قرائن سے معلوم ہو جائے کہ اس وقت کسی ضروری کام میں مشغول ہے جس میں دوسروں کے آنے سے خلل واقع ہو گا) اور جہاں

استئذان کی ضرورت ہے ۔ ہاں یہ طریقہ ہے کہ پہلے جاکر سلام کرو السلام علیکم ! پھر اپنا نام بتلاکر کہو کہ میں اندر آسکتا ہوں ۔ اگر وہ اجازت دے چلے جاؤ ورنہ تین دفعہ اس طرح کر کے لوٹ آؤ ۔

چنانچہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور تین دفعہ اسی طرح کر کے واپس ہو گئے ۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خادم سے فرمایا کہ میں نے ابوموسیٰ کی آواز سنی تھی ان کو بلا لاؤ ۔ اس نے باہر آکر دیکھا تو وہ واپس ہو چکے تھے آکر عرض کیا تو فرمایا کہ جہاں ہوں وہیں سے بلا لاؤ ۔ جب وہ تشریف لائے تو پوچھا آپ واپس کیوں ہو گئے تھے ۔ فرمایا کہ ہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی حکم فرمایا ہے کہ تین دفعہ سلام و استئذان کے بعد جواب نہ آئے تو واپس ہو جایا کرو ۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ مسئلہ معلوم نہ تھا ۔ اس لئے فرمایا کہ تمہارے پاس کوئی گواہ ہے جو تمہارے موافق حضورؐ کے ارشاد کو بیان کر سکے ۔ حضرت ابوموسیٰ گواہ کی تلاش میں مسجد نبوی میں آئے جہاں انصار کا مجمع موجود تھا ۔ انہوں نے کہا کہ ہم سب اس مسئلہ پر گواہ ہیں مگر تمہارے ساتھ ہم اپنے میں سب سے چھوٹے کو بھیجیں گے تاکہ حضرت عمرؓ کو معلوم ہو جائے کہ انصار کے بچے بھی اس مسئلہ کو جانتے ہیں ۔ چنانچہ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ اس مجمع میں سب سے چھوٹے تھے وہ گواہی کے لئے حاضر ہوئے اور آکر بیان کیا کہ واقعی حضورؐ نے تین دفعہ کے بعد لوٹ جانے کا حکم دیا ہے ۔

یہ تو حضورؐ کا حکم ارشادی تھا ۔ حضورؐ نے اپنے عمل سے بھی اس حکم کو ظاہر فرمایا ہے ۔ چنانچہ ایک بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت سعد بن عبادہ

کے گھر تشریف لے گئے اور تین مرتبہ فرمایا السلام علیکم ادخل۔ حضرت سعدؓ تینوں دفعہ اس خیال سے خاموش رہے کہ اچھا ہے حضورؐ بار بار سلام فرمائیں تو ہم کو حضورؐ کی دعا کی برکت زیادہ نصیب ہو۔ جب تیسری دفعہ کے بعد پھر آپ نے سلام نہ کیا تو وہ گھر سے نکل کر دوڑے اور دیکھا کہ حضورؐ واپس تشریف لے جا رہے ہیں۔ جا کر حضورؐ سے عرض کیا کہ یارسول اللہ! میں تو مزید برکت حاصل کرنے کے لئے خاموش ہو رہا تھا، آپ واپس کیوں چلے۔ فرمایا کہ مجھ کو یہی حکم ہے کہ تین دفعہ سے زیادہ استیذان نہ کروں غرض پھر آپؐ واپس تشریف لے آئے۔

اگر آج کوئی ایسا قانون مقرر کر دے کہ اجازت لے کر آؤ اور تین دفعہ میں جواب نہ ملے تو واپس ہو جاؤ، تو لوگ اُس کو فرعون اور مغرور سمجھیں مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اور حضرات سلف کا یہی طریقہ تھا۔ اور تین دفعہ اجازت مانگنے پر اگر اجازت نہ ملے تو وہ بخوشی واپس ہو جاتے تھے گرانی مطلق نہ ہوتی تھی۔ تو دیکھئے، یہ صورت کیسی آسان ہے اور اس میں کس قدر مصالح ہیں۔ پس ہماری معاشرت ہر طرح سے مکمل ہے۔ کھانے پینے میں بھی اور ملنے ملانے میں بھی۔ مگر افسوس ہم لوگ اس کی قدر نہیں کرتے اور خواہ مخواہ دوسروں کے دروازوں پر دریوزہ گری کرتے ہیں۔

تصوّف کی حقیقت

پانچواں جزو دین کا تصوّف ہے۔ اس کو تو لوگوں نے بالکل ہی چھوڑ رکھا ہے۔ اکثر لوگوں نے تو تصوّف کے متعلق یہ سمجھ لیا ہے کہ یہ بہت ہی مشکل ہے کیونکہ اس میں بیوی بچوں کو چھوڑنا پڑتا ہے۔ یہ بالکل غلط ہے جناب تصوّف کی حقیقت ہے خدا تعالیٰ سے تعلق بڑھانا۔ سو اس میں تعلقات

ناجائز تو بے شک چھوڑنا پڑتے ہیں باقی تعلقات جائزہ ضرور یہ تو پہلے سے بھی بڑھ جاتے ہیں۔ صوفیہ کے تعلقات اور معاملات بیوی بچوں کے ساتھ ایسے خوشگوار ہوتے ہیں کہ اہل تمدن کے بھی ویسے نہیں ہوتے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ تصوف والے سنگ دل ہو جاتے ہیں حالانکہ وہ ایسے رحم دل ہوتے ہیں کہ انسان تو انسان جانوروں تک رحم کرتے ہیں۔ چنانچہ ان حضرات کے پاس رہ کر معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ ہر شخص کی راحت کا کس قدر خیال کرتے ہیں۔ لہٰذا اس سے متوحش ہونا نادانی ہے جس کی وجہ سے اسلام کا ایک ضروری جزو لوگوں سے فوت ہو رہا ہے۔ یہ جزو ایسا ضروری ہے کہ قرآن شریف میں اس کی تحصیل کا جا بجا امر ہے۔ حق تعالےٰ فرماتے ہیں۔

یَاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقٰتِہٖ

یعنی اے ایمان والو! حق تعالےٰ سے ڈرو جیسا کہ حق ڈرنے کا ہے اس میں تکمیل تقویٰ کا امر ہے۔ یہی تصوف کا حاصل ہے اور مشاہدہ ہے کہ ایسا ڈرنا سوائے صوفیہ کرام اہل اللہ کے کسی کو بھی نصیب نہیں ہے۔ ان کی بات بات میں خشیت ہوتی ہے۔ بیباکی اور آزادی کہیں نام کو بھی نہیں ہوتی۔ اب حدیث میں اس کی تاکید لیجیئے۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

اِنَّ فِیْ جَسَدِ ابْنِ اٰدَمَ مُضْغَۃً اِذَا صَلُحَتْ صَلُحَ الْجَسَدُ کُلُّہٗ وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ کُلُّہٗ اَلَا وَھِیَ الْقَلْبُ۔

یعنی انسان کے بدن میں ایک ٹکڑا ہے جب وہ درست ہو جاتا ہے تمام بدن درست ہو جاتا ہے اور جب وہ بگڑتا ہے تو تمام بدن بگڑ جاتا ہے۔ سُن لو وہ دل ہے۔ اس میں اصلاحِ قلب کی کتنی تاکید ہے کہ اسی کو مدارِ اصلاح قرار دیا گیا ہے اور یہی تصوف کا حاصل ہے۔ اس میں بھی

اصلاحِ قلب ہی کا اہتمام ہوتا ہے۔

اسلام کی حقیقت

ایک اور حدیث میں ہے (جو حدیث جبریل کے نام سے مشہور ہے) کہ ایک دفعہ حضرت جبریل علیہ السلام بصورت انسان حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مبارک میں حاضر ہوئے اور صحابہ کی تعلیم کے لئے انہوں نے حضورؐ سے چند سوالات کیے جن میں پہلا سوال یہ تھا۔

یَا مُحَمَّدُ اَخْبِرْنِیْ عَنِ الْاِسْلَامِ

اے حضورؐ! مجھے بتلایئے کہ اسلام کی حقیقت کیا ہے؟

قَالَ اَلْاِسْلَامُ اَنْ تَشْهَدَ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَتُقِيْمَ الصَّلٰوةَ وَتُؤْتِيَ الزَّكٰوةَ وَتَصُوْمَ رَمَضَانَ وَتَحُجَّ الْبَيْتَ اِنِ اسْتَطَعْتَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا۔

آپ نے فرمایا کہ اسلام یہ ہے کہ اللہ کے لاشریک لہ ہونے کی اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول اللہ ہونے کی گواہی دو اور نماز کی پابندی کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور رمضان کے روزے رکھو اور بیت اللہ کا حج کرو اگر وہاں تک پہنچنے کی استطاعت ہو۔

قَالَ فَاَخْبِرْنِیْ عَنِ الْاِيْمَانِ قَالَ اَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْقَدَرِ خَيْرِهٖ وَشَرِّهٖ۔

حضرت جبریلؑ نے پھر پوچھا کہ مجھے ایمان کی حقیقت بتلایئے۔ آپ نے فرمایا کہ ایمان یہ ہے کہ تم اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور سب کتابوں پر اور سب رسولوں پر اور قیامت کے دن پر اور تقدیر پر ایمان لاؤ اور

ان سب کی تصدیق کرو۔ اس سے معلوم ہوگیا کہ اسلام کے لئے تصدیق رسالت اور ایمان کے لئے قیامت اور تقدیر اور ملائکہ کی تصدیق کی بھی ضرورت ہے اس کے بدون آدمی مومن نہیں ہو سکتا۔ اور ظاہر ہے کہ قیامت کا ماننا اس کا نام نہیں کہ جس طرح جی چاہے مان لے بلکہ جس طرح حضورؐ نے بتلایا ہے اس طرح مانے۔ تو اس میں حساب کتاب اور وزن اعمال اور پلصراط وغیرہ سب کا ماننا داخل ہے۔ اسی طرح یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اسلام کا ایک جزو اعمال بھی ہیں۔ پس اس سے اُن لوگوں کی غلطی واضح ہو گئی جنہوں نے اجزاء دین میں انتخاب کر رکھا ہے جیسا کہ اوپر مفصلّ ذکر ہو چکا)

قَالَ فَاَخْبِرْنِيْ عَنِ الْاِحْسَانِ قَالَ اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ۔

پھر حضرت جبرئیلؑ نے پوچھا کہ بتلائیے احسان (واخلاص) کیا چیز ہے آپ نے فرمایا احسان یہ ہے کہ تم خدا تعالٰے کی عبادت اس طرح کرو گویا اُسے دیکھ رہے ہو۔ کیونکہ اگر تم اُسے نہیں دیکھتے تو وہ یقیناً تم کو دیکھ رہا ہے (اور اس کا بھی مقتضا یہی ہے کہ جیسی عبادت خود اُن کو دیکھ کر کرتے ویسی ہی اب بھی کرو کیونکہ نوکر کو اگر یہ معلوم ہو جائے کہ حاکم مجھے دیکھ رہا ہے گو اُسے نظر نہ آتا ہو جب بھی وہ ایسا ہی کام کرتا ہے جیسا کہ خود اُسے آنکھوں سے دیکھ کر کرتا ہے) اس سے معلوم ہوا کہ اسلام و ایمان کی تکمیل کرنے والی ایک تیسری چیز اور ہے جس سے عبادت بدرجہ کمال ادا ہوتی ہے وہ احسان ہے اور اس کی تحصیل تصوف میں مطلوب ہے)

اقسامِ اعمال

حقیقت اس کی یہ ہے کہ اعمال دو قسم کے ہیں۔ ایک اعمال جوارح۔

دوسرے اعمالِ قلب۔ اعمالِ جوارح تو عبادات و معاملات و معاشرت وغیرہ ہیں۔ اور اعمالِ قلب کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جن کا معلوم کرنا اور یقین کر لینا کافی ہے ان کو عقائد کہتے ہیں۔ دوسرے وہ جن کو قلب کے اندر پیدا کرنا اور ان کی اضداد سے دل کو پاک کرنا ضروری ہے جیسے اخلاص و صبر و شکر و محبت و خشیت و رضا و توکل و تواضع و قناعت وغیرہ۔ ان کا تو حاصل کرنا ضروری ہے اور ان کے اضداد کا دل سے نکالنا ضروری ہے جیسے ریا، وکبر و غصہ و طمع و حُبِ دنیا وغیرہ۔ غرض کچھ کرنے کے کام ہیں اور کچھ نہ کرنے کے اور اسی سے اعمالِ جوارح عبادات وغیرہ درجۂ کمال پر پہنچتے ہیں اور ان سب کی تکمیل کا نام احسان ہے۔

اب قرآن و حدیث سے دیکھیے کہ ان اعمالِ باطنہ کی تاکید ہے یا نہیں اور یہ معلوم ہوتا ہے امر و نہی اور وعدہ وعید سے سو قرآن میں ہے

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَاءُوْنَ۔

اس میں نماز میں ریا و غفلت پر سخت وعید ہے) اور حدیث میں ہے۔

لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِيْ قَلْبِهٖ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِّنْ كِبْرٍ۔

یعنے جنت میں وہ شخص داخل نہیں ہوگا جس کے دل میں ذرہ برابر بھی تکبر ہو۔ اسی طرح قرآن و حدیث کو دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ جا بجا اخلاقِ رذیلہ کی ممانعت اور ان پر وعید مذکور ہے اور اخلاق حمیدہ کی تاکید اور ان پر وعدہ موجود ہے۔ تو اس جزو اخلاق کا حاصل کرنا واجب ہوا اور یہی حقیقت ہے تصوف کی۔ پس تصوف کا جزو دین ہونا ثابت ہوگیا۔

مگر قاعدہ ہے کہ ہر چیز کے کچھ توابع اور ذرائع ہوا کرتے ہیں۔ جیسے

حج کے لئے سفر کرنا اور زادِ راہ ساتھ لینا جس سے وصول میں سہولت ہو اسی طرح تصوف میں اصل مقصود تو اصلاحِ قلب ہے کہ اخلاقِ حمیدہ حاصل اور رذیلہ زائل ہوں مگر اس مقصود کے لئے کچھ توابع و ذرائع ہیں جن سے مقصود میں آسانی ہو جاتی ہے جیسے اذکار و اشغال و احوال و کیفیات جن کو آج کل لوگوں نے غلطی سے مقصود قرار دے لیا ہے مگر یہ محض توابع و ذرائع ہیں۔ اصل مقصود اصلاحِ قلب ہے۔ اور اس مقصود کا بھی ایک مقصود ہے یعنی رضائے حق جس کا ثمرہ ہے قربِ باری تعالیٰ۔

پس حاصل یہ ہوا کہ دین کی ترتیب اس طرح ہوئی کہ اوّل تو عقائد کو صحیح کرے۔ پھر اعمالِ جوارح عبادات و معاملات و معاشرات کو درست کرے۔ پھر اصلاحِ قلب کا اہتمام کرے جس کا طریقہ کسی شیخِ کامل سے پوچھے اور اُس کے کہنے کے موافق ذکر و شغل میں لگے۔ اس سے اعمالِ قلب کی اصلاح آسانی سے ہو گی۔ کیونکہ ذکر و شغل سے حق تعالیٰ کے ساتھ تعلق بڑھ جاتا ہے تو قلب میں اخلاقِ حمیدہ کی قابلیت جلدی پیدا ہو جاتی ہے اسی لئے ذکر کے ساتھ اخلاق کی طرف بھی توجہ رکھنا چاہیئے (کیونکہ اصل چیز یہی ہے جس کی تحصیل ضروری اور فرض ہے رہا ذکر و شغل وہ تو امر مستحب ہے جو اس مقصود کا ذریعہ ہے) یہ ہے امرِ مہم اور یہ ہے اصلی درس مگر بعض لوگ صرف ذکر و اشغال پر اکتفا کرتے ہیں اخلاق کی درستی کا اہتمام نہیں کرتے۔ یہ حقیقت سے ناواقفی کی دلیل ہے۔ اور اخلاقِ باطنیہ کی درستی اس طرح ہوتی ہے کہ شیخ کے سامنے اپنے امراضِ قلبیہ بیان کئے جائیں کہ ہمارے اندر فلاں فلاں امراض ہیں ریا یا عجب و کبر وغیرہ۔ پھر جو تدبیر شیخ بتلائے اُس پر عمل کرے جیسا کہ امام غزالی نے ہر ہر مرض کی حقیقت

اور ہر ایک کا جدا جدا علاج (احیاء العلوم میں) بیان فرمایا ہے۔ صحیح طریقہ تو یہ ہے تصوّف کا اور ایک وہ ہے جو آج کل لوگوں نے اپنی رائے سے سمجھ رکھا ہے۔ بس ذکر و شغل ہی پر کفایت کرنے لگے۔ یاد رکھو اس طرح باطن کی اصلاح نہیں ہوتی۔ بلکہ صورت وہی ہے کہ امراض کا علاج بھی کرے۔ مثلاً ایک شخص میں تکبّر ہے تو شیخ کو چاہیئے کہ ذکر و شغل کے ساتھ اُس کے سپرد ایسا کام بھی کرے جس سے نفس میں تواضع پیدا ہو۔ مثلاً نمازیوں کے لئے لوٹے بھر بھر کے رکھنا، اُن کی جوتیاں سیدھی کرنا وغیرہ۔ اور اگر شیخ نہ بتلاوے تو طالب کو خود ایسے کام کرنے چاہئیں۔ جن سے نفس میں تذلّل پیدا ہو و علیٰ ہذا۔ اگر کسی میں حسد ہے تو اُس کو چاہیئے کہ محسود کی تعریفیں کیا کرے۔ اس سے قلب کا غبار نکل جائے گا۔ اسی طرح ہر ہر مرض کا ایک خاص علاج ہے جو تصوّف کی کتابوں سے معلوم ہو سکتا ہے ——— یہ ہے تہذیب اخلاق۔

اس کے بعد اس کا ثمرہ ہے یعنی رضائے حق۔ مگر آج کل لوگوں نے ثمرہ اس کو سمجھ لیا ہے کہ کچھ لطائف جاری ہو جائیں، کچھ گریہ اور رقّت طاری ہونے لگے۔ صاحبو! یہ تو احوال ہیں جو غیر اختیاری ہیں۔ یہ مطلوب نہیں ہیں مطلوب وہ امور ہیں جو بندہ کے اختیار میں ہیں یعنی اخلاق حمیدہ کا حاصل کرنا اور رذائل کا علاج کرنا۔ اسی طرح کشف بھی مطلوب نہیں۔ جس کو کشف ہوتا ہو اُس کے لئے نعمت ہے شکر کرے بشرطیکہ غوائل کبر و عجب وغیرہ سے محفوظ ہو اور جس کو نہ ہوتا ہو اُس کے درپے نہ ہو۔ وہ سمجھ لے کہ میرے لئے کامیابی کا طریقہ یہی تجویز کیا گیا ہے کہ کشف نہ ہو کیونکہ بعض دفعہ کشف سے انسان بہت سی بلاؤں میں پھنس جاتا ہے۔ بس تم اپنے لئے کوئی طریقہ

تجویز نہ کرو ؎

بدرد و صاف ترا حکم نیست دم درکش
کہ آنچہ ساقی ما ریخت عین الطاف است

اور فرماتے ہیں ؎

تو بندگی چو گدایاں بشرط مزد مکن
کہ خواجہ خود روش بندہ پروری داند

اور ساری وجہ پریشانی کی یہی ہوتی ہے کہ لوگ حالات و کیفیات کو مقصود سمجھتے ہیں۔ حالانکہ میں نے بتلا دیا کہ یہ مقاصد میں سے نہیں محض توابع و ذرائع ہیں۔ جو ہر اک کو مختلف طور پر پیش آتے ہیں۔ بس یہ خلاصہ ہے دین کا کہ ان پانچوں اجزاء کو حاصل کیا جائے۔ اسی کا بیان مختصر لفظوں میں اس آیت میں حق تعالیٰ نے فرمایا ہے اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَیَجْعَلُ لَھُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا ؁ ان پانچوں اجزا کی تحصیل پر آپ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کے مصداق بن گئے۔ پھر اس پر وہ ثمرہ مرتب ہوگا جو آیت میں مذکور ہے یعنی حق تعالیٰ کی محبوبیت حاصل ہوگی۔ جس کا تفصیل کے ساتھ پہلے ذکر ہو چکا ہے ـــــ آج تو تفصیل طریق کا بیان تھا سو بحمد اللہ اس وقت بقدر ضرورت طریق کی تفصیل بھی بیان کر دی ہے۔ اب عمل کرنا آپ کا کام ہے اب دعا کیجیے کہ حق تعالیٰ ہم کو فہم سلیم عطا فرمائیں اور عمل کی ہمت دیں

آمین وَصَلَّی اللّٰہُ عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ سَیِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی
اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ بِعِزَّتِہٖ وَجَلَالِہٖ
تَتِمُّ الصّٰلِحٰتُ

ـــ ؞ ؞ ـــ

الکمال فی الدین

(للرجال)

تکمیل دین کی ضرورت اور اس کے طریق کے متعلق یہ وعظ محلہ بلی ماران مسجد پنجابیاں دہلی میں ۲۵ ذوالحجہ سنہ ۱۳۴۰ھ بروز یکشنبہ بوقت صبح ۷ بج کر ۵ منٹ پر شروع ہو کر سوا گیارہ بجے ختم ہوا قریباً تین ہزار کا مجمع تھا اور یہ سارا وقت کھڑے ہو کر بیان فرمایا۔ یہ مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی نے قلمبند فرمایا

خدا تک پہنچنے کا آسان ترین راستہ یہ ہے کہ ہم کو اپنی ناقص حالت پر قناعت نہ کرنی چاہیئے بلکہ کمالِ دین حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ جس کا طریقہ یہ ہے کہ اعمال کو کامل کیا جائے۔ فرائض و واجبات کے بجالانے میں کوتاہی نہ ہو اور محرمات کا ارتکاب نہ ہو۔ اور اعمال کے کامل کرنے میں نفس جو مزاحمت کرے اُس کے علاج کیلئے کاملین کی صحبت اختیار کی جائے ــــــــ!

خطبۂ ماثورہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الحمد للہ نحمدہٗ ونستعینہٗ ونستغفرہٗ ونومن
بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا و
من سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہٗ
ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا اللہ
وحدہٗ لاشریک لہ ونشھد ان سیدنا و مولانا
محمدًا عبدہٗ و رسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ
اٰلہ واصحابہ وبارک وسلم امابعد فاعوذ باللہ من
الشیطان الرجیم ۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم ۔
یاایھا الذین اٰمنوا اتقوا اللہ وکونوا مع الصدقین ہ

تمہید

یہ ایک مختصر آیت ہے جس میں حق تعالیٰ نے ایک مقصود کا بیان فرمایا ہے اور اُس کے ساتھ ہی اُس کے طریق کی تعیین فرمائی ہے اور آگے چل کر میں اس کو واضح کر دوں گا کہ وہ طریق نہایت ہی آسان ہے۔ حاصل یہ ہے کہ ہر شخص جانتا ہے کہ ہر انسان کا ایک مقصود ہوتا ہے اور ایک اُس کی تحصیل کا طریق ہوتا ہے۔ پھر طریق کبھی سہل ہوتا ہے کبھی دشوار۔ اگر مقصود متعین ہو اور اس کا طریق معلوم ہو اور وہ طریق سہل بھی ہو تو بہت جلد کامیابی ہو جاتی ہے۔ ناکامی کا راز صرف یہی ہے کہ یا تو مقصود متعین نہ ہو یا طریق صحیح نہ معلوم ہو یا وہ طریق دشوار ہو جس کے حاصل کرنے کی ہمت نہیں۔

ناکامی کا راز

مثلاً ایک شخص بیمار ہے۔ اُس کی ناکامی کا سبب کبھی یہ ہوتا ہے کہ اُس کو صحت کا مقصود ہونا معلوم نہ ہو۔ اس لئے وہ صحت کے لئے کوشش اور تدبیر ہی نہیں کرتا یا صحت کا مقصود ہونا تو معلوم ہے لیکن یہ معلوم نہیں کہ

صحت حاصل کرنے کا طریقہ معالجہ ہے یا یہ بھی معلوم ہے لیکن طریق معالجہ میں غلطی کر رہا ہے صحیح طریق پر چلتا نہیں۔ اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ مقصود بھی معلوم طریق بھی معلوم اور اس کا صحیح ہونا بھی معلوم مگر ہمت نہیں ہوتی۔ مثلاً یہ معلوم ہے کہ مقصود صحت ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ اس کا طریق معالجہ ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ طبیب ماہر فن ہے۔ جو صحیح طریق سے معالجہ کرتا ہے لیکن دشواری یہ ہے کہ حکیم صاحب نے سو روپیہ کا نسخہ لکھ کر دیا ہے اور یہ شخص غریب ہے جو سو روپیہ کا نسخہ استعمال کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ اسی طرح تمام دنیاوی امور میں ناکامی کا سبب یہی ہوتا ہے کہ کبھی مقصود معلوم نہیں ہوتا کبھی طریق معلوم نہیں ہوتا۔ کبھی طریق میں غلطی ہوتی ہے کبھی طریق دشوار ہوتا ہے ـــــــ،

مثلاً ایک شخص کو کسب کا مقصود ہونا ہی معلوم نہیں اس لئے وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہتا ہے۔ یا کسب کا مقصود ہونا معلوم ہے مگر اس کا طریق معلوم نہیں۔ یہ دونوں شخص بھوکوں مریں گے۔ یا کسب کا طریق معلوم ہے لیکن سب نے معاش حاصل کرنے کا طریق تجارت کو بتلایا کیونکہ وہ لوگ تجارت کرنے والے تھے اور اُن کو تجارت میں بہت کچھ نفع ہو چکا تھا، اس لئے وہ ہر شخص کو یہی بتلاتے ہیں کہ معاش کا طریق تجارت ہے مگر اس کے لئے روپیہ کی ضرورت ہے اور اس شخص نے کبھی روپیہ کی صورت نہیں دیکھی۔ یہ شخص بھی بھوکا مرے گا۔ کیونکہ گو اس کو مقصود بھی معلوم ہے، طریق بھی جانتا ہے لیکن لوگوں نے اُس کو ایسا طریقہ بتلایا ہے جو اُس کے قبضہ سے باہر ہے۔ کسی شفیق نے اُس کو مزدوری کا طریقہ نہیں بتلایا جس میں صرف ہاتھ پیر چلانے کی ضرورت ہے روپیہ کی کچھ ضرورت نہیں۔

غرض اسی طرح تمام کاموں میں غور کر لیجئے۔ تو ناکامی کا راز بھی معلوم ہو جائے گا۔

تمنّا اور طریق کا فرق

عدم تعیین مقصود و عدم تعیین طریق یا عدم سہولت۔ اور ان دونوں کی تعیین و تسہیل کے بعد جو ناکام رہے گا وہ محض اپنی سستی اور کاہلی کی وجہ سے ناکام رہے گا۔ یہ شخص حصول مقصود کا طریق محض تمنا کو سمجھتا ہے اور یہ سخت غلطی ہے محض تمنا واسطہ ہونے کے قابل نہیں۔ مثلاً ایک شخص گھر میں غلہ جمع کرنا چاہے لیکن نہ کھیتی کرے نہ بیج ڈالے نہ کچھ کرے تو اس کا گھر غلہ سے ہرگز نہ بھرے گا گو وہ کتنی ہی تمنّا کرتا رہے کیونکہ عادت اللہ اس طرح جاری نہیں ہے کہ محض تمنا سے گھر بھر جایا کرے۔ یوں قدرت ظاہر کرنے کے لئے کبھی حق تعالیٰ ایسا کر دیں تو وہ شاذ و نادر ہے وَالنَّادِرُ کَالْمَعْدُوْمِ خدا تعالیٰ کی قدرت میں یہ ضرور ہے کہ بدون کسب وغیرہ کے بھی گھر بھر دیں۔ اور بعض دفعہ اس کا وقوع بھی ہوا ہے کہ بعض لوگوں کو بے گمان کسی جگہ سے خزانہ مل گیا اور وہ امیر کبیر ہو گئے مگر اس کا وعدہ نہیں ہے۔ پس جب نہ عادت اللہ اس طرح جاری ہے نہ کوئی وعدہ کیا گیا ہے پھر کس بھروسے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھا جاوے۔

مثلاً حق تعالیٰ نے اپنی قدرت دکھانے کے لئے حضرت مریم علیہا السلام کو ایک بیٹا بدون باپ کے دیا تھا۔ مگر عادت اللہ یہی ہے کہ بدون باپ کے لڑکا نہیں ہوتا۔ اب اگر کوئی عورت اولاد کی تمنا کرے اور یوں چاہے کہ مریم علیہا السلام کی طرح میرے بھی بدون نکاح کے لڑکا ہو جائے تو اس کو سب پاگل کہیں گے اور یہ سمجھا جائے گا کہ اس کو اولاد مقصود نہیں

ہے۔ اگر اولاد مقصود ہوتی تو یہ نکاح ضرور کرتی۔

اسی طرح حق تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو بدون ماں باپ کے پیدا کیا تھا۔ اب اگر کوئی مرد یہ تمنّا کرنے لگے کہ میرے بھی کوئی لڑکا آدم علیہ السلام کی طرح ہو جائے کہ نہ مجھے نکاح کرنا پڑے نہ عورت کے پاس جانا پڑے۔ بس مٹی سے بنا بنایا پتلا پیدا ہو جائے۔ تو سب لوگ اُس کو احمق سمجھیں گے اور یہی کہیں گے کہ اس کو اولاد مقصود نہیں ورنہ یہ نکاح ضرور کرتا۔۔۔۔

غرض دنیا کے کاموں میں تمام عقلاء اسباب کے اختیار کرنے کو ضروری سمجھتے ہیں اور محض تمنّا کو کافی نہیں سمجھتے بلکہ تمنّا مجرّد عن الاسباب کو حماقت پر محمول کرتے ہیں حالانکہ بعض اسباب پر مسبّبات کا ترتب یقینی بھی نہیں۔ چنانچہ بعض لوگ تجارت کرتے ہیں اور ان کو نقصان ہوتا ہے بعض ملازمت کرتے ہیں اور تنخواہ نہیں ملتی۔ بعضے محنت مزدوری کرتے ہیں مگر مزدوری نہیں ملتی۔ بعضے صنعت و حرفت جانتے ہیں اور اُن کو کوئی کام پر نہیں لگاتا۔ لیکن محض توقع کی بناء پر سب عقلاء نے ان اسباب کی ضرورت پر اتفاق کر لیا ہے۔

دین میں تنگی نہیں!

مگر حیرت در حیرت ہے کہ دین میں اس قاعدہ سے کام نہیں لیا جاتا حالانکہ وہ مقصودیت میں سب سے بڑھا ہوا ہے کیونکہ مسلمان کا عقیدہ ہے کہ دنیا سے دین مقدم ہے۔ پھر اُس کے طُرق بھی معیّن و معلوم ہیں اور ان طُرق کی صحت بھی معلوم ہے کیونکہ خدا و رسولؐ کے کلام کا صادق ہونا مسلمانوں کے عقیدہ میں داخل ہے۔ پھر وہ طرق و اسباب دشوار بھی نہیں ہیں

یہ مطلب نہیں کہ اُن کے لئے ارادہ کی بھی ضرورت نہیں۔ میں ارادہ کی نفی نہیں کرتا بلکہ مشقت کی نفی کرتا ہوں کہ اسباب دینیہ میں دشواری اور مشقت کچھ نہیں۔ ارادہ کی بے شک ضرورت ہے اور اس کی سب سے بڑھ کر دلیل حق تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ——— اور ——— يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ۔

خدا نے تمہارے لئے دین میں کچھ تنگی نہیں کی حرج وکرہ تحت نفی ہے جو عموم کو مفید ہے مطلب یہ ہوا کہ خدا نے دین میں کچھ بھی تنگی نہیں کی۔ اس میں مطلق کچھ دشواری نہیں۔ دوسری آیت میں ارشاد ہے کہ خدا تعالیٰ تمہارے ساتھ آسانی کرنا چاہتے ہیں تم کو دشواری میں ڈالنا نہیں چاہتے۔

قرآن پر مسلمانوں کا ایمان ہے۔ اس لئے اس دعویٰ کے ثابت کرنے کے لئے صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ دین میں کچھ تنگی نہیں لیکن میں اسی پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ ترقی کر کے کہتا ہوں کہ یہ مسئلہ عقلاً بھی ثابت ہے کیونکہ جس وقت قرآن نازل ہوا ہے تمام کفار اُس کی مخالفت پر آمادہ اور اُس میں عیب نکالنے کے درپے تھے۔ وہ قرآن کی تکذیب کے لئے بہانے ڈھونڈھتے رہتے تھے۔ اِدھر قرآن میں تمام عالم کو دعوت دی گئی کہ وہ قرآن کا مثل بنا لاویں جس سے اُن کو اور بھی زیادہ اشتعال ہو گیا تھا۔ پھر اُس وقت سے لے کر اس وقت تک ہر زمانہ میں ملاحدہ اور مخالفین نے قرآن پر اعتراض کرنے کی کوشش کی ہے اور قرآن میں یہ دعوے بڑے شد و مد کے ساتھ کیا گیا ہے کہ دین میں کچھ تنگی نہیں۔ اگر یہ دعوے کمزور ہوتا اور اس میں کچھ بھی خلاف واقع ہونے کی بُو ہوتی تو ملاحدہ اور

کفار و مشرکین ہرگز اعتراض سے نہ چوکتے وہ ضرور اُس کی تکذیب کرتے اور قرآن کی مخالفت کے لئے اچھا خاصہ بہانہ اُن کے ہاتھ آجاتا کہ دیکھئے قرآن کا یہ دعوے کتنا خلافِ واقع ہے کہ جو دین اس قدر دشوار ہے اس کو آسان بتلایا گیا ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ اس میں کچھ تنگی نہیں ہے لیکن کسی ملحد یا مخالف نے آج تک قرآن کے اس دعویٰ کی تکذیب نہیں کی ورنہ اور اعتراضوں کی طرح یہ اعتراض بھی ضرور منقول ہوتا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ مخالفین کو اس دعوے میں چون وچرا کی کچھ بھی گنجائش نہیں ملی

آج کل کے اعتراضات

مگر افسوس ہے کہ اس زمانہ میں قرآن پر اعتقاد رکھنے والے یعنی بعضے مسلمان اس دعویٰ پر اعتراض کرتے ہیں جس پر مخالفین کو بھی حرف گیری کا موقع نہ ملا تھا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اُن کو اس پر اعتقاد نہیں۔ اعتقاد تو ہے مگر حالت یہ ہے کہ اگر وہ قرآن کے اس دعوے کی تکذیب نہیں کرتے تو دل کھول کر تصدیق بھی نہیں کرتے۔ اس کی تصدیق کرتے ہوئے اُن کے دل رکتے ہیں۔ مگر جس مسئلہ کو مخالف بھی تسلیم کر چکا ہو اُس پر مسلمانوں کا اعتراض کرنا بڑی شرمناک بات ہے۔

صاحبو — میں بقسم کہتا ہوں کہ قرآن کا یہ دعویٰ بالکل سچا اور صحیح ہے اگر اس میں کچھ بھی کمزوری ہوتی تو ملاحدہ ہرگز نہ چوکتے۔ خصوصاً جب کہ وہ ان کمزور مسلمانوں کے وہ دلائل بھی سُن لیتے جو آج کل اس کے خلاف بیان کئے جاتے ہیں کہ صاحب دین پر عمل کرنا بہت دشوار ہے۔ اگر تجارت کرو تو بات بات پر شریعت کا فتویٰ یہ ہے کہ اس صورت میں ربوا لازم آگیا۔ اس صورت میں ثمن مجہول ہے اس لئے بیع فاسد ہے۔ اس صورت میں

یہ شرط فاسد ہے۔ کسی صورت میں جہالت بیع کی وجہ سے بیع فاسد ہے اور ہم کو تجارتی معاملات اہلِ یورپ سے اُس طریق پر کرنے پڑتے ہیں جو اُن کے یہاں رائج ہے۔ اور اہلِ یورپ بالکل آزاد ہیں۔ اُن کے معاملات کی اکثر صورتیں خلافِ شریعت ہیں۔ اب اگر تجارت کریں تو دین پر کس طرح قائم رہیں اور دین پر قائم رہیں تو تجارت کس طرح چلے۔ قرض بلا سود کہیں سے نہیں ملتا اور تجارتی کاروبار بدون قرض کے نہیں چل سکتا۔ اب کریں تو کیا کریں؟

ملازمت کا حال یہ ہے کہ اُس میں بھی بعض کام خلافِ شرع کرنے پڑتے ہیں۔ زراعت میں بھی قدم قدم پر شرعی احکام رکاوٹ پیدا کرتے ہیں۔ میں ان سب اعتراضوں کا بھی جواب دوں گا بلکہ اور بھی کوئی اعتراض کسی کے ذہن میں ہو تو انشاء اللہ وہ بھی اس جواب سے حل ہو جائے گا۔

وضاحتی تمثیلات

مگر جواب سے پہلے میں ایک مثال بیان کرتا ہوں۔ اگرچہ حکایت گندی ہے مگر اس حالت کے بالکل ہی مطابق ہے اور یہ قاعدہ ہے کہ مثال سے مضمون جلدی ذہن نشین ہو جاتا ہے۔ ہمارے قصبہ میں ایک عورت مغرب کے وقت اپنے بچّہ کو پاخانہ پھرا رہی تھی۔ چاند رات کا موقع تھا۔ بچّے اور عورتیں عید کا چاند دیکھ رہی تھیں۔ یہ عورت بھی بچّہ کو پونچھ پانچھ کر چاند دیکھنے کھڑی ہوئی۔ جلدی میں کچھ پاخانہ انگلی کو لگا رہ گیا۔ جلدی میں اُسے خبر نہ رہی کہ میری انگلی میں کیا لگا ہوا ہے۔ اُس نے عورتوں کی عادت کے موافق ناک پر انگلی رکھ کر چاند دیکھا تو اُس میں سے پاخانہ کی بدبو آئی۔ تو آپ فرماتی ہیں کہ اے ہے اب کے عید کا چاند سڑا ہوا کیوں

نکلا ـــــ ا

تو جس طرح اس عورت کو اپنی انگلی کا پاخانہ چاند میں محسوس ہوتا تھا اور وہ یہ سمجھتی تھی کہ چاند سڑا ہوا نکلا ہے۔ اب صاحبو، خدا کی قسم! اسی طرح جو تم کو دین میں تنگی نظر آرہی ہے، یہ دین کی تنگی نہیں بلکہ حقیقت میں یہ تنگی تمہارے اندر ہے۔ تمہارے تمدن اور معیشت میں تنگی ہے جس کو میں آگے وضاحت کے ساتھ بتلا دوں گا۔ مگر آپ کی یہ حالت ہے کہ اپنی انگلی کو تو آپ دیکھتے نہیں کہ اس میں نجاست لگی ہوئی ہے خواہ مخواہ ماہتاب شریعت کو بدبو دار بتلاتے ہیں حالانکہ وہ اتنی بلندی پر ہے کہ یہ گندگیاں اس کے پاس بھی نہیں پھٹک سکتیں۔

جیسے ایک حبشی کا قصہ ہے کہ اس کو راستہ میں ایک آئینہ پڑا ہوا ملا تو آپ نے اس کو اٹھا لیا اور اس میں اپنا چہرہ دیکھنا شروع کیا تو ایک ڈراؤنی صورت، بھدی شکل اس میں نمودار ہوئی تو آپ کو یہ خیال ہوا کہ یہ صورت اس آئینہ میں پہلے ہی سے بنی ہوئی ہے۔ اپنی نسبت یہ بدگمانی نہ ہوئی کہ شاید یہ میری ہی صورت دلفریب ہو۔ کیونکہ آدمی کو اپنی صورت تو نظر نہیں آتی۔ اس لئے اپنی صورت کا بھلا برا ہونا خود کو کم معلوم ہوتا ہے تو اس حبشی نے آئینہ میں اپنی صورت دیکھ کر اس کو پھینک دیا اور کہا کہ ایسی بری صورت کا تھا جبھی تو تجھے کوئی یہاں پھینک گیا۔

صاحبو ـــ اسی طرح آپ کو اپنی مہیب صورت دین کے آئینہ میں نظر آتی ہے جس کو آپ سمجھتے ہیں کہ یہ سارا بھدا پن نعوذ باللہ دین کے اندر ہے حالانکہ اس میں تو اس قدر صفائی اور نور ہے کہ ظلمت اور سیاہی کا وہاں قائم بھی نہیں لیکن شفاف ہونے کی وجہ سے آپ کو اپنی صورت اس

میں نظر آرہی ہے جس کو آپ دین کی صورت سمجھے ہوئے ہیں اس کی نظیر میں مولانا فرماتے ہیں ؎

حملہ بر خود میکنی اے سادہ مرد
ہم چو آں شیرے کہ بر خود حملہ کرد

اس کا قصہ مولانا نے مثنوی میں بیان فرمایا ہے کہ ایک مرتبہ نچیروں نے باہم مشورہ کیا کہ شیر روزانہ ہم کو پریشان کرتا ہے اور ایک دو کو شکار کر لیتا ہے جس سے ہر ایک کو روزانہ اپنی جان کا خطرہ رہتا ہے اور اس خطرہ سے زندگی تلخ رہتی ہے آؤ ہم سب چل کر شیر سے یہ کہیں کہ وہ اس طرح ہم کو پریشان نہ کیا کرے۔ ہم روزانہ اپنے میں سے ایک کو اُس کی غذا کے لئے بھیج دیا کریں گے جس سے دوسروں کو تو اطمینان ہو جائے گا چنانچہ سب نے جا کر شیر سے یہ بات کہی اُس نے منظور کر لیا۔ کیونکہ اس میں اُس کو بھی راحت تھی کہ روزانہ بے محنت و مشقت گھر بیٹھے غذا مل جایا کرے گی اب نچیروں نے قرعہ ڈال کر روزانہ ایک شکار کو شیر کے پاس بھیجنا شروع کیا۔ جس کا نام قرعہ میں نکل آتا، سب اُس کو مجبور کر کے شیر کے پاس بھیج دیتے ——،

ایک دن خرگوش کی باری آئی سب نے اُس سے کہا کہ جاؤ آج شیر کی غذا تم ہی ہو۔ کہنے لگا کہ میں تو نہیں جاتا۔ یہ کون سی عقلمندی ہے کہ اپنے ہاتھوں موت کے منہ میں چلا جاؤں۔ یہ تو خودکشی ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ بھائی یہ بات مناسب نہیں۔ شیر سے وعدہ خلافی ہو گی۔ کہنے لگا کہ یہ وعدہ خود ہی ناجائز ہے کیونکہ یہ خودکشی کو مستلزم ہے اور ناجائز وعدہ کا ایفا واجب ہی نہیں۔ اب تو نچیروں میں کھلبلی پڑ گئی۔ سارے اکٹھے ہو گئے اور خرگوش

کو سمجھانے لگے کہ اگر تُو نہ گیا تو شیر کو غصہ آجائے گا۔ اُس نے کہا کہ بلا سے اگر اُسے غصہ آوے گا تو سبھی پر آوے گا۔ پھر جس کی موت آگئی ہو گی، اُسے کھالے گا۔ ممکن ہے کہ اس صورت میں میں بچ جاؤں۔ اور جو صورت تم تجویز کر رہے ہو اس میں تو میری موت یقینی ہے۔ اور موت محتمل پر موت یقینی کو کون گوارا کر سکتا ہے یہ تو بالکل عقل کے خلاف ہے۔ وہ کہنے لگے کہ اس وعدہ خلافی سے فتنہ برپا ہو جائے گا۔ اُس نے کہا کہ میرے لئے تو آج ہی فتنہ آگیا مجھے فتنہ کی کیا پرواہ ہے۔ میرے لئے موت سے بڑھ کر کیا فتنہ ہے۔ بیش بریں نیست کہ وہ غصہ میں آکر مجھے کھالے گا تو یہی تجویز تم میرے واسطے کر رہے ہو۔ اتنا فرق ہے کہ اس وقت میں خود موت کے منہ میں جا رہا ہوں اور فتنہ کے وقت میں اپنے بچنے کی پوری کوشش کروں گا۔ پھر بھی اگر مر گیا تو تقدیر ہے لیکن وہ صورت اس سے اہون ہے کیونکہ اس میں خودکشی تو نہ ہو گی۔

جب نخچیروں نے دیکھا کہ دلائل سے یہ قائل نہیں ہوتا تو اب برادری کے زور سے کام لیا اور سب نے اُس پر دباؤ ڈالا کہ نہیں تم کو ضرور جانا ہو گا۔ اگر تم نہ جاؤ گے تو ہم جبراً تم کو شیر کے سپرد کر دیں گے۔ بالآخر برادری کے دباؤ سے خرگوش مجبور ہو کر چلا۔ مگر راستہ میں سوچنے لگا کہ کوئی تدبیر ایسی کرنی چاہیئے کہ جس سے جان بھی بچ جائے اور برادری بھی ناخوش نہ ہو۔ راستہ میں اُسے کنواں نظر پڑا جس میں پانی بھرا ہوا تھا۔ خرگوش بہت خوش ہوا کہ بس شیر کو اسی کنویں میں ڈبو دینا چاہیئے۔ اس کے بعد وہ شیر کے پاس پہنچا۔

شیر کے راتب میں چونکہ آج بہت دیر ہو گئی تھی۔ اس لئے وہ

پیچ و تاب کھا رہا تھا اور یہ خیال کر رہا تھا کہ معلوم ہوتا ہے ان نخچیروں نے اپنے وعدہ کو بدل دیا ہے۔ پس میں آج جا کر اُن کو کافی سزا دوں گا۔
خرگوش کو دیکھ کر شیر بہت غرّایا اور اُس کو بُرا بھلا کہنے لگا کہ آج معمول سے زیادہ دیر کیوں ہوئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ تمہارے دلوں میں وعدہ خلافی کا خیال پیدا ہوا ہے۔

خرگوش نے کہا کہ حضور! آپ پہلے ہمارا واقعہ تو سُن لیں اُس کے بعد ہی غصّہ کیجیے گا۔ آج مجھ کو آنے میں دیر اس لیے ہوئی کہ آپ کی دار السلطنت میں ایک قوی دشمن گھس آیا ہے جس نے راستہ روک رکھا ہے۔ اور یوں کہتا ہے کہ تم بجائے فلاں شیر کے مجھ کو راتب دیا کرو اُس کو مت دیا کرو۔ اور آج آپ کے راتب کے لیے ایک بڑا موٹا خرگوش تجویز ہوا تھا۔ وہ میرے ہمراہ راستہ میں آ رہا تھا کہ اُس کو دوسرے شیر نے پکڑ لیا۔ میں بھاگ کر بچ گیا اور اطلاع کرنے کے لیے آپ کے پاس پہنچ گیا۔ پس اگر آپ کو اپنے راتب کی خیر منظور ہے تو اس دشمن کو اپنی دار السلطنت سے نکال دیجیے ورنہ کل سے آپ کا راتب بالکل بند ہے۔ وہ کسی کو آپ تک پہنچنے نہ دے گا۔

شیر کو اپنے رقیب کا حال معلوم کر کے بڑا غصّہ آیا اور کہا میرے ساتھ چلو میں ابھی اُس کو سزا دیتا ہوں۔ وہ ایسا شیر کون سا ہے جو مجھ سے بھی زیادہ زبردست ہے۔ چنانچہ خرگوش اُس کو ساتھ لے کر کنویں پر پہنچا اور کہا کہ حضور دیکھیے وہ اس کنویں میں رہتا ہے۔ اور دیکھیے اُس کے قبضہ میں مجھ سے بھی موٹا تازہ خرگوش ہے۔ شیر نے جو کنویں میں جھانکا تو اُس کو اپنی صورت نظر آئی اور اپنے ساتھ ہی خرگوش کی بھی صورت نظر

آئی اور یہ قاعدہ ہے کہ پانی کی تہ میں ہر چیز بڑی نظر آیا کرتی ہے تو خرگوش کی صورت بھی بڑی معلوم ہوئی۔ شیر نے پانی میں اپنا عکس دیکھ کر غصہ میں اس پر حملہ کیا اور دھڑام سے کنویں کے اندر جا پہنچا۔ وہاں پانی کے سوا کیا تھا۔ اب خرگوش اوپر سے کہتا ہے کہ بس یہ تمہارا قید خانہ ہے تم اسی میں ڈوب کر جان دے دو اور میں جاتا ہوں۔ میرا سلام لو اس کے بعد خرگوش خوش ہوتا ہوا اپنی برادری میں پہنچا۔ انہوں نے کہا کہ کیا تو شیر کے پاس نہیں گیا۔ اس نے جواب دیا کہ تم نے مجھے اس کا شکار بنانا چاہا تھا۔ میں نے اسی کا شکار کر دیا۔ اس پر مولانا فرماتے ہیں ؎

حملہ بر خود میکنی اے سادہ مرد
ہمچو آں شیرے کہ بر خود حملہ کرد

تنگی کی حقیقت

صاحبو۔ یہی حال معترضین کا ہے کہ جو اعتراض وہ شریعت پر کرتے ہیں حقیقت میں وہ اپنے اوپر اعتراض کر رہے ہیں مگر ان کو خبر نہیں شاید آپ یہ کہیں کہ یہ تو ایک دعویٰ ہے اس کی دلیل کیا ہے۔ اور شریعت میں تنگی کا ہونا تو ہم کو مشاہدہ سے معلوم ہے کیونکہ ہم خود دیکھ رہے ہیں کہ معاملات وغیرہ میں ہم کو شریعت پر عمل کرتے ہوئے سخت تنگی پیش آتی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ میں اس کی تکذیب و تردید نہیں کرتا کہ آپ کو معاملات وغیرہ میں تنگی پیش نہیں آتی۔ میں اس کو تسلیم کرتا ہوں لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اس تنگی کا سبب شریعت مقدسہ ہے یا آپ کی معیشت اور تمدن کا خراب ہونا۔ یاد رکھو کسی قانون کو تنگ اس وقت کہا جاتا ہے

جب کہ سب آدمی اس پر عمل کرنا چاہیں اور پھر بھی اس پر عمل کرنا دشوار ہو۔ اور اگر کسی قانون پر عمل کرنا اس لئے دشوار ہو جاوے کہ ہزار آدمیوں میں سے دس آدمی تو اس پر عمل کرنا چاہتے ہیں اور باقی تمام جماعت اس ارادہ کی مخالفت کرتی ہے اس صورت میں قانون کو ہرگز تنگ نہیں کہا جا سکتا بلکہ یہی کہا جائے گا کہ تمہاری قوم کا تمدن تنگ ہے ان کی معیشت میں تنگی ہے۔

اس قاعدہ کو سمجھ کر سوچیئے کہ آپ کو شریعت پر عمل کرنے میں تنگی کیوں پیش آتی ہے محض اسی وجہ سے تاکہ آپ تنہا اس پر عمل کرنا چاہتے ہیں اور باقی تمام تجار اس پر عمل کرنا نہیں چاہتے۔ آپ سود کی ڈگری نہیں دینا چاہتے مگر مدعی سود لینا چاہتا ہے۔ اگر آپ ڈگری نہ دیں گے تو وہ اپیل کر کے سود وصول کر لے گا۔

ایک محکمہ میں ہزار آدمی ملازم ہیں۔ ان میں دو چار آدمی نماز کے وقت کام کرنا نہیں چاہتے۔ باقی تمام ملازم نماز کے ضائع کرنے پر راضی ہیں اس لئے ان دو چار آدمیوں کو تنگی پیش آتی ہے۔ اگر سب اس کا ارادہ کر لیں کہ ہم نماز کو کبھی ضائع نہ کریں گے تو حاکم محکمہ ضرور اس کے لئے قانون بنانے پر مجبور ہو گا۔ علیٰ ہذا تمام صورتوں میں غور کر لیجئے کہ شریعت پر عمل میں تنگی محض اس وجہ سے پیش آئے گی کہ ایک کام کا تعلق پوری جماعت سے ہے جن میں صرف دو چار آدمی شریعت پر عمل کا قصد کرتے ہیں اور زیادہ حصہ عمل کرنا نہیں چاہتا۔ اب آپ ہی بتلایئے کہ یہ تنگی احکام شرعیہ میں ہے یا آپ کے تمدن و معیشت میں ــــــ؟

صاحبو ــــ اس طرح تو آسان سے آسان کام بھی دشوار ہو جائے گا

دیکھئے کھانا کتنا آسان ہے لیکن اگر آپ کسی ایسے گاؤں میں پہنچ جائیں جہاں نہ آٹا بکتا ہو نہ لکڑی داموں سے ملتی ہو نہ دال اور گھی ملتا ہے تو کیا آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ کھانا بہت دشوار چیز ہے — ہرگز نہیں۔ بلکہ یہی کہا جائے گا کہ اس گاؤں کا تمدن تنگ ہے۔ —— یا آپ کھانا چاہتے ہوں لیکن آپ کے سر پر دس ڈاکو آکر کھڑے ہو جائیں کہ جب لقمہ اٹھاؤ، وہ چھین کر کھا جاتے ہیں تو کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ کھانا مشکل کام ہے ہرگز نہیں۔ بلکہ یہ کہا جائے گا کہ آپ کی معاشرت تنگ ہے۔ ڈاکوؤں کی جگہ سے علیحدہ ہو کر رہو پھر دیکھو کھانا کتنا آسان کام ہے۔

اسی طرح میں کہتا ہوں کہ آپ کسی ایسی جگہ جا کر رہیں جہاں عموماً سب لوگوں کو شریعت پر عمل کرنے کا اہتمام ہو۔ پھر بتلایئے کہ شریعت میں کیا تنگی ہے۔

دیکھو — اگر کوئی مریض طبیب کے پاس جائے اور وہ اس کو ایسا نسخہ لکھ کر دے جس کی قیمت دو پیسہ ہے سستی دوائیں لکھے اور معمولی دوائیں بتلائے جو عموماً ہر جگہ مل جاتی ہیں لیکن مریض ایسے کورده کا رہنے والا ہے جہاں قسمت سے معمولی دوائیں بھی نہیں ملتیں نیز حکیم صاحب نے معمولی پرہیز بتلایا تھا اور دس پندرہ چیزوں کی اجازت دے دی تھی کہ پالک کا ساگ، تری، کدو، مونگ کی دال، بکری کا گوشت، شلجم کی بھجیا وغیرہ کھا سکتے ہو۔ لیکن اس کوردہ میں کوئی چیز بھی مریض کے کھانے کے قابل نہیں ملتی ہاں بینگن، کریلے اور مسور کی دال بہت ملتی ہے۔ جس سے طبیب نے پرہیز بتلایا ہے۔ اب یہ مریض اگر یوں کہنے لگے کہ اس طبیب کے مطب میں بہت تنگی ہے یا یوں کہنے لگے کہ علم طب ہی بہت تنگ

ہے جس پر عمل کرنا بہت دشوار ہے تو کیا کوئی عاقل اس کی بات کو تسلیم کر سکتا ہے۔ ہرگز نہیں بلکہ سب یہی کہیں گے کہ ظالم علم طب میں تو بہت وسعت ہے کہ سنگین سے سنگین مرض کا علاج ہزار روپوں میں بھی ہو سکتا ہے اور چار پیسہ کی دوا میں بھی، لیکن تیرا گاؤں ہی بہت تنگ ہے جس میں معمولی چیزیں بھی ملنا دشوار ہیں۔

صاحبو۔ بعینہٖ یہی مثال ان اعتراض کرنے والوں کے اعتراضات کی ہے کہ وہ اپنے تمدن اور معاشرت کی تنگی کو تو دیکھتے نہیں، خواہ مخواہ شریعت پر الزام لگاتے ہیں کہ اس میں تنگی اور دشواری ہے۔ میں بقسم کہتا ہوں کہ قانون شریعت سے زیادہ آسان کوئی قانون ہو ہی نہیں سکتا جس میں مصالح دنیا و آخرت کی پوری پوری رعایت کی گئی ہو۔ مگر یہ ضرور ہے کہ جس جگہ زیادہ حصہ مسلمانوں کا شریعت پر عمل نہ کرنا چاہے بلکہ عمل کرنے والوں کو بھی اس سے روکنا چاہے تو ان ڈاکوؤں کی وجہ سے تنگی پیش آ جائے گی ورنہ احکام شرعیہ فی نفسہا بہت سہل ہیں جن پر اگر سب مل کر عمل کرنا چاہیں تو نہایت راحت و اطمینان سے زندگی بسر ہو۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا

پھر یہ کیوں کر تسلیم کر لیا جاوے کہ شریعت کے احکام وسعت انسانیہ سے باہر ہیں یا اُن میں کچھ بھی دشواری ہے۔ خدا تعالیٰ کا کلام کبھی ٹوٹ نہیں سکتا۔ نہ اس میں شک و شبہ کی گنجائش ہے۔

اس مضمون کو میں نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کر سکتا ہوں لیکن میں اس مضمون پر پہلے عرصہ ہوا کہ ایک مفصل تقریر کر چکا ہوں جس کا نام نفی الحرج

ہے اور وہ اب قریب الطبع ہے۔ اہل مطبع کہتے تھے کہ ہم اس کو بہت جلد شائع کریں گے۔ اس میں ہر پہلو سے اس دعوے کو خوب اچھی طرح ثابت کر دیا گیا ہے کہ دین میں ہرگز تنگی نہیں اور اُس وعظ میں نو تعلیم یافتہ طبقہ کے بھی بہت حضرات موجود تھے۔ سب نے اُس کو سُن کر گردنیں جھکا دیں اور اس کا اقرار کیا کہ واقعی یہ دعویٰ اچھی طرح ثابت ہو گیا اور ہمارا عرصہ کا اشکال رفع ہوا۔ اس وعظ کی ایک کاپی ہر مسلمان کے گھر میں رہنی چاہیئے خصوصاً نو تعلیم یافتہ حضرات تو ایک کاپی ضرور رکھیں کیونکہ اُن کو اس قسم کے اشکالات زیادہ پیش آتے ہیں اور دین میں شک و شبہ کا رہنا بڑا سنگین مرض ہے۔ اس کا علاج بہت اہم ہے۔ انشاء اللہ اس وعظ سے بہت سے اشکالات رفع ہو جائیں گے۔

حاصل یہ کہ دین مقصودیت میں بھی سب سے بڑھا ہوا ہے اور اُس کا طریق بھی متعیّن ہے اور طریق میں تنگی بھی نہیں بلکہ سہل اور بہت سہل ہے اور پھر اُس طریق پر مقصود کا ترتب بھی یقینی۔ چنانچہ اوپر بھی مذکور ہوا ہے اور یہاں اُس کا راز بتلاتا ہوں۔

ثمرات کا وعدہ

وہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے دین کے کاموں میں ثمرہ کا وعدہ فرمایا ہے اور اسباب دنیویہ میں اس کا وعدہ نہیں فرمایا۔ چنانچہ دنیا کے متعلق ارشاد ہے۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَاءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ

یعنی جو کوئی دنیا کا قصد کرے گا ہم اُس کو دنیا میں جس قدر ہم چاہیں گے اور جس کے لئے چاہیں گے سر دست دے دیں گے۔ جس کا حاصل یہ

ہے کہ دنیوی مراد کا حصول مشیت پر موقوف ہے۔ یہ وعدہ نہیں کہ جو تم چاہو وہی مل جائے اور یہ بھی وعدہ نہیں کہ ہر ایک کا مقصود پورا ہو جائے بلکہ بعض کا مقصود حسب مشیت الٰہی حاصل ہو جاتا ہے اور بعض کا مقصود بالکل حاصل نہیں ہوتا۔

اور اعمالِ آخرت کے متعلق ارشاد ہے۔

وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا۔

اور جو کوئی آخرت کا ارادہ کرے اور مومن بن کر اُس کے لیے وہ کوشش کرے جو اُس کے مناسب ہے تو اُن لوگوں کی کوشش مشکور ہے یعنی حق تعالیٰ اُن کی قدر فرمائیں گے۔ اس آیت میں وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا۔ اَرَادَ۔ کا بیان ہے یعنی ارادہ سے مراد محض تمنّا نہیں۔ کیونکہ خالی تمنّا کافی نہیں بلکہ ارادہ سے مراد قصدِ جازم ہے جس کے لئے سعی لازم ہے۔ آگے اس کی جزا مذکور ہے اُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا کہ اُن کی سعی کی قدر کی جائے گی۔ اور ظاہر ہے کہ شاہی محاورہ میں یہ جملہ بہت امید افزا ہے۔ جب کوئی بادشاہ اپنے کسی خادم سے یہ کہہ دے کہ ہم تمہاری خدمات کے قدردان ہیں تو اُس کو انعاماتِ جلیلہ کی پختہ امید ہو جاتی ہے اور وہ یہ سمجھ جاتا ہے کہ مجھ کو میری خدمات سے بدرجہا زائد صلہ ملے گا۔ جب ادنیٰ سے ادنیٰ حاکم کے کلام میں ایسے جملہ سے بہت کچھ امیدیں پختہ ہو جاتی ہیں تو احکم الحاکمین کے کلام میں اس جملہ سے کیا کچھ امیدیں پیدا ہونی چاہئیں۔ اس کا فیصلہ اہلِ ذوق خود کر سکتے ہیں۔

دوسری جگہ فرماتے ہیں۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا۔

دنیا کے متعلق نُؤْتِهٖ مِنْهَا فرمایا جس کا حاصل یہ ہے کہ جو شخص دنیا کا قصد کرتا ہے اس کو ہم کچھ دے دیتے ہیں۔ یہ وعدہ نہیں کہ جو وہ چاہے وہی دے دیں اور آیت سابقہ کی قید لمن نشاء یہاں بھی ہے اور آخرت کے متعلق ترقی کا وعدہ ہے اور وعدہ بھی اطلاق کے ساتھ ہے جس میں مشیت وغیرہ کی قید مذکور نہیں نہ من تبعیضیہ لایا گیا ہے جس سے یہ بات مفہوم ہوتی ہے کہ ارادۂ آخرت کے بعد تو مراد ضرور حاصل ہوتی ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ عطا ہوتا ہے۔ سبحان اللہ! دنیا کے متعلق تو یہ بھی وعدہ نہیں کہ جو مانگے وہی مل جائے اور یہاں زیادت کا بھی وعدہ ہے اور یہ ترقی محض آخرت ہی میں نہیں بلکہ دین اختیار کرنے والوں کو دنیا میں بھی اُن کے اعمال سے زیادہ جزا مل جاتی ہے۔ دین داروں کو دنیا میں بھی ایسی چیزیں مل جاتی ہیں جن کی اُن کو پہلے سے خبر بھی نہیں تھی۔ آخرت کے متعلق تو مسلمانوں کو اس کا علم عام طور پر ہے۔ سب جانتے ہیں کہ آخرت میں عمل سے زیادہ صلہ ملے گا کیونکہ وہ یہ حدیث سُنے ہوئے ہیں۔

اَعْدَدْتُ لِعِبَادِيَ الصّٰلِحِيْنَ مَا لَا عَيْنٌ رَأَتْ وَلَا اُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلٰى قَلْبِ بَشَرٍ۔

میں نے اپنے نیک بندوں کے لیئے وہ چیزیں تیار کر رکھی ہیں جن کو نہ آنکھ نے دیکھا نہ کان نے سُنا نہ کسی بشر کے دل پر اُن کا خطرہ گزرا لیکن دنیا میں زیادت اور ترقی کا علم بہت لوگوں کو نہیں ہے۔ اکثر مسلمانوں کا خیال یہ ہے کہ دین کا ثمرہ عمل سے زیادہ آخرت ہی میں ملے گا۔ اور دنیا

ہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اعمال صالحہ کا ثمرہ نہیں ملتا یا کم ملتا ہے مگر یہ خیال بالکل غلط ہے۔ حق تعالیٰ اعمال دینیہ کا ثمرہ دنیا میں بھی امید اور خیال سے زیادہ عطا فرماتے ہیں اور اس ثمرہ کی بھی وہی شان ہوتی ہے وَلَا خَطَرَ عَلٰی قَلْبِ بَشَرٍ کہ انسان کے دل میں پہلے سے اس کا خطرہ بھی نہیں گزرتا۔

شاید آپ یہ سوال کریں کہ وہ ثمرات کیا ہیں۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ دین کو اختیار کر لو۔ خود ہی تم کو وہ ثمرات حاصل ہو جائیں گے۔ میں ان کو بیان نہیں کر سکتا اور وہ بیان میں آ بھی نہیں سکتے کیونکہ ان کی تو شان یہ ہے ولا خطر علیٰ قلب بشر اور بیان کرنے سے قابل خطور ہونا لازم آ جائے گا سچ یہ ہے کہ دنیا میں بھی اہل دین کو وہ نعمتیں حاصل ہوتی ہیں جن کے بیان کے لئے الفاظ بھی نہیں ملتے۔ ہاں کچھ کچھ پتہ ان کا بزرگوں کے کلام سے معلوم ہوتا ہے جن کا صادق ہونا امارات یقینیہ سے معلوم ہے۔ ایک کتاب میں ایک بزرگ کا قول لکھا ہے۔

لَوْ عَلِمَتِ الْمُلُوْكُ بِمَا عِنْدَنَا مِنَ النِّعَمِ لَجَادَلُوْنَا بِالسُّيُوْفِ

کہ اگر سلاطین کو ان نعمتوں کا علم ہو جائے جو ہمارے پاس ہیں تو وہ تلواریں لے کر ہم پر چڑھائی کر دیں اور ان کو چھیننا چاہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان کے پاس وہ نعمتیں ہیں جن کی لذت کے سامنے سلطنت ہفت اقلیم کی بھی کچھ حقیقت نہیں۔ کیونکہ سلاطین تو اسی چیز کے طالب ہو سکتے ہیں جو ان کی دولت موجودہ سے بڑھ کر ہو۔ اگر وہ نعمت سلطنت سے کم ہوتی تو بادشاہوں کو ادھر توجہ کرنے کی کیا ضرورت پڑی ہے جب کہ وہ اس سے زیادہ نعمت لئے بیٹھے ہیں۔

پس یقیناً وہ نعمت ایسی ہے جس کی سلاطین کو ہوا بھی نہیں لگی۔ پھر یہی

نہیں کہ بزرگوں کی یہ باتیں ہی باتیں ہیں بلکہ جس کو وہ نعمت حاصل ہوئی ہے اُس نے سلطنت پر لات مار کر بھی دکھلا دیا ہے۔ ابراہیم ادہمؒ کا قصہ مشہور ہے کہ جب خدا تعالیٰ نے اُن کو اپنی خاص نعمت سے نوازا ہے تو تخت سلطنت چھوڑ کر فقر و فاقہ کو اختیار کر لیا۔ پس وہ ایسی نعمت ہے کہ جس کے سامنے وہ سلطنت کو ہیچ سمجھتے ہیں۔ مگر ظاہر میں یہ حالت ہے کہ نہ کپڑے درست ہیں نہ صورت ٹھیک ہے اور باطن میں بھی وہ ایسے غنی ہیں کہ سلاطین کو بھی منہ نہیں لگاتے بلکہ خود سلاطین اُن کی غلامی کو اپنے لئے فخر سمجھتے ہیں۔ اس نعمت کو عارف شیرازی اس طرح بیان فرماتے ہیں ؎

مبیں حقیر گدایانِ عشق را کیں قوم
شہاں بے کمر و خسرواں بے کلہ اند

نیز عارف شیرازی اس نعمت کا کسی قدر پتہ بھی بتلاتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

بفراغِ دل زمانے نظرے بماہ روئے
بہ ازاں کہ چتر شاہی ہمہ روز ہاؤ ہوئے

معلوم ہوا کہ وہ نعمت یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی طرف کامل توجہ اور اُس سے کامل تعلق ہو جاوے۔ اس نعمت کی یہ خاصیت ہے کہ پھر یہ شخص دنیا سے مستغنی ہو جاتا ہے اور کیوں نہ ہو جس دل میں خدا ہو گا، اُس میں کوئی دوسری چیز کب رہ سکتی ہے ؎

عشق آں شعلہ است کو چوں برفروخت
ہر چہ جز معشوق باقی جملہ سوخت

ماند الا اللہ باقی جملہ رفت　　مرحبا اے عشق شرکت سوز رفت

تعلق مع اللہ کی صورت

لیکن یہ بھی اس نعمت کا اجمالی پتہ ہے کیونکہ اس سے بھی یہ نہ معلوم ہوا کہ خدا تعالیٰ سے کامل تعلق کیونکر ہوا کرتا ہے۔ اسی لئے اس میں غلطی بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ بعض لوگ محض ملکۂ یادداشت کو کامل تعلق کا مصداق سمجھتے ہیں اور نسبت کی حقیقت اسی کو سمجھتے ہیں اور ایک زمانہ تک میں بھی یہی سمجھتا رہا مگر الحمد للہ کہ اب حق تعالیٰ نے حقیقت منکشف فرمادی حق تعالیٰ سے تعلق و نسبت کا مطلب یہ ہے کہ دونوں طرف سے تعلق ہو۔ بندہ کو خدا سے تعلق ہو اور حق تعالیٰ کو بندہ سے تعلق ہو۔ اگر صرف بندہ کو تعلق ہوا اور اُدھر سے تعلق نہ ہوا بلکہ حجاب رہا تو یہ نسبت مطلوبہ نہیں غرض لوگ محض یادداشت کو نسبت مطلوبہ سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یادداشت تو مشق سے حاصل ہو سکتی ہے۔

نسبت مقصودہ یہ ہے کہ تم خدا سے راضی رہو وہ تم سے راضی رہیں اور یہ بات محض مشق ذکر سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس کے لئے کثرت ذکر کے ساتھ اجتناب معاصی و ادائے طاعات بھی شرط ہے۔ اگر ذکر کے ساتھ معاصی سے اجتناب کا اہتمام نہیں اور طاعات کے بجالانے کی فکر نہیں تو نسبت مطلوبہ حاصل نہیں۔ بہت لوگ اس دھوکا میں مبتلا ہیں کہ جہاں اُن کو ذکر کی مشق ہو گئی اور ہر وقت خدا کا دھیان رہنے لگا بس وہ اپنے کو صاحب نسبت سمجھنے لگے۔ پھر چونکہ معصیت سے اس مشق میں فتور نہیں آتا اس لئے یہ شخص یوں سمجھنے لگتا ہے کہ مجھ کو معاصی مضر نہیں۔ حالانکہ صوفیاء کا قول ہے کہ معصیت سے نسبت باطنیہ کمزور ہو جاتی ہے اور معاصی پر اصرار کرنے سے وہ رفتہ رفتہ زائل ہو جاتی ہے بلکہ بعض لوگ یہاں تک

دھوکا میں پڑ گئے کہ بعد حصول نسبت کے ایک مقام ایسا آتا ہے جس میں اس شخص سے تکالیف شرعیہ ساقط ہو جاتی ہیں اور کوئی حرام اس کے لئے حرام نہیں رہتا۔ یاد رکھو یہ صریح زندقہ ہے۔ تکالیف شرعیہ جب تک ہوش دحواس درست رہیں کسی سے بھی کسی وقت ساقط نہیں ہوتیں۔

پس نسبت ایک ایسا تعلق ہے جو طرفین سے ہوتا ہے۔ اگر صرف ایک طرف سے ہو اور دوسری طرف سے نہ ہو تو وہ نسبت ایسی ہے جیسے ایک طالب علم سے کسی نے پوچھا تھا کہ آج کل کس فکر میں ہو۔ کہنے لگا شہزادی سے نکاح کرنے کی فکر میں ہوں۔ اس نے پوچھا کہ پھر اس کے لئے کیا سامان کیا۔ کہنے لگا آدھا سامان تو ہو گیا آدھا باقی ہے۔ اُس نے پوچھا کیوں کر۔ کہنے لگا میں تو راضی ہوں مگر وہ راضی نہیں۔

تو جیسا کہ یہ شخص اپنی رضامندی سے آدھا سامان مکمل کئے ہوئے تھا اسی طرح ان لوگوں کی نسبت ہے۔ اور ظاہر ہے کہ نکاح میں ایک طرف کی رضا بدون رضا دوسرے کی کچھ بھی وقعت نہیں رکھتی۔ اسی طرح ان لوگوں کی نسبت جو کہ محض ایک طرف سے ہے محض بالکل کالعدم ہے اس صحیح نسبت ہی میں وہ لذت حاصل ہوتی ہے جس کے سامنے سلطنت کی کچھ حقیقت نہیں۔

حضرت غوث اعظم رح کی خدمت میں ایک مرتبہ ملک سنجر نے یہ لکھا کہ میں حضرت کی خانقاہ کے مصارف کے لئے ملک نیمروز کے ایک حصّہ کو نامزد کرنا چاہتا ہوں۔ حضرت اُس کو قبول فرما دیں تو آپ نے اُس کے جواب میں یہ رباعی لکھ کر بھیجی ؎

چوں چتر سنجری رُخ بختم سیاہ باد

در دل اگر بود ہوسِ ملکِ سنجرم

اس زمانہ میں ان سلاطین کا پرچم سیاہ رنگ کا ہوا کرتا تھا۔ اس لئے آپ نے فرمایا کہ اگر مجھ کو ملک سنجر کی ہوس ہو تو چتر سنجری کی طرح میرا بخت سیاہ ہو جائے ؎

زانگہ کہ یافتم خبر از ملک نیم شب
من ملک نیمروز بیک جو نمی خرم

ملک نیم شب اور نیمروز میں صنعت تقابل کس قدر عجیب ہے۔ ان حضرات کے کلام میں علاوہ باطنی صولت وشوکت کے ظاہری خوبیاں بھی بہت ہوتی ہیں۔ آخر وہ کیا چیز تھی جس نے ان حضرات کے دل کو سلطنت سے اس درجہ بے نیاز کر دیا تھا معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات کو دنیا میں بھی وہ نعمتیں ملتی ہیں جن کا اہلِ دنیا کو خطرہ بھی نہیں گزرا۔

ناز و نیاز کا مقام

اسی طرح ایک اور بزرگ کا قصہ ہے جو اہلِ دلال میں سے تھے۔ مگر اہلِ ضلال میں سے نہ تھے۔ یہ ایک حال ہوتا ہے جو متوسطانِ سلوک پر وارد ہوتا ہے۔ کاملین اہلِ دلال نہیں ہوتے۔ اُن میں عجز و نیاز غالب ہوتا ہے۔ ہاں وسط سلوک میں بعض لوگوں پر غلبۂ بسط سے دلال کا حال وارد ہو جاتا ہے۔ وہ اُس وقت ناز میں آکر بعض ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں، جو دوسرا اگر کہے تو مردود ہو جاوے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

ناز را روئے بباید ہمچو ورد ۔۔۔ چوں نداری گرد بد خوئی گرد
زشت باشد روئے نازیبا و ناز ۔۔۔ عیب باشد چشم نابینا و باز
پیش یوسف نازش و خوبی مکن ۔۔۔ جز نیاز و آہِ یعقوبی مکن

یعنی ناز کے لئے بھی منہ چاہیئے۔ ہر ایک کا منہ ناز کے قابل نہیں ہوتا۔ اگر کسی کو یہ حال حاصل ہوا ہو اُس کے لئے ناز بجا ہے اور اگر حال نہ ہو تو بجز آہ و نیاز کے کچھ مناسب نہیں۔ اور کبھی تو اہل دلال کی بات سُن لی جاتی ہے اور گاہے اُن کی گوشمالی بھی کر دی جاتی ہے۔

چنانچہ وہ بزرگ اہل دلال میں سے تھے۔ ایک مرتبہ دن میں وہ کسی شہر پر گزرے۔ دیکھا تو شہر پناہ کا دروازہ بند تھا۔ دربانوں سے پوچھا کہ بھائی یہ دن میں دروازہ کس لئے بند کیا گیا ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ بادشاہ کا باز اڑ گیا ہے اس لئے اُس نے حکم دیا ہے کہ شہر پناہ کے دروازے بند کر دیئے جائیں، کہیں دروازوں سے نکل کر بھاگ نہ جاوے۔

یہ قصہ سُن کر وہ بزرگ بہت ہنسے کہ معلوم ہوتا ہے بادشاہ عقل سے بالکل ہی کورا ہے۔ بھلا باز کو دروازے سے کیا نسبت؟ وہ اگر بھاگنا چاہے گا تو اوپر سے اُڑ جائے گا۔ دروازے بند کرنے سے اُس کی کیا روک ہو سکتی ہے۔ اُس کے بعد اُنہوں نے ہنس کر آسمان کی طرف منہ کیا اور حق تعالیٰ سے عرض کی کہ ایسے احمق کو آپ نے بادشاہت دی ہے جس کو اتنی بھی عقل نہیں کہ باز دروازے سے جایا کرتا ہے یا اوپر سے۔ اور ہم تو اتنے عاقل ہیں مگر ہماری یہ حالت ہے کہ نہ پیر میں جوتا درست ہے نہ لباس اچھا ہے۔ فوراً اُدھر سے عتاب ہوا کہ بہت اچھا ہم آپ کو بھی سلطنت دیئے دیتے ہیں لیکن کیا تم اس پر راضی ہو کہ تمہاری معرفت اور ولایت اور تمام کمالات مع تمہارے فقر و فاقہ کے اس بادشاہ کو دے دیئے جائیں اور اُس کی سلطنت وغیرہ مع اُس کی حماقت کے تم

کو دے دی جائے۔

بس یہ عتاب سُن کر اُن بزرگ کا رنگ زرد ہو گیا اور جلالِ خداوندی سے ڈر گئے۔ فوراً سجدہ میں گر پڑے اور عرض کرنے لگے کہ میں اپنی خطا سے توبہ کرتا ہوں۔ پھر ایسی گستاخی نہ ہوگی۔ میں اپنی نعمتوں کو ہزار سلطنتوں کے بدلے میں بھی دینا گوارا نہیں کر سکتا۔ خوب کہا ہے ؎

رَضِیْنَا قِسْمَةَ الْجَبَّارِ فِیْنَا لَنَا عِلْمٌ وَّلِلْجُهَّالِ مَالٌ

فَاِنَّ الْمَالَ یَفْنِیْ عَنْ قَرِیْبٍ وَاِنَّ الْعِلْمَ بَاقٍ لَا یَزَالُ

ہم خدا کی اس تقسیم پر راضی ہیں کہ ہمارے لئے علم و معرفت ہو اور جاہلوں کے پاس مال و دولت۔ کیونکہ مال و دولت تو عنقریب فنا ہو جائے گا اور علم و معرفت کے لئے فنا نہیں ہے۔

اب جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اعمال صالحہ کا ثمرہ دنیا میں نہیں ملتا وہ اس حکایت میں غور کریں کہ ان بزرگ نے فقر و فاقہ کو کیوں گوارا کیا اور ملنے والی سلطنت پر کیوں لات مار دی۔ آخر وہ کوئی تو نعمت تھی جس کے سلب ہو جانے کا نام سُن کر وہ لرز گئے، کانپ اٹھے اور سلطنت کے بدلے میں بھی اُس کو دینا گوارا نہ کیا۔ صاحبو! خدا کی قسم جن لوگوں کو اس دولت کی خبر ہو گئی ہے اُن کی مستی کی کچھ حد نہیں۔ وہ سلطنت وغیرہ کو مچھر کے پَر کے برابر بھی نہیں سمجھتے ؎

آں کس کہ ترا شناخت جاں را چہ کند

فرزند و عیال و خانماں را چہ کند

ہر کام کا طریق کار

غرض یہ بات ثابت ہو گئی کہ دین کے کاموں کا ثمرہ آخرت میں

تو ملتا ہی ہے اس کو تو سب تسلیم کرتے ہیں، دنیا میں بھی اعمال سے زیادہ ملتا ہے اور ایسی ایسی نعمتیں ان پر فائز ہوتی ہیں جن کے سامنے اہلِ دنیا کی نعمتیں کچھ بھی نہیں۔

پس دین کا مقصود ہونا بھی معلوم ہے اس کا طریق بھی معلوم ہے اور وہ طریق آسان بھی بہت ہے اور طریق پر مقصود کا ترتب بھی یقینی ہے اور دنیا و آخرت میں امید سے بھی زیادہ ثمرہ اس پر مرتب ہوتا ہے اور چوتھی بات یہ ہے کہ اس کے ثمرات دائم بھی ہیں اور دنیا کے ثمرات فانی ہیں مگر باوجود اس کے حیرت در حیرت ہے کہ لوگ اس کے لئے سعی نہیں کرتے اور اس کے اسباب کو اختیار نہیں کرتے۔ جو لوگ کچھ سعی کرتے بھی ہیں وہ محض تمنا کا درجہ رکھتے ہیں اسباب کو اختیار نہیں کرتے حالانکہ دنیوی امور میں محض تمنا بلا اسباب کو سب لوگ حماقت اور پاگل پن سمجھتے ہیں مگر نہ معلوم دین کے معاملہ ہی میں کیوں سب کی عقلیں مسخ ہو جاتی ہیں۔ بس اس کو سعی سمجھ لیا ہے کہ تھوڑی دیر بزرگوں کے پاس بیٹھ کر رو لئے یا وعظ میں آنسو بہا لئے۔ سو یاد رکھو محض رونے سے کچھ نہیں ہوتا۔ کام کو اس کے طریقہ سے کرنا چاہیئے۔

عرفی اگر بگریہ میسر شدے وصال
صد سال می تواں بتمنا گریستن

ان لوگوں کی اس تمنا کی ایسی مثال ہے۔ جیسے کوئی صاحب بزرگوں سے جا کر یہ کہیں کہ حضور دعا کیجئے ہمارے لڑکا ہو جاوے مگر یہ حضرت نکاح کرتے نہیں۔ تو اب تبلایئے ان کے لڑکا کہاں سے ہو۔ اسی طرح ان کا یہ کہنا کہ حضور دعا کر دیجئے ہم بھی دین میں کامل ہو جاویں مگر جو اس کا

طریقہ ہے اُس کو اختیار نہیں کرتے تو یہ لغو حرکت ہے یا نہیں۔ یاد رکھو ہر کام طریقہ ہی سے ہو سکتا ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں وَاْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ اَبْوَابِھَا۔ گو شانِ نزول اس کا خاص ہے مگر اعتبار عموم الفاظ کا ہوتا ہے۔ اس لئے یہ حکم عام ہے۔ پس دین ایک گھر ہے اور اُس کا دروازہ وہ طرق ہیں جو شریعت نے تبلائے ہیں۔ اُس دروازہ سے داخل ہو گے جبھی دین کامل ہو سکتا ہے۔ مولانا اس مضمون کو نظم میں اس طرح بیان فرماتے ہیں ؎

اُطْلُبُوا الْاَرْزَاقَ مِنْ اَسْبَابِھَا
وَادْخُلُوا الْاَبْیَاتَ مِنْ اَبْوَابِھَا

اطلبوا الارزاق کو پہلے بیان فرمایا جس میں نظیر کی طرف اشارہ ہے کہ جس طرح تم رزق کے واسطے اسباب کو اختیار کرتے ہو اسی طرح دین کے لئے بھی اُس کے طریقے اختیار کرو۔ آپ دین کے کام کرنا شروع کریں انشاء اللہ دروازہ خود بخود کھل جائے گا اور پھر آپ کو دین کے ثمرات بھی حاصل ہو جائیں گے جن میں ایک ثمرہ یہ ہے کہ آپ کو خدا تعالیٰ سے تعلق ہو جاوے گا زندگی پُر لطف ہو جاوے گی۔ باقی وہ دولت باطنیہ جو اہل اللہ کو حاصل ہے اُس کی کیفیت میں آپ کو تبلا نہیں سکتا کیونکہ وہ ذوقی چیز ہے جس کو اہلِ ذوق ہی سمجھ سکتے ہیں۔ دین کے کاموں میں لگیئے، انشاء اللہ آپ کو بھی وہ ذوق حاصل ہو جائے گا۔ اور اس سے پہلے کتنا ہی سمجھایا جائے آپ کی سمجھ میں نہیں آسکتا کہ اہل اللہ کو کیا دولت عطا ہوئی ہے۔

نامرد کو عورت کی لذّت کا کبھی ادراک نہیں ہو سکتا گو اُس کے سامنے

کتنی ہی وضاحت کر دی جائے۔ ہاں جب خدا کرے گا اُس کو اس مرض سے شفا ہو جائے گی۔ اس وقت وہ خود بخود اس لذّت کو سمجھ جائے گا پھر کسی کے تبلانے کی ضرورت نہ ہو گی۔ پس خدا کے لئے آپ اس لے حسی کا علاج کیجئے۔

دین و دنیا کا فرق

کوئی مرض ایسا نہیں جس کی دوا نہ ہو مگر علاج شرط ہے اور طریقہ پر عمل کرنا۔ ایک فرق دنیا اور دین میں اور سمجھ میں آیا۔ وہ یہ کہ دنیوی مقاصد کے حصول کا وعدہ بدون سعی کے بھی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰہِ رِزْقُھَا ـــــــ

ہر جاندار کی روزی خدا تعالیٰ کے ذمّہ ہے جو بدون سعی کے بھی اُس کو مل سکتی ہے مگر اس پر بھی لوگ دنیوی مقاصد میں سعی کو ضروری سمجھتے ہیں اور آخرت کے ثمرات کا وعدہ تو بدون سعی کے ہے ہی نہیں۔ چنانچہ صاف ارشاد ہے۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِہٖ وَمَنْ اَسَاءَ فَعَلَیْھَا

یعنے ہر شخص کو اُس کے عمل کا ثمرہ ملے گا جیسا کرے گا ویسا بھرے گا پھر تعجب ہے کہ لوگ دین میں سعی کو کس لئے ضروری نہیں سمجھتے جب کہ بدون سعی کے اُس کے حصول کا وعدہ نہیں۔ اہل اللہ نے اس فرق پر نظر کر کے دنیوی مقاصد کے لئے سعی کو ترک کر دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ روزی کا ذمّہ تو حق تعالیٰ نے لے لیا ہے اس کے لئے سعی کی کیا ضرورت ہے اور دین کے کاموں کو ہمارے اوپر چھوڑ دیا ہے ہم کو اس کے لئے سعی کرنا چاہیئے۔

ایک بزرگ کا قصہ ہے کہ اُنہوں نے ایک امام کے پیچھے نماز پڑھی۔ نماز کا سلام پھیر کر امام صاحب نے اُن بزرگ سے ملاقات کی اور یہ سوال کیا کہ آپ کھاتے پیتے کہاں سے ہیں کیونکہ آپ کوئی کام کسب وغیرہ کا نہیں کرتے۔ بزرگ نے فرمایا کہ ذرا ٹھہریئے میں آپ کے سوال کا جواب ابھی دیتا ہوں۔ یہ کہہ کر نماز کی نیّت باندھ لی۔ سلام پھیر کر فرمایا کہ اب پوچھئے آپ کیا پوچھتے ہیں۔ امام نے کہا کہ اب تو مجھے ایک سوال اور پیدا ہو گیا۔ وہ یہ کہ آپ نے یہ نماز دوبارہ کیسی پڑھی ہے۔ آپ تو ابھی نماز سے فارغ ہو چکے تھے۔ فرمایا کہ میں نے اُس نماز کا اعادہ کیا ہے کیونکہ مجھے آپ کے سوال سے یہ شبہ ہو گیا تھا کہ شاید آپ کو خدا تعالیٰ کے اس ارشاد پر یقین نہیں وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا تو مجھے آپ کے ایمان ہی میں شک ہو گیا (یہ غلبہ ہے حال کا) اس لئے میں نے جلدی سے اپنی نماز کا اعادہ کیا کہ مبادا کہیں موت نہ آ جائے اور یہ نماز میرے ذمہ ہی رہے۔

اس کے بعد فرمایا کہ بندۂ خدا کیا روزی کا ملنا کمانے ہی پر موقوف ہے حالانکہ خدا تعالیٰ نے فرما دیا ہے کہ روزی میرے ذمہ ہے پھر تمہارے قلب میں یہ سوال کیوں پیدا ہوا۔ کیا تم کو خدا کے اس ارشاد پر اعتماد نہیں؟ وہ امام بہت شرمندہ ہوئے۔

ایک دوسرے بزرگ کا ارشاد ہے کہ دنیا خدا کا ایک گھر ہے اور ہم یہاں مہمان ہیں۔ اور حدیث میں وارد ہے اَلضِّيَافَةُ ثَلَاثَةُ اَيَّامٍ کہ مہمانی تین دن تک کرنی چاہیئے۔ جب ہم دنیا میں آئے تو تین دن تک تو ہم خدا تعالیٰ کے مہمان ہیں اور خدا تعالیٰ کے یہاں ایک دن ہزار

سال کا ہوتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے

وَإِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَأَلْفِ سَنَةٍ مِمَّا تَعُدُّونَ

تو ہم کو تین ہزار سال کے لئے تو بالکل بے فکری ہے۔ اگر اس سے زیادہ عمر ہوئی تو پھر کچھ انتظام سوچ لیا جائے گا۔

ظاہر میں یہ ایک لطیفہ معلوم ہوتا ہے مگر اس سے اہل اللہ کے مذاق کا پتہ چلتا ہے کہ دنیوی کاموں میں وہ سعی اور اہتمام کو ضروری نہیں سمجھتے کیونکہ روزی کا ذمہ حق تعالیٰ نے خود لے لیا ہے لیکن اعمال آخرت کا انہوں نے ذمہ نہیں لیا۔ اگر تم آخرت کے لئے ارادہ و سعی نہ کرو جب بھی وہ تم کو جنت دے دیں گے یا کہ از خود تم سے جنت کے کام لے لیں گے بلکہ اُس کے متعلق تو یہ ارشاد ہے۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهِ وَمَنْ أَسَاءَ فَعَلَيْهَا اور ارشاد ہے

أَنُلْزِمُكُمُوهَا وَأَنْتُمْ لَهَا كَارِهُونَ۔

اور رزق کے بارہ میں حدیث نبوی وارد ہے۔

— وَمَنْ كَانَ لَهُ رِزْقٌ فِي رَأْسِ جَبَلٍ أَوْ حَضِيضٍ يَأْتِ بِهِ اللهُ۔

گر نہ ستانی بستم میر سد۔ پھر حیرت ہے کہ اتنے فروق کے ہوتے ہوئے ہم کو اعمال آخرت کی فکر نہیں اور دنیا کی فکر ہے حالانکہ ان فروق کے ہوتے ہوئے دنیا کسی درجہ میں بھی توجہ کے قابل نہیں اور ان کا تو مقتضا یہ تھا کہ دنیا کے لئے سعی اور عمل کو ناجائز ہی کر دیا جاتا۔ مگر خدا تعالیٰ کی شفقت و رحمت ہے کہ انہوں نے ہمارے ضعف پر نظر فرما کر دنیا کے لئے بھی اسباب اختیار کرنے کی اجازت دے دی ہے۔

اسبابِ معیشت کی رعایت

صرف اجازت بھی نہیں بلکہ بعض مواقع میں دنیا کے لیئے سعی کو فرض کر دیا ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے۔

طَلَبُ الْحَلَالِ فَرِيْضَةٌ مِنْ بَعْدِ الْفَرِيْضَةِ

کہ حلال روزی کا طلب کرنا بھی فریضہ شرعی کے بعد ایک فرض ہے۔ بلکہ حکماء امت تو یہاں تک ان اسباب کی رعایت فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص حرام ملازمت میں بھی گرفتار ہو اور فراست سے ان کو اُس کا ضعیف الہمّت ہونا معلوم ہو تو اُس کو فوراً حرام ملازمت چھوڑ دینے کا امر نہیں فرماتے بلکہ یہ فرما دیتے ہیں کہ پہلے کوئی حلال ملازمت تلاش کر لو اس کے بعد اُس کو چھوڑنا۔ اور جب تک حلال ملازمت نہ ملے اُسی میں گرفتار رہو، اپنے کو گنہگار سمجھتے رہو اور خدا تعالےٰ سے استغفار کرتے رہو۔

کیونکہ بعض لوگ تنگی معاش سے گھبرا کر عیسائی یا آریہ قادیانی ہو گئے ہیں۔ اہل باطل اپنے گروہ میں بلانے کے لئے لوگوں کو طرح طرح کے طمع دلاتے ہیں جن کے سامنے فقر و فاقہ کے ساتھ اپنے دین پر جما رہنا ہمّت والوں کا کام ہے۔ بعض لوگ تنگی معاش سے پریشان ہو کر پیری مریدی کا پیشہ اختیار کر لیتے ہیں اور مخلوق کو دھوکا دیتے ہیں ؎

او خویشتن گم ست کرا رہبری کند

میں نے بعض لوگوں کو دیکھا ہے جو پیر بنے پھرتے ہیں کہ اپنے گھر پر اگر وہ نماز بھی نہیں پڑھتے اور باہر جا کر مقدس بن جاتے ہیں۔ اور ایک واقعہ تو ایسا سنگین سننے میں آیا جس کی نظیر نہیں سُنی گئی۔

میرے ایک دوست مولوی بیان کرتے تھے کہ ہندوستان سے ایک جاہل شخص ضلع بردوان میں جا کر پیری مریدی کرتا تھا۔ یہ شخص ضلع الہ آباد کا رہنے والا تھا اور تکیہ دار فقیر تھا۔ بردوان کے ایک رئیس اُس کے پھندے میں پھنس گئے۔ ان رئیسوں کو اکثر دنیا ہی کی عقل ہوتی ہے۔ دین کی عقل نہیں ہوتی۔ اس لیئے جاہل درویشوں اور طریق کے ڈاکوؤں کے ہاتھ میں اکثر رؤسا اور مالدار لوگ ہی پھنستے ہیں۔

ہمارے حاجی صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ جس درویش کی طرف زیادہ رجوع اہل دنیا کا ہو وہ درویش نہیں بلکہ دنیا دار ہے کیونکہ قاعدہ ہے اَلْجِنْسُ یَمِیْلُ اِلَی الْجِنْسِ۔ اگر اس میں دین کامل ہوتا تو دین دار لوگ اُس کی طرف زیادہ رجوع کرتے۔

چنانچہ حدیث ہرقل میں بھی یہ مضمون آیا ہے۔ ہرقل نے ابو سفیانؓ سے دریافت کیا کہ نبی عربی (صلی اللہ علیہ وسلم) کا اتباع زیادہ تر کون لوگ کرتے ہیں، اغنیاء یا ضعفاء؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ زیادہ تر ضعفاء اتباع کرتے ہیں، تو ہرقل نے اُس پر کہا ہُم اتباع الرسل کہ رسولوں کا اتباع کرنے والے ضعفاء ہی ہوتے ہیں (چونکہ حضرات صحابہؓ نے ہرقل کے اس قول پر انکار نہیں کیا بلکہ سکوت فرمایا۔ اس لئے تقریر صحابہؓ کی وجہ سے یہ قول حجت ہو گیا) الحمد للہ کہ ہمارے حضرات کے سلسلہ میں زیادہ تر غربا و طلبا ہی کی جماعت ہے رؤسا و امراء کم ہیں (اور جو رؤسا ہیں بھی وہ عقلاء اور دیندار ہیں، بد دین اور کم عقل نہیں ہیں۔ دینداری کی وجہ سے وہ نِعْمَ الْاَمِیْرُ عَلٰی بَابِ الْفَقِیْرِ کے مصداق ہیں)

غرض ایک بار وہ بنگالی رئیس کسی کام سے ہندوستان آئے۔ الہ آباد

پہنچ کر اُن کو اپنے مرشد سے ملنے کا اشتیاق ہوا۔ اُس کے گاؤں میں پہنچ کر کوئی چودہری چارپائی بچھائے بیٹھے تھے اُن سے بڑی تعظیم کے ساتھ اُس کا نام لے کر دریافت کیا کہ وہ کہاں رہتے ہیں۔ اُنہوں نے کہا کہ وہ تو تکیہ دار فقیر ہے۔ آپ اُس کے ہاتھ میں کہاں پھنس گئے۔ وہ بنگالی صاحب بولے کہ آپ جو چاہے کہیں میرے تو وہ مالک اور مرشد ہیں۔ وہ سمجھ گئے کہ بے چارہ عقل سے کورا ہے۔ اُنہوں نے اپنے کسی نوکر سے کہا کہ فلانے تکیہ دار کو پکڑ لا۔ بنگالی رئیس نے کہا کہ حضور کے ساتھ ایسی گستاخی مجھ کو زیبا نہیں میں خود اُن کی خدمت میں حاضر ہوں گا۔ آپ صرف اتنا کام کر دیجئے کہ راستہ بتلانے کے لئے خادم کو میرے ساتھ کر دیجئے۔ اُنہوں نے خادم کو ساتھ کر دیا۔ وہ ایک تکیہ میں رہتا تھا وہاں پہنچے اور بڑی تعظیم سے سلام و کلام کیا۔

اُس کی حالت یہ تھی کہ تکیہ میں اُس کے پاس چند بدمعاش رہتے تھے اور ہر وقت بھنگ وغیرہ پیتا رہتا تھا۔ اُن رئیس صاحب کا اعتقاد اس حالت کے مشاہدہ سے بھی نہ گیا۔ یہ پیری ایسا پیشہ ہے کہ اگر ایک دفعہ کسی کے تقدس کا اعتقاد ہو جاوے تو پھر بوی تمیزہ کے وضو کی طرح وہ تقدس کبھی ٹوٹتا ہی نہیں۔

تمیزہ ایک فاحشہ تھی جو نماز بھی نہ پڑھتی تھی۔ ایک بزرگ نے اُس کو نماز کی تاکید کی اور وضو کرا دیا۔ نماز کی ترکیب بتلا دی۔ جب سال بھر گزر گیا تو وہ بزرگ پھر آئے اور بی تمیزہ سے پوچھا کہ نماز بھی پڑھتی ہو؟ کہا حضور روزانہ پڑھتی ہوں۔ پوچھا وضو بھی کیا کرتی ہو۔ کہنے لگی کہ حضور نے تو وضو کرا دیا تھا اُسی وضو سے اب تک نماز پڑھ رہی ہوں۔

تو جس طرح بی تمیزہ کا وضو نہ پیشاب پاخانہ سے ٹوٹتا تھا نہ زنا اور بدکاری سے (وضو کیا تو ہلاٹ تھا) اسی طرح آج کل کی پیری جب چل جاتی ہے تو نہ وہ شراب خوارے سے ٹوٹتی ہے نہ زناکاری سے نہ صوم وصلوٰۃ کے چھوڑنے سے نہ داڑھی منڈانے سے نہ ننگا پھرنے سے بلکہ اگر کوئی لنگوٹا بھی اتار کر پھینک دے تو اس کے اور زیادہ معتقد ہوتے ہیں۔ اگر پیر صاحب خاموش رہیں تو چپ شاہ بلکہ فنا فی اللہ ہیں۔ اگر اینڈی بینڈی باتیں ہانکنے لگیں تو رموز ہیں گو وہ کفریات ہی کیوں نہ ہوں اور کوئی ٹھیک بات کہہ دی تو عارف اور محقق ہیں۔

منشار اس غلطی کا یہ ہے کہ لوگوں کے دلوں میں یہ بات جم رہی ہے کہ شریعت اور ہے، طریقت اور ہے۔ اس لئے اگر کوئی شخص ظاہر میں شریعت کے بالکل خلاف ہو اس سے بھی ان کا اعتقاد زائل نہیں ہوتا وہ سمجھتے ہیں کہ شاید یہ بھی طریقت کا کوئی رمز ہو گا۔ استغفر اللہ ولا حول ولا قوۃ الا باللہ۔

غرض اس فقیر نے چند روز تک ان رئیس صاحب کی دعوت کی آرام سے اپنے پاس رکھا۔ دو چار دن رہ کر رئیس نے واپسی کی اجازت چاہی۔ فقیر نے اجازت دی اور کہا کہ میں اسٹیشن تک آپ کو خود پہنچادوں گا۔ چنانچہ وہ اور اس کا بھائی اسٹیشن تک پہنچانے کے لئے ساتھ ہولئے اور اس کو ایسے راستہ سے لے چلے جہاں آدمی بہت کم چلتے تھے۔ جب چلتے چلتے دیر ہو گئی تو رئیس کو خطرہ ہوا۔ اس نے کہا کہ حضور یہ تو وہ راستہ نہیں جس سے میں آیا تھا۔ کہنے لگا کہ میں آپ کو قریب کے راستہ سے باہر باہر لئے چلتا ہوں۔ یہ غریب خاموش ہو گیا۔ یہاں تک

کہ ایک ایسے بن میں اُس کو جا پہنچایا، جہاں نہ آدمی کا پتہ نہ جانور کا۔ اگر آدمی گلا پھاڑ پھاڑ کر بھی چلا دے تو بھی کوئی مدد کو نہ آسکے۔

وہاں پہنچ کر فقیر نے کہا جو کچھ ساتھ لے رہے ہو رکھ دو۔ اس بیچارہ نے جو کچھ ساتھ تھا رکھ دیا۔ کہا کپڑے بھی اتار دو۔ اُس نے کپڑے بھی اتار دیئے۔ اس کے بعد اُس نے رئیس کے قتل کا ارادہ کیا۔ اُس نے بہت کچھ ہاتھ پیر جوڑے اور خوشامدیں کیں کہ آپ مجھے قتل نہ کریں۔ میں اس سے دو چند اور سہ چند روپیہ گھر جا کر بھیج دوں گا۔ کہنے لگا اب تمہارا زندہ چھوڑنا مصلحت نہیں۔ تم ہمارا راز کھول دو گے۔ اُس نے بہت قسمیں کھائیں کہ میں کسی سے یہ معاملہ ظاہر نہ کروں گا مگر اُس سنگدل نے ایک نہ سُنی اور اُس غریب کا کام تمام کر دیا اور نعش کو ایک کنویں میں پھینک دیا۔

کتنے دنوں کے بعد اتفاقاً ایک چرواہا اُس کنویں پر آیا تو اُس کو کنویں میں سے بدبو آئی۔ اُس نے جھانک کر دیکھا تو ایک نعش تیرتی ہوئی نظر آئی۔ اُس نے فوراً پولیس کو اطلاع دی۔ پولیس نے نعش کو نکالا تو اُس کا پہچاننے والا وہاں کوئی نہ تھا مگر اُس کی جیب میں سے کچھ کاغذات نکلے جن میں بردوان کا پتہ لکھا ہوا تھا۔ بس اب کیا تھا پولیس کو پتہ چلانے کے واسطے اتنا کافی تھا۔ سُراغ لگاتے لگاتے سب واقعہ منکشف ہو گیا۔ پولیس نے اُس فقیر کو پکڑا اور اُس سے اظہار لیا۔ آخر اُس نے اقرار کیا کہ میں نے اُس کو قتل کیا ہے۔ چنانچہ اُس کو پھانسی دی گئی۔

سو دیکھئے تنگیٔ معاش سے پریشان ہو کر دوسری طرح حقوق العباد کو

ضائع کرتے ہیں۔ کسی سے قرض لے لیا اور مار لیا۔ کسی کی امانت لے کر انکار کر دیا۔ کسی کی کوئی چیز مانگ لی اور اس کو رہن رکھ دیا۔ اور بہت سے کرتب لوگ کرنے لگتے ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ حقوق العباد کے تلف کرنے کا ضرر متعدی ہے جو ضرر لازم سے اشد ہے۔ اگر یہ شخص کسی حرام ملازمت میں مبتلا رہا بشرطیکہ اُس ملازمت کا فرض منصبی کسی کا اضرار نہ ہو تو اپنا ہی نقصان کرے گا۔ مخلوق کو تو پریشان نہ کرے گا۔ لیکن اگر اُس نے بدون حلال روزی تلاش کئے حرام ملازمت کو بھی چھوڑ دیا تو پھر دوسروں کو نقصان پہنچائے گا۔ اس لئے حکماء اُمت ان اسبابِ معیشت کی اتنی رعایت کرتے ہیں کہ حرام سبب کو بھی حکمت سے چھوڑواتے ہیں تو حلال سبب کو تو وہ کیوں چھڑانے لگے۔

بعض کم فہم لوگ اُن پر اعتراض کرتے ہیں کہ حرام ملازمت کی اجازت دے دی۔ حالانکہ وہ حرام ملازمت کی اجازت نہیں دیتے بلکہ وہ اُس کے ایمان کو محفوظ کرنا چاہتے ہیں کہ اس وقت تو گناہ ہی میں مبتلا ہے پھر کہیں ایمان سے بھی نہ ہاتھ دھو لے۔ نیز اس وقت تو وہ اپنا ہی نقصان کر رہا ہے اس کو چھوڑ کر کہیں مخلوق کو نہ پریشانی میں ڈال دے۔ اور قاعدہ فقہیہ ہے کہ مفسدہ یسیرہ کو مفسدہ عظیمہ سے بچنے کے لئے گوارا کیا جاتا ہے۔ لیکن اس قاعدہ سے کام لینے کا ہر ایک کو حق نہیں۔ اس کا موقع و محل محقق ہی سمجھ سکتا ہے خوب یاد رکھو۔

نفس کے بہانے

غرض میں یہ کہہ رہا تھا کہ اسباب دنیا اسباب دین کے مقابلہ میں تو اس قابل بھی نہیں کہ اُن کے لئے سعی کی جائے۔ نہ کہ ایسی سعی کریں کہ

آخرت کی سعی بھی چھوڑ دیں۔ مگر افسوس ہے کہ اکثر مسلمان اسبابِ دنیا کے اختیار کرنے کو تو ضروری سمجھتے ہیں اور دین کے بارہ میں اسباب کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے۔ پھر بعض لوگ جو دین ہی کی ضرورت نہیں سمجھتے وہ تو قابل خطاب ہی نہیں۔ شکایت تو اُن لوگوں کی ہے جو دین کی ضرورت کو تسلیم کرتے ہیں اور پھر اُس کے اسباب اختیار نہیں کرتے۔ بزرگوں کے پاس آتے جاتے ہیں لیکن اُن سے دین کا راستہ نہیں پوچھتے۔ بڑی دوڑ اُن کی یہ ہے کہ بزرگوں سے جا کر عرض کرتے ہیں کہ ہم کو ایک توجہ سے کامیاب کر دیجئے گویا وہ بھی اسی طرح کامیاب ہو گئے تھے۔ میں کہتا ہوں اسی پر فیصلہ ہے۔ اگر محض توجہ سے دین کامل ہو سکتا ہے تو اُن بزرگ ہی سے پوچھ لو کہ حضور آپ بھی توجہ ہی سے کامیاب ہوئے تھے یا آپ کو کچھ کرنا بھی پڑا تھا۔ اگر وہ محض توجہ سے کامیاب نہیں ہوئے تو پھر آپ کو اُن سے ایسی درخواست کرنے کا کیا حق ہے۔

صاحبو ـــ یہ سب نفس کے بہانے ہیں وہ آپ کو ان دھوکوں سے گمراہ کرنا چاہتا ہے اور منشاء اُس کا محض کم ہمتی اور قلت مبالاۃ بالدین ہے کہ ہم کو خدا کی طاعات میں وہ اہتمام نہیں جو دنیا کے کاموں میں ہے

اللہ سے ہم کلامی

بعض لوگ دھوپ کی وجہ سے جماعت کی نماز ترک کر دیتے ہیں لیکن اگر اُس وقت حاکم بلاوے تو دھوپ کبھی مانع نہ ہو۔ عین دوپہر کے وقت حاکم کے پاس جاویں گے۔ پھر وہاں سے آکر دھوپ کی کچھ شکایت نہ کریں گے بلکہ حاکم سے ملاقات کرنے پر فخر کریں گے کہ ہم سے آج خوب باتیں ہوئیں حاکم نے فلاں مقدمہ کی بابت یوں سوالات کئے۔ ہمارے فلاں معاملہ

کے متعلق یوں کہا۔ حالانکہ یہ کوئی فخر کی بات نہ تھی۔ آخر حاکم کون ہے، تمہارے ہی جیسا ایک آدمی ہے۔ فخر کی بات تو یہ ہے کہ نماز میں حق تعالیٰ سے باتیں ہوتی ہیں۔ ہم اس قابل تو کہاں تھے کہ خدا تعالیٰ ہم سے باتیں کریں۔ واللہ ہم تو اس قابل بھی نہیں ہیں کہ ہم اُن کا نام ہی لے لیں۔

ہزار بار بشویم دہن بمشک و گلاب
ہنوز نام تو گفتن کمال بے ادبی ست

مگر یہ حق تعالیٰ کی رحمت ہے کہ انہوں نے ہم کو اجازت دے دی کہ نماز میں جب چاہو اُن سے باتیں کر لو۔ پھر وہ ہماری باتوں پر توجہ بھی فرماتے ہیں۔ ہماری عرض و معروض کا جواب بھی دیتے ہیں۔ پھر نماز میں ہم کو قرآن پڑھنے کی اجازت دی بلکہ اُس کو فرض کر دیا جو کہ خدا تعالیٰ کا کلام ہے گویا اس طرح حق تعالیٰ بھی ہم سے باتیں کرتے ہیں۔ پھر یہ کس قدر رحمت ہے کہ ہم کو اسمِ عَلَم سے پکارنے کی یعنی یا اللہ کہنے کی اجازت دی کہ اُن کا نام لے کر پکار سکتے ہیں۔ ذرا کسی حاکم کو تو نام لے کر پکارو۔ فوراً جرم قائم ہو جاوے گا۔ پھر نام بھی اتنا آسان کہ بچہ سب سے پہلے اللہ کا نام یاد کر لیتا ہے۔ افسوس ایسے رحیم و کریم خدا سے باتیں کرنے کے لئے لوگوں کو دھوپ مانع ہوتی ہے اور بلا وجہ جماعت کی نماز چھوڑ دیتے ہیں ــــــ!

قبولِ طاعات کی علامت

پھر ایک رحمت یہ ہے کہ وہ ہماری طاعاتِ ناقصہ کو بھی قبول کر لیتے ہیں۔ باقی یہ بات کہ کیسے معلوم ہوا کہ ہماری یہ طاعات ناقصہ قبول ہوتی ہیں۔ سو حضرت حاجی صاحبؒ نے قبول طاعات کی ایک علامت عجیبہ

بیان فرمائی۔

فرمایا کہ قاعدہ ہے کہ جس شخص کے آنے سے کسی کو ناگواری ہوا کرتی ہے تو اگر وہ قادر ہو تو دوسرے وقت اُس کو اپنے گھر میں گھسنے نہیں دیا کرتا۔ تو یاد رکھو اگر حق تعالیٰ کو تمہاری پہلی عبادت ناگوار ہوئی ہوتی، تو وہ دوسرے وقت تم کو مسجد میں نہ گھسنے دیتے نہ نماز کی توفیق دیتے۔ پس جب ایک نماز کے بعد دوسرے وقت تم کو پھر اُسی نماز کی توفیق ہوئی، تو سمجھ لو کہ پہلے وقت کی نماز قبول ہو چکی۔ اسی طرح تمام طاعات میں سمجھ لو۔

واقعی عجیب بات بیان فرمائی۔ گو یہ حجت قطعیہ نہ ہو مگر انا عند ظن عبدی بی کے ساتھ ملا کر امید ہے کہ اگر ہم حق تعالیٰ کے ساتھ یہی گمان رکھیں تو قبولیت کا اچھا قرینہ ہے۔ آخر کوئی تو وجہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے تم کو تو پانچوں وقت مسجد میں آنے کی توفیق دے دی۔ اور بہت سی مخلوق ایسی ہے جن کو سال میں ایک وقت آنے کی بھی توفیق نہیں دی۔ معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کو اُن کا مسجد میں آنا گوارا نہیں۔

ایک گنوار کا قصہ ہے کہ اس کا بچھڑا مسجد میں گھس گیا تھا۔ ملاّ خفا ہونے لگا کہ لوگ نہ نماز پڑھتے ہیں نہ کچھ کرتے ہیں اور جانوروں کو مسجد میں گھسا دیتے ہیں۔ گنوار نے ملاّ سے کہا کہ کیوں بڑ بڑ کرتا ہے جانور تھا مسجد میں گھس آیا کبھی ہم کو بھی آتے ہوئے دیکھا ہے ——— دیکھئے توفیق نہ ہونا اس کا نام ہے۔

اسی طرح ایک آقا اور غلام کا قصہ ہے۔ کہ آقا اور غلام بازار میں کسی کام کو گئے تھے۔ راستہ میں نماز کا وقت آ گیا۔ غلام نمازی تھا۔ اُس نے آقا سے نماز کی اجازت مانگی۔ اُس نے اجازت دے دی کہ اچھا جلدی

نماز پڑھ کے چلے آؤ میں مسجد کے باہر بیٹھا ہوا ہوں۔ اب خدا کی قدرت دیکھیے کہ غلام کو تو مسجد میں آنے کی اجازت دی گئی اور آقا کو باہر ہی سے روک دیا گیا۔ غلام نے آکر نماز پڑھی اور نہایت اطمینان سے فرض و نوافل کو پورا کیا۔ حتیٰ کہ سب نمازی فارغ ہو کر چلے گئے۔ اس کا آقا انتظار کرتے کرتے تھک گیا۔ اس نے ایک شخص سے جو سب کے اخیر میں مسجد سے نکلا تھا پوچھا کہ اب مسجد میں کتنے آدمی ہیں۔ کہا صرف ایک آدمی ہے۔ وہ سمجھا کہ شاید اب جلدی آجائے گا مگر غلام نے وہاں تنہائی میں کوئی وظیفہ شروع کر دیا۔ پھر بھی نہ آیا۔ آخر آقا نے تنگ ہو کر آواز دی کہ میاں کہاں رہ گئے باہر کیوں نہیں آتے۔ غلام نے کہا کہ آنے نہیں دیتا۔ آقا نے پوچھا کون نہیں آنے دیتا۔ کہا جو تم کو باہر سے اندر نہیں آنے دیتا وہ مجھ کو اندر سے باہر نہیں جانے دیتا۔ سبحان اللہ! خوب جواب دیا۔

صاحبو ـــ توفیق الٰہی کا انکار نہیں ہو سکتا۔ دین کے کام وہی کرتا ہے جس کو خدا توفیق دیتا ہے۔ اور یہاں سے اہل طاعات کو سبق لینا چاہیے اور اُن کو اپنی طاعات پر غرور نہ کرنا چاہیے نہ کسی محروم الطاعت کو حقیر سمجھنا چاہیے کیونکہ تم جو کچھ کر رہے ہو محض توفیق الٰہی سے کر رہے ہو اپنا کمال مت سمجھو بلکہ ڈرتے رہو کہ کہیں حق تعالیٰ تم سے یہ توفیق سلب نہ کرلیں جس طرح دوسروں سے سلب کر لی ہے۔ (اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَعُوْذُبِكَ مِنَ الْحَوْرِ بَعْدَ الْكَوْرِ)

غرض مسئلہ توفیق پر نظر کرنے سے حضرت حاجی صاحبؒ نے قبول طاعت کی جو علامت بیان فرمائی ہے اُس کی تصدیق ہوتی ہے اور اس سے حق تعالیٰ کی رحمت کا اندازہ ہوتا ہے کہ بہت ہی رحمت ہے کیونکہ

ہم لوگ جیسی نماز پڑھتے ہیں ظاہر ہے۔ نہ خضوع نہ خشوع نہ ذکر ہے نہ فکر بس گھڑی کی کوک ہے جس سے سوئی خود بخود چل رہی ہے۔ دنیا بھر کے خیالات نماز ہی میں ہم کو سوجھتے ہیں مگر بقاعدۂ مذکور وہ بھی قبول ہوتی معلوم ہوتی ہے تو اس رحمت کا کیا ٹھکانا ہے۔ جلا تم کسی حاکم کے سامنے کھڑے ہو کر تو دوسری طرف توجہ کرو جو فوراً دربار سے نہ نکال دیئے جاؤ۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

این قبولِ ذکر تو از رحمت ست

چوں نمازِ مستحاضہ رخصت ست

واقعی خوب مثال دی کہ جیسے مستحاضہ کی نماز محض رحمت سے قبول ہوتی ہے حالانکہ اس کو نہ طہارت حاصل ہے نہ نظافت۔ خون ٹپک رہا ہے اور شریعت فتویٰ دیتی ہے کہ کچھ حرج نہیں نماز پڑھے جاؤ سب قبول ہے۔ یہی حال ہماری نمازوں کا ہے مگر اس رحمت کا حال معلوم کر کے بے فکر نہ ہونا چاہیئے کہ بس جب وہ ہر طرح قبول کر لیتے ہیں تو خشوع وخضوع کی کیا ضرورت ہے۔ کیونکہ اس حالت میں نماز کا قبول ہونا قاعدہ کے خلاف ہے۔ قاعدہ وہی ہے کہ نماز جبھی قبول ہوگی جب کہ واجبات وشرائط کے ساتھ ادا کی جائے۔ بعض علماء کا قول ہے کہ خشوع وخضوع نماز میں فرض ہے اور بعض نے اس کو سنت کہا ہے۔ بہر حال بے فکری کسی حال میں نہیں ہونی چاہیئے۔ غیرت مند طبائع تو اس رحمت وشفقت کا حال معلوم کر کے مارے شرم کے گڑ جاتے ہیں کہ افسوس اُدھر سے تو اتنی توجہ اور ہماری طرف سے ایسی بے رُخی، مر جانے کی جگہ ہے اور شرم سے اور زیادہ سعی اور خدمت کرتے ہیں۔

دین میں ناکامی کی وجہ

الغرض دلائل سے یہ بات ثابت ہو چکی کہ دین کو دنیا پر بہت سے وجوہ سے ترجیح ہے اور دنیا کے کاموں میں اسباب وطرق کے اختیار کرنے کی ضرورت عقلاء کے نزدیک مسلم ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ دین کے اسباب اختیار نہیں کئے جاتے۔

میں پہلے بتلا چکا ہوں کہ ناکامی کا راز عدم علم بالمقصود ہوتا ہے یا عدم تعین طریق یا صعوبت طریق یا عدم ترتب مقصود علی الطریق۔ اور جہاں ان میں سے کسی کا وجود نہ ہو وہاں ناکامی کا سبب بجز کم ہمتی اور سستی اور کاہلی کے کچھ نہیں۔ اس سے یہ نتیجہ خود بخود نکل آیا کہ جو لوگ دین میں ناکام ہیں وہ محض اپنی سستی اور کاہلی کی وجہ سے ناکام ہیں۔ اس کے سوا کوئی سبب ناکامی کا نہیں نکل سکتا۔ کیونکہ دین کا مقصود ہونا معلوم، اس کا طریق بھی معلوم اور میں دعوئے کے ساتھ اس کو بیان کر چکا ہوں کہ دین میں تنگی کچھ نہیں، اس لئے صعوبت طریق بھی معدوم۔ یہ بھی نصوص سے میں بیان کر چکا ہوں کہ مقاصد دنیویہ کا ترتب اسباب دنیویہ پر لازم نہیں۔ مگر مقاصد دینیہ کا ترتب اسباب دینیہ پر ضروری ہے۔ کیونکہ نصوص میں اس کا وعدہ بطور جزم کے ہے بلکہ ترقی عطا کرنے کا بھی وعدہ ہے اور اعانتِ الٰہیہ کا بھی وعدہ ہے۔ اس کے بعد بھی اگر کوئی دین میں ناکام رہے تو اس کا سبب بجز بدبختی اور کاہلی اور سستی کے کیا کہا جاوے۔

تفسیر آیت کریمہ

اس وقت جو آیت میں نے تلاوت کی ہے اس میں بھی حق تعالیٰ نے اسی مقصود دینی کو بیان فرمایا ہے اور ایک اس کا طریق بتلایا ہے

آئندہ آپ کو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ اس آیت میں جو طریق حق تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے وہ کتنا سہل اور آسان طریق ہے جس سے زیادہ آسان کوئی دوسرا طریق نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس تفصیل سے پہلے میں آیت کی تفسیر کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

یَا أَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَکُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ۔

اس آیت کے دو جزو ہیں۔

۱۔ اتَّقُوا اللّٰهَ ۲۔ کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ

یہ قرآن کا اعجاز ہے کہ دو جملوں میں دریا کو بھر دیا ہے۔ چنانچہ ابھی تفصیل معلوم کر لینے کے بعد آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ ان دو جملوں میں کتنے بڑے مضمون کو حق تعالےٰ نے بیان فرمایا ہے۔ قرآن کے جملوں کی تفسیر مختلف عنوانات سے ہو سکتی ہے۔ اس لئے ممکن ہے کہ اس آیت میں بھی کسی مفسر نے دوسرا عنوان اختیار کیا ہو مگر وہ اختلاف محض عنوان ہی کا ہوتا ہے معنوں میں ایک ہوتا ہے۔ اس آیت کے معنی جو میں سمجھا ہوں وہ یہ ہیں کہ اتقوا اللہ میں مقصود کا ذکر ہے اور کونوا مع الصدقین میں اس مقصود کے طریق کا ذکر ہے کیونکہ جن لوگوں نے قرآن کو بنظر غائر دیکھا ہے وہ خوب سمجھتے ہیں کہ حق تعالیٰ شانہٗ قرآن میں مقاصد کے ساتھ طرق کا ذکر بھی اکثر فرما دیا کرتے ہیں اور یہ ان کی غایت شفقت و رحمت ہے کہ وہ اپنے بندوں کو کسی بات کا حکم فرما کر حیران و پریشان نہیں چھوڑتے بلکہ اس کا طریق بھی ساتھ کے ساتھ بتلا دیتے ہیں کہ یہ کام اس طرح سے ہوگا۔ یہ طریقہ اختیار کرو۔ اس عادت پر نظر کر کے میرا ذوق یہ بتلاتا ہے کہ اس آیت میں بھی جملۂ اولیٰ میں مقصود کا بیان ہے اور ثانیہ میں طریق کا۔ یعنی تقویٰ مقصود

ہے اور معیت صادقین اس کے حصول کا طریق ہے۔ بعبارت دیگر یہ سمجھئے کہ حق تعالیٰ نے دین کامل حاصل کرنے کا امر فرمایا ہے اور معیت کاملین اس کا طریق بتلایا ہے۔ اس کو میں آگے چل کر واضح کر دوں گا کہ تقویٰ کی تفسیر کمالِ دین ہے یا نہیں۔ اس وقت میں یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ کمالِ دین مقصود و مطلوب ہے یا نہیں۔

سعئ کمال

تو سمجھ لیجئے کہ مقاصد میں ہمیشہ کمال ہی مطلوب ہوتا ہے۔ ناقص حالت پر کوئی قناعت نہیں کرتا۔ تجارت کرتے ہیں تو اس میں بھی کمال مطلوب ہوتا ہے۔ لاکھ دو لاکھ پر کوئی بس نہیں کرتا بلکہ جس قدر ترقی ہو اس سے آگے کے طالب رہتے ہیں۔ ایسا کوئی نہیں کرتا کہ جب ضرورت سے زیادہ آمدنی ہو جائے تو آئندہ کے لئے سعی اور کوشش چھوڑ دے۔ نہیں بلکہ قسم قسم کی تجارتیں نئی نئی شروع کر دیتے ہیں۔ اگر ایک شخص کے یہاں بساط خانہ کی تجارت ہے اور اس سے معقول آمدنی ہو رہی ہے تو سرمایہ زیادہ ہو جانے کے بعد وہ کپڑے کی بھی ایک دوکان کھول دیتا ہے۔ اور ترقی ہوئی تو جوتوں کی دوکان بھی کر لیتا ہے یہاں تک کہ پہلے اگر باپ بیٹے سب مل کر ایک دوکان کر رہے تھے تو اب ہر بیٹے کی الگ دوکان کھول دی جاتی ہے۔ چنانچہ مشاہدہ ہے۔ پھر بہت سے مکان خرید کر کرایہ پر دے دیئے جاتے ہیں غرض ہر وقت ترقی کی دھن لگی رہتی ہے۔ کسی حد پر بس نہیں کرتے۔ وہ حال ہو جاتا ہے ع

لا ینتہی ارب الا الی ارب

اگر کسی کے پاس ضرورت کے موافق زمین موجود ہو تو وہ اس پر

قناعت نہیں کرتا بلکہ ہمیشہ اس فکر میں رہتا ہے کہ آج ایک گاؤں پورا خرید لوں۔ ایک گاؤں خریدنے کے بعد دوسرے گاؤں کی تمنا رہتی ہے ؎

ہفت اقلیم ار بگیرد پادشاہ
ہمچناں در بندِ اقلیمے دگر

غرض انسان دنیوی ترقی میں ہمیشہ زیادت کا طالب رہتا ہے، یہاں تک کہ موت ہی سے یہ سلسلہ منقطع ہوتا ہے اس سے پہلے منقطع نہیں ہوتا۔ شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں ؎

گفت چشم تنگ دنیا دار را
یا قناعت پُر کند یا خاکِ گور

دنیا دار کو قناعت تو ہوتی نہیں ہاں، خاکِ گور ہی سے اُس کی حرص منقطع ہوتی ہے۔

شاید آپ مجھ کو کوئی ایسا آدمی دکھلائیں کہ جس نے دس ہزار روپیہ یا دس گاؤں حاصل کر کے بس کر دیا ہو اور آئندہ کے لئے سعی کو ختم کر دیا ہو۔ لیکن اوّل تو یہ بہت ہی شاذ ہے۔ لاکھوں میں ایک آدمی ایسا ہوگا۔ والنادر کالمعدوم۔ اگر لاکھوں میں ایک آدمی آپ نے ایسا دکھلا بھی دیا تو اُس سے میرے بیان پر نقض وارد نہیں ہوتا۔ کیونکہ قواعد میں اکثر کا لحاظ ہوا کرتا ہے اور اکثر کی حالت وہی ہے جو میں نے بیان کی۔ پھر میں کہتا ہوں کہ جو شخص ایسا آپ دکھلائیں گے وہ دین دار ہوگا دنیا دار نہ ہوگا۔ اور گفتگو اہل دنیا کی حالت میں ہے۔ اور اگر وہ دین دار بھی نہ ہو، دنیا دار ہی ہو تو اُس کا ایک سرسری جواب تو یہ ہے کہ اُس کے نزدیک غالباً یہی کمال ہوگا۔ جب وہ کمال حاصل ہو گیا تو مقصود تک وصال ہو گیا

اس سے آگے کوئی کمال اس کی نظر میں ہے ہی نہیں۔ پس وہ بھی طالبِ کمال نکلا۔ ناقص حالت پر اس نے بھی قناعت ہرگز نہیں کی۔

اور حقیقی جواب یہ ہے کہ گو اس نے صورۃً ترقی کو ختم کر دیا مگر معناً وہ اب بھی ترقی کر رہا ہے۔ کیونکہ یہ شخص عاقل دنیا دار ہے نادان نہیں۔ وہ دنیا کی روح کو سمجھ گیا ہے کہ اسباب معاش سے مقصود سکونِ قلب و راحتِ قلب ہے۔ اور ہر وقت اسبابِ معاش میں لگے رہنے سے راحت و سکونِ قلب میسر نہیں ہوتا۔ دل پریشان اور مشغول رہتا ہے اس لئے اس نے ایک معقول سرمایہ حاصل کر کے آئندہ کے لئے صورت ترقی کو بند کر دیا لیکن اب بھی حقیقت میں وہ ترقی کر رہا ہے۔ پہلے اسباب میں ترقی کر رہا تھا اب مسبّب اور مقصود میں ترقی کر رہا ہے یعنی راحت و آرام کے بڑھانے میں مشغول ہے۔

غرض یہ بات ثابت ہو گئی کہ دنیوی اسباب میں ہر شخص کمال کا طالب ہے۔ کسی قدر حاصل پر کوئی بس نہیں کرتا بلکہ اس سے بھی آگے کا طالب رہتا ہے (اور اگر کوئی شخص کسی خاص حد پر بس بھی کرتا ہے تو ناقص حالت پر ہرگز بس نہیں کرتا بلکہ کوشش اور سعی کو ہمیشہ درجۂ کمال پر پہنچا کر ختم کیا جاتا ہے۔ مثلاً اگر کسی کو تجارت میں نقصان ہو رہا ہو تو اس حالت پر کوئی بھی سعی کو ختم نہ کرے گا بلکہ جب اتنا سرمایہ اکٹھا ہو جائے کہ وہ ساری عمر کو کافی ہو جاوے بلکہ بچ بھی جاوے اس وقت بعض لوگ سعی کو ختم کر سکتے ہیں۔ پس یہ بات یقیناً معلوم ہو گئی کہ ناقص حالت پر کوئی بھی قناعت نہیں کرتا۔ قناعت ہمیشہ حصول کمال ہی کے بعد ہوتی ہے۔ گو وہ بھی قناعت صوری ہے ورنہ حقیقت میں اب بھی ترقی ختم نہیں ہوتی)

دین داری اور قناعت

پھر حیرت ہے کہ دین میں لوگوں کو ناقص حالت پر قناعت کیوں ہے۔ چنانچہ بڑی دینداری آج کل یہ ہے کہ نماز پانچوں وقت کی پڑھ لی جب نماز پڑھنا شروع کر دی تو اب وہ اپنے کو دین دار سمجھنے لگتے ہیں اور اسی پر قناعت کر لیتے ہیں۔ پھر افسوس یہ ہے کہ جس نماز پر قناعت کی جاتی ہے وہ بھی کامل نہیں ہوتی یعنی اوّل تو محض نماز کے کامل کر لینے سے بھی دین کامل نہیں ہوتا چہ جائیکہ وہ نماز بھی کامل نہ ہو، ناقص در ناقص ہی ہو اس پر قناعت کر لینا تو بہت ہی کوتاہی ہے۔ بعضے نماز کے بعد زکوٰۃ بھی ادا کرتے ہیں۔ زکوٰۃ دے دی تو گویا انہوں نے جنّت کو خرید لیا اور اگر حج بھی کر لیا تو پھر کیا تھا جنید وقت ہو گئے۔ اب انہیں آگے ترقی کی کچھ ضرورت نہیں رہتی۔ وہ اسی پر دین کو کامل سمجھ کر سعی اور ترقی بند کر دیتے ہیں۔ عوام کی کیا شکایت کی جائے افسوس یہ ہے کہ بعض اہلِ علم بھی اس بلا میں گرفتار ہیں۔

ایک عالم نے مجھے لکھا کہ آپ نے جو وظیفہ وغیرہ مجھ کو بتلایا تھا وہ تو کر لیا۔ اب آگے کچھ اور سبق بھی ہے۔ یا بس ختم ہو گیا۔ افسوس دنیا مُردار تو ایسی چیز ہے کہ اس میں کسی حد پر بھی قناعت نہیں کی جاتی اور دین کو ایسا حقیر سمجھ لیا ہے کہ چار دن کام کر کے اپنے کو کامل اور منتہی ہونے کا احتمال سوجھنے لگا۔ مجھے ان عالم کا یہ خط سخت ناگوار ہوا اور میں سمجھا کہ ان کو دین کا ادب بھی بالکل نہیں۔ کیونکہ اُن کے الفاظ سے تمسخر ٹپکتا تھا۔ میں نے اُن کو لکھ دیا کہ میرا تم سے نباہ نہ ہو گا۔ میں تم کو قابلِ خطاب بھی نہیں سمجھتا۔ تم کو نہ دین کی طلب ہے نہ اُس کا ادب دل میں ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا

اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡنَ ط۔

غرض لوگوں نے دین کو نماز و روزہ و زکوٰۃ و حج میں منحصر سمجھ لیا ہے اس سے زیادہ کی وہ ضرورت نہیں سمجھتے بلکہ جو شخص تقویٰ کامل اختیار کرے اور حقوق العباد وغیرہ کا پورا لحاظ کرے اور دین میں ترقی کا ارادہ کرے اُس کو پاگل سمجھتے ہیں مگر وہ ایسا پاگل ہے جس کو مولانا فرماتے ہیں ؎

او گل سرخ ست تو خونش مخواں

مست عقل ست او تو مجنونش مداں

ما اگر قلاش و گر دیوانہ ایم　　مست آں ساقی و آں پیمانہ ایم

وہ خدا کے دیوانے ہیں جن کے لئے یہ دیوانگی فخر ہے ؎

اوست دیوانہ کہ دیوانہ نشد　　مرعسس را دید و در خانہ نشد

ایک طالبِ خدا کا قصہ

میرے ایک دوست پہلے ڈپٹی کلکٹر تھے لیکن انہوں نے اپنے دین کی حفاظت کے لئے صیغہ حکومت سے اپنا تبادلہ کرا لیا ہے۔ اب وہ تعلیم کی لائن میں ہیں جس میں تنخواہ ڈپٹی کلکٹری سے کم ہے۔ اس پر بہت لوگوں نے اُن کو بے وقوف بنایا کہ یہ بھی عجب دیوانے ہیں کہ اتنی بڑی تنخواہ چھوڑ کر چھوٹی تنخواہ پر قناعت کر لی اور حکومت کا عہدہ چھوڑ کر ذلیل عہدہ اختیار کیا۔ مگر جب یہ لوگ خدا کے سامنے پہنچیں گے اُس وقت معلوم ہو جائے گا کہ بے وقوف کون تھا؟

انہیں دوست کا یہ قصہ بھی ہے کہ ایک مرتبہ وہ ریل کا سفر کرنے کو تھے۔ اُن کے ساتھ اُن کا ایک لڑکا بھی تھا۔ وہ اُس کی عمر دریافت کر رہے تھے کہ بارہ سال سے کم ہے یا پورے بارہ سال کی ہے۔ اگر پورے بارہ

سال کی ہے تو قاعدہ ریلوے کے موافق اُس کا بھی ٹکٹ لینا چاہیے۔ اُن کے ساتھی کہہ رہے تھے کہ اس بچّہ کی عمر بارہ سال کی تھوڑا ہی ہے اور اگر ہو بھی تو اس کا قد بہت کم ہے۔ دس سال کا معلوم ہوتا ہے۔ اگر آپ ٹکٹ نہ لیں گے تب بھی کوئی کچھ نہ کہے گا۔ انہوں نے کہا کہ ریل والے کچھ نہ کہیں تو خدا تعالیٰ تو کہیں گے کہ تم نے ایک شخص کی چیز کو اُس کی بلا اجازت بدون کرایہ دیئے کیوں استعمال کیا۔ وہ بے چارے اُن کی عمر کی تحقیق کر رہے تھے اور اُن کے نوکر ہنس رہے تھے۔ تحقیق سے معلوم ہوا کہ بچّہ کی عمر بارہ سال سے زیادہ ہے تو اُنہوں نے اُن کا بھی پورا ٹکٹ لیا۔ لوگ اُن کو یہ رائے دیتے تھے کہ صاحب اگر آپ کے پاس یہ روپیہ ایسا ہی فضول ہے تو کسی غریب کو دے دیجئے۔ ریل والوں کو آپ کیوں دیتے ہیں خصوصاً جب کہ وہ اس بچّہ کے ٹکٹ کا آپ سے سوال بھی نہیں کر سکتے۔ اُنہوں نے کہا کہ جس غرض سے میں اس کی عمر دریافت کر رہا ہوں غریبوں کو روپیہ دینے سے وہ غرض حاصل نہ ہو گی۔ یعنی تصرف فی ملک الغیر بلا اذنہ غریبوں کو دینے سے جائز نہ ہو جائے گا۔ اس معاملہ میں سب لوگ اُن کو بے وقوف اور مجنون سمجھ رہے تھے کہ فضول روپیہ ضائع کر رہے ہیں مگر وہ خدا کے مجنون تھے۔

یہ قاعدہ ہے کہ جب دین کا غلبہ ہوتا ہے تو مسلمان کو دنیوی مضرت کی پروا نہیں ہوا کرتی۔ مگر یہ بات حکماء الہٰی سے دریافت کرنے کی ہے کہ دین کے لئے کس جگہ مضرت کا تحمل مناسب ہے اور کس جگہ غیر مناسب ہے۔ یہ قاعدہ کلیہ نہیں ہے کہ ہر مضرت دنیویہ کا تحمل کر لینا چاہئے اور

اس کی پروا نہ کرنی چاہیئے بلکہ اس میں تفصیل ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ جب شریعت کسی کام کو واجب کر دے یا کسی کام کو حرام کر دے تو واجب کے ادا کرنے اور حرام سے بچنے میں اگر ہم کو کچھ دنیوی مضرت ایسی پہنچے جو مال یا آبرو کو ضرر پہنچانے والی ہو تو ہم کو اس مضرت کی پروا نہ کرنی چاہیئے اور اگر ایسی مضرت ہو جس سے جان کا غالب خطرہ ہو تو اس وقت واجب کے وجوب اور حرام کی حرمت کا مکلف ہی یہ شخص نہ رہے گا اور مستحبات وسنن کے لیئے تو مال یا آبرو کی مضرت کا تحمل کرنا بھی واجب نہیں ہوتا بلکہ افضل اور عزیمت ہے۔ اور جان کی مضرت کا تحمل کرنا تو بعض دفعہ مستحبات وسنن کے لیئے ناجائز اور حرام ہے۔ غرض اس مسئلہ میں بہت تفصیل ہے) جس کے لیئے کتب فقہ کا مطالعہ ضروری ہے۔ ہر شخص اس بات کو نہیں سمجھ سکتا کہ کس جگہ مضرت کا تحمل مناسب ہے اور کہاں مناسب نہیں اور کہاں واجب ہے اور کہاں حرام ہے

جاہل متوکل کا قصہ

اگر ہر شخص کی رائے پر اس کو چھوڑ دیا جائے تو وہی قصہ ہوگا کہ ایک شخص نے ایک مولوی صاحب کے وعظ میں توکل کی فضیلت اور اس کی ضرورت کا مضمون سنا تھا۔ وہ بہت خوش ہوا کہ جب خدا تعالیٰ یوں بھی روزی پہنچا سکتے ہیں تو محنت ومشقت کی کیا ضرورت ہے۔ پس آپ نے سارا کاروبار چھوڑ دیا اور جنگل میں لب سڑک جا بیٹھا۔ اتنی ہمت بھی نہ ہوئی کہ سڑک سے دور جا بیٹھے۔ یہ خیال کیا کہ سڑک کے کنارے کوئی تو آتا جاتا دیکھے گا۔ دوسرے وہاں ایک کنواں بھی پاس تھا جس پر بیٹھ کر مسافر کھانا کھایا کرتے تھے۔ تو اس نے یہ جگہ اس لیئے تجویز کی کہ ایسا بھی کیا ہے کہ

کوئی مسافر بھی مجھے کھانا نہ دے گا۔ اب آپ کو مسافروں کا انتظار شروع ہوا کہ شاید کوئی آوے اور مجھے کھانا کھلاوے۔ ایک آیا اور اُس نے کھا پی سیدھا اپنا رستہ لیا۔ سمجھا کہ انشاء اللہ اس مرتبہ جو کوئی آوے گا وہ ضرور مجھے دیکھ کر کھلاوے گا۔ دوسرا آیا اُس نے اُس شخص کی طرف سے پشت کر لی اور سڑک کی طرف منہ کر کے کھانا کھایا اور وہ بھی چلتا ہوا اسی طرح دو تین دن گزر گئے اور کسی نے بھی اُس کو ایک ٹکڑا نہ دیا۔ آخیر میں ایک مسافر آیا اور اُس نے بھی کھا پی کر چلنے کا ارادہ کیا تھا کہ آپ نے کھنکارا آہیں آہیں۔ اُس نے مڑ کر جو دیکھا تو ایک آدمی نظر پڑا جس کا فاقوں کے مارے بُرا حال ہے۔ اُس کو ترس آیا اور جو کچھ بچی ہوئی روٹیاں تھیں اُس کے حوالے کیں۔ جنہیں کھا کر میاں کے حواس درست ہوئے۔

بھاگا ہوا مولوی صاحب کی خدمت میں آیا اور کہنے لگا کہ مولوی صاحب! آپ نے توکل کے بیان میں ایک قید ضرور چھوڑ دی ہے جس سے لوگوں کو ضرور دھوکا ہوا ہو گا۔ اور نہ معلوم کتنے آدمی اس دھوکا سے پریشان ہوئے ہوں گے۔ وہ تو خدا نے خیر کی کہ میں نے اپنے اجتہاد سے اُس قید کو سمجھا ورنہ میں بھی ہلاک ہو گیا ہوتا۔ براہِ کرم آئندہ آپ جہاں کہیں توکل کا بیان فرمایا کریں اتنی قید اور بڑھا دیا کریں کہ کھنکارنے کی بھی ضرورت ہے۔ پھر اُس نے اپنا قصہ بیان کیا۔

تو دیکھئے اس شخص نے ترک اسباب کا بیان سُن کر یہ سمجھ لیا کہ میں بھی ترک اسباب کا اہل ہوں۔ اس لئے ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھ گیا اور پریشان ہوا۔ حالانکہ اس کی تشخیص اُس کو کسی طبیب روحانی سے کرانی چاہیئے تھی کہ میں ترکِ

اسباب کا اہل ہوں یا نہیں۔

اسی طرح ایک شخص نے وعظ میں سُن لیا تھا کہ اللہ کے راستہ میں جو ایک روپیہ دے گا اُس کو دس دنیا میں ملیں گے اور ستر آخرت میں۔ اُس نے اپنے دل میں کہا کہ اس سے اچھی تجارت کیا ہو گی بس سب کام چھوڑ کر یہی کرنا چاہیئے۔ چنانچہ اُس کے پاس ایک روپیہ تھا اُس نے اُسے خیرات کر دیا اور منتظر رہا کہ اب دس روپے آویں گے۔ کئی دن گزر گئے ایک پیسہ بھی نہ آیا بڑا پریشان ہوا۔ یہاں تک کہ میاں کو دست لگ گئے کیونکہ اب اس کو رہ رہ کر اپنے روپے کے جانے کا بھی غم ہوتا تھا اور دل ہی دل میں مولوی صاحب کو بُرا بھلا کہتا تھا کہ انہوں نے یہ کیسا غلط مسئلہ بیان کیا بے چارے کو اسی فکر میں دست اور ہیضہ لگ گئی۔ بار بار اجابت کے لئے جنگل جاتا تھا۔

ایک دفعہ وہ قضائے حاجت کر رہا تھا اور زمین کو کرید رہا تھا کہ دفعتہً مٹی میں سے ایک بٹوہ ملا جس میں پورے دس روپے تھے۔ بڑا خوش ہوا اور دست تو فوراً موقوف ہو گئے کیونکہ جس علت سے دست آنے شروع ہوئے تھے وہ علت ہی نہ رہی۔ دوڑا ہوا مولوی صاحب کے پاس آیا کہ مولوی صاحب آپ نے جو کچھ وعظ میں فرمایا تھا بالکل درست ہے مگر اُس میں ایک قید آپ نے چھوڑ دی۔ آئندہ جہاں یہ مسئلہ آپ بیان کریں ساتھ میں یہ بھی فرما دیا کریں کہ مروڑے بھی لگتے ہیں۔ اس کے بعد جس کو تحمل ہو گا ایک کے دس لے گا اور جس کو تحمل نہ ہو گا وہ اس طریقہ کو اختیار نہ کرے گا۔ یہ سچ ہے کہ ایک کے دس ملتے ہیں مگر مروڑے غضب کے ہیں ——— !

غرض یہ بات ضروری ہے کہ ہر شخص کو تحمل مضرت کی اجازت نہیں اس کے لئے کچھ شرائط اور محل ہیں۔ مگر یہ بات ضرور ہے کہ جب دین کا غلبہ ہو جاتا ہے تو دین دار کو دنیوی مضرت کی پروا نہیں رہا کرتی۔

ایک طالبِ خدا کی حکایت

میرے ایک دوست کی حکایت ہے جو بی اے ہیں۔ ایک مرتبہ وہ ریل کا سفر کر رہے تھے۔ اُن کے پاس اسباب زیادہ تھا اور جس اسٹیشن سے وہ سوار ہوئے تھے وہاں وزن کرانے اور بلٹی لینے کی فرصت نہ ملی۔ تو اُنہوں نے یہ خیال کیا کہ جس اسٹیشن پر اُتروں گا وہاں وزن کرا کے محصول ریلوے ادا کر دوں گا۔ چنانچہ جب وہ منزل مقصود پر اُترے تو وہاں کے بابو سے اُنہوں نے کہا کہ میرے پاس اسباب زیادہ ہے جس کا محصول ادا کرنا میرے ذمہ ہے مجھ کو بوجہ تنگی وقت کے سوار ہوتے ہوئے اس کی بلٹی کرانے کا موقع نہ ملا۔ آپ اس وقت وزن کر کے مجھ سے محصول لے لیجئے اور چونکہ میں نے اپنا واقعہ خود بیان کر دیا ہے۔ اس سے آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ میں نے خیانت اور خلاف ورزی قانون کا قصد نہیں کیا تھا اس لئے آپ کو اصل محصول لے لینا چاہیئے ڈبل چارج نہ کرنا چاہیئے۔ بابو نے کہا جائیے ہم کچھ نہیں لیتے۔ انہوں نے پھر اصرار کیا۔ وہ متعجب ہو کر اسٹیشن ماسٹر کے پاس لے گیا۔ اُس نے بھی وزن کرنے اور محصول لینے سے انکار کیا اُنہوں نے پھر اصرار کیا تو وہ دونوں ان کو انگریزی زبان سے ناواقف سمجھ کر انگریزی زبان میں باتیں کرنے لگے۔ وہ باتیں یہ تھیں کہ معلوم ہوتا ہے اس شخص نے شراب پی ہے جو باوجود انکار کے از خود روپیہ دینا چاہتا ہے اُنہوں نے کہا میں نے شراب نہیں پی، میرا مذہب مجھ کو مجبور کرتا ہے۔

افسوس! آج کل فریب اور پالیسی کا بازار ایسا گرم ہے کہ لوگوں کی سمجھ میں یہ بات ہی نہیں آتی کہ کوئی شخص از خود بھی خدا کے خوف سے دوسروں کا حق ادا کر سکتا ہے۔ بس وہ یوں سمجھتے ہیں کہ عاقل وہی ہے جو از خود کسی کا حق ادا نہ کرے اور جس کو خود بخود اس کی فکر لگی ہوئی ہو اُسے پاگل سمجھتے ہیں۔ چنانچہ ریل والوں نے اُن کو پاگل ہی سمجھا اور یہ کہا کہ آپ اپنا اسباب لے جائیں۔ ہماری اجازت ہے آپ کو کوئی کچھ نہ کہے گا۔ اُنہوں نے کہا کہ آپ کو اس اجازت کے دینے کا کوئی اختیار ہی نہیں کیونکہ آپ ریلوے کمپنی کے مالک نہیں ہیں بلکہ اُس کے ملازم ہیں۔ آپ کو ریلوے کے حق چھوڑنے کا کیا حق ہے۔ مگر کسی طرح ریل والوں نے اُن سے محصول نہ لیا اُنہوں نے اپنا اسباب اٹھایا اور باہر آ کر سوچنے لگے کہ اے اللہ میں کیا کروں؟ اب حق تعالیٰ نے اُن کی اعانت فرمائی جب کہ دیکھا کہ میرے بندہ کو معصیت سے بچنے کا راستہ نظر نہیں آتا اور دوسرے لوگ اس کو معصیت میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں اور یہ اُس سے بچنے کی کوشش کرتے کرتے تھک گیا ہے۔ معاً دل میں یہ بات آئی کہ مقدار محصول کے برابر ایک ٹکٹ اسی ریلوے کمپنی کا لے کر چاک کر دینا چاہیے۔ اس طرح محصول ادا ہو جائے گا۔ چنانچہ اُنہوں نے ایسا ہی کیا۔

صاحبو ــــ آپ دین پر عمل کر کے تو دیکھیں۔ انشاء اللہ قدم قدم پر آپ کو اعانت الٰہیہ کھلی آنکھوں نظر آئے گی۔

اعانتِ الٰہیہ

یہ تو سب جانتے ہیں کہ کمالِ دین بدون اعانت خداوندی کے حاصل نہیں ہوتا۔ مگر میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ ابتدائی منازل میں بھی

حق تعالیٰ پوری اعانت کرتے ہیں۔ پس جب دین کے کام میں ابتدا سے انتہا تک اعانت الٰہیہ ساتھ رہتی ہے پھر تم کیوں ڈرتے ہو۔ کہ صاحب دین پر عمل کیسے کریں یہ تو بہت مشکل معلوم ہوتا ہے۔ ارے بھائی تم کو اگر مشکل معلوم ہوتا ہے تو خدا کو تو کوئی مشکل نہیں۔ جب وہ تمہاری اعانت کا وعدہ فرماتے ہیں۔ پھر یہ عذر کرنا محض نفس کی شرارت ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰهَ یَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا۔

فکر کا فقدان

پھر بھی افسوس ہے کہ لوگ دین میں ترقی حاصل نہیں کرتے اور جس کو جتنا دین حاصل ہے وہ اسی پر قانع ہے۔ میں عوام ہی کی شکایت نہیں کرتا۔ افسوس یہ ہے کہ خواص کو بھی ترقی دین کی فکر نہیں۔ بس جو تعلیم میں مشغول ہے وہ اسی پر قانع ہے اور سمجھتا ہے کہ میں بڑا دیندار ہوں کہ ہر وقت قال اللہ و قال الرسول ہی میں رہتا ہوں۔ جو لوگ ذکر شغل میں مشغول ہیں وہ اسی پر قناعت کئے ہوئے ہیں۔ کوئی ان سے پوچھے کہ آخر شریعت میں معاملات اور معاشرات کی تعلیم کس لئے دی گئی ہے۔ اصلاح اخلاق کا اہتمام کیوں کیا گیا ہے۔ کیا یہ دین نہیں کیا اس پر عمل کرنے کے لئے مسلمانوں کے علاوہ کوئی دوسری قوم پیدا ہو گی۔ آخر تقوے کی فروع فقہیہ پر تم کیوں عمل نہیں کرتے۔ یہ مسائل فقہاء نے کس کے لئے بیان کئے ہیں۔

دنیا دار اگر قلیل حصہ دین پر قناعت کرے تو وہ اتنا خسارہ میں نہیں جتنا خسارہ اہل علم کو ادنیٰ حصہ دین پر قناعت کرنے سے پہنچے

گا۔ کیونکہ دنیادار نے اگر دین کم حاصل کیا تو اُس نے دنیا میں تو لذت و راحت حاصل کر لی۔ اور یہ مولوی صاحب دنیا میں تو پھسڈی تھے ہی اگر دین میں بھی پھسڈی رہے تو کسی طرف کے بھی نہ ہوئے۔ نہ دنیا میں چین ہوا نہ آخرت میں۔ وہاں بھی یہ کلفت ہی میں رہیں گے اور دنیا میں تو یہ کلفت کے اندر رہیں ہی کہ نہ عالیشان محل رہنے کو ہے نہ نوکر چاکر ہیں نہ زیادہ روپیہ ہے نہ عمدہ اور لذیذ غذائیں ہیں نہ ریشمی لباس زیب تن ہے۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ طبقہ ادنیٰ دین پر کیوں کر قناعت کرتا ہے اور دنیا کو چھوڑنے کے بعد یہ کمال دین کی فکر کیوں نہیں کرتے امام غزالی نقل فرماتے ہیں ؎

أَرَى الْمُلُوْكَ بِأَدْنَى الدِّيْنِ قَدْ قَنِعُوْا
وَمَا أَرَاهُمْ رَضُوْا فِي الْعَيْشِ بِالدُّوْنِ
فَاسْتَغْنِ بِالدِّيْنِ عَنْ دُنْيَا الْمُلُوْكِ
كَمَا اسْتَغْنَى الْمُلُوْكُ بِدُنْيَاهُمْ عَنِ الدِّيْنِ

مطلب یہ ہے کہ میں سلاطین و اہلِ دول کو دیکھتا ہوں کہ اُنہوں نے تھوڑے سے دین پر قناعت کر کے اپنے کو دنیا میں مشغول کر دیا ہے اب تم ان کو اس طرح نیچا دکھاؤ کہ تھوڑی سی دنیا پر قناعت کر کے دین میں کمال پیدا کرو اور سلاطین کی دنیا سے مستغنی ہو جاؤ۔ کیونکہ اب اُن کو نیچا دکھانے کا یہی طریقہ ہے۔ دنیا میں تو اُن سے بڑھ جانا تمہاری قدرت میں نہیں ہے مگر دین میں بڑھنا تو قدرت میں ہے۔ پس تم دین میں سلاطین کو نیچا دکھا دو۔ کہ وہ آج تم سے بڑھے ہوئے نظر آتے ہیں تو دین کی برکت سے کل تم اُن سے بڑھے ہوئے رہو گے۔ اور

اگر تم دین میں بھی کم رہے تو سلاطین تم سے ہر جگہ بڑھے ہوئے رہیں گے اور یہ بہت بڑا خسارہ ہے۔ سبحان اللہ! کیا عجیب تعلیم ہے اور یہ لطیفہ ایسا ہے جیسا ایک شاعر نے کہا ہے ؎

یاد داری کہ وقتِ زادنِ تو   ہمہ خنداں بدند و تو گریاں
آنچناں زی کہ وقت مردنِ تو   ہمہ گریاں شوند و تو خنداں

ایک عجیب مضمون

یعنی تم کو یہ بات بھی یاد ہے کہ جب تم پیدا ہوئے تھے تو سب لوگ ہنس رہے تھے اور تم روتے ہوئے آئے تھے۔ تو یہ لوگ نہایت ظالم ہیں کہ ان کو تمہارے رونے پر بھی رحم نہ آیا۔ اس وقت ان کو خوشی کی سوجھ رہی تھی۔ اب تم ان کو اس طرح بدلہ دو کہ تمہارے مرنے کے وقت وہ سب روئیں اور تم ہنستے ہوئے جاؤ۔ یعنی ایسی زندگی بسر کرو جس کی بدولت سب کو تمہارے مرنے کا غم ہو اور تم کو لقاءِ الٰہی کی خوشی ہو۔ وہ روتے رہیں اور تم ہنستے ہوئے جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ مرنے کے وقت بھی سب ہنسیں اور خوش ہوں کہ اچھا ہوا کم بخت کا پاپ کٹا۔ اور تم اعمال سیئہ کی وجہ سے روتے ہوئے جاؤ۔ تو اس مضمون میں بھی ویسا ہی مقابلہ ہے جیسا اوپر کے اشعار میں مقابلہ تھا کہ جس طرح تمہارے رونے پر لوگ ہنستے تھے اب تم ان کے رونے پر ہنسو اور دنیا سے اس طرح جاؤ کہ آخرت کی راحتیں دیکھ کر تم بے ساختہ یوں کہو۔

یَا لَیْتَ قَوْمِیْ یَعْلَمُوْنَ بِمَا غَفَرَ لِیْ رَبِّیْ وَجَعَلَنِیْ مِنَ الْمُکْرَمِیْنَ۔

اے کاش میری قوم کو اطلاع ہو جائے کہ میرے خدا نے مجھے بخش دیا اور مجھ کو معززین میں داخل کر دیا ہے۔ تو اس اطلاع سے وہ رونے سے باز آجائیں یہی مقابلہ کا مضمون پہلے اشعار میں تھا کہ تم امراء و سلاطین کو دین میں نیچا دکھا دو جب کہ انہوں نے تم کو دنیا میں نیچا دکھایا ہے کیونکہ آج کل کے امراء حضرات صحابہؓ کی طرح تھوڑا ہی ہیں جن کو نیچا دکھانا مشکل ہو۔

صحابہ کرام کی حالت

حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کی تو یہ حالت تھی کہ غرباء حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں شکایت کرتے ہوئے آئے کہ یا رسول اللہ مالدار لوگ ہم سے بڑھ گئے۔ کیونکہ جس طرح نماز روزہ ذکر و شغل ہم کرتے ہیں وہ بھی کرتے ہیں۔ اور اُن میں یہ بات زیادہ ہے کہ وہ زکوٰۃ بھی دیتے ہیں۔ خیرات و صدقات کرتے رہتے ہیں۔ جہاد میں خوب مال خرچ کرتے ہیں اور یہ کام ہم نہیں کر سکتے۔ تو حضورؐ نے اُن سے فرمایا کہ تم پانچوں نمازوں کے بعد

سُبْحَانَ اللّٰہِ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَلَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ

پڑھا کرو۔ اس کا تم کو اتنا ثواب ملے گا کہ مالداروں کے صدقات اور خیرات سے بڑھ جائے گا۔ مالدار صحابہؓ کو جو اس کی خبر ہوئی تو انہوں نے بھی یہ کام شروع کر دیا۔ غرباء پھر شکایت لائے کہ یا رسول اللہ! امراء نے بھی وہ تسبیحیں پڑھنا شروع کر دیں جو آپ نے ہم کو تعلیم فرمائی تھیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ اب میں کیا کروں۔ میں خدا کے فضل کو کسی سے کیوں کر روک دوں۔ ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ۔

حضرات صحابہؓ میں جو لوگ مالدار تھے اُن کی یہ حالت تھی کہ وہ ہر وقت اپنے دین کی ترقی میں لگے رہتے تھے اور جو نیک کام اُن کو معلوم ہوتا اُس کی طرف سبقت کرتے تھے۔ اُن کو دین میں نیچا دکھانا غرباء کو مشکل تھا۔ ان حضرات کے پاس مال بہت کچھ تھا مگر حالت یہ تھی کہ دل کو اُس سے ذرا بھی لگاؤ نہ تھا۔

ایک صحابی کا انتقال ہونے لگا۔ تو وہ رو رہے تھے۔ لوگوں نے اُن کو تسلی دی کہ ماشاء اللہ تم نے حضورؐ کے ساتھ فلاں فلاں غزوات میں شرکت کی اور خدا کے راستہ میں اسلام کی بہت سی خدمتیں کی ہیں انشاء اللہ تم کو حق تعالیٰ بخش دیں گے۔ تم کیوں روتے ہو۔ اُنہوں نے کہا میں اس وجہ سے نہیں روتا بلکہ میں اس واسطے روتا ہوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہماری تنگدستی کی یہ حالت تھی کہ عثمان بن مظعونؓ کا جب انتقال ہوا تو اُن کے کفن کے لئے صرف ایک چھوٹا سا کمبل تھا جس کو سر کی طرف کھینچتے تو پیر کھل جاتے اور پیر کی طرف کھینچتے تو سر کھل جاتا تھا۔ حضورؐ نے حکم دیا کہ کمبل کو سر کی طرف کھینچ دیا جائے اور پیروں پر گھاس ڈال دی جاوے۔ اور آج ہمارے پاس اتنا مال ہے کہ سوائے مٹی کے اور کہیں اس کی جگہ نہیں۔

اس کے دو مطلب بیان کیئے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ سوائے زمین میں دفن کرنے کے اور کہیں اس کی جگہ نہیں۔ دوسرے یہ کہ بجز عمارتوں میں خرچ کرنے کے اور کسی کام میں یہ روپیہ نہیں آتا۔ تو وہ حضرات ایسے تھے کہ زیادہ مال جمع ہونے سے روتے تھے۔ اس کی اُن کو زیادہ خوشی نہ تھی۔

صاحبو۔۔۔ یہ وہ امراء تھے جن کی وجہ سے حضرات صوفیہ میں اختلاف ہوا ہے کہ صبر افضل ہے یا شکر افضل ہے۔ تو صوفیہ کرام کے اس قول میں ایسے شاکر مراد ہیں جیسے حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم تھے نہ کہ ہم جیسے حرام خور جو خدا کی نعمتیں کھا کھا کر معاصی پر اور زیادہ دلیر ہوتے ہیں۔ اگر حضرات صوفیہ ہمارے زمانہ کے امراء کو دیکھ لیتے تو وہ یہی فرماتے کہ صابر افضل ہے شاکر سے (الا ماشاء اللہ)

پس آج کل کے امراء کو دین میں نیچا دکھا دینا کچھ بھی مشکل نہیں پھر تعجب ہے کہ ہم کو اس بات پر غیرت نہ آئی کہ ہم دنیا میں تو امراء سے کم رہے دین میں بھی اُن سے بڑھے ہوئے نہ رہیں۔ بالخصوص اہل علم کو تو یہ غیرت ضرور ہونی چاہئے۔ پس اُن کو لازم ہے کہ جس طرح اہل دنیا کسی وقت ترقی دنیا سے نہیں تھکتے وہ بھی ترقی دین سے نہ تھکیں اور دین میں کمال حاصل کرتے رہیں۔ جس کا ایک اور آسان طریقہ اس آیت میں بیان فرماتے ہیں جس کو میں نے تلاوت کیا ہے۔

تقویٰ کی تفصیل

حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَکُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ۔

اے ایمان والو! خدا سے ڈرو اور سچے لوگوں کے ساتھ ہو

اُس میں اوّل تقویٰ کا امر ہے۔ یہ بات تو اوپر ثابت ہو چکی کہ ہر مقصود میں درجہ کمال مطلوب ہوا کرتا ہے۔ اب یہ بات ثابت کرنا رہی کہ تقویٰ کمال دین ہے یا نہیں۔ نصوص شرعیہ میں غور کرنے سے یہ مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔ تقویٰ کا امر اور فضل قرآن میں جس قدر ہے غالباً

کسی چیز کا اتنا نہیں۔ اس سے اس کا مہتم بالشان ہونا معلوم ہوا۔ اور حقیقت اس کی یہ ہے کہ تقویٰ کا استعمال شریعت میں دو معنی میں ہوتا ہے۔ ایک ڈرنا دوسرے بچنا۔ اور تامل کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اصل مقصود تو بچنا ہی ہے یعنی معاصی سے۔ مگر سبب اس کا ڈرنا ہے کیونکہ جب کسی چیز کا خوف دل میں ہوتا ہے تبھی اُس سے بچا جاتا ہے۔ تقویٰ کا معنی اوّل میں استعمال اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً۔ میں ہے اور بچنے کے معنی میں استعمال نصوص کثیرہ میں۔ اور اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے اِتَّقُوا النَّارَ وَلَوْ بِشِقِّ تَمْرَةٍ۔ بچو جہنم سے اگرچہ ایک ٹکڑا چھوہارے کا دے کر۔ یہاں بچنے ہی کے معنی بن سکتے ہیں ڈرنے کے معنی نہیں بن سکتے۔

غرض استعمال دونوں معنی میں وارد ہے لیکن اصل مقصود احتراز عن المعاصی ہے اور خوف علی الاطلاق مقصود بالذات نہیں بلکہ وہ ذریعہ اور سبب ہے احتراز عن المعاصی کا۔ جس کی دلیل یہ حدیث ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم اپنی دعا میں فرمایا کرتے تھے۔

وَاَسْئَلُكَ مِنْ خَشْيَتِكَ مَا تَحُوْلُ بِهٖ بَيْنَنَا وَبَيْنَ مَعَاصِيْكَ

اے اللہ! میں آپ سے آپ کا اتنا خوف مانگتا ہوں جس سے مجھ میں اور معاصی کے درمیان میں آڑ ہو جاوے۔ اس سے معلوم ہوا کہ خوف علی الاطلاق مقصود نہیں کیونکہ مقاصد کا ہر درجہ مطلوب ہوتا ہے کوئی درجہ غیر مقصود نہیں ہوتا۔ اور حدیث کی اس قید سے معلوم ہوتا ہے کہ خوف ایک خاص حد تک مطلوب ہے اس سے آگے مطلوب نہیں وہ خاص حد یہ ہے کہ جس سے معاصی میں رکاوٹ ہو جاوے۔ حضور

صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں مَا تَحُوْلُ بِہٖ بَیْنَنَا وَبَیْنَ مَعَاصِیْکَ کی قید بڑھا کر ایک ایسی بات بتلائی ہے جو سالکین کو سالہا سال کے تجربہ کے بعد معلوم ہوتی ہے مگر آپ نے دو لفظوں میں اس کو حل فرما دیا۔ وہ بات یہ ہے کہ بظاہر یہ بات سمجھ میں آیا کرتی ہے کہ خدا کا خوف تو اچھی چیز ہے۔ پس وہ جتنا بھی زیادہ ہو اچھا ہے۔ لیکن تجربہ سے معلوم ہوا کہ اس کا حد سے بڑھ جانا مضر ہو جاتا ہے۔

اوّل تو زیادت خوف سے صحت خراب ہو جاتی ہے ہر وقت انسان رنج وغم ہی میں رہتا ہے اور صحت کے اختلال سے اعمال میں کوتاہی ہونے لگتی ہے۔

دوسرے صاحبِ خوف کو دیکھ کر دوسرے مسلمانوں کی ہمتیں پست ہو جاتی ہیں کہ بس صاحب خدا کو راضی کرنا بڑا مشکل ہے۔ ہر وقت رنج وغم میں گھلنا پڑتا ہے۔

تیسرے جب خوف کا غلبہ حد سے زیادہ ہوتا ہے تو یہ شخص رحمتِ الٰہی سے مایوس ہو جاتا ہے۔ یاس تک نوبت پہنچ جاتی ہے جو کہ کفر ہے اور مایوس ہونے سے وہ بالکل معطل وبیکار ہو جاتا ہے سمجھتا ہے کہ جب میرے کئے کچھ نہیں ہو سکتا اور میں رحمتِ حق کے قابل ہی نہیں ہوں تو پھر اس ساری محنت سے کیا فائدہ۔ بس سب کام چھوڑ چھاڑ کر بیٹھ جاتا ہے۔

تو غلبہ خوف سے یہ باتیں پیش آیا کرتی ہیں۔ اُس وقت سالک کو معلوم ہوتا ہے کہ خوف کا ہر درجہ مطلوب نہیں۔ مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو دو لفظوں میں اس حقیقت پر متنبہ کر دیا۔

جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ اصل مقصود تقویٰ بمعنی احتراز عن المعاصی ہے۔ اور خدا کی نافرمانی سے بچنے کا کمالِ دین ہونا ظاہر ہے کیونکہ اس میں ادائے فرائض و واجبات و اجتناب عن المحرمات سب داخل ہیں کوئی مقصود شرعی اس سے خارج نہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ نماز بھی پڑھو کیونکہ ترکِ صلوٰۃ معصیت ہے۔ زکوٰۃ بھی دو کیونکہ ترکِ زکوٰۃ معصیت ہے۔ اسی طرح تمام ماموراًت کا چھوڑنا معصیت ہے۔ تو اس میں ماموراًت کے ادا کا حکم بھی ہے اور محرمات کے ترک کا بھی۔ اور کمالِ دین کے یہی دو اجزاء ہیں۔ تو تقویٰ کا کمالِ دین ہونا ثابت ہو گیا۔

دوسری دلیل ایک اور ہے جس سے تقویٰ کا کمالِ دین ہونا ثابت ہے۔ وہ یہ کہ حدیث میں ہے

اَلَا اِنَّ التَّقْوٰی ھٰھُنَا وَ اَشَارَ اِلٰی صَدْرِہٖ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سینۂ مبارک کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ سن لو تقویٰ یہاں ہے یعنی تقویٰ کا محل قلب ہے۔ ایک مقدمہ تو یہ ہوا اس کے ساتھ دوسری حدیث کو ملا لیجئے۔

اَلَا اِنَّ فِی الْجَسَدِ مُضْغَةً اِذَا صَلُحَتْ صَلُحَ الْجَسَدُ کُلُّهٗ وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ کُلُّهٗ اَلَا وَھِیَ الْقَلْبُ۔

یعنی جسم میں ایک ٹکڑا ہے جب وہ درست ہو جاتا ہے تو تمام بدن درست ہو جاتا ہے اور جب وہ بگڑ جاتا ہے تو تمام بدن بگڑ جاتا

لہ اس حدیث سے بعض جاہل صوفیوں نے یہ سمجھا ہے کہ بس اصل مقصود اصلاح قلب ہے۔ اعمال ظاہرہ کی کچھ ضرورت نہیں۔

ہے۔ سُن لو۔ وہ قلب ہے۔ اس حدیث سے اصلاحِ قلب کا صلاحیتِ کاملہ ہونا ثابت ہے۔ اور پہلی حدیث سے یہ معلوم ہو چکا کہ تقویٰ کا اصل محل اور موصوف قلب ہے اور اس سے لازم آتا ہے کہ تقویٰ سے اوّل اصلاح قلب کی ہوتی ہے تو ان دونوں مقدموں سے تقویٰ کا مستلزم صلاحیت کاملہ ہونا ثابت ہوگیا اور صلاحیت کاملہ ہی کمالِ دین ہے۔ پس یہ دعوٰے ثابت ہوگیا کہ تقویٰ کمالِ دین ہے۔ اور قلب کو محل تقویٰ اس حدیث میں اس لئے فرمایا کہ تقویٰ بمعنی الاجتناب عن المعصیۃ کا سبب خوف خداوندی ہے اور ظاہر ہے کہ خوف کا

یہ بالکل غلط اور صریح زندقہ ہے اور اس کا غلط ہونا خود اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کیونکہ آپ فرماتے ہیں کہ جب دل صالح ہوتا ہے تو تمام بدن صالح ہوجاتا ہے اور جب دل بگڑ جاتا ہے تو تمام بدن بگڑ جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اعمال ظاہرہ صلاحیتِ قلب و فسادِ قلب کی دلیل ہیں۔ پس جس شخص سے اعمال صالحہ صادر ہوں یہ اُس کے قلب کی صلاحیت کی دلیل ہے اور جس سے اعمالِ سیئہ صادر ہوں یہ اُس کے قلب کے فساد کی دلیل ہے پس صلاحیتِ قلب کے بعد اعمالِ صالحہ کا ترک ممکن نہیں اور جو شخص اعمال صالحہ کو ترک کر کے صلاحیت قلب کا دعویٰ کرتا ہے وہ جھوٹا ہے پس یہ مسلّم کہ اصل مقصود اصلاحِ قلب ہے مگر وہ اعمال صالحہ کی مداومت اور اعمال سیئہ سے اجتناب سے منفک نہیں ہوسکتی ہے۔ لہٰذا اعمال ظاہرہ ہرگز بیکار نہیں۔ فافہم ۱۲- جامع۔

اصلی محل قلب ہے۔ یہاں تک جملۂ اولیٰ کے متعلق کلام تھا۔

صادقین کی تشریح

دوسرے جملہ کی بابت میں نے یہ کہا تھا کہ کونوا مع الصدقین بیان ہے مقصود مذکور کے طریق کا کہ حاصل اس کا معیت مع المتقین ہے۔ پس صادقین انہی کا ایک عنوان ہے اور متقی کے معنی کاملین فی الدین کی معیت ہے۔ پس صادقین کے بھی وہی معنی ہوں گے یعنے کمال فی الدین کا طریق کاملین فی الدین کی معیت ہے۔ پس کونوا مع صدقین کی توجیہ کونوا مع الکاملین ہوتی ہے۔ کیونکہ صادقین سے معنی مشہور صادقین فی القول مراد نہیں بلکہ راسخ فی الدین مراد ہیں۔ جیسے ہمارے محاورہ میں بھی پکے آدمی کو سچا کہتے ہیں اور اس معنی کے اعتبار سے حق تعالیٰ نے بعض انبیاء علیہم السلام کو صدیق فرمایا ہے۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا

اور اسی صدیقیت کا درجہ بعد نبوت کے ہے پھر شہداء و صالحین کا درجہ۔ چنانچہ ایک آیت میں حق تعالیٰ نے اسی ترتیب سے ان درجات کو بیان فرمایا ہے۔

فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا۔

اور رسوخ فی الدین بھی کمال فی الدین ہے۔ پس مع الصدقین کی توجیہ مع الکاملین ثابت ہو گئی۔ نیز اس کی دلیل ایک اور آیت ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ بلکہ یہ آیت اتفاق سے میرے دونوں دعووں کو ثابت کر رہی ہے یعنی اس سے تقویٰ اور

صدق دونوں کے معنی کمالِ دین ہونا ثابت ہو رہا ہے۔ پوری آیت اس طرح ہے۔

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ۗ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ۗ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝

کچھ ساری خوبی اسی میں نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق کی طرف کر لو یا مغرب کی طرف لیکن (اصلی) خوبی تو یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی (ذات و صفات) پر یقین رکھے اور قیامت کے دن پر (بھی) اور فرشتوں (کے وجود) پر (بھی) اور (سب) کتب (سماویہ) پر (بھی) اور (سب) پیغمبروں پر (بھی) اور مال دیتا ہو اللہ کی محبت میں (اپنے حاجت مند) رشتہ داروں کو اور (نادار) یتیموں کو اور دوسرے غریب محتاجوں کو اور (بے خرچ) مسافروں کو اور (لاچاری میں) سوال کرنے والوں کو اور (قیدیوں اور غلاموں کی) گردن چھڑانے میں (بھی مال خرچ کرتا ہو) اور نماز کی پابندی رکھتا ہو اور زکوٰۃ بھی ادا کرتا ہو۔ اور جو لوگ اپنے عہدوں کو پورا کرنے والے ہوں جب (کسی امر جائز کا) عہد کر لیں اور وہ لوگ مستقل مزاج رہنے والے ہوں تنگ دستی میں اور بیماری میں اور (معرکہ) قتال میں۔ یہ لوگ ہیں جو سچے ہیں اور یہی لوگ ہیں جو

متقی ہیں۔

حاصل یہ ہے کہ صادق اور متقی یہی لوگ ہیں جن کے یہ اوصاف اور ان اوصاف میں تمام اجزاء دین کا ذکر اجمالاً آگیا ہے۔ دین کا کوئی جزو اس سے باقی نہیں رہا۔ پس یہ اوصاف کمالِ دین کو متضمن ہیں اس کے بعد فرماتے ہیں کہ جو لوگ ان اوصاف سے متصف ہیں وہی صادق اور وہی متقین ہیں۔ اس سے صاف طور پر یہ بات معلوم ہو گئی کہ صادق اور متقی وہی شخص ہے جو دین میں کامل ہو۔ پس صدق اور تقویٰ کی حقیقت کمالِ دین ہونا ثابت ہو گیا۔

تفسیر آیت البر

رہا یہ کہ آیا اس آیت میں تمام اجزاء دین کا ذکر آگیا ہے؟ اس کی تفصیل یہ ہے کہ شریعت میں کل احکام کا حاصل تین چیزیں ہیں۔

۱۔ عقائد ۲۔ اعمال ۳۔ اخلاق

اور تمام جزئیات انہی کلیات کے تحت میں داخل ہیں اور اس آیت میں اقسامِ ثلثہ کے بڑے بڑے شعبے ارشاد فرمائے گئے ہیں۔ اس اعتبار سے یہ آیت منجملہ جوامع کلم کے ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ۔ بر کے معنے بھلائی کے ہیں اور لام عہد کا ہے۔ معنی یہ ہوئے لیس البر الکافی ان تولوا وجوہکم قبل المشرق و المغرب۔ یعنی مشرق و مغرب کی طرف نماز میں منہ کر لینا برِ کافی نہیں ہے کہ اسی پر قناعت کر لی جائے۔ اس توجیہ سے یہ اشکال رفع ہو گیا کہ استقبال قبلہ بھی تو مامور بہ شرعاً ہے۔ اور مامور بہ شرعی کا بر ہونا لازم ہے پھر اس کی نسبت لیس البر کیوں فرمایا۔ اس اشکال کے جواب لوگوں

نے مختلف وجوہ سے دیئے ہیں لیکن جو توجیہ میں نے بیان کی ہے یہ بہت آسان ہے اور یہ توجیہ اسی وقت سمجھ میں آئی ہے۔ حاصل اس کا یہ ہے کہ اس میں استقبال سے مطلق خیریت کی نفی کی گئی ہے بلکہ اس کے برِ کافی ہونے کی نفی مراد ہے۔

رہا یہ کہ اس مضمون کی اس جگہ ضرورت کیا تھی۔ استقبال مشرق ومغرب سے برِ کافی کی نفی کیوں کی گئی۔ سو بات یہ ہے کہ اس سے پہلے تحویل قبلہ کا مسئلہ مذکور ہوا ہے۔ جس میں کفار ومشرکین نے بہت شور وغل کیا تھا۔ اور اس وقت ان کی تمام تر بحث اسی میں رہ گئی تھی کہ مسلمانوں کا بھی عجب دین ہے کبھی کسی طرف منہ کرتے ہیں کبھی کسی طرف۔ تو حق تعالیٰ اُن کو تنبیہ فرماتے ہیں کہ تم تو اس بحث میں ایسے پڑ گئے کہ گویا مشرق ومغرب کی طرف منہ کرنا کوئی بڑا مقصود ہے۔ حالانکہ یہ مقصود نہیں بلکہ شرائط ووسائل مقصود میں سے ہے پس یہ حماقت ہے کہ مقاصد کو چھوڑ کر غیر مقاصد کی بحث پر اکتفا کر لیا جاوے۔ مشرق ومغرب کی طرف منہ کرنا یہ برِ کافی نہیں بلکہ برِ کافی وہ ہے جس کا آگے بیان آتا ہے۔ اس کا اہتمام کرو۔

مشرق ومغرب کی تخصیص ذکر میں ایک نکتہ کی وجہ سے ہے اس سے قبلہ کا مشرق ومغرب میں منحصر کرنا مقصود نہیں کیونکہ جن لوگوں سے مکہ معظمہ کا رُخ جانب شمال میں ہے اُن کا قبلہ شمال ہے۔ اور جس جگہ سے مکہ کا رُخ جنوب میں ہے اُس جگہ کا قبلہ سمت جنوب ہے۔ چنانچہ مدینہ والوں کا قبلہ جنوب ہے۔ اسی لئے حدیث میں اہل مدینہ کو فرمایا گیا ہے وَلٰکِنْ شَرِّقُوْا اَوْ غَرِّبُوْا کہ استنجا کے وقت تم لوگ مشرق

یا مغرب کی طرف منہ کیا کرو۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ قبلہ مشرق و مغرب میں منحصر نہیں۔ پس اس جگہ مشرق و مغرب کی تخصیص میں نکتہ یہ ہے کہ تمام جہات میں سے یہی دونوں جہتیں عرفاً زیادہ مشہور ہیں۔ جب ان کا غیر مقصود ہونا بیان کر دیا تو دوسری جہات کا مقصود نہ ہونا بھی اس سے واضح ہو گیا۔

دوسری بات یہ ہے کہ مشرق و مغرب کی جہت میں امتیاز بوجہ تقابل حسّی کے زیادہ محسوس ہے۔ پس اوّلاً و بالذّات انہی دو جہات کا علم حاصل ہوتا ہے اور دوسری جہات کا علم ان کے واسطے سے ہوتا ہے۔ چنانچہ مشرق و مغرب کی جہت کا سمجھنا شمال و جنوب کے جاننے پر موقوف نہیں۔ ہر شخص جانتا ہے کہ مشرق وہ جہت ہے جدھر سے آفتاب نکلتا ہے اور مغرب وہ ہے جدھر آفتاب ڈوبتا ہے اور شمال و جنوب کی معرفت بدون مشرق و مغرب کے نہیں ہو سکتی چنانچہ شمال و جنوب کی تعریف اس طرح کی جاتی ہے کہ مشرق کی طرف منہ کر کے کھڑے ہونے سے داہنے ہاتھ کی سمت جنوب ہے اور بائیں ہاتھ کی سمت شمال ہے۔ پس یہ دونوں جہتیں اصل ہوئیں اور جنوب و شمال ان کی فرع ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ اصل کے غیر مقصود ہونے سے فرع کا غیر مقصود ہونا خود ہی سمجھ میں آ جاتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ کہ شریعت میں قلیل انحراف مفسدِ صلوٰۃ نہیں تو مشرق و مغرب جن کا قبلہ ہے وہ اگر قدرے شمال و جنوب کی طرف مائل ہو جاویں نماز فاسد نہ ہو گی۔ اس طرح گویا مشرق و مغرب میں شمال و جنوب بھی آ گئے۔

پس مطلب صرف یہ ہے کہ کسی جہت کی طرف بھی منہ کرنا برِّ کافی

نہیں بلکہ بر کافی وہ ہے جس کا آگے ذکر ہے وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ ـــــ الخ یہاں دونوں جہتیں جائز ہیں۔ ایک یہ کہ مسند الیہ کی جانب میں مضاف کو مقدر کیا جائے۔ وَلٰكِنَّ ذَا الْبِرِّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ ـــــ الخ۔ ایک یہ کہ مسند کی طرف مضاف مقدر مانا جاوے۔ یعنے وَلٰكِنَّ الْبِرَّ بِرُّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ ـــــ الخ اور حاصل دونوں کا ایک ہے۔

عقائد کا بیان

خواہ یہ کہا جائے کہ بھلائی کافی اس شخص کی بھلائی ہے یا کافی بھلائی والا وہ شخص ہے جو اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے اور قیامت کے دن پر۔ اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے میں ذات وصفات کے متعلق جس قدر احکام ہیں سب آگئے۔ اور قیامت کے دن پر ایمان لانے میں جزاو سزا وحساب وکتاب وجنت ودوزخ وغیرہ کے سب احکام آگئے وَالْمَلٰٓئِكَةِ اور فرشتوں پر ایمان لائے یعنی اُن کے وجود کا قائل ہو اس میں تمام مغیبات داخل ہیں اور فرشتوں کی تخصیص اس لئے کی گئی ہے کہ شریعت کے معلوم ہونے کا مدار وواسطہ ملائکہ ہی ہیں۔ وَالْكِتٰبِ اور کتاب پر ایمان لائے۔ یہاں کتاب بصیغۂ مفرد لایا گیا ہے حالانکہ کتب سماویہ متعدد ہیں اور ایمان لانا سب پر واجب ہے (گو عمل منسوخ پر جائز نہیں) اور اسی وجہ سے دوسری آیتوں میں صیغۂ جمع اختیار کیا گیا ہے۔ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ـــــ الخ لیکن یہاں صیغۂ مفرد اختیار کرنے میں اشارہ ہے ایک امر کی طرف وہ یہ کہ قرآن ایسا جامع ہے کہ وہ تمام کتب سماویہ پر حاوی ہے اس لیئے اُس پر ایمان لانا گویا سب پر ایمان لانا ہے یا یہ کہا جاوے

کہ کتب سماویہ میں سے ہر کتاب دوسری کتاب پر ایمان لانے کا امر کرتی ہے۔ پس وہ سب مل کر بمنزلہ کتاب واحد کے ہیں۔ ان سب پر ایمان لانا بمنزلہ کتاب واحد پر ایمان لانے کے ہے۔ (اور جو شخص ایک کتاب کو مان کر دوسری کا انکار کرے وہ حقیقت میں پہلی کتاب پر بھی ایمان نہیں رکھتا) لیکن یہ حکم ایمان کا ہے اور عمل کرنا سب کتابوں پر جائز نہیں بلکہ عمل صرف مؤخر پر ہوگا کیونکہ وہ مقدم کے لئے ناسخ ہے۔
وَالنَّبِيِّينَ اور پیغمبروں پر ایمان لائے۔ یہاں تک تو امہات عقائد مذکور ہیں۔ آگے اخلاق و اعمال کا ذکر ہے۔

اعمالِ شرعیہ کی اقسام

اعمال شرعیہ کی دو قسمیں ہیں۔ طاعات، دیانات دوسرے معاملات (معاملات کی پھر دو قسمیں ہیں۔ ایک متعلق اموال کے دوسرے متعلق غیر اموال کے ہیں۔ ان میں نکاح و طلاق و عتاق و حدود وغیرہ داخل ہیں) اور دیانات کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک طاعات بدنیہ، دوسرے طاعات مالیہ۔ اسی طرح اخلاق کی دو قسمیں ہیں حسنہ و سیئہ۔ اخلاق حسنہ کے ساتھ موصوف ہونا مقصود شرعی ہے۔ اور اخلاق سیئہ سے خالی و منزہ ہونا مطلوب ہے۔ عقائد سے آگے ان سب کے اصول مذکور ہیں جن میں طاعاتِ مالیہ کا ذکر مقدم کیا گیا۔ کیونکہ بہت لوگ طاعات بدنیہ میں ہمت والے ہوتے ہیں اور طاعاتِ مالیہ میں ان کا یہ حال ہوتا ہے ؎

گر جاں طلبی مضائقہ نیست
گر زر طلبی سخن دریں ست

چنانچہ ارشاد ہے وَاٰتَی المَالَ علیٰ حبہ اور دیتا ہو مال اللہ کی محبت میں رشتہ داروں کو۔ علیٰ حُبّہٖ کی ضمیر اگر اللہ کی طرف راجع ہو جیسا کہ یہی ظاہر ہے تو اس میں علمِ اخلاق کا بھی ایک اصلِ عظیم مذکور ہو گا یعنی مال خدا کے راستہ میں محبت الٰہی کی وجہ سے دینا چاہیئے۔ اس میں ایک تو محبت الٰہی کے حاصل کرنے کی تعلیم ہوئی کہ خدا سے محبت پیدا کرنی چاہیئے۔ محض ضابطہ کا تعلق نہ ہونا چاہیئے دوسرے اخلاص کی تعلیم اور ریا و ناموری کی ممانعت ظاہر ہوئی کہ مال خرچ کرنے میں کسی کی مدح وثنا و شکریہ وغیرہ کا منتظر نہ ہو بلکہ محض خدا کی محبت اس کا سبب ہونا چاہیئے —— اور اخلاص بھی اخلاقِ باطنیہ کا ایک بڑا رکن ہے۔

اگر مرجع ضمیر مال ہے تو معنی یہ ہوں گے کہ ایسا مال جس سے محبت ہو اور دل کو تعلق ہو خدا کے لیئے خرچ کر دے۔ اس میں ایک تو خرچ کرنے کا ادب مذکور ہوا کہ اللہ کے واسطے عمدہ مال خرچ کرنا چاہیئے۔ ردی مال نہ دینا چاہیئے۔ دوسرے علمِ سلوک کا یہ مسئلہ بھی اشارۃً مذکور ہوا کہ محبتِ مال جو کہ خلقِ ذمیم ہے اس کا علاج یہ ہے کہ جس چیز سے محبت ہو اسی کو اللہ کی راہ میں خرچ کر دے۔ دو چار بار ایسا کرنے سے حُبِّ مال کا مرض جاتا رہے گا۔

ذَوِی القُربیٰ میں تمام قرابت دار داخل ہیں۔ بیوی بچے بھی اُن میں آگئے جن کا نفقہ مرد پر واجب ہوتا ہے۔ اور دوسرے غریب رشتہ دار بھی آگئے جن کو کچھ دیتے رہنا اور اُن کا خیال رکھنا مستحب ہے۔

وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسَاکِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ اور یتیموں کو بھی دے اور مسکینوں کو بھی دے اور مسافروں کو بھی۔ یہ سب صدقات نافلہ ہیں کیونکہ زکوٰۃ کا بیان آگے آرہا ہے۔

اب یہاں دو سوال پیدا ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ طاعاتِ مالیہ کا ذکر طاعاتِ بدنیہ سے کیوں مقدم ہوا۔ اس کا جواب تو میں نے دے دیا کہ بعض طبائع میں بخل کا مادّہ زیادہ ہوتا ہے۔ وہ طاعاتِ بدنیہ کی ہمت خوب کر لیتے ہیں اور مال دینے سے جان چراتے ہیں۔ اس لئے طاعاتِ مالیہ کو اہتماماً مقدم کر دیا۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ طاعاتِ مالیہ میں سے صدقہ نافلہ کو صدقہ واجبہ یعنی زکوٰۃ پر کیوں مقدّم کیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بعض لوگ خدا تعالیٰ سے ایسا ضابطہ کا تعلق رکھتے ہیں کہ زکوٰۃ مفروضہ کے علاوہ اور کچھ خیرات نہیں کرتے۔ اس میں گناہ نہیں مگر ضعفِ تعلق مع الحق کی دلیل ضرور ہے۔ اس لئے حق تعالیٰ نے صدقاتِ نافلہ کو زکوٰۃ سے مقدم فرمایا جس سے اس طرف اشارہ کر دیا کہ زکوٰۃ تو واجب ہے۔ وہ تو تم ادا کرو ہی گے لیکن اس کے علاوہ بھی کچھ صدقہ خیرات موقع بموقع کرتے رہنا چاہیئے۔

دیکھیئے اگر کوئی محبوب یا کوئی بادشاہ ہم سے یہ کہہ دے کہ اس موقع میں تم دو روپیہ خرچ کردو تو خود کیجیئے اس وقت ہمارے دل کی کیا حالت ہوگی۔ کیا ہم دو روپیہ ہی پر اکتفا کریں گے۔ ہرگز نہیں بلکہ محبوب کو خوش کرنے یا بادشاہ کی نگاہ میں جانثار بننے کے لئے ہم دو کی جگہ دس خرچ کریں گے ورنہ چار تو دے ہی ڈالیں گے

اس لئے خدا تعالیٰ سے ضابطہ کا تعلق نہ رکھنا چاہیئے۔

اس نکتہ کی وجہ سے صدقات نافلہ کو صدقہ مفروضہ مالیہ سے مقدم کیا بلکہ طاعتِ بدنیہ یعنی صلوٰۃ سے بھی مقدم کر دیا۔ لیکن بعد میں جب زکوٰۃ کا ذکر فرمایا تو نماز کو اس سے مقدم کیا تاکہ یہ معلوم ہو جاوے کہ رتبہ کے اعتبار سے نماز ہی مقدم ہے۔ چنانچہ دیکھ لو ہم نے زکوٰۃ کا ذکر اس کے بعد کیا ہے۔ اور جن صدقات مالیہ کو نماز اور زکوٰۃ سے پہلے بیان کیا ہے۔ وہاں تقدیم کی وجہ محض اہتمام بالشان ہے نہ کہ رتبہ کا زیادہ ہونا۔ رتبہ نماز کا طاعاتِ مالیہ سے بڑھا ہوا ہے اور زکوٰۃ کا رتبہ صدقاتِ نافلہ سے بڑھا ہوا ہے۔ سبحان اللہ — خدا تعالیٰ کے کلام میں ہر چیز کے درجہ کا کتنا لحاظ ہے۔ یہی تو باتیں ہیں جن کی وجہ سے بشر کی عقل اس کلام کو دیکھ کر چکرا تی ہے کہ اتنی رعائتیں انسان ہرگز نہیں کر سکتا۔

وَالسَّائِلِینَ وَفِی الرِّقَابِ اور مانگنے والوں کو بھی دے اور گردن چھڑانے میں بھی۔ یہ بھی صدقاتِ نافلہ کی ایک فرد ہے۔ اس میں اس قدر تفصیل ضروری ہے کہ دیگر نصوص شرعیہ سے سائلین کا لفظ۔ اُن سوال کرنے والوں کے ساتھ مخصوص ہو گیا ہے جو مجبوری کی وجہ سے سوال کرتے ہوں۔ جن کا پیشہ سوال نہ ہو گیا ہو اور جو لوگ مضبوط ہٹے کٹے سوال کو پیشہ بنائے ہوئے ہیں اُن کو دینا جائز نہیں نہ اُن کو سوال کرنا جائز ہے۔

اس مسئلہ پر اس زمانہ میں سب سے پہلے حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے تنبیہ فرمائی۔ ایک دن فرمایا کہ ایک مسئلہ بتلاتا ہوں،

گالیاں تو بہت پڑیں گی چنانچہ واقعی جب اس مسئلہ کی شہرت ہوئی تو لوگوں نے بہت اعتراضات کئے اور بُرا بھلا کہا۔ کوئی یہ کہتا تھا کہ بس اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی فقیر کو کچھ مت دو مجھے دے جاؤ کوئی یہ کہتا تھا کہ بس یہی تو ایک نئے مولوی پیدا ہوئے ہیں۔ آج تک کسی نے بھی ان سوال کرنے والوں کو دینا حرام نہیں تبلایا۔

عاشق کا مقام

مگر مولانا تو شریعتِ الٰہیہ کے عاشق تھے اور عاشق کو گالیوں کی پروا نہیں ہوا کرتی۔ کسی نے خوب کہا ہے ؎

گرچہ بدنامی ست نزدِ عاقلاں
مانمی خواہیم ننگ و نام را

اور اسی معنی میں ایک شعر اردو کا ہے مگر ذرا شاعریت سے گرا ہوا ہے اور نہ معلوم یہ کیا بات ہے کہ اردو کے اشعار فارسی اشعار کے سامنے پھیکے ہوتے ہیں مگر خیر مضمون کے موافق کی وجہ سے پڑھے دیتا ہوں ؎

عاشق بدنام کو پروائے ننگ و نام کیا
اور جو خود ناکام ہو اس کو کسی سے کام کیا

ناکامی کا مطلب حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھو آپ نے ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ بھائی جو بامرادِ ہونا چاہے وہ کسی اور بزرگ کے یہاں جائے اور جو نامرادی چاہے وہ ہمارے پاس چلا آوے۔ پھر چپکے سے فرمایا کہ جانتے ہو نامرادی کے کیا معنی ہیں؟ اس کے معنی ہیں عشق۔ کیونکہ عاشق بوجہ طلب اور اشتیاق کے غلبہ کے

ہر جگہ اپنے آپ کو ناکام اور بے مراد ہی سمجھتا ہے۔ وہ کسی حالت یا کسی مقام پر قناعت نہیں کرتا۔ ہر وقت آگے کی طلب رہتی ہے اس لئے وہ ہمیشہ ناکام رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چشتیہ میں بعد تمکین کے بھی سوز و گداز رہتا ہے مگر یہ دنیا ہی میں ہے کیونکہ یہاں وصال کامل نہیں ہو سکتا۔ جس سے تسلی ہو جائے لیکن آخرت میں تسلی ہو جاوے گی۔

ایک صاحب حال صوفی کا قول مشہور ہے۔ اِنَّ فِی الْجِنَانِ جَنَّةً لَیْسَ فِیْهَا حُوْرٌ وَّلَا قُصُوْرٌ وَّلٰکِنْ فِیْهَا اَرِنِیْ اَرِنِیْ۔ یعنی ایک جنت ایسی بھی ہے جس میں نہ حوریں ہیں نہ محلات ہیں۔ بس وہاں جو لوگ رہیں گے ان کی یہ حالت ہو گی کہ وہ ہر وقت حق تعالیٰ سے عرض کرتے رہیں گے کہ اپنے کو دکھلا دیجئے، اپنے کو دکھلا دیجئے۔

بعض لوگ اس کو حدیث سمجھتے ہیں یہ غلط ہے بلکہ ایک صوفی کا قول ہے اور قول بھی غلط۔ میرے نزدیک اس صوفی نے جنت کو دنیا پر قیاس کیا ہے حالانکہ جنت میں حسب استعداد وصال کامل نصیب ہو جائے گا جس سے پوری تسلی ہو جائے گی۔ اور کسی قسم کی خلش باقی نہ رہے گی۔ جس کی دلیل یہ ہے کہ نصوص قرآنیہ سے جنت میں ہر قسم کی کلفت اور خلش کی نفی صراحتہً معلوم ہو چکی ہے اور یقیناً اگر یہ خلش وہاں بھی رہی تو اس سے بڑھ کر کوئی خلش نہ ہو گی۔ عشاق تو آخرت ہی کی امید پر زندگی کے دن پورے کر رہے ہیں اگر وہاں بھی تسلی کامل نہ ہوئی تو بڑی حسرت کی بات ہے۔ اور نصوص سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ جنت میں کوئی حسرت باقی نہ رہے گی۔

وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِيٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُوْنَ۔

اور دنیا میں سکون کامل اور پوری تسلی اس لئے نہیں ہو سکتی کہ یہاں وصال کامل عادۃً ممتنع ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں قویٰ وصالِ کامل کے متحمل نہیں اور جنت میں تحمل عطا ہو جائے گا۔ اور اہل نسبت کو جو دنیا میں وصال نصیب ہوتا ہے اس کو حالتِ تلوین کی اضافت سے وصال کہہ دیا جاتا ہے ورنہ حقیقی وصال کے سامنے وہ بھی کچھ نہیں۔ بس ایک قسم کا حضور حاصل ہو جاتا ہے۔ وہ بھی کسی وقت ہوتا ہے کسی وقت نہیں بھی ہوتا۔ اس لئے عارف شیرازی فرماتے ہیں ؎

در بزم دور یک دو قدح درکش و برو
یعنی طمع مدار وصالِ دوام را

اور حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ کو حضورؐ نے فرمایا تھا وَلٰكِنْ يَاحَنْظَلَةُ سَاعَةً سَاعَةً یعنے سَاعَةً كَذَا وَسَاعَةً كَذَا۔

غرض یہ کہہ رہا تھا کہ عاشق کو بدنامی اور ذلت اور گالیوں کی پروا نہیں ہوا کرتی۔ چنانچہ مولانا گنگوہیؒ نے بھی اس کی پروا نہیں کی فقہا نے بھی صراحۃً فرمایا ہے کہ یہ لوگ جو گلی کوچوں میں سوال کرتے پھرتے ہیں جنہوں نے سوال کو پیشہ بنا لیا ہے، ان کو سوال کرنا حرام ہے اور چونکہ ان کا سوال پورا کر دینے سے ان کو آئندہ کے لئے سوال پر جرأت ہوتی ہے اس لئے ان کو کچھ دینا سوال حرام پر اعانت کرنا ہے اور اعانت الحرام حرام ہے۔ اس لئے ہٹے کٹے قوی لوگوں کو سوال کرنا بھی حرام اور ان کو دینا بھی حرام خوب سمجھ لو۔

وَفِي الرِّقَابِ۔ اور گردن چھڑانے میں۔ یہ قیدیوں اور غلاموں

کے متعلق ہے۔ اور اسی کے حکم میں یہ صورت بھی ہے کہ جو شخص قرض کے اندر بندھا ہوا ہو، اُس کی اعانت کر دی جائے کہ یہ بھی گردن چھڑانے میں داخل ہے۔

وَاَقَامَ الصَّلٰوۃَ وَاٰتَی الزَّکٰوۃَ۔ اور نماز کی پابندی کرے اور زکوٰۃ ادا کرے۔ یہاں زکوٰۃ کو نماز سے اصل کے مطابق مؤخر کر دیا جس کا نکتہ اوپر مذکور ہو چکا ہے۔

حقوق العباد کی اقسام

یہاں تک طاعات بدنیہ و طاعاتِ مالیہ کے اصول عظام مذکور ہوئے۔ آگے حقوق العباد کا بیان ہے۔

وَالْمُوْفُوْنَ بِعَھْدِھِمْ اِذَا عٰھَدُوْا۔ اور وہ لوگ عہد کو پورا کرنے والے ہیں جب عہد کر لیتے ہیں۔ ہر چند کہ حقوق العباد میں بعض حقوق ایسے ہیں جو ایفائے عہد سے مقدم ہیں مثلاً قرض کا ادا کر دینا امانت میں خیانت نہ کرنا۔ لیکن اس جگہ حق تعالیٰ نے صرف ایفائے عہد کو بیان فرمایا ہے۔ جس میں اس طرف اشارہ ہے کہ جب وہ لوگ ایسے حقوق العباد کو ادا کرتے ہیں جن کا مطالبہ کرنے والا ان سے کوئی بھی نہیں (کیونکہ ایفائے عہد قضاءً لازم نہیں گو دیانتاً بعض کے نزدیک واجب ہے) تو اس سے خود بخود یہ بات معلوم ہو گئی کہ جن حقوق کا مطالبہ کرنے والا موجود ہو اُن کو تو ضرور ادا کریں گے اور اسی نکتہ کی وجہ سے مواریث میں وصیت کو دَین پر مقدم فرمایا ہے اس سے حقوق العباد کا درجہ معلوم ہو گیا کہ جب حق تعالیٰ کو اُن حقوق کا بھی اہتمام ہے جس کا مطالب کوئی نہ ہو تو جن حقوق کا مطالب بھی

موجود ہو وہ تو کس قدر قابل اہتمام ہوں اور یہاں بطور مثال کے بعض حقوق کا ذکر فرمایا گیا ہے ورنہ حقوق العباد اور بھی ہیں۔ اگرچہ لوگ فقط مال کو حق العباد سمجھتے ہیں مگر ایک حدیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حق العباد مال ہی میں منحصر نہیں بلکہ حقوق العباد کے اقسام اور بھی ہیں۔۔۔۔

وہ حدیث یہ ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں جو خطبہ پڑھا ہے اس میں آپؐ نے صحابہ سے دریافت فرمایا این یوم ھذا۔ یہ کون سا دن ہے۔ قَالُوْا اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ۔ صحابہ نے عرض کیا کہ خدا اور اس کا رسولؐ ہم سے زیادہ جانتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا اَلَیْسَ یَوْمُ النَّحْرِ۔ کیا یہ قربانی کا دن نہیں ہے۔ قالوا بلیٰ۔ صحابہ نے عرض کیا بے شک۔ اس سے صحابہ کا غایت ادب معلوم ہوا کہ جس بات کو وہ جانتے بھی تھے اس کو بھی اللہ و رسول کے حوالے کر دیتے تھے اپنی شانِ علم ظاہر نہ کرتے تھے۔ اس کے بعد حضورؐ نے دریافت فرمایا کہ یہ مقام کون سا ہے۔ پھر اسی طرح خود ہی فرمایا کیا یہ بلدۃ الحرام نہیں ہے؟ صحابہ نے عرض کیا بے شک۔ پھر آپؐ نے مہینہ کی بابت سوال کیا اور اسی طرح خود ہی فرمایا، کیا یہ ذی الحجہ کا مہینہ نہیں ہے۔ صحابہ نے عرض کیا بے شک۔ پھر آپ نے فرمایا۔

فَاِنَّ اَمْوَالَکُمْ وَدِمَاءَکُمْ وَاَعْرَاضَکُمْ حَرَامٌ عَلَیْکُمْ
کَحُرْمَتِہٖ یَوْمِکُمْ ھٰذَا فِیْ شَھْرِکُمْ ھٰذَا فِیْ بَلَدِکُمْ ھٰذَا

کہ تمہارے اموال اور جانیں اور آبروئیں آپس میں تم پر ہمیشہ کیلئے ایسی ہی حرام ہیں جیسے اس مہینہ میں اس مقام میں اس دن میں حرام ہیں پس معلوم ہوا کہ ایک قسم حقوق العباد کی جان کو تکلیف پہنچانا ہے مثلاً

ناحق مارنا جس میں اہل حکومت اور معلمین بکثرت مبتلا ہیں۔ اور ایک قسم حقوق العباد کی کسی کی آبرو کو صدمہ پہنچانا بھی ہے یعنی کسی پر طعن طعن کرنا، کسی کی تحقیر کرنا، کسی پر بے وجہ بدگمانی کرنا یہ سب حرام ہے اسی طرح کسی کی غیبت کرنا بھی ناجائز ہے بلکہ بعض نصوص سے حقوق آبرو کا درجہ زنا وغیرہ سے بھی بڑھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

لیکن ہماری حالت یہ ہے کہ بالخصوص آبرو کے حقوق کی ذرا پروا نہیں۔ ایسے لوگ بکثرت ہیں جو کسی کا ایک پیسہ بھی نہیں رکھتے حقوق مالیہ میں فروگزاشت نہیں کرتے اور اپنے آپ کو بڑا متقی سمجھتے ہیں کہ ہم کسی کا حق نہیں رکھتے مگر آبرو کے حقوق میں وہ بھی مبتلا ہیں ہماری کوئی مجلس غیبت سے خالی نہیں ہوتی۔ عوام کی تو کیا شکایت علماء کی مجالس بھی غیبت سے خالی نہیں۔ اور سب سے بڑھ کر غضب یہ ہے کہ مشائخ کی مجالس بھی اس سے خالی نہیں۔ عوام تو عوام ہی کی غیبت کرتے ہیں جن میں اکثر فساق بھی ہوتے ہیں جن کی آبرو کا زیادہ حق بھی نہیں لیکن علماء جب غیبت کریں گے تو وہ عوام کی نہ کریں گے بلکہ علماء کی غیبت کریں گے اور مشائخ ہمیشہ مشائخ کی غیبت کریں گے تاکہ یہ ہم سے بڑھ نہ جائیں۔ لوگ ہم سے زیادہ اُن کے معتقد نہ ہو جائیں اس لئے اکثر علماء و مشائخ کی مجلسیں علماء و مشائخ کی غیبت سے بھری ہوئی ہوتی ہیں۔ یہ لوگ مقبولانِ الٰہی و اولیاء اللہ کی غیبت کرتے ہیں تو اس بارہ میں یہ عوام سے بڑھے ہوئے ہیں۔ یاد رکھو یہ باتیں معمولی نہیں ہیں۔ لوگ اس کو معمولی بات سمجھتے ہیں حالانکہ یہ باتیں سارے نماز روزہ کو لے ڈوبیں گی۔ جس کی تم نے آبروریزی کی ہو گی قیامت میں اُس کو تمہاری نیکیاں دلوائی جائیں گی۔ اس لئے نماز روزہ سے

زیادہ حقوق آبرو کا اہتمام کرنا چاہئے۔

ایک بات اور یاد آئی وہ یہ کہ مال اور جان کا حق تو مرنے پر ختم ہو جاتا ہے اور آبرو کا حق بعد موت کے بھی باقی رہتا ہے۔ اگر بعد مرنے کے کسی کو مارو تو اُس کو اس کا احساس نہیں ہوتا اس لئے ضرب کا قصاص بھی نہ ہوگا۔ اسی طرح مرنے کے بعد کسی کا مال چراؤ تو وہ مال اُس کا نہیں رہا ورثاء کا ہو گیا —— لیکن مرنے کے بعد کسی کو مہتم کرو اور اُس کو بُرا بھلا کہو تو غیبت کا گناہ اُس وقت بھی ہوگا اور اب اُس کا کفارہ یہ ہے کہ میّت کے لئے بکثرت دُعا و استغفار کرو۔ اُمید ہے کہ حق تعالیٰ اُس کو تم سے راضی کر دیں گے۔

جسم اور روح کا تعلق

اور یہ جو میں نے کہا ہے کہ مرنے کے بعد ضرب کا احساس نہیں ہوتا۔ شاید کسی کو اس حدیث سے شبہ ہو۔ کسرُ[1] عظمِ المؤمن میتا ککسرہ حیًّا (مسلمان کی ہڈی کو مرنے کے بعد توڑنا ایسا ہے جیسا زندہ کی ہڈی توڑنا) اس کا مطلب یہ نہیں کہ تشبیہ من کل الوجوہ ہے جس سے میت کو بعد موت کے زندہ کی برابر احساس ہونے کا شبہ کیا جاوے

[1] قال السخاوی فی المقاصد الحسنۃ حدیث کسر عظم المیت ککسر عظم الحی احمد و ابو داؤد و ابن ماجۃ و البیہقی من حدیث عائشۃ مرفوعا وحسنہ ابن القطان وقال ابن دقیق العید انہ علی شرط مسلم ورواہ الدارقطنی من وجہ آخر عنہا وزاد فی الاثم وفی روایۃ یعنی فی الاثم و ذکرہ مالک فی الموطا بلاغا عن عائشۃ رض موقوفا ورواہ ابن ماجۃ من حدیث ام سلمۃ رض ص ۱۴۸ واللہ اعلم ۱۲ جامع عفا اللہ عنہ

اگر ایسا ہوتا تو شرعاً اس شخص سے قصاص لیا جاتا بلکہ یہ تشبیہ بعض وجوہ میں ہے۔

ایک وجہ تو یہ ہے کہ بعد موت کے بھی روح کو کسی قدر تعلق جسم سے رہتا ہے اور وہ ایسا تعلق ہے جیسا کہ اس وقت ہمارے جسم کو لباس سے تعلق ہے۔ پس اگر کوئی ہمارا اُترا ہوا کرتہ پھاڑ دے تو ہم کو کلفت ہوتی ہے۔ نیز اس تعلق کا یہ اثر بھی ہے کہ قبر کے پاس جا کر سلام و دعا جو کچھ کی جاتی ہے مُردہ اس کو سنتا ہے اور شہداء میں یہ تعلق عام مومنین سے زیادہ ہوتا ہے جس کا اثر یہ ہے کہ اُن کا جسم بعد موت کے سالم رہتا ہے۔ زمین اُس کو کھا نہیں سکتی۔ نیز اسی تعلق سے بعض اولیاءؒ کو مرنے کے بعد قوت تصرف بھی عطا ہوتی ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم اُن کے مزاروں پر جا کر اُن سے مرادیں مانگا کریں کہ شرعاً یہ بالکل ناجائز ہے۔ ہاں اس کا مضائقہ نہیں کہ ان کے وسیلہ سے حق تعالیٰ سے دعا مانگی جائے۔ باقی اُن سے یہ بھی نہ کہا جائے کہ تم ہمارے واسطے دُعا کرو۔ کیونکہ شریعت میں اس کا کہیں ثبوت نہیں کہ وہ ایسی دعاؤں کے ماذون ہیں۔

احادیث سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ قبرستان میں جا کر مُردوں کے لئے دعا کی جائے۔ یہ بھی احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مُردوں کو احیاء کی دعا سے نفع ہوتا ہے اور اس کے منتظر رہتے ہیں مگر اس کا کہیں ثبوت نہیں کہ اگر اُن سے یہ کہا جائے کہ تم ہمارے واسطے دُعا کرو تو وہ دُعا کر دیتے ہیں۔ اور اولیاء سے زیادہ انبیاءؑ علیہم السلام کی ارواح کو اپنے اجسام سے تعلق رہتا ہے جس کے بعض

آثار یہ ہیں کہ اُن کی میراث تقسیم نہیں ہوتی۔ ایک اثر یہ ہے کہ اُن کی بیبیوں سے نکاح کرنا اُن کے بعد بھی حرام ہے (گو یہ حکم آیات و احادیث میں صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بیان کیا گیا ہے مگر بعض علماء نے تمام انبیاءؑ کے لئے یہ حکم عام مانا ہے۔ واللہ اعلم)

تو کسر عظم سے جسمانی ایذاء تو نہیں ہوتی ہاں روحانی ایذاء ہو سکتی ہے اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ مردہ کی ہڈی توڑنا ایسا ہی ہے جیسا کہ زندہ کی ہڈی توڑنا۔

حضرت اُستاد علیہ الرحمۃ (مولانا محمد یعقوب صاحبؒ) فرماتے تھے کہ مردہ کے جسم کو جلانے سے اُس کی ایسی ایذاء ہوتی ہے جیسے تمہارے چادرہ کو اُتار کر کوئی تمہارے سامنے جلا دے تو اس سے تم کو رنج اور غم ہوتا ہے۔ اسی طرح روح کو بھی رنج ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ چادرہ کے جلانے سے ہمارے جسم کو ایذاء نہیں ہوتی صرف روحانی ایذاء ہوتی ہے۔ یہی حال بعد موت کے بدن جلانے کا ہے۔ ایک وجہ تشبیہ تو یہ ہوئی۔

دوسرے یہ بھی احتمال ہے کہ تشبیہ گناہ میں ہو کہ جب گناہ زندہ کی ہڈی توڑنے میں ہوتا ہے ایسا ہی میت کی ہڈی توڑنے میں ہوتا ہے (قلت وھذا الوجہ اولی لانہ مؤید بالروایۃ وقد ذکرتہا فی الحاشیۃ) اور وجہ تشبیہ ترک احترام ہے کیونکہ ہڈی توڑنے اور بدن جلانے سے میت کی بے حرمتی ہوتی ہے۔ غرض احترام میت کا اب بھی باقی ہے۔

مُردوں کو بُرا بھلا کہنے کی ممانعت

اس تقدیر پر اس حدیث کا مآل بھی حقوق آبرو کی طرف ہو جائے گا۔ حاصل یہ ہوا کہ چونکہ مردہ کا احترام بعد موت کے بھی باقی ہے اور کسر عظم میں اُس کی بے حرمتی اور بے عزتی ہے۔ اس لئے یہ فعل حرام ہے اور ظاہر ہے کہ اقوال کی تاثیر بے حرمتی میں کسر عظم سے زیادہ ہے۔ پس مُردوں کو بُرا بھلا کہنا بھی حرام ہے

حدیث میں وارد ہے کہ اپنے مُردوں کو بُرا نہ کہو کیونکہ وہ اعمال کی جزا کو پہنچ چکے ہیں۔ اگر واقع میں وہ بُرے ہیں تو اپنے افعال کی سزا بھگت رہے ہیں پھر تمہارا اُن کو بُرا بھلا کہنا بے سود ہے اور اگر واقع میں وہ اچھے ہیں تو اُن کو بُرا کہنے سے تم کو گناہ ہوگا۔ اس لئے یہ حرکت قابل ترک ہے (البتہ جو لوگ اپنی زندگی میں کوئی بُرا طریقہ رائج کر گئے ہوں اور اُن کی موت کے بعد بھی لوگ اُس کا اتباع کرتے ہوں اُن کو بُرا بھلا کہنے کا مضائقہ نہیں تاکہ لوگ اُس کے اتباع سے باز آجائیں) پس مسلمان مُردوں کی بے حرمتی کرنا خواہ فعل سے ہو یا قول سے ہر طرح ناجائز ہے۔ اور اُس بے حرمتی کے بہت سے شعبے ہیں جن میں سے ایک شعبہ وہ بھی ہے جس کی ضرورت کی طرف مجھ کو میرے ایک عنایت فرمانے توجہ دلائی ہے۔

وہ یہ کہ سُنا گیا ہے کہ بعض لوگ قبرستانوں میں پیشاب کرتے ہیں اور قبرستانوں کی زمین میں گھر بناتے ہیں۔ تو اس میں ایک تفصیل ہے جس کو غور سے سُن لینا چاہیے۔ وہ یہ کہ اگر قبرستان کی زمین کسی کی ملک

ہو تب تو اس کو قبروں کے نشانات مٹا کر اس جگہ مکان بنانا جائز ہے مگر جس جگہ قبر کا نشان ہو وہاں پاخانہ بنانا ٹٹی پیشاب کرنا اس وقت بھی حرام ہے اور جو قبرستان وقف ہیں اُن کا استعمال بالکل حرام ہے اُن میں کسی کو مکان بنانا جائز نہیں اور اکثر قبرستان وقف ہی ہیں اس لئے اس سے بچنا چاہیے۔ اور اس میں آخرت کا ضرر تو ہے ہی کہ گناہ ہوتا ہے لیکن بعض دفعہ دنیوی ضرر بھی ہوتا ہے کہ بعضے مُردے پٹک بھی دیتے ہیں۔ چنانچہ ایسے واقعات اکثر سُنے گئے ہیں۔ میں یہ نہیں دعویٰ کرتا کہ سب حکایات صحیح ہیں مگر بہت سی سند صحیح سے ثابت بھی ہیں۔ پھر اس سے قطع نظر اس میں تو کچھ شک ہی نہیں کہ قبروں پر ٹٹی پیشاب کرنے سے مُردوں کو ایذا ہوتی ہے[1]۔

اولیاء اللہ کا احترام

ان میں بعض اولیاء بھی ہیں۔ جن کی نسبت حدیث صحیح میں وارد ہے

مَنْ اٰذٰی لِیْ وَلِیًّا فَقَدْ اٰذَنْتُہٗ بِالْحَرْبِ

یعنی جو کوئی میرے کسی ولی کو ایذا پہنچاوے اُس کو خدا تعالیٰ کی طرف سے اعلانِ جنگ دیا جاتا ہے۔ اللہ اکبر — یہ وعید کتنی سخت ہے خدائی الٹی میٹم کا کون مقابلہ کر سکتا ہے۔ پھر اس وعید کا ظہور کبھی تو اس

---

[1] ذکر فی المرقاۃ بروایۃ ابن ابی شیبۃ عن ابن مسعود اذی المؤمن فی موتہ کاذاہ فی حیوتہ وفی المشکوٰۃ عن عمرو بن حزم قال رآنی النبی صلی اللہ علیہ وسلم متکئا علی قبر فقال لا تؤذ صاحب ھذا القبر

طرح ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ خود اولیاء کو تصرف کی اجازت دیتے ہیں اور وہ اپنے تصرف سے اس شخص کو ضرر پہنچا دیتے ہیں اور بعض دفعہ اولیاء کوئی تصرف نہیں کرتے لیکن حق تعالیٰ کو اپنے محبوب کی بے حرمتی پر غیرت آتی ہے کہ ہمارے محبوب کے ساتھ یہ معاملہ کیوں کیا گیا اس لیئے حق تعالیٰ خود اس شخص کو کسی بلا میں گرفتار کر دیتے ہیں غرض اولیاء کے ساتھ گستاخی اور بے ادبی کرنا بڑا سنگین جرم ہے اگر وہ حضرات اپنی شفقت سے کچھ بھی نہ کہیں تو غیرتِ حق نہیں چھوڑتی اس لیئے اس سے بہت بچنا چاہیئے۔ عارف شیرازی فرماتے ہیں ؎

بس تجربہ کردیم دریں دیر مکافات
با دُرد کشاں ہر کہ در افتاد بر افتاد

مولانا رومی فرماتے ہیں ؎

ہیچ قومے را خُدا رسوا نہ کرد
تا دلِ صاحب دلے نامد بدرد

یاد رکھو جب کوئی قوم کسی ولی کا دل دکھاتی ہے تو اُن کا صبر ضائع نہیں جاتا۔ حق تعالیٰ بعض دفعہ اُن کی طرف سے اس طرح انتقام لیتے ہیں کہ خود اُن کو بھی اس کی خبر نہیں ہوتی۔ یہ مت سمجھو کہ حقوق العباد صرف جان و مال ہی کے متعلق ہیں بلکہ آبرو بھی حقوق العباد میں داخل ہے۔ اور اُس کے حقوق جان و مال سے بھی زیادہ ہیں کہ بعد موت کے بھی اُس کے حقوق باقی رہتے ہیں۔ جن میں سے ایک حق یہ بھی ہے جس کو ابھی ذکر کیا کہ بعد مرنے کے مسلمانوں کی قبروں کا احترام کیا جائے۔ اُن کی بے حرمتی نہ کی جائے۔ جس کو میں نے ضروری

تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ یہ مضمون میرے دوست نے کئی مرتبہ مجھ کو یاد دلایا مگر ہر بیان کے وقت میں اس کو بھول جاتا تھا کیونکہ فرمائشی مضمون بہت کم یاد رہتے ہیں لیکن اس مرتبہ یاد رہا۔ اور الحمد للہ اس کا بیان کافی ہو گیا۔

میں نے یہ بھی سنا ہے کہ بعض مخلصین قبرستانوں کی حفاظت کے لئے خاص اہتمام کر رہے ہیں۔ سب مسلمانوں کو ان کا ساتھ دینا چاہئے اور ان کی اعانت کرنی چاہئے۔

اس تقریر پر شاید کوئی یہ اشکال کرے کہ تم نے بیان کیا ہے کہ اولیاء اللہ کی بے حرمتی سے وبال آتا ہے لیکن ہم تو اب تک قبرستان میں ٹٹی پیشاب کرتے رہے ہم کو تو کچھ ضرر نہیں ہوا۔ ہم تو ویسے ہی ہٹے کٹے صحیح و سالم موجود ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ یہ اعتراض ویسا ہی ہے جیسا کہ کفار نے انبیاء سے کہا تھا کہ تم روز روز ہم کو عذاب سے ڈراتے ہو کہ اگر کفر کرو گے تو یوں وبال آئے گا، یوں بلائیں نازل ہوں گی مگر ہم تو مدت سے کفر کر رہے ہیں اور اب بھی کفر میں مبتلا ہیں۔ ہم پر تو کچھ بھی عذاب نہ آیا۔ پس جو انجام کفار کے اس اعتراض کا ہوا تھا وہی انجام یہ حضرات سوچ لیں۔ میں ان سے پوچھتا ہوں کہ اگر اب تک کوئی وبال تم پر نہیں آیا تو کیا آئندہ کے لئے بھی تمہارے پاس وحی آگئی ہے کہ تم کبھی وبال میں مبتلا نہ ہو گے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ جو لوگ ایسا اعتراض کر رہے ہیں وہ اس وقت بھی وبال سے خالی نہیں ہیں۔ لیکن وبال کی دو قسمیں ہیں۔

ایک ظاہری ایک باطنی۔ ظاہری وبال تو یہ ہے کہ جان و مال کا نقصان ہو جاوے۔ صحت برباد ہو جاوے۔ اور یہ وبال آہون ہے۔ اور باطنی وبال یہ ہے کہ دل سیاہ ہو جاوے۔ اس میں اعمال صالحہ کی صلاحیت باقی نہ رہے نیک کاموں سے دل گھبرانے لگے یہ وبال بہت سخت ہے کیونکہ جب دل سیاہ ہو جاتا ہے تو بعض دفعہ ایمان بھی سلب ہو جاتا ہے جس کا انجام ابدالآباد کے لئے عذاب جہنم ہے۔ پس میں کہتا ہوں کہ یہ لوگ اس وقت بھی وبال سے خالی نہیں ہیں۔ باطنی وبال میں گرفتار ہیں کہ ان کے دلوں سے قہر خداوندی کا خوف نکل گیا ہے۔ جبھی تو اتنی جرائت ہے کہ قہر خداوندی کا نام سن کر اپنی حرکتوں سے باز آنے کا قصد نہیں کرتے، بلکہ الٹا اس کے ساتھ تمسخر کرتے ہیں۔ اگر ان کے دلوں میں قہر الٰہی کا خوف ہوتا تو جس کام میں اس کا وہم بھی ہوتا اس سے فوراً الگ ہو جاتے اسی مضمون کو مولانا ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں ؎

آتشی گر نامدست ایں دود چیست
جان سیہ گشت و رواں مردود چیست

یعنی تم جو کہتے ہو کہ ہم پر گناہوں کا وبال نہیں آیا۔ مولانا فرماتے ہیں کہ تمہارے اندر قہر کی آگ تو جل رہی ہے۔ اگر تمہارے اندر آگ نہیں ہے تو یہ دھواں کہاں سے آیا یعنی یہ کلماتِ جرائت و بے باکی کے تمہاری زبان سے کیوں کر نکل رہے ہیں جن سے دل کے سیاہ ہو جانے کا پتہ چل رہا ہے اور یہ بہت بڑا قہر ہے جو ظاہری قہر سے بھی بڑھا ہوا ہے۔ یہاں تک حقوق العباد کا ذکر ہو گیا۔

صبر کی حقیقت اور اُس کے اقسام

آگے اخلاق کا ذکر ہے۔ والصابرین فی البأساء والضراء و حین البأس۔ اور وہ لوگ صبر کرنے والے ہیں۔ تنگ دستی میں اور بیماری میں اور قتال کے وقت۔

ہر چند کہ اخلاق باطنیہ بہت ہیں لیکن حق تعالیٰ نے اُن میں سے اس مقام پر صرف صبر کو بیان فرمایا ہے اور اُس کے تین مواقع بیان فرمائے ہیں۔ وجہ اس تخصیص کی یہ ہے کہ صبر ایسی صفت ہے جس کے حاصل ہو جانے کے بعد بقیہ اخلاق کا حصول خود بخود ہو جاتا ہے کیونکہ صبر کے معنی صرف یہی نہیں ہیں کہ عزیز و قریب کے مرنے پر مستقل مزاج رہے یہ بھی صبر کی ایک فرد ہے لیکن صبر کی حقیقت اس سے عام ہے۔ صبر کے معنی لغت میں حبس کے ہیں یعنی روکنا اور یہی معنی شریعت میں بھی ہیں۔ صرف ایک قید زیادہ ہے یعنی حبس النفس علےٰ ماتکرہ انسان کا اپنے نفس کو اُس کی ناگوار بات پر روکنا اور ناگواری کے

اقسام پر شرعاً صبر کی تین قسمیں ہیں۔

۱۔ صبر علی العمل ۲۔ صبر عن العمل ۳۔ صبر فی العمل

صبر علی العمل یہ ہے کہ نفس کو کسی کام پر روک لینا یعنی اُس پر جم جانا اور قائم رہنا۔ مثلاً نماز زکوٰۃ وغیرہ کی پابندی کرنا اور بلاناغہ اُن کو ادا کرتے رہنا۔

صبر فی العمل یہ ہے کہ عمل کے وقت نفس کو دوسری طرف التفات کرنے سے روکنا اور ہمہ تن متوجہ ہو کر کام کو بجالانا۔ مثلاً نماز پڑھنے

کھڑے ہوئے یا ذکر میں مشغول ہوئے تو نفس کو یہ سمجھا دیا کہ بچہ جی اتنی دیر تک تم سوائے نماز یا ذکر کے اور کوئی کام نہیں کر سکتے۔ پھر دوسرے کاموں کی طرف توجہ کرنا فضول ہے۔ اتنی دیر تک تجھ کو نماز یا ذکر ہی طرف متوجہ رہنا چاہیئے۔ جب یہ ملکہ راسخ ہو جاتا ہے تو سب اعمال ٹھیک ادا ہوتے ہیں۔ بعض لوگوں کو فرائض شرعیہ کی پابندی تو نصیب ہے۔ اس لیئے یہ کہہ سکتے ہیں کہ اُن کو صبر علی العمل کا درجہ حاصل ہے لیکن اعمال کو بجالاتے وقت وہ اُن کے آداب و حقوق کی رعایت نہیں کرتے گڑبڑ کر دیتے ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ اُن کو صبر فی العمل حاصل نہیں ہوا۔

تیسری قسم ہے صبر عن العمل یعنی نفس کو ماہنی اللہ عنہ سے روکنا، شریعت نے جن چیزوں سے منع کیا ہے اُن سے رُکنا۔ جن میں سب سے اہم صبر عن الشہوت ہے کہ نفس کے تقاضائے شہوت کو روکا جاوے اور یہ سب سے اہم اس لیئے ہے کہ نفس کے دوسرے تقاضے تو ایسے ہیں کہ اُن سے اگر نہ روکا جاوے تو بعد میں اُس کو خود ہی بہت کلفت ہوتی ہے اور اُس کلفت کا خیال کر کے نفس اُن تقاضوں سے خود ہی رُک جاتا ہے۔

مثلاً صبر عن الغضب بہت آسان ہے کیونکہ غصّہ کے وقت گو نفس کو لذت آتی ہے مگر بعد میں کوفت ہوتی ہے۔ مشاہدہ ہے کہ غصّہ کر کے بعد میں ایک ندامت سی طاری ہوتی ہے کہ ہم نے خواہ مخواہ غصّہ کیا۔ بات کو ٹال کیوں نہ دیا۔ غصّہ کر کے کبھی جی بھلا نہیں ہوتا۔ نیز بعض دفعہ کسی پر غصّہ کرنے سے اُس کو دشمنی ہو جاتی ہے

پھر وہ ایذا رسانی کے درپے ہو جاتا ہے۔ ان مضرتوں پر نظر کر کے غصّہ کو انسان خود ہی دبانے لگتا ہے۔

لیکن صبر عن الشہوت بہت مشکل ہے کیونکہ شہوت رانی میں وقت قضاء شہوت کے بھی لذت آتی ہے اور بعد میں بھی اس کی لذت رہتی ہے۔ قضاء شہوت کے بعد کچھ کوفت نہیں ہوتی۔ اگر کسی کو روحانی کوفت ہوتی ہو تو ممکن ہے لیکن ایسے بہت کم ہیں۔ عام حالت یہی ہے کہ شہوت رانی کے بعد اس کا مزہ پڑ جاتا ہے۔ پہلے سے زیادہ آگ بھڑک جاتی ہے گو تھوڑی دیر کے لئے سکون ہو جاتا ہے۔

شہوت بالامارد

شہوت بالنساء سے بھی اشد شہوت بالامارد ہے۔ آج کل امردوں کے ساتھ ابتلا عام ہو رہا ہے جس کی چند وجوہ ہیں۔

اوّل تو عورتوں میں قدرتی حیا کا مادہ زیادہ ہوتا ہے اس لئے اُن سے اظہار شہوت کی جرائت ذرا دقت سے ہوتی ہے اور لڑکوں میں حیا کا مادہ کم ہوتا ہے۔

دوسرے عورتوں کی حفاظت بہت کی جاتی ہے۔ اُن کے پاس پہنچنا آسان نہیں اور جو کوئی پہنچ بھی جاتا ہے اُس کی رسوائی جلد ہو جاتی ہے اور بچوں کی کچھ بھی حفاظت نہیں کی جاتی۔ اُن کا کسی سے پردہ نہیں ہوتا۔

تیسرے اس میں اتہام کم ہوتا ہے۔ بچوں کے سر پر شفقت سے بھی ہاتھ پھیرا جاتا ہے اور شہوت سے بھی۔ اب اگر کسی کے بچہ کو پیار کریں تو سب لوگ یہ سمجھیں گے کہ ان کو بچوں پر شفقت

زیادہ ہے۔ شہوت کی کسی کو کیا خبر۔

ان وجوہ سے آج کل امارد کے ساتھ ابتلا بہت زیادہ ہے اور شہوت بالنساء سے یہ شہوت بالرجال اشد ہے کیونکہ عورتوں میں محارم کے ساتھ ابتلا کم ہوتا ہے۔ اکثر غیر محارم سے ہوتا ہے سو وہ کسی نہ کسی وقت تمہارے لئے حلال بھی ہو سکتی ہیں۔ اگر وہ کنواری ہے تو اسی وقت نکاح کا پیغام دیا جا سکتا ہے اور اگر شوہر والی ہے تو ممکن ہے شوہر مر جاوے یا طلاق دے دے تو پھر تم اُن سے نکاح کر سکتے ہو۔ بہر حال اس میں حلت کی توقع تو ہے گو کسی وقت ہو۔ اور گو توقع ضعیف ہی ہو مگر مردوں کا حلال ہونا تو کسیوقت بھی متوقع نہیں۔ بلکہ بعضے گناہ تو ایسے ہیں جو جنت میں جا کر گناہ نہ رہیں گے۔ مثلاً شراب پینا دنیا میں گناہ ہے لیکن جنت میں شراب ملے گی۔ اور یہ شہوت بالرجال ایسا خبیث فعل ہے کہ جنت میں بھی اُس کا وقوع نہ ہو گا۔ پس یہ زنا اور شراب خوری سے بھی بدتر ہے۔ بلکہ شراب میں تو جو کچھ حرمت ہے سُکر کی وجہ سے ہے۔ اگر کسی تدبیر سے شراب کا سُکر زائل ہو جائے مثلاً سرکہ بن جائے تو بعینہ اُس کا پینا حلال ہو جاتا ہے لیکن شہوت بالامرد کی خباثت لذاتہ ہے۔ یہ کسی طرح بھی زائل نہیں ہو سکتی۔ پس یہ فعل حرمت میں سب سے بڑھا ہوا ہے کہ اس میں کسی طرح بھی حلت کی گنجائش نہیں۔

یہ ناپاک فعل سب سے پہلے قوم لوط میں رائج ہوا۔ اُن سے پہلے آدمیوں میں اُس کا وقوع نہ ہوا تھا۔ چنانچہ لوط علیہ السلام نے اُن سے فرمایا۔

اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَۃَ مَا سَبَقَکُمْ بِھَا اَحَدٌ مِّنَ الْعٰلَمِیْنَ

گو حیوانات میں بعض کی نسبت کہا جاتا ہے کہ ان میں پہلے سے اس کا وقوع تھا۔ حق تعالیٰ نے قوم لوط پر جو سنگین عذاب نازل کیا ہے وہ سب کو معلوم ہے کہ اس کی نظیر نہیں ملتی۔ اسی سے معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ فعل کیسا سنگین ہے۔ کیونکہ کفر تو تمام کفار میں مشترک تھا لیکن انواع عذاب کا مختلف ہونا بظاہر خصوصیت افعال ہی کی وجہ سے ہے۔ اور سیر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فعلِ بد قوم لوط نے بھی خود نہیں ایجاد کیا بلکہ شیطان نے ان کو سکھایا۔ یہ فعل ایسا خبیث ہے کہ انسان کا نفس باوجود امارۃٌ بالسوء ہونے کے اس کی طرف از خود منتقل نہیں ہوا بلکہ شیطان خبیث نے اس کی طرف قوم لوط کو متوجہ کیا۔

شہوت بالامارد کی ابتداء

جس کا قصہ اس طرح کتابوں میں لکھا ہے کہ شیطان خوبصورت لڑکے کی صورت میں متشکل ہو کر ایک شخص کے باغ میں سے انگور توڑ توڑ کر کھایا کرتا تھا۔ باغ والا اس کو دھمکاتا مارتا تھا مگر یہ باز نہ آتا تھا۔ ایک دن اس نے تنگ آکر اس سے کہا کہ کم بخت تو نے میرے باغ کا پیچھا کیوں لے لیا۔ سارے درخت برباد کر دیئے تو مجھ سے کچھ روپے لے لے اور میرے باغ کا پیچھا چھوڑ دے شیطان بصورت امرد نے کہا کہ میں اس طرح باز نہ آؤں گا۔ اگر تم یہ چاہتے ہو کہ میں تمہارے درختوں کا ناس نہ کروں تو جو بات میں کہوں اس پر عمل کرو۔ اس نے کہا وہ کیا بات ہے۔ ابلیس نے اس کو

یہ فعل تعلیم کیا کہ میرے ساتھ تو یہ فعل کیا کر پھر میں تیرے باغ کو چھوڑ دوں گا۔

چنانچہ پہلی بار تو اُس نے جبراً و قہراً اپنے باغ کے بچاؤ کے لئے یہ فعل کیا۔ پھر خود اُن کو مزہ پڑ گیا۔ وہ اس کی خوشامدیں کرنے لگا کہ تو روز آیا کر اور جتنے انگور چاہے کھا لیا کر۔ پھر اُس نے دوسرے آدمیوں کو اس کی اطلاع دی۔ اور لوگ بھی یہ فعل کرنے لگے۔ پھر کیا تھا عام رواج ہو گیا۔ اس کے بعد شیطان تو غائب ہو گیا۔ لوگوں نے لڑکوں کے ساتھ یہ فعل کرنا شروع کر دیا۔ خدا تعالیٰ کو یہ فعل بہت ہی ناگوار ہے۔ چنانچہ لوط علیہ السلام کو حکم ہوا کہ اپنی قوم کو اس فعل سے روکو، ورنہ سخت عذاب آئے گا۔ اُنہوں نے بہت سمجھایا مگر وہ باز نہ آئے۔ آخر عذاب نازل ہوا اور سب کے سب تباہ ہو گئے۔

صاحبو۔۔۔ یہ فعل ایسا خبیث ہے کہ جو اس کا ارتکاب کرتا ہے وہ تو بدنام ہوتا ہی ہے مگر اس سے بڑھ کر یہ ستم ہے کہ جس نبی کی اُمت نے اس فعل کا ارتکاب کیا ہے آج اُس نبی کی طرف بھی بلفظاً نسبت کرنا لوگوں میں باعث ننگ ہو گیا۔ یعنی کوئی شخص اپنے لئے یہ گوارا نہیں کرتا کہ اس کو لوطی کہا جاوے۔ حالانکہ لفظ لوطی میں یائے نسبت ہے اور لوط علیہ الصلوٰۃ والسلام کا نام ہے تو یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ محمدیؐ اور موسوی اور عیسوی اور یوسفی۔ اگر لوط علیہ السلام کی قوم نے یہ فعل بد نہ کیا ہوتا تو آج لوطی کا لفظ باعثِ فخر ہوتا جیسا کہ دیگر انبیاء کی طرف نسبت کرنا باعثِ فخر ہے مگر ان کم بخت قوم نے اپنے نبی کے نام کو بھی نہ چھوڑا۔

لفظ لواطت کا غلط استعمال

صاحبو۔۔۔ مجھے تو اس فعل کے لئے لفظ لواطت کا استعمال بہت ہی ناگوار ہوتا ہے۔ کیونکہ لواطت کا لفظ لوط علیہ السلام کے نام سے بنایا گیا ہے تو ایسے گندے کام کا نام نبی کے نام سے مشتق کرنا بہت ہی نازیبا ہے۔ جس نے یہ لفظ ایجاد کیا ہے بہت ہی ستم کیا ہے۔ میرے نزدیک یہ لفظ عربیت میں دخیل اور مولّد ہے۔ فصحائے عرب کے کلام میں اس کا استعمال نظر سے نہیں گزرا۔ عربی میں اس کے لئے اتیان فی الدُّبر کا لفظ معلوم ہوتا ہے یا اور کوئی لفظ بھی ہو۔ بہر حال لواطت کا لفظ قابلِ ترک ہے اور میرے نزدیک اغلام کا لفظ بھی مولّد ہے۔ عربی فصیح میں اس کا بھی استعمال نہیں ہے۔ یہ سب بعد کے گھڑے ہوئے ہیں۔

غرض اس فعل کی خباثت عقلاً و نقلاً ہر طرح ثابت ہے اور طبیعت سلیمہ اس سے خود ہی انکار کرتی ہے۔ اس فعل پر سوائے بدطینت آدمی کے اور کوئی سبقت نہیں کر سکتا۔ ایک کھلا ہوا فرق شہوت بالنساء اور شہوت بالرجال میں یہ ہے کہ عورت سے قضاءِ شہوت کرنے کے بعد آپس میں محبّت بڑھتی ہے اور مرد کی عزّت عورت کی نظر میں بڑھ جاتی ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ یہ مرد ہے نامرد نہیں ہے۔ اور لڑکوں سے قضاءِ شہوت کر کے ایک دوسرے کی نظر میں اُسی وقت ذلیل و خوار ہو جاتا ہے۔ پھر بہت جلد مفعول کے دل میں عداوت ایسی قائم ہو جاتی ہے کہ وہ دوسرے کی صورت سے بیزار ہو جاتا ہے۔

نظر کا مرض

بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو شہوت بالرجال سے پاک وصاف ہیں مگر ان میں بھی نظر کے مرض میں اکثر مبتلا ہیں۔ حالانکہ حدیث سے معلوم ہو چکا ہے کہ زنا آنکھ سے بھی ہوتا ہے۔ پس امردوں کو بنظر شہوت دیکھنا بھی حرام ہے۔ اس میں بہت کم لوگ احتیاط کرتے ہیں۔ حالانکہ نظر مقدمہ ہے فعل کا اور مقدمۃ الحرام حرام قاعدہ فقہیہ ہے۔ یعنی حرام کے مقدمات بھی حرام ہوتے ہیں۔ اس لئے نگاہ کی حفاظت بھی بہت ضروری ہے۔

بعض اکابر کا قول ہے کہ جس شخص کو حق تعالیٰ اپنے دربار سے نکالنا چاہتے ہیں اس کو محبت امارد میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ محبت گو فعل اختیاری نہیں مگر اس کے اسباب اختیاری ہیں یعنی اُن کو دیکھنا اُن سے اختلاط کرنا وغیرہ۔ پس مطلب یہ ہوا کہ جس کو حق تعالیٰ اپنے دربار سے مطرود کرنا چاہتے ہیں اسی کو نظر الی الامارد اور اختلاط بالامارد میں مبتلا کر دیتے ہیں اور یہ افعال اختیاریہ ہیں جو مقتضی ہو جاتے ہیں محبت وغیرہ کی طرف۔ جس کا انجام طرد عن الحق ہے (اعاذنا اللہ) دوسرے میری سمجھ میں یہ ہرگز نہیں آتا کہ لڑکوں سے کسی کو عشق ہوتا ہو۔ آج کل لوگوں نے فسق کا نام عشق رکھ لیا ہے مولانا فرماتے ہیں ؎

عشق ہائے کز پئے رنگے بود
عشق نبود عاقبت ننگے بود

کسی اور کا قول ہے ؎

ایں نہ عشق ست آنکہ در مردم بود
ایں فسادِ خوردنِ گندم بود

اور اگر ہزار میں کسی ایک کو عشق ہو بھی جائے تو اُس کو عشق پر تو ملامت نہ کی جائے گی مگر اُس کے بعد جو افعال اس سے صادر ہوتے ہیں اُن پر ملامت کی جائے گی کیونکہ وہ اختیاری افعال ہیں حتیٰ کہ اُس کا تصوّر کرنا اور تصوّر سے لذّت لینا یہ بھی فعل اختیاری ہے جس کا چھوڑنا واجب ہے۔ اور تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ اس حالت میں محبوب سے بعد کو نفع میں بہت زیادہ دخل ہے۔ تباعد سے اکثر یہ مرض خفیف ہو جاتا ہے۔ اور تکشف میں جو علاج میں نے اُس کا لکھا ہے اس سے بہت لوگوں کو نفع ہوا ہے اُس پر بھی ضرور عمل کیا جاوے۔ اس باب میں سالکین کو خصوصاً اور تمام مسلمانوں کو عموماً سخت احتیاط کرنا چاہیئے۔

ہمارے یہاں ایک ذاکر ہیں۔ ایک مرتبہ اُن کو ذکر کے وقت ایسا معلوم ہوا کہ گویا یہ آیت اُن کے قلب پر وارد ہوئی۔

اِنَّا مُنۡزِلُوۡنَ عَلٰۤى اَهۡلِ هٰذِهِ الۡقَرۡيَةِ رِجۡزًا بِمَا كَانُوۡا يَفۡسُقُوۡنَ ط

اور یہ منجانب اللہ الہام تھا جو کسی ہاتف وغیرہ کے ذریعہ سے اُن پر القا ہوا۔ اور اس کا مطلب بے ساختہ اُن کے دل میں یہ آیا کہ اس بستی پر جس میں ہیں مقیم ہوں عذاب خداوندی نازل ہونے والا ہے اور وہ عذاب بصورت طاعون ہو گا۔ کیونکہ بعض احادیث میں

طاعون کو رجز سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور چونکہ یہ آیت قومِ لوط کی شان میں ہے۔ اس لئے اُن کی سمجھ میں یہ آیا کہ اس عذاب کا سبب عملِ قومِ لوط ہے جو اس بستی میں بکثرت رائج تھا۔

اس کے بعد ایک جمعہ میں انہوں نے یہ واقعہ بیان کر دیا کہ مجھ کو یہ بتلایا گیا ہے کہ اس بستی پر عملِ قومِ لوط کی کثرت کی وجہ سے عذاب نازل ہوگا جو بصورت طاعون ہوگا۔ اس لئے لوگوں کو اس عمل سے رُک جانا چاہیے اور خدا تعالیٰ کی جناب میں توبہ و استغفار کرنا چاہئے۔ مگر اس عمل خبیث سے قلوب کچھ ایسے سیاہ ہو جاتے ہیں کہ اُن میں تاثیر کا مادّہ نہیں رہتا۔ اس لئے لوگوں نے اُن کا مذاق اڑایا کہ سبحان اللہ! ان پر تو وحی آنے لگی۔ بجائے تاثیر اور توبہ کے الٹا تمسخر کرنے لگے۔ آخر تھوڑے ہی دنوں کے بعد وہاں اس زور کا طاعون آیا کہ گھر کے گھر تباہ ہو گئے۔

پس خوب سمجھ لیجئے کہ اس منحوس عمل سے باطنی عذاب بھی نازل ہوتا ہے کہ قلوب مسخ ہو جاتے ہیں اور ظاہری بلائیں بھی نازل ہوتی ہیں۔ خدا سب مسلمانوں کو اس سے نجات دے (آمین)

سعی وصول الی اللہ

پس شہوت سے صبر کرنا صبر عن الغضب سے بھی دشوار ہے یہی وجہ ہے کہ اس مرض میں عام ابتلا ہے لیکن یہ دشواری اس وقت تک ہے جب تک آپ اس سے بچنے کا ارادہ نہ کریں اور جس دن آپ اس سے بچنے کا اہتمام کریں گے اسی دن سے آسانی شروع ہو جائے گی۔ کیونکہ یہ مشکل آپ کے لحاظ سے ہے۔ خدا تعالیٰ کے

لحاظ سے تو مشکل نہیں۔ آپ ارادہ کر کے دیکھیں وہ اس مشکل کو بہت جلد آسان کر دیں گے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

تو مگو مارا بداں شہ بار نیست
بر کریماں کارہا دشوار نیست

دوسرا مصرع اصل میں ایک جملہ مقدرہ کی دلیل ہے۔ تقدیر عبارت یوں تھی۔ "تو مگو مارا بداں شہ بار نیست۔" زیراکہ وصول در دستِ تو نیست بلکہ در دستِ خدائے کریم ست و "بر کریماں کارہا دشوار نیست"۔ یعنی تم یہ مت کہو کہ ہم خدا کے دربار میں نہیں پہنچ سکتے کیونکہ وصول تمہارے قبضہ میں تھوڑا ہی ہے جو دشواری اس کی مانع ہو بلکہ خدا تعالیٰ کے قبضہ میں ہے اور وہ کریم ہیں اپنی عنایت سے وہ خود تم کو پہنچا دیں گے کیونکہ کریموں پر بڑے سے بڑا کام بھی دشوار نہیں۔ پس اس میں کچھ بھی دشواری نہیں کہ حق تعالیٰ ہم کو اپنے تک پہنچا دیں۔ گو ہم اس قابل نہ تھے۔ اس لئے مایوسی کی کوئی وجہ نہیں خلاصہ یہ کہ تمہاری سعی سے تو پہنچنا مشکل تھا مگر سعی کے بعد وہ امداد فرماتے ہیں۔ تم طلب اور ارادہ کرو وہ خود تم کو پہنچا دیں گے اور تمام دشواریوں کو آسان کر دیں گے۔

اس پر شاید کسی کو یہ اشکال ہو کہ صاحب ہماری تو طلب اور سعی بھی ناتمام ہے۔ پس یہ مانا کہ سعی کے بعد حق تعالیٰ خود پہنچا دیتے ہیں مگر پہلے سعی تو ہو اور یہاں تو سعی بھی ناتمام ہے۔ اس کے جواب میں مولانا فرماتے ہیں ؎

ہم بایں رہا نماید خویش را
ہم بدوزد خرقۂ درویش را

خرقۂ درویش سے مراد سالک کی ناتمام سعی ہے۔ یعنی وہ ایسے کریم ہیں کہ تمہاری ناتمام سعی کو بھی خود ہی کامل کر دیتے ہیں اور تمہارے پھٹے ہوئے خرقہ کو بھی خود ہی سی دیتے ہیں اور سالکین کے قلوب میں جلوہ گری فرماتے ہیں ورنہ ہمارے قلوب اس قابل کہاں تھے کہ حضرتِ حق ان میں تجلّی فرمائیں۔ لیکن تم جس حال میں بھی اپنی طلب اور ارادہ ظاہر کرو گو ناتمام ہی طلب سہی پھر وہ اپنی رحمت سے طلب کو بھی کامل کر دیتے ہیں اور تمہارے دلوں کو بھی اپنی تجلّی کے قابل کر دیتے ہیں۔ پھر اس میں تجلّی بھی فرماتے ہیں تم کو آئینہ تلاش کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ وہ تم کو بلا کر آئینہ بھی خود ہی عطا کر دیتے ہیں کہ لو اس کے اندر سے ہمارے جمال کا مشاہدہ کرو ——— سبحان اللہ! کیا رحمت ہے!!

بس اب تو کوئی اشکال نہیں رہا۔ اب آپ کو سعی اور طلب سے کون مانع ہے۔ آپ اس کا بھی خیال نہ کیجئے کہ آپ کی طلب کامل ہے یا ناقص۔ تم طلب میں لگو سب کامل ہو جائے گی۔ حدیث قدسی میں وارد ہے۔

مَنْ تَقَرَّبَ اِلَیَّ شِبْرًا تَقَرَّبْتُ اِلَیْہِ ذِرَاعًا وَمَنْ تَقَرَّبَ اِلَیَّ ذِرَاعًا تَقَرَّبْتُ اِلَیْہِ بَاعًا وَمَنْ اَتَانِیْ یَمْشِیْ اَتَیْتُہٗ اِلَیْہِ هَرْوَلَةً اَوْ کَمَا قَالَ۔

جو شخص میری طرف ایک بالشت چل کر آتا ہے میں اس کی طرف

ایک ہاتھ جاتا ہوں اور جو میری طرف ایک ہاتھ چلتا ہے میں اُس کی طرف کُھلے ہوئے دو ہاتھ آتا ہوں اور جو میری طرف آہستہ چل کر آتا ہے میں اُس کی طرف دوڑ کر جاتا ہوں ـــــــ اس حدیث میں بالشت اور گز وغیرہ اور دوڑ کر آنا سمجھانے کے لئے ایک مثال ہے۔ مقصود یہ ہے کہ جو میری طرف ذرا بھی توجہ کرتا ہے میں اُس کی طرف دو چند اور سہ چند توجہ کرتا ہوں۔

واقعی سچ ہے اگر حق تعالیٰ اتنی توجہ اور رحمت نہ فرمائیں تو انسان کی کیا مجال تھی جو اُن تک پہنچ سکے۔ آخر انسان کو خدا سے نسبت ہی کیا ہے۔ وہ وراء الوراء ثم وراء الوراء ہیں۔ اس کا وہم و گمان بھی وہاں تک نہیں پہنچ سکتا۔ تو جو ذات اس قدر بالا و برتر ہو۔ اس کی معرفت اور محبت اور مشاہدہ انسان خود کیوں کر کر سکتا ہے پس یہ اُنہی کی عنایت ہے جو کچھ حصہ معرفت وغیرہ کا انسان کو عطا ہو جاتا ہے ورنہ واقعی وہ مسافت تو ایسی ہے ؎

نہ گردد قطع ہرگز جادۂ عشق از دویدنہا
کہ می بالد بخود ایں راہ چوں تاک از بریدنہا

غیر متناہی مسافت ہے جس کا قطع کرنا انسان کی طاقت سے باہر ہے لیکن وہ کیوں کر قطع ہوتی ہے۔ سنیئے ؎

خود بخود آں شہ ابرار ببر می آید
نہ بزور و نہ بزاری نہ بزر می آید

صورت وصول الی اللہ

یعنی صورت وصول کی یہ ہوتی ہے کہ ابتدا میں تو سالک میں ادر

محبوب حقیقی میں غیر متناہی مسافت ہوتی ہے جس کو سالک طے نہیں کر سکتا مگر جب یہ چلنا شروع کرتا ہے تو حق تعالیٰ اس کے ضعف پر رحم فرماتے ہیں کہ اتنی لمبی مسافت اس سے قطع نہ ہو گی۔ اب وہ خود بھی چلنا شروع کرتے ہیں اور اُن کو اس مسافت کا طے کرنا کچھ بھی مشکل نہیں تو وہ خود اُس کے نزدیک آجاتے ہیں۔ اس طرح وصول ہو جاتا ہے پس حقیقت میں بندہ واصل نہیں ہوتا بلکہ حق تعالیٰ اس کے پاس پہنچ جاتے ہیں۔ مگر کیا ٹھکانا ہے رحمت کا کہ پھر بھی بندہ کو واصل کا خطاب دے دیا گیا۔)

اس کی مثال میں نے ایک تجویز کی ہے جس سے وصول عبد کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ وہ یہ کہ مثلاً آپ کا ایک شیر خوار بچہ ہو جو آپ سے دُور کھڑا ہو۔ آپ اُس سے کہتے ہیں کہ دوڑ کر چلے آؤ۔ حالانکہ آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ اتنی مسافت یہ طے نہیں کر سکتا لیکن پھر بھی اُس کو بلاتے ہیں۔ اب بچہ ہمت کر کے ایک دو قدم چلتا ہے اور گر پڑتا ہے اور رونے لگتا ہے۔ اُس وقت باپ کو خود جوش آئے گا اور وہ دوڑ کر خود آوے گا اور اُس کو گود میں اٹھا لے گا۔ تو دیکھئے یہ مسافت بعیدہ جو نقار سے مانع تھی کیوں کر طے ہوئی۔ اس طرح طے ہوئی کہ بچہ تو دو قدم چل کر گر پڑا اور رونے لگا پھر باپ خود اُس کے پاس آگیا اور اُس کو گلے سے لگا لیا۔

یہی صورت سلوک باطن کی ہے کہ اوّل تم اپنی ناتمام طلب اور سعی ظاہر کرتے ہو تمہاری وہ سعی ہر گز وصول کے لئے کافی نہیں تھی مگر جب تم دو قدم چل کر گر پڑتے ہو اُس وقت حق تعالیٰ کی رحمت

کو جوش ہوتا ہے وہ خود آ کر تم کو گلے سے لگا لیتے ہیں۔ مگر ہاں اس کی ضرورت بے شک ہے کہ تم بچّہ کی طرح ایک دو قدم چل کر رونا تو شروع کرو۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

ہر کجا پستی ست آب آنجا رود　　ہر کجا مشکل جواب آنجا رود
ہر کجا دردے دوا آنجا رود　　ہر کجا رنجے شفا آنجا رود

گر نہ گرید طفل کے جوشد لبن
گر نہ گرید ابر کے خندد چمن

اور رونے اور گر پڑنے سے میری مراد یہ نہیں کہ چلّانا چیخنا شروع کرو بلکہ سالک کا رونا اور گرنا یہ ہے کہ اپنی عاجزی اور ناتوانی کا مشاہدہ کرے۔ حق تعالیٰ کے سامنے الحاح و التجا کرے۔ تواضع اور خاکساری پیدا کرے۔ تکبّر اور فرعونیت کو دماغ سے نکال پھینکے اس کے بعد وصول میں دیر نہیں لگتی۔ ذرا تم خاکساری اختیار کر کے تو دیکھو۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

سالہا تو سنگ بودی دلخراش　　آزموں را یک زمانے خاک باش

در بہاراں کے شود سر سبز سنگ
خاک شو تا گل بروید رنگ رنگ

خدا کی کمند

میں نے وصول الی اللہ کی مثال جو بچّہ کی حالت سے بیان کی ہے اس پر ایک بادشاہ کی حکایت یاد آئی۔ میں نے کسی بزرگ سے یہ حکایت سنی ہے کہ ایک بادشاہ اپنے بالا خانے پر بیٹھا ہوا تھا کہ نیچے سے ایک درویش کا گزر ہوا۔ بادشاہ نے درویش کو آواز دی کہ

ذرا میرے پاس آؤ۔ مجھے تم سے کچھ پوچھنا ہے۔ اُس نے کہا میں تمہارے پاس کیونکر آؤں۔ تم بالاخانے پر، میں زمین پر اور محل کا دروازہ دُور۔ کیونکہ شاہی محلات کا بڑا دروازہ وہاں سے دُور تھا اور جس بالاخانے پر بادشاہ تھا وہاں بہت سے دروازے اور درجے طے کر کے پہنچنا ہوتا تھا۔ بادشاہ نے فوراً ایک کمند لٹکا دی کہ اس کو پکڑ لو۔ درویش نے اُس کو پکڑ لیا۔ بادشاہ نے کھینچ لیا۔ دو منٹ میں اوپر آگیا۔ جب وہ اوپر پہنچ گیا تو بادشاہ نے اُن سے سوال کیا کہ تم خدا تک کیوں کر پہنچے۔ اُنہوں نے برجستہ جواب دیا کہ جیسے تم تک پہنچا۔ خدا تک پہنچنا تو بہت مشکل تھا مگر میں نے خدائی کمند کو مضبوط پکڑ لیا تھا۔ اُنہوں نے خود ہی کھینچ لیا ــــ سبحان اللہ! خوب ہی جواب دیا۔

اے صاحبو ــــ تم بھی خدا کی کمند کو مضبوط پکڑ لیتے تو اسی طرح تم بھی اُن کے جذب سے واصل ہو جاتے۔ مگر افسوس ہے کہ لوگ تو کمند الٰہی کو قطع کر رہے ہیں۔ صاحبو! خدا کی کمند یہ ہے کہ انبیاءؑ مبعوث ہوئے جنہوں نے مخلوق کو خدا تک پہنچا دیا۔ انبیاء کے بعد علماء حقانی و اولیاء اُمت پیدا ہوئے جو ہر وقت مسلمانوں کو احکام الٰہی اور اُس تک پہنچنے کا راستہ تبلاتے رہتے ہیں۔ ترغیب و ترہیب ہو رہی ہے۔ محبت الٰہی و معرفت کے فضائل و اصلاح نفس کا طریقہ بیان ہو رہا ہے مگر پھر بھی لوگوں کے کانوں پہ جوں نہیں رینگتی۔ اور وہ اسی طرح غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔ پھر اسی پر اکتفا نہیں بلکہ جو اُن کو خدا تک پہنچانا چاہے اُس پر طعن و ملامت چاروں طرف سے ہوتی ہے۔ محض اس لئے کہ وہ اُن کو اُن کاموں سے منع

کرتا ہے جو وصول الی اللہ سے مانع ہیں۔ بس یہی کمند الٰہی کو قطع کرنا ہے۔ جب تم خود نہ پہنچنا چاہو تو خدا کو کیا غرض پڑی ہے کہ جو خوشامد کرکے تم کو پہنچا دے۔

اَنُلۡزِمُکُمُوۡہَا وَاَنۡتُمۡ لَہَا کٰرِہُوۡنَ ؁

شہوت کے اقسام

الغرض صبر عن الشہوت گو فی نفسہٖ دشوار ہے مگر جب آدمی اس کا ارادہ کرتا ہے تو آسانی شروع ہو جاتی ہے حتیٰ کہ پھر کبھی دشواری نہیں رہتی۔

ایک بات یہ بھی یاد رکھنے کی ہے کہ شہوت عورتوں اور لڑکوں ہی کے تعلق میں منحصر نہیں بلکہ لذیذ غذاؤں کی فکر میں رہنا بھی شہوت ہے عمدہ لباس کی دھن میں رہنا بھی شہوت ہے۔ ہر وقت باتیں بگھارنے کی عادت ہونا بھی شہوت ہے۔ اور ان سب شہوتوں سے نفس کو روکنا یہ بھی عن الشہوت میں داخل ہے۔

آج کل لوگوں کو باتیں بنانے کا بہت مرض ہے۔ بس جہاں کام سے فارغ ہوئے مجلس آرائی کرکے فضول باتیں کرنے لگے۔ میں صرف عوام کی شکایت نہیں کرتا بلکہ میں علماء و مشائخ کو بھی مجلس آرائی سے منع کرتا ہوں۔ کیونکہ یہ مرض اُن میں بھی بہت ہے۔ بعض مشائخ کے یہاں عشاء کے بعد بھی مجلس آرائی ہوتی ہے جس سے خواہ مخواہ نیند برباد ہوتی ہے۔ اگر شیخ کے معمولات میں اس سے فرق بھی نہ آتا ہو تاہم سب اہلِ مجلس یکساں نہیں ہوتے۔ اُن میں سے بعض صبح کی نماز بھی غائب کر دیتے ہیں۔ پھر یہ بھی نہ ہو تو بلا ضرورت باتیں بنانا

ظلمتِ قلب کا سبب ہے۔ یہی بڑا کافی نقصان ہے گو اور کوئی بھی نقصان نہ ہو۔ خصوص اگر باتیں بھی شیخ کی مدح کی ہوں جو خوشامدی مرید بناتے ہوں۔ بیچارے ممدوح کا تو اس سے ستیاناس ہو جاتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

تن قفس شکل ست آں خارِ جاں
از فریبِ داخلاں و خارِجاں
اینست گوید نے منم ہمراز تو
آنت گوید نے منم انبازِ تو
او چو بیند خلق را شد مست خویش
از تکبر میرود از دستِ خویش

ایک جامع خلق

اس تقریر سے آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ صبر کتنا جامع خلق ہے مگر لوگ صرف اسی کو صبر سمجھتے ہیں کہ مصیبت کے وقت رویا نہ جاوے حالانکہ شہوت و غضب کا روکنا بھی صبر ہے۔ اور شہوت میں شہوتِ رجال و نساء و شہوتِ لباس و شہوتِ طعام و شہوتِ کلام بھی داخل ہے اسی طرح تمام معاصی سے نفس کو روکنا یہ بھی صبر میں داخل ہے۔ نیز طاعات پر پابندی کرنا بھی صبر میں داخل ہے۔ طاعات بجا لانے کے وقت اُن کے حقوق و آداب کو اطمینان و سکون سے ادا کرنا بھی صبر میں داخل ہے پس یہ ایسا جامع خلق ہے کہ بہت سے اخلاق اس کے اندر داخل ہیں۔ اسی لیے حدیث میں آیا ہے۔ اَلصَّبْرُ نِصْفُ الْاِیْمَانِ۔ اور یہی راز ہے کہ حق تعالیٰ نے اخلاق میں سے اس جگہ صرف صبر کو بیان فرمایا۔

اب تو آپ کی سمجھ میں آگیا ہو گا کہ اس آیت میں تمام اجزاء دین

بالاجمال مذکور ہیں۔ آگے صبر کے چند مواقع جو مہتم بالشان ہیں بیان فرماتے ہیں ـــــ!

فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِيْنَ الْبَأْسِ۔ یعنی وہ صبر کرنے ہیں باساء میں اور ضراء میں اور باس کے وقت۔ ان الفاظ کی تفسیر مفسرین نے اس طرح کی ہے کہ باساء سے فقر و تنگدستی مراد ہے اور ضراء سے بیماری اور باس سے حرب۔ لیکن عموم الفاظ پر نظر کر کے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ باساء سے تو فقر و تنگدستی ہی مراد ہو۔ جس کا حاصل یہ ہو گا کہ فقر و تنگدستی میں صبر کرے یعنی خدا پر نظر رکھے۔ مخلوق کے مال و دولت پر نظر نہ کرے۔ نہ اُن سے کچھ توقع رکھے۔ اس میں قناعت و توکل کی تعلیم ہو گئی۔

اور ضراء سے مطلق بیماری مراد ہو خواہ ظاہری ہو یا باطنی۔ ظاہری مرض میں تو صبر یہ ہے کہ لوگوں سے شکایت نہ کرتا پھرے۔ خدا سے دل میں تکدر نہ ہو۔ اس میں تسلیم و رضا کی تعلیم ہو گئی۔ اور باطنی بیماریوں میں صبر یہ ہے کہ امراض قلبیہ کے مقتضا پر عمل نہ کرے۔ اور ہمت سے اُن کا مقابلہ کرے۔ مثلاً کسی میں شہوت بالنساء یا بالرجال کا مرض ہے تو اُس کے مقتضا پر عمل نہ کرے اور ہمت کر کے عورتوں اور امردوں کی طرف نگاہ نہ اٹھائے۔ اُن سے اختلاط نہ کرے بلکہ بُعد اختیار کرے۔ اسی طرح بخل کا مرض ہو تو اُس کے مقتضاء پر عمل نہ کرے بتکلف خدا کے راستہ میں مال خرچ کر دیا کرے وعلیٰ ہذا تمام امراض کو اسی پر قیاس کر لیا جاوے۔

اور باس سے مراد مطلق شدت و پریشانی ہو تو یہ تعمیم بعد تخصیص

کے ہو جائے گی یعنے فقر و فاقہ اور امراض ظاہریہ و باطنیہ میں بھی ہمّت سے کام لے۔ اور اسی طرح جو پریشانی بھی لاحق ہو اُس میں مستقل مزاج رہے جس کا ایک فرد صبر عند الحرب بھی ہے کہ جہاد کے وقت لڑائی میں ثابت قدم رہے۔ پس اب صبر کا حاصل یہ ہوا کہ موحد کامل بن جانا چاہیئے جس کی یہ شان ہوتی ہے ؎

موحد چہ بر پائے ریزی زرش
چہ فولادِ ہندی نہی برسرش
امید و ہراسش نباشد ز کس
ہمیں ست بنیادِ توحید و بس

جب مقامِ صبر کامل ہو جاتا ہے تو توحید بھی کامل ہو جاتی ہے ان تمام اجزاء شریعت کو بیان فرما کر آگے نتیجہ کے طور پر فرماتے ہیں۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ؕ یہی لوگ ہیں جو صادق ہیں اور یہی لوگ متقی ہیں۔ یہ جملہ گویا بمنزلہ مہر کے ہے کہ سارا مضمون بیان فرما کر اخیر میں مہر لگا دی کہ یہی لوگ صادق و متقی ہیں۔ چونکہ تفصیل سابق سے یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ اس آیت میں جو اوصاف مذکور ہیں وہ تمام اجزاء دین کو جامع ہیں۔ تو اب جملہ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ سے یہ مسئلہ بخوبی ثابت ہو گیا کہ صادق و متقی کامل فی الدین کو کہتے ہیں اور یہ کہ تقویٰ و صدق کمال فی الدین کا نام ہے۔ لہذا آیت مذکورہ میں جو ہمیں نے دعویٰ کیا تھا کہ اتقوا اللّٰہ وکونوا مع الصّٰدقین کے یہ معنی ہیں اَكْمِلُوْا فِي الدِّيْنِ وَكُوْنُوْا مَعَ الْكَامِلِيْنَ۔ یہ دعویٰ بالکل بے غبار ہو گیا اور قرآن

ہی سے اس دعویٰ کی تائید مل گئی (اور ظاہر ہے کہ جس تفسیر کی تائید قرآن کی دوسری آیتوں سے ہو جائے وہ زیادہ اولیٰ ہے)

کامل بننے کا طریقہ

معنے آیت کے یہ ہوئے کہ اے مسلمانو! دین میں کامل ہو جاؤ۔ جس کا طریقہ بھی آگے بتلاتے ہیں کہ دین میں کامل ہونے کا طریقہ یہ ہے کہ کاملین کے ساتھ ہو جاؤ۔ صاحبو۔ جو طریقہ کمال حاصل کرنے کا حق تعالیٰ نے بتایا ہے واللہ کوئی سالک کوئی محقق ہرگز نہیں بتلا سکتا۔ یہ بات کسی کی سمجھ میں آ ہی نہیں سکتی کہ کاملین کی معیت سے بھی کمال حاصل ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ کاملین کی معیت ہی معیت حصول کمال کے لیے کافی ہے۔ ممکن ہے بعض لوگ یہی سمجھے ہوں مگر یہ صحیح نہیں کیونکہ اگر کوئی شخص سالہا سال کاملین کے ساتھ رہے اور خود کچھ نہ کرے تو اس کو کمال حاصل نہیں ہو سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اصل طریق تو کمال فی الدین حاصل کرنے کا یہ ہے کہ اعمال میں کمال حاصل کرو۔ اعمال میں کمال حاصل کرنا یہ ہے کہ طاعات کو بجا لاؤ اور معاصی سے اجتناب کرو۔ چنانچہ آیت لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ ــــــ الخ میں انہی اعمال کو بِرّ کافی فرمایا ہے اور ان کو بیان فرما کر ان لوگوں کو متقی اور صادق ہونا بتلایا ہے۔ جو ان اعمال کو اختیار کئے ہوئے ہیں جس سے اعمال پر مدارِ کمال ہونا بخوبی ظاہر ہے۔

مگر اب سوال یہ ہے کہ اعمال میں کیسے کامل ہوں۔ کیونکہ کمال فی الاعمال کی تحصیل میں ایک مانع پیش آتا ہے جو نفس ہے۔ ہر عمل

میں اس کا ایک تقاضا مزاحم ہوتا ہے۔ شریعت حکم دیتی ہے کہ جاڑوں میں پانچوں وقت وضو کرو۔ نفس کی آرام طلبی اس کی مزاحمت کرتی ہے شریعت کا حکم ہے کہ زکوٰۃ سالانہ ادا کرو۔ نفس کا تقاضائے بخل اس کی مزاحمت کرتا ہے۔ شریعت کا حکم ہے کہ رشوت اور سود نہ لو۔ نفس کا تقاضائے حرص اس کی مزاحمت کرتا ہے۔ شریعت کا حکم ہے کہ لڑکوں اور نامحرم عورتوں کو بُری نگاہ سے نہ دیکھو۔ تقاضائے شہوت اس کی مزاحمت کرتا ہے۔ اسی طرح حکم ہے کہ فقر و تنگ دستی میں مخلوق کے مال پر نظر نہ کرو۔ تقاضائے حرص اس کی مزاحمت کرتا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس جتنے احکام شریعت کے ہیں ہر عمل کے مقابلہ میں اس کے خلاف نفس کا ایک تقاضا ہے جو اس حکم کی مزاحمت کرتا ہے۔ تو خدا تعالیٰ نے دین کامل حاصل کرنے کا تو حکم کر دیا اور اس کا طریقہ بھی بتلا دیا کہ اعمال کا جمع کرنا ہے۔

تقاضائے نفس کی مزاحمت

مگر اس نفس کے ان بے شمار تقاضوں کا کیا علاج ہو۔ جو ہر حکم پر عمل کرنے میں رکاوٹ پیدا کرتے ہیں۔ سو حق تعالیٰ نے کونوا مع الصّٰدقین میں اسی مانع کو مرتفع فرمایا ہے۔ اور نفس کی اس مزاحمت ہی کا علاج بتلایا ہے۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ طریق حصول کمال فی الدین یعنی تکمیل اعمال ظاہری و باطنی میں جو مزاحمت نفس کی پیش آتی ہے اس معیت صادقین یعنی کاملین میں یہ خاصیت ہے کہ وہ مزاحمت مرتفع ہو جاتی ہے یعنی نفس میں اس درجہ کا تقاضا نہیں رہتا اور جو

کچھ رہتا ہے اُس کی مقاومت سہل ہو جاتی ہے۔ پس اعمال کی تکمیل سہولت سے میسّر ہو جاتی ہے اور اسی طرح کمال فی الدین حاصل ہو جاتا ہے۔

دیکھئے کتنا سہل اور آسان علاج ہے۔ گویا دمڑی کا نسخہ اور ہزاروں کا فائدہ ہے بلکہ یوں کہئے کہ جڑی بوٹی کا علاج ہے جس میں دھیلہ کا بھی خرچ نہیں۔ اور اس آیت میں جو طریقہ دینی کمال حاصل کرنے کا بتلایا گیا ہے حقیقت میں وہ اصل طریق کمال کے مانع کا مرتفع کرنے والا ہے۔ لیکن چونکہ وہ طریق بدون اس مانع کے مرتفع ہوئے دشوار تھا اس لئے اگر اسی کو طریق کمال کہہ دیا جاوے تو کچھ مضائقہ نہیں کیونکہ علّت تامہ وجود شرائط ارتفاع موانع سے مرکب ہوتی ہے اور ان دونوں میں اُس میں دخل ہوتا ہے گو وجود معلول کا اُن سب سے نہیں ہوتا۔ وجود صرف جزو اخیری سے ہوتا ہے اور جو طریقہ تقاضائے نفس کی مزاحمت کو مضمحل کرنے کا اس آیت میں بتلایا گیا ہے واللہ اس سے سہل علاج کوئی نہیں بتلا سکتا۔ فن شناس لوگوں نے نفس کی اصلاح کے لئے نہ معلوم کیا کیا طریقے تجویز کر رکھے ہیں جن پر عمل کرنا ہمت والے کا کام ہے۔ مگر یہ طریقہ تو ایسا آسان ہے کہ کسی کو بھی اس پر عمل دشوار نہیں۔ اور یہ محض قرآن کا دعویٰ ہی نہیں بلکہ مشاہدہ ہے۔ یہ بات ثابت ہے کہ کاملین کی صحبت میں یہ اثر ہے کہ اُن کے پاس جا کر نفس کا تقاضا مضمحل ہو جاتا ہے۔

ولایت عامہ اور خاصہ کا فرق

کاملین تو بھلا کامل ہی ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ عام مومنین کے مجمع

میں جا کر دیکھو کہ جس وقت سب لوگ نماز کا اہتمام کرتے ہیں تو بے نمازی کے دل میں بھی نماز کا تقاضا ہوتا ہے اور کیوں نہ ہو آخر یہ بھی تو اولیاء اللہ ہیں کیونکہ ولایت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ولایت عامہ دوسری ولایت خاصہ۔ ولایت عامہ ہر مسلمان کو حاصل ہے۔ اس لئے عام مومنین کی صحبت میں بھی ضرور اثر ہوتا ہے بشرطیکہ وہ کیفما اتفق جمع ہو گئے ہوں چھانٹ چھانٹ کر بدمعاش جمع نہ کئے گئے ہوں ——— لیکن یہ بات سن کر کوئی صاحب ناز نہ کریں کہ جب عام مسلمان بھی ولی ہیں تو پھر ہم کو کسی اور ولی کی کیا ضرورت ہے ہم کیوں کسی کے پاس جائیں۔ کیونکہ ولایت عامہ سے جو مقبولیت حاصل ہوتی ہے وہ ایسی ہے جیسے باغیوں اور دشمنوں کے مقابلہ میں عام رعایا کو بادشاہ کا دوست اور وفادار کہہ دیا جاتا ہے جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ باغی اور دشمن نہیں۔ مگر کیا اتنی بات پر کوئی اکتفا کیا کرتا ہے اور کیا اس سے عام رعایا بادشاہ کے مقربین میں داخل ہو گئی ——— ہرگز نہیں۔ کیونکہ رعایا میں سے بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کو چوری اور بدمعاشی کرنے کی سزا میں قید خانہ بھیج دیا جاتا ہے۔ جہاں روزانہ سو بیدیں اُن کی کمر پر لگائی جاتی ہیں۔ مگر اس حالت میں بھی یہ شخص بہ نسبت باغی کے بادشاہ کا وفادار اور اُس کی رعایا ضرور کہلاتا ہے جس کا اتنا اثر ہوتا ہے کہ کبھی مراحم خسروانہ سے اُس کو رہا بھی کر دیا جاتا ہے اور باغی مراحم خسروانہ کا اہل نہیں رہتا ——— تو ولایت عامہ بدون ولایت خاصہ کے ایسی ہے جیسے جیل خانہ کے مجرموں کو باغیوں کے مقابلے میں بادشاہ سے تعلق ہوا کرتا

ہے مگر عاقل محض اتنے تعلق پر کبھی کفایت نہیں کیا کرتا۔ وہ خاص تعلق کے لئے کوشش کیا کرتا ہے۔ چنانچہ میں اسی کو پہلے بیان کر چکا ہوں کہ مقاصد میں درجۂ کمال ہی مطلوب ہوتا ہے۔ لیکن عام مومنین کی صحبت کا اثر بیان کرنے سے میرا مقصود یہ تھا کہ جب ناقصین کی صحبت میں یہ اثر ہے تو خود سمجھ جاؤ کہ کاملین کی صحبت میں کیا کچھ اثر ہوگا ؎

جرعہ خاک آمیز چوں مجنوں کند   صاف گر باشد ندانم چوں کند

جب خاک آمیز گھونٹ میں اتنی تاثیر ہے تو صاف اور مقطر میں تو نہ معلوم کیسی مستی ہوگی۔ تجربہ کرکے دیکھ لیجئے کہ جس شخص کی رات کو آنکھ نہ کھلتی ہو وہ چند دنوں ایسے لوگوں میں جا کر رہے جو رات کو اٹھتے ہیں انشاء اللہ اس شخص کو بھی تہجد کی عادت ہو جائے گی اسی طرح جس شخص کو ذکر اللہ سے مناسبت نہ ہوتی ہو وہ کچھ دنوں ذاکرین کی جماعت میں رہے بہت جلد ذکر سے مناسبت ہو جائے گی۔ کیونکہ ذاکرین کے حلقہ میں رہ کر خود بخود اندر سے دل تقاضا کرے گا کہ میں بھی ذکر کروں۔ گویا آج ہی سے اس کا وہ تقاضا جو ذکر کے خلاف تھا مضمحل ہو گیا۔ پھر جو لوگ کامل ہیں ان کی صحبت میں تو کیا کچھ نفع ہوگا اس کو خود ہی سمجھ لینا چاہیے۔ بس ان کی صحبت کا نفع یہ ہے

؎ آہن کہ بپارس آشنا شد
فی الحال بصورت طلا شد

جیسے ایک پتھر مشہور ہے جس کا نام پارس ہے۔ اس کی یہ تاثیر سنی گئی ہے کہ لوہے کو اس سے مس کر دیا جائے تو وہ خالص

سونا ہو جاوے۔ یہ خاصیت کاملین کی صحبت میں ہوتی ہے۔

صحبت کاملین کی شرط

مگر کاملین کی صحبت کے موثر ہونے کی ایک شرط ہے اور اس کے لئے ایک پرہیز بھی ہے۔ پرہیز تو یہ ہے کہ اعمال و افعال وغیرہ میں اس کی مخالفت نہ کرو اور شرط یہ ہے کہ اپنے حالات سے اُن کو اطلاع دیتے رہو۔ تمہارے نفس میں جو مرض بھی ہو اُس سے صاف صاف کہہ دو۔ حیا نہ کرو کیونکہ طبیب اور ڈاکٹر کے سامنے بضرورت علاج بدن مستور کا کھولنا جائز ہے۔ اسی طرح طبیب روحانی سے نفس کے امراض بیان کر دینا جائز ہیں۔ تو ایک مرتبہ اپنا سارا کچا چٹھا اُن کے سامنے کھول کر رکھ دو۔ اور اس سے مت ڈرو کہ اُن کی نظر میں ذلیل ہو جاؤ گے۔ بخدا اہل اللہ کی نظر میں خود اُن سے زیادہ کوئی ذلیل نہیں۔ وہ اپنے کو اتنا ذلیل سمجھتے ہیں کہ فساق و فجار بھی اپنے کو اتنا ذلیل نہیں سمجھتے۔ اس سے بالکل مطمئن رہو۔ پھر جب تم اپنا حال بیان کر چکو تو اُس پر وہ جو کچھ بتلاویں اس کا اتباع کرو۔ یہی طریقہ علاج ظاہری میں بھی آپ کرتے ہیں کہ پہلے اپنا حال طبیب سے ظاہر کرتے ہیں۔ پھر وہ نسخہ تجویز کرتا ہے آپ اُس کو استعمال کرتے ہیں اور کچھ پرہیز بتلاتا ہے اُس سے آپ بچتے ہیں۔ یہی طریقہ حضرات کاملین کی صحبت میں اختیار کرنا چاہیے۔

بھلا اگر کوئی شخص طبیب کے پاس روزانہ محض ملاقات کے طور پر چلا جایا کرے۔ نہ اُس سے اپنا حال کہے نہ نسخہ پوچھے تو کیا اس طرح وہ مرض سے شفا پا سکتا ہے — ہرگز نہیں۔ اسی طرح

اولیاء کی صحبت میں محض زیارت و ملاقات کی نیت سے جانا امراض باطنیہ سے شفا ہونے میں کافی نہیں۔ گو اُن کی زیارت بھی موجب ثواب ہے۔ یہ الگ بات ہے۔ مگر اس وقت محض ثواب حاصل کرنے سے گفتگو نہیں۔ ثواب کے لئے تو اور بھی بہت سے کام ہیں۔ یہاں تو کمال دین حاصل کرنے سے بحث ہو رہی ہے۔ تو اولیاء کاملین سے کمالِ دین اسی طرح حاصل ہو گا جیسا کہ میں نے بیان کیا۔ اس کا ہمیشہ لحاظ رکھو اور جب اُن کے پاس جاؤ یا خط لکھو تو اس کا قصد کرو کہ اُن کے سامنے نفس کے امراض بیان کریں گے اور جو وہ بتلا دیں گے اُس پر عمل کریں گے۔ پس اولیاء کاملین کے پاس رہنے کی صورت میں بھی عمل کرنا آپ ہی کو پڑے گا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ تم کچھ نہ کرو اور کامل بن جاؤ۔

صحبت کاملین کا اثر

مگر اتنا فرق ہو گا کہ پہلے تم عمل کا قصد کرتے تھے اور اُس کے خلاف تقاضا پیدا ہوتا تھا اور اُن کے پاس رہنے سے اعمال صالحہ کا تقاضا پیدا ہو گا اور دوسرا تقاضا مضمحل ہو جائے گا۔ تو یہ کیا تھوڑا نفع ہے کہ جس کام کا کرنا پہلے مشکل تھا آج آسان ہو گیا اور صرف آسان ہی نہیں بلکہ اس کی طرف دل کو از خود تقاضا ہونے لگا کہ اس کے بغیر تم کو چین نہیں ملتا۔

صاحبو ـــــ یہ بہت بڑا نفع ہے اس کو کم مت سمجھو۔ کاملین کی صحبت میں جا کر بس یہ بات پیدا ہوتی ہے جو اُن سے دور رہ کر نہیں پیدا ہوتی۔ جن لوگوں کو کاملین سے تعلق نہیں وہ متقی ہو سکتے ہیں

مگر بڑی مصیبت کے ساتھ اُن کو تقویٰ حاصل ہوگا۔ اور جن کو اُن سے تعلق ہے اُن کو بہت آسانی اور راحت سے تقویٰ حاصل ہو جاتا ہے یہ تو اُن کی صحبت کا ادنیٰ اثر ہے کہ اعمال میں سہولت ہو جاتی ہے اس کے بعد نور فہم اور معرفت اور احوال وکیفیات کی سلامتی مقامات باطنیہ کی ترقی حاصل ہوتی ہے اُس کی تو کچھ انتہا نہیں۔

پس یہ مضمون اس آیت کے متعلق مجھ کو بیان کرنا تھا جس کو میں بیان کر چکا۔ اور اس سے آپ کو معلوم ہوا ہوگا کہ گو میں نے آج کوئی نیا مضمون نہیں بیان کیا مگر تحدیث بالنعمۃ کے طور پر کہتا ہوں دعوےٰ نہیں کرتا کہ میں نے آج خدا تک پہنچنے کا سیدھا راستہ آپ کو بتلا دیا ہے بلکہ یوں کہئے کہ میں نے سب کو واصل کر دیا ہے۔ کیونکہ وصول کا آسان طریق بتلا دینا یہ بھی واصل کر دینا ہے۔ اور آج میں نے ایسا آسان راستہ آپ کو بتلا دیا ہے جو شاید کبھی کان میں نہ پڑا ہوگا۔ اب بھی اگر قدم نہ اٹھاؤ اور واصل بننے کی کوشش نہ کرو تو حجت الٰہیہ ختم ہو چکی ہے۔

صدق کے معنی و تفسیر

اب میں اس آیت کے متعلق ایک دو باتیں مختصر طور پر بیان کر کے تقریر کو ختم کرنا چاہتا ہوں۔ ایک بات یہ جاننے کی ہے کہ اور اجمالاً پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ اس آیت میں صدق سے مراد محض زبان سے سچ بولنا نہیں ہے۔ کہیں لوگ یہ نہ سمجھیں کہ جس صدق کو کمال دین بتلایا ہے وہ تو ہم کو حاصل ہے کیونکہ ہم سچ بولتے ہیں۔ پس سمجھ لیجئے کہ صدق کے معنی پختگی کے ہیں اور اسی

سے ولی کامل کو صدیق کہا جاتا ہے کیونکہ وہ تمام احوال وافعال و اقوال میں مرتبہ رسوخ حاصل کر چکتا ہے۔ صدق کے معنی جو اصطلاح لغاۃ و بلغاء میں بیان کیئے گئے ہیں مطابقۃ الخبر للمحکی عنہ۔ یہ معنی اصطلاح شرعی سے خاص ہیں۔ شریعت میں صدق عام ہے افعال کو بھی، اقوال کو بھی، احوال کو بھی۔

اقوال کا صدق تو یہی ہے کہ بات پکی ہو یعنی واقع کے مطابق ہو کچی بات نہ ہو جو کہ واقع کے خلاف ہو۔ جو شخص اس صفت سے موصوف ہو اُس کو صادق الاقوال کہتے ہیں۔

افعال کا صدق یہ ہے کہ ہر فعل مطابق امر ہو حکم شرعی کے خلاف نہ ہو۔ پس جس شخص کے افعال ہمیشہ شریعت کے موافق ہوں اُس کو صادق الافعال کہا جاتا ہے۔

احوال کا صدق یہ ہے کہ وہ سنّت کے موافق ہوں۔ پس جو احوال خلاف سنّت ہوں وہ احوال کاذبہ ہیں اور جس شخص کے احوال وکیفیات سنّت کے موافق ہوتے ہوں اُس کو صادق الاحوال کہتے ہیں ——،

نیز صدق احوال کے یہ معنی بھی ہیں کہ وہ احوال ایسے ہوں جن کا اثر صاحب حال پر باقی رہے۔ یہ نہ ہو کہ آج ایک حالت پیدا ہوئی پھر زائل ہو گئی اور اس کا کچھ بھی اثر باقی نہ رہا جیسا کہ بعض لوگوں کو کسی وقت خوف کا یا توکّل کا غلبہ اپنے اوپر معلوم ہوتا ہے لیکن بعد میں اس کا کچھ بھی اثر نہیں رہتا۔ اس کو صادق الاحوال نہ کہیں گے۔ یہ مطلب نہیں کہ احوال کا غلبہ ہمیشہ رہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس کا

اثر ہمیشہ رہنا چاہیئے کہ جو حالت طاری ہو وہ بعد میں مقام ہو جائے اس میں سالکین کو بہت دھوکا ہوتا ہے۔ بعض دفعہ وہ محض وہم سے یہ سمجھ لیتے ہیں کہ ہم کو تسلیم ورضا یا توکل ورجا کا حال حاصل ہے مگر تھوڑے سے عرصہ کے بعد اُس کا کچھ بھی اثر نہیں رہتا۔ جس سے اس حالت کا اُن کا وہم ہونا ظاہر ہو جاتا ہے۔ غرض صدق شریعت میں صرف اقوال کے ساتھ خاص نہیں جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے اور اس سمجھنے سے بہت سے اغلاط میں ابتلا ہو جاتا ہے

اصطلاحاتِ شرعیہ

اسی کو امام غزالیؒ نے لکھا ہے کہ منجملہ احداثات کے ایک یہ بھی احداث ہے کہ لوگوں نے اصطلاحات شرعیہ کو بدل دیا ہے جیسے فقہ نام رکھا ہے کنز وہدایہ کے پڑھ لینے کا حالانکہ فقہ شریعت میں محض کتاب پڑھ لینے کا نام نہیں بلکہ وہ ایک خاص فہم ہے۔ جس سے ملکہ راسخہ پیدا ہو جاتا ہے احکام کے سمجھنے کا۔ نیز سلف صالحین فقیہ ایسے کو کہتے تھے جس کو احکام کی فہم کے ساتھ عمل کامل بھی حاصل ہو مگر آج کل فقہ کے لئے عمل کو ضروری نہیں سمجھا جاتا۔ اسی طرح بہت سے الفاظ شرعیہ کو شرعی اصطلاح سے بدل دیا گیا ہے۔

مثلاً شریعت میں علم مخصوص ہے علوم نقلیہ شرعیہ کے ساتھ مگر آج کل بعض لوگوں نے اس کو عام کر دیا ہے۔ نیچری فرقہ اس مرض میں زیادہ مبتلا ہے۔ اُنہوں نے علم میں سائنس اور جغرافیہ کو بھی ٹھونس دیا ہے۔ انگریزی زبان سیکھنے کو بھی وہ علم میں داخل

کرتے ہیں۔ چنانچہ میں نے بعض تحریریں ایسی دیکھی ہیں جن میں علم کی فضیلت احادیث سے ثابت کر کے اس پر انگریزی تعلیم اور سائنس وغیرہ کی تحصیل کو متفرع کیا ہے۔ وہ اپنی تحریروں میں سائنس وغیرہ کی ترغیب دیتے ہیں اور استدلال کرتے ہیں اطلبوا العلم ولو بالصین جس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ نعوذ باللہ احادیث نبویہ میں جس علم کی ترغیب دی گئی ہے ان میں یہ علم بھی داخل ہیں۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ شریعت میں جہاں علم کی فضیلت کا ذکر ہے یا اس کی ترغیب دی گئی ہے یا امر کیا گیا ہے وہاں صرف علوم نقلیہ شرعیہ مراد ہیں۔ جن میں اصل الاصول علم فقہ، علم حدیث و علم قرآن ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ان کے مقدمات کو بحکم مقدمۃ الواجب واجب ان کے ساتھ ملحق کر دیا جائے مگر سائنس و جغرافیہ تو ان علوم کے لئے مقدمات بھی نہیں۔ ان کو کس دلیل سے علم شرعی میں داخل کیا جاتا ہے اور ان پر حدیث سے استدلال کس طرح صحیح ہو سکتا ہے۔ یہ سخت مغالطہ ہے جس کی طرف بہت کم لوگوں کو التفات ہے۔ یہی حال اصطلاح صدق میں ہو رہا ہے کہ لوگوں نے اس کو محض اقوال کے ساتھ خاص کر لیا ہے حالانکہ شرعاً وہ افعال و احوال سب کو عام ہے۔ خوب سمجھ لو۔

تقویٰ کی فضیلت

اب ایک بات یہ رہ گئی کہ جب تقویٰ اور صدق دونوں کا کمال دین ہونا ثابت ہو گیا تو سوال یہ ہوتا ہے کہ اس آیت میں تقویٰ کا ذکر مقدم اور صدق کو مؤخر کیوں کیا گیا کیونکہ آیت کا مقصود تو اس:

طرح بھی حاصل ہو سکتا ہے کہ یوں فرما دیتے

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اُصْدُقُوْا وَکُوْنُوْا مَعَ الْمُتَّقِیْنَ

اس کے بھی وہی معنے ہوئے کہ اے مسلمانو! دین کامل حاصل کرو اور کاملین کے ساتھ رہو۔ جب یہ مضمون صدق کو مقدم اور تقویٰ کو موخر کرنے سے بھی حاصل ہو سکتا تھا تو پھر تقوے کو مقدم کیوں کیا گیا ہے؟

یہ سوال میرے ذہن میں اسی وقت آیا ہے۔ اس سے پہلے یہ سوال ذہن میں نہ تھا۔ اس کا جواب بھی الحمدللہ اسی وقت ذہن میں آیا ہے اس کو بیان کرتا ہوں۔ اگر کسی کے ذہن میں اس سے اچھا جواب ہو وہ اُس کو بیان کر دے۔ میرے نزدیک اُس میں نکتہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ آیاتِ قرآنیہ کے تتبع سے تقویٰ کے تو درجات چند در چند معلوم ہوتے ہیں اور صدق کے درجات مختلف نہیں بلکہ اس کا ایک درجہ متعین ہے جس کی دلیل یہ آیت ہے۔

لَیْسَ عَلَی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِیْمَا
طَعِمُوْا اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ ثُمَّ اتَّقَوْا
وَّاٰمَنُوْا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاَحْسَنُوْا وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ط

شانِ نزول آیت کا یہ ہے کہ جب حق تعالیٰ نے شراب کو مسلمانوں پر حرام کر دیا تو بعض صحابہ کو یہ خیال ہوا کہ ہم میں جو لوگ تحریم سے پہلے شراب پیتے تھے مر گئے ہیں کہیں اُن کو گناہ نہ ہوا ہو (یہ شبہ نہ کیا جائے کہ جب اُس وقت تک شراب کی حرمت نازل نہ ہوئی تھی تو اُنہوں نے حرام کا ارتکاب ہی نہ کیا تھا پھر صحابہ کو اُن پر گناہ

کا وہم کیوں ہوا؟ جواب یہ ہے کہ اتنی بات تو صحابہ بھی جانتے تھے کہ اس وقت حرمت خمر کا نزول نہ ہوا تھا لیکن ممکن ہے کہ ان کو یہ خیال ہوا ہو کہ نہ معلوم اس وقت تک جو شراب کی حرمت نازل نہ ہوئی تو اس کا سبب یہ ہے کہ شراب اب تک واقع میں حلال تھی یا یہ سبب ہے کہ واقع میں تو وہ پہلے بھی حرام تھی لیکن چونکہ ہم لوگ اس کے عادی بہت زیادہ تھے تو دفعتہً اس کی تحریم اس وجہ سے نازل نہیں کی گئی کہ ہم اس پر عمل نہ کر سکیں گے۔ پھر تدریجاً جب ہمارے اندر قابلیت عمل زیادہ ہو گئی اس وقت حکم تحریم نازل ہو گیا پس صورت اوّل میں تو جن لوگوں نے تحریم سے پہلے شراب پی تھی انہوں نے حلال کا ارتکاب کیا۔ لیکن دوسری صورت میں حرام کا ارتکاب لازم آتا ہے گو بوجہ نص نازل نہ ہونے کے ان کو گناہ نہ ہوا ہو۔ لیکن شاید ان کے درجات میں کچھ کمی اس لئے ہو گئی کہ وہ حرام فی نفسہ کا ارتکاب کرتے ہوئے دنیا سے گئے ہیں)

اس شبہ کا ازالہ حق تعالیٰ نے اس آیت میں فرمایا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ مسلمانوں پر کچھ گناہ نہیں ہے اس چیز میں جو انہوں نے (اب تک) کھایا پیا ہے (یعنے حکم تحریم سے پہلے شراب پینے میں تو ان پر کچھ گناہ نہیں ہوا) جب کہ وہ دوسرے گناہوں سے بچتے رہے ہوں اور ایمان دار رہے ہوں اور نیک اعمال کرتے رہے ہوں پھر وہ تقویٰ کرتے رہے ہوں اور ایمان دار رہے ہوں پھر وہ تقویٰ کرتے رہے ہوں اور اخلاص سے کام لیتے رہے ہوں اور اللہ تعالیٰ اہل اخلاص سے محبت رکھتے ہیں۔

اس جگہ اصل مقصود تو یہ بتلانا تھا کہ نزول تحریم سے پہلے جن لوگوں نے شراب پی ہے اُن پر اس فعل کی وجہ سے کچھ گناہ نہیں ہوا لیکن لَیْسَ عَلَی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا جُنَاحٌ فِیْمَا طَعِمُوْا۔ سے چونکہ بظاہر گناہ کی نفی مطلقاً ہو رہی ہے۔ اس لئے آگے قاعدہ کلیہ کے طور پر وہ شرائط بھی بیان فرما دیں جن کے اجتماع کے بعد گناہ کی نفی مطلقاً صحیح ہو سکتی ہے۔ کیونکہ اگر کسی شخص نے تحریم خمر سے پہلے شراب بھی پی ہو اور زنا بھی کیا ہو تو یہ کہنا تو صحیح ہے کہ شراب کی وجہ سے اُس کو گناہ نہیں ہوا۔ لیکن یہ کہنا صحیح نہیں کہ اُس کو کچھ بھی گناہ نہیں ہوا۔ پس حاصل آیت کا یہ ہوا کہ جب وہ لوگ دوسرے گناہوں سے بچتے رہے ہوں جن کی حرمت اس وقت نازل ہو چکی تھی۔ نیز اُن اعمال صالحہ کو بھی بجا لاتے رہے ہوں جن کا امر اُس وقت نازل ہو چکا تھا تو پھر اُن کو شراب پینے کی وجہ سے کچھ گناہ نہیں ہوا۔

اب اس جگہ ایک سوال یہ ہوتا ہے کہ اس آیت میں تقویٰ اور ایمان کا ذکر تین مرتبہ ہوا ہے اس کا کیا مطلب ہے۔ جب اُن کو ایک بار مومن کہہ دیا گیا اور اُس کے بعد تقویٰ سے اُن کو موصوف کر دیا گیا تو پھر دوبارہ اٰمنوا اتقوا کے ذکر سے کیا مقصود ہے۔ یہ ایمان کے بعد ایمان لانا اور تقویٰ کے بعد پھر تقویٰ کرنا کیسا ہے۔ تکرار ایمان کا جواب تو یہ ہے کہ ایمان کے مختلف مراتب ہیں۔ ایک مرتبہ ایمان کا یہ ہے کہ شرک و کفر سے توبہ کرے۔ یہ درجہ تو ایمان کا وہ ہے جو صحت کے لئے شرط ہے کہ اس کے بغیر کوئی عمل صالح مقبول نہیں ہوتا۔ اور ایک مرتبہ ایمان کا وہ ہے جو اعمال صالحہ

سے پیدا ہوتا ہے یعنی اس کے دل میں پیوستہ اور جاگزیں ہو جانا اور اُس پر ثبات و استقامت حاصل ہو جانا۔ دوبارہ لفظ اٰمنوا میں اس درجہ کی طرف اشارہ ہے۔

حاصل یہ ہوا کہ ایک مرتبہ ایمان لا کر وہ اعمال صالحہ کرتے رہے اور محرمات سے بچتے رہے تو اس سے اُن کو ایمان پر مداومت و استقامت حاصل ہوئی۔ پھر اس کے بعد جیسے اعمال ہوتے ہیں ویسا ہی ایمان اُن سے پیدا ہوتا ہے مطلق مداومت وثبات علی الایمان کہ اعمال صالحہ کے ہمیشہ بجا لانے سے ہر شخص کو حاصل ہو جاتی ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ جس شخص کے اعمال ناقص ہیں اُن سے جو ایمان پیدا ہو گا وہ بھی ناقص ہو گا اور جس کے اعمال کامل ہیں اُن سے کامل ایمان پیدا ہو گا۔

تیسری مرتبہ ذکر ایمان سے اس درجہ کی طرف اشارہ ہے کہ بعد ثبات علی الایمان کے حسب اعمال اُن کو ایمان میں ترقی حاصل ہوتی رہتی ہے۔ اس کے بعد پھر ایمان کا ذکر نہیں فرمایا بلکہ احسان کا ذکر فرمایا جس کے معنی شریعت میں اخلاص کے ہیں اور یہ اعلیٰ درجہ ایمان کا ہے۔ اسی کو صدق سے بھی تعبیر کرتے ہیں اور صدیق بھی صاحب احسان ہی کو بولتے ہیں ـــــ مطلب یہ ہوا کہ اس کے بعد ترقیٔ اعمال سے درجہ احسان کا عطا ہوتا ہے اور یہی درجہ ایمان کا مطلوب ہے۔ اور جو شخص اس درجہ میں فائز ہوتا ہے، وہ خدا کا محبوب بن جاتا ہے۔ پھر اُس کو کچھ عذاب اور گناہ نہیں ہوتا۔ کیونکہ محبوب مطیع کو کوئی بھی عذاب نہیں دیا کرتا۔ یہ جواب تو تکرار ایمان

کے اشکال کا ہوا

تقویٰ کے درجات

اور اسی سے تکرارِ تقویٰ کا جواب بھی نکل آیا۔ وہ یہ کہ تقویٰ کے بھی مدارج مختلف ہیں۔ ایک تقویٰ تو یہ ہے کہ کفر و شرک سے بچے۔ دوسرا درجہ یہ ہے کہ اعمالِ صالحہ کو ترک نہ کرے اور محرمات کا ارتکاب نہ کرے۔ پھر جیسے جیسے اعمال ہوں گے ویسا ہی تقویٰ پیدا ہوتا رہے اور اس تقویٰ کے کمال سے ایمان بھی کامل ہوتا رہے گا حتیٰ کہ درجۂ احسان جو کہ ایمان کا اعلیٰ درجہ ہے، وہی تقویٰ کا بھی اعلیٰ درجہ ہے اور یہی درجہ مطلوب ہے۔ پس اس آیت سے تقویٰ کے مراتب کا چند در چند ہونا معلوم ہو گیا۔ اور صدق میں ایسے مدارج کی کوئی دلیل نہیں۔ اور آیت بر میں اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا دال ہے صدق کے خاص ہونے پر انتہائی درجہ کے ساتھ پس اس سے معلوم ہو گیا کہ صدق کے درجات مختلف نہیں بلکہ اُس کا ایک درجہ متعین ہے جس کو میں نے ابھی بتلایا ہے کہ احسان ہی کا دوسرا نام شریعت میں صدق و اخلاص ہے۔

جب یہ بات سمجھ میں آ گئی تو اب سمجھو کہ اگر حق تعالیٰ اس طرح فرماتے۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْدُقُوْا وَكُوْنُوْا مَعَ الْمُتَّقِيْنَ تو سامعین کے دل پر ایک پتھر سا رکھا جاتا۔ وہ یہ سمجھتے کہ ہم کو اوّل ہی دن میں کامل بن جانے کا حکم دیا گیا۔ حالانکہ شروع ہی سے کامل بننا دشوار ہے۔ اس لئے اوّل صدق کو بیان نہیں فرمایا بلکہ تقویٰ کا ذکر مقدم کیا کیونکہ اُس کے درجات مختلف ہیں۔ تو اس

سے یہ نہ سمجھا جائے گا کہ اوّل ہی دن میں کامل بننے کا حکم ہے بلکہ سامعین سمجھ لیں گے کہ تقویٰ کے درجات بہت ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تدریجاً یکے بعد دیگرے تقوے کے تمام درجات حاصل کرتے رہو یہاں تک کہ تم درجۂ صدق میں پہنچ کر صادقین اور کاملین کے ساتھ مل جاؤ گے۔ جس کا طریقہ یہ ہے کہ تم ظاہر میں اُن کی صحبت اختیار کرو پھر باطناً بھی اُن جیسے ہو جاؤ گے۔

درجات تقویٰ کا مختلف ہونا آیت فَاتَّقُوا اللّٰہَ مَا اسْتَطَعْتُمْ کے شانِ نزول سے بھی واضح ہو جاتا ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ اوّل فَاتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقَاتِہٖ کا نزول ہوا تھا۔ صحابہ اس سے ڈر گئے کیونکہ وہ یہ سمجھے کہ آج ہی سے حق تقویٰ لازم ہو گیا۔ حالانکہ شروع ہی سے حق تقویٰ کا حصول دشوار ہے۔

حق تقویٰ کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ جیسا تقویٰ خدا کی شان کے لائق ہے وہ اختیار کرو۔ اِتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقَاتِہٖ میں یہ مراد نہیں کیونکہ یہ تو بشر کی طاقت سے خارج ہے اور اُس کی تکلیف تکلیف مالایطاق ہے۔

دوسرے معنی یہ ہیں کہ انسان کی وسعت کے موافق جو تقویٰ خدا کی شان کے لائق ہے اُس کو بجا لاؤ۔ آیت میں یہی معنی مراد ہیں اور گو یہ تقویٰ طاقت سے خارج نہیں۔ کیونکہ اس کا مکلف کیا جانا دلیل ہے اس کے تحت الاختیار ہونے کی۔ لیکن ابتدا ہی سے انسان کا اس درجہ میں پہنچ جانا دشوار ضرور ہے گو ممتنع نہیں۔

صحابہ رضؓ کے خوف کا یہی سبب تھا۔ پس وہ اس لئے خائف

ہوئے کہ یہ درجہ گو اختیار سے باہر نہیں مگر عادۃً پہلے ہی دن اس کا حاصل ہو جانا دشوار ہے۔ اور وہ صیغہ امر فاتقوا اللہ سے یہ سمجھے کہ ہم کو اسی وقت اس درجہ کی تحصیل کا امر ہو رہا ہے نہ اس لئے کہ صیغہ امر فور کو مقتضی ہے بلکہ اس لئے کہ محاورات میں بسا اوقات امر فور کے لئے بھی مستعمل ہوتا ہے اور صحابہ کی نظر ہمیشہ اسی جانب جاتی تھی جس میں احتیاط ہو۔ اسی لئے انہوں نے امر فور پر معمول کیا۔

اگر یہ خطاب ہم لوگوں کو ہوتا تو ہم کو کچھ بھی اندیشہ نہ ہوتا کیونکہ ہم تاویل کر لیتے کہ امر فور کو مقتضی تھوڑا ہی ہے۔ پس حق التقوی کا امر اسی وقت دفعتہً نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ تدریجاً حاصل کرتے رہنا یہ مطلب صحابہ کے ذہن میں بھی ضرور آیا ہوگا مگر انہوں نے غایت خشیت واحتیاط کی وجہ سے اس کو فور پر محمول کیا کیونکہ احتمال تو یہ بھی تھا۔ چنانچہ محاورات میں کثرت سے امر کا استعمال فور کے لئے ہوتا ہے جس کا پتہ قرینہ مقام سے چل جاتا ہے۔

آپ اگر اپنے نوکر سے پانی مانگیں اور وہ اگلے دن لا کر پلا دے تو کیا آپ خفا نہ ہوں گے ضرور خفا ہوں گے اور اس کے جواب میں نوکر یہ نہیں کہہ سکتا کہ حضور نے تو اتنا فرمایا تھا کہ پانی لاؤ۔ یہ تو نہیں فرمایا تھا کہ ابھی لاؤ۔ کیونکہ قرینۂ مقام سے اس امر کا فور کے لئے ہونا متعین ہو چکا تھا۔ اور اسی طرح اکثر صیغۂ امر کا استعمال فور ہی میں ہوتا ہے گو کبھی عدم فور کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔

حکایت لطیفہ

اس پر مجھے ایک حکایت یاد آئی۔ ہمارے ہاں ایک حافظ صاحب تھے۔ جن کا لقب حافظ جنازہ تھا۔ وہ ایک گاؤں میں مسجد کے امام تھے۔ وہاں کوئی مر گیا تو لوگ اس کا جنازہ مسجد میں لائے اور حافظ جی سے کہا کہ اس کی نماز پڑھا دو تو آپ نے یہ عذر کیا کہ مجھے اس وقت ایک دعا میں شبہ ہے اُس کو یاد کر لوں پھر پڑھاؤں گا۔ لوگ جنازہ لے گئے اور کسی دوسرے سے نماز پڑھوا کر دفن کر دیا اگلے دن حافظ جنازہ صاحب نے گاؤں والوں سے کہا کہ بھائی مجھے اب دعا یاد ہو گئی ہے لاؤ اب جنازہ لے آؤ۔ لوگ ہنسنے لگے کہ سبحان اللہ! آپ کی دعا کے بھروسہ اب تک ہم اس کا اچار ڈالے رکھتے۔ ہم نے تو اُس کو دفن بھی کر دیا۔

تو دیکھئے فور و عدم فور میں فرق نہ کرنے سے لوگوں نے اُن کو بے وقوف بنایا۔ یہاں تک کہ اُن کا لقب ساری عمر کے لئے حافظ جنازہ ہی پڑ گیا۔ تو صحابہ نے اس آیت کو بمعنی فور سمجھا اور پھر یہ خوف پیدا ہوا کہ حق تقویٰ کا آج ہی حاصل کرنا تو بڑا دشوار ہے پھر اس حکم کی تعمیل کیوں کر ہو۔ اس پر دوسری آیت نازل ہوئی فاتقوا اللہ ما استطعتم یعنے یہ مطلب نہیں کہ حق تقویٰ آج ہی حاصل کر لو بلکہ مطلب یہ ہے کہ جتنا تقویٰ تم سے اس وقت ہو سکتا ہے اس وقت تو اُس کو اختیار کر لو پھر ترقی کرتے رہو یہاں تک کہ حق تقویٰ حاصل ہو جاوے۔

نسخ کے معنی

اس تقریر پر شاید طلبہ کو یہ اشکال ہو کہ تمہاری تقریر سے تو اِتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقَاتِہٖ کا بھی مامور بہ ہونا معلوم ہوتا ہے حالانکہ حدیث میں آتا ہے کہ اس کے بعد اِتَّقُوا اللّٰہَ مَا اسْتَطَعْتُمْ نازل ہوئی اور اس نے پہلی آیت اِتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقَاتِہٖ کو منسوخ کر دیا۔

سو طلباء کو سمجھ لینا چاہیے کہ سلف کی اصطلاح میں نسخ کے معنی یہاں تبدیل کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ وہ بیان تفسیر وغیرہ پر بھی نسخ کا اطلاق کر دیتے ہیں۔ قاضی ثناء اللہ صاحب نے تفسیر مظہری میں اس پر تنبیہ کی ہے۔ واقعی بہت لطیف بات ہے۔ خدا اُن کو جزاءِ خیر دے۔ پس حدیث میں جو اِتَّقُوا اللّٰہَ مَا اسْتَطَعْتُمْ کو ناسخ کہا گیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اس آیت نے پہلی آیت کی تفسیر کر دی بیان تفسیر کو نسخ سے تعبیر کر دیا گیا۔ ورنہ فاتقوا اللّٰہ حَقَّ تُقَاتِہٖ کے جو معنی میں نے بیان کئے ہیں وہ ہرگز قابل تبدیل و نسخ نہیں ہیں۔

اور ایک بات طلباء کو یہ بھی سمجھ لینی چاہیے کہ اِتَّقُوا اللّٰہَ مَا اسْتَطَعْتُمْ میں استطاعت باعتبار کمیت کے مراد نہیں۔ یعنی یہ مطلب نہیں کہ جتنے اعمال بجا لاسکو اور جتنے محرمات سے بچ سکو۔ بس اُنہی کے تم مکلف ہو۔ یہ معنی بالکل غلط ہیں کیونکہ تمام واجبات و فرائض کا بجالانا اور تمام محرمات سے بچنا ہر شخص پر ہر وقت واجب ہے اور سب لوگ اس وقت اُن کے مکلف ہیں اور اُن میں سے کوئی کام بھی استطاعت سے باہر نہیں۔ اس لئے کمیت کے اعتبار سے مَا اسْتَطَعْتُمْ کی قید کا لغو ہونا لازم آئے گا بلکہ یہ قید کیفیت

کے اعتبار سے ہے۔ یعنی اعمال شرعیہ میں جس کیفیت کا تقویٰ تم اس وقت حاصل کر سکو اس کو تو ابھی بجا لاؤ اور باقی کیفیات کے حصول کی کوشش کرتے رہو۔ پس اس سے تقویٰ کے درجات کا کیفیت کے اعتبار سے متفاوت ہونا معلوم ہوتا ہے نہ کمیت کے اعتبار سے خوب سمجھ لو۔

اب یہ بات بخوبی واضح ہو گئی کہ اس آیت میں صدق کا مؤخر کرنا اور تقویٰ کا مقدم کرنا ہی مناسب تھا کہ اس سے سامعین کی طبیعت پر بوجھ نہیں ہوا بلکہ ہمت بلند ہو گئی کہ ہم کو تدریجاً تقویٰ کے مراتب حاصل کر کے کمال تقویٰ تک پہنچنا چاہیے۔

بس اب میں بیان کو ختم کرتا ہوں۔ خلاصہ یہ ہوا کہ کمال دین حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ جس کا طریقہ یہ ہے کہ اعمال کو کامل کیا جائے۔ فرائض و واجبات کے بجا لانے میں کوتاہی نہ ہو۔ محرمات کا ارتکاب نہ ہو اور اعمال کے کامل کرنے میں جو نفس کی مزاحمت مانع ہوتی ہے اس کا علاج کاملین کی صحبت اختیار کرنا ہے ان کے پاس جانا چاہیے۔ اور جا نہ سکے تو ان سے خط و کتابت کا تعلق رکھا جائے جس میں فضول قصے نہ لکھیں بلکہ اپنے کو مریض اور ان کو طبیب سمجھ کر اپنے حالات سے ان کو اطلاع کرتے رہیں۔ پھر اس کے بعد جو کچھ وہ بتلا دیں اس پر عمل کریں اور ان کے احکام کا اتباع کریں۔ بس یہ راستہ ہے خدا تک پہنچنے کا۔ جس سے زیادہ آسان راستہ کوئی نہیں بتلا سکتا۔ مجلس ختم ہو چکی ہے۔ اب دعا کیجیے حق تعالیٰ شانہٗ ہم کو فہم سلیم اور عمل مستقیم عطا فرما دیں۔

آمین وَاٰخِرُ دَعْوٰىنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ
وَصَلَّی اللّٰہُ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ
اَجْمَعِیْنَ۔

ضرورۃ الاعتناء بالدین

ضرورت اہتمام دین کے متعلق یہ وعظ ۲۔ ذیقعدہ ۱۳۲۹ھ
کو مدرسہ احیاء العلوم الہ آباد میں قریباً ۱۰۰۰ کے مجمع میں
ہوا جو بیٹھ کر بیان فرمایا اور قریباً اڑھائی گھنٹوں میں
ختم ہوا۔ اسے مولانا سعید احمد صاحب تھانوی نے
قلمبند فرمایا

اس وقت مسلمانوں میں ایک بہت بڑا مرض پیدا ہو گیا ہے یعنی قلّتِ اہتمامِ دین۔ یہ وہ مرض ہے کہ اس کی بدولت آج ہم مسلمان کہلانے کے قابل نہیں رہے اور اس کی بدولت اکثر حصّہ دین کا ہم سے نکل گیا ہے۔ نہ عقائد کی پروا نہ اعمال کی فکر نہ حسنِ معاشرت کا خیال، نہ بداخلاقی پر رنج۔ اب آپ خود ہی خیال کریں کہ ہماری حالت اسلام کے کس قدر قریب ہے اور اس کے کتنی مناسب!

خطبہ ماثورہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الحمد للہ نحمدہٗ ونستعینہٗ ونستغفرہٗ ونومن
بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا و
من سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہٗ
ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا اللہ
وحدہٗ لاشریک لہ ونشھد ان سیّدنا ومولانا
محمدًا عبدہٗ ورسولہ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ
اٰلہ واصحابہ وبارک وسلم امابعد فاعوذ باللّٰہ من
الشیطان الرجیم ۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم ۔
ربنا وابعث فیھم رسولًا منھم یتلوا علیھم اٰیاتک و
یعلمھم الکتاب والحکمۃ ویزکیھم انک انت العزیز الحکیمؕ

اصلی نفع دینی نفع ہے

یہ ایک آیت ہے جس کے نظائر قرآن میں اور بھی ہیں یعنے دوسرے مقامات پر بھی یہ مضمون قرآن میں آیا ہے۔ اس مقام پر یہ مضمون حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام سے منقول ہے کہ بنائے کعبہ کے وقت جو دعائیں ان دونوں صاحبوں نے کی ہیں، اُن میں ایک دُعا یہ بھی ہے کہ جس کا نفع اُن کی اولاد کو پہنچا۔ ان حضرات نے اوّل اپنے لئے دُعا کی۔ اس کے بعد اپنی اولاد کے لئے دُعا کی۔ منجملہ دُعا للاولاد کے یہ بھی ہے۔

حاصل اس دُعا کا یہ ہے کہ حضرت ابراہیم وحضرت اسمٰعیل علیہما السلام نے اپنی اولاد کو ایک دینی نفع پہنچایا۔ اس دُعا کے طرز سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ امر اصلی قابلِ التفات نفع دینی ہے اور نفع دنیوی اس کے تابع اور اس کے ساتھ ملحق۔ ہم کو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے سبق لینا چاہئے کہ انہوں نے جہاں اپنی اولاد

کے لئے نفع دنیاوی کی دُعا کی کہ

وَارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرَاتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ۔

وہاں اس دینی نفع کی بھی دُعا کی کہ رَبَّنَا وَابْعَثْ ـــــ الخ تو نفع دنیوی کے لئے دُعا کرنے سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی ضروری ہے اور ظاہر بھی ہے کہ اگر دنیا کا نفع نہ ہو تو دنیا میں بہت کم طبیعتیں ایسی ہیں کہ وہ خدا تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوں۔ پس اپنے رزق کی وسعت کے ساتھ اپنی صحت کے لئے بھی خدا تعالیٰ سے دُعا کرنی چاہئے۔

ـــــ اور یہی وجہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ایک صحابی کو دیکھا کہ بہت لاغر ہو رہے ہیں تو حضورؐ نے دریافت فرمایا کہ تم نے کچھ دُعا تو نہیں کر لی۔ کہنے لگے کہ ہاں دُعا تو کی تھی۔ آپؐ نے فرمایا کیا دُعا کی تھی۔ کہنے لگے کہ یہ دُعا کی تھی کہ جو کچھ عذاب ہونا ہو دنیا ہی میں ہو جاوے۔ آپؐ نے اُن کو متنبہ فرمایا۔ تو یہ غلطی کی بات ہے کیونکہ انسان ضعیف ہے اور احتیاج اُس کے خمیر میں ہے۔

ایک شخص میرے پاس آئے اور کہا کہ میرے لئے دس روپے کا انتظام کر دیجئے کیونکہ مجھے سخت ضرورت ہے۔ اس کے بعد ادھر اُدھر کا تذکرہ کر کے لگے فقیری کا دم بھرنے۔ کہنے لگے کہ جنت کی کیا پروا ہے اور دوزخ کا کیا ڈر ہے۔ میں نے کہا میاں بیٹھو تم سے دس روپے سے تو صبر ہو نہیں سکا جنت سے کیا صبر کر سکو گے۔ اگر ایسے مستغنی تھے تو دس روپے ہی سے صبر کر لیا ہوتا۔

تو واقعی ایسا انسان محتاج ہے کہ دنیا اور آخرت دونوں کی

اس کو ضرورت ہے اور آخرت کا دنیا سے زیادہ محتاج ہے اسی لئے ابراہیم علیہ السلام نے جیسے دنیا کے لئے دعا کی ایسے ہی آخرت کے لئے بھی دعا کی۔ تو گویا ہم کو سبق سکھلاتے ہیں۔

اور اولاد عام ہے۔ خواہ اولاد حقیقی ہو یا مذہبی۔ بلکہ اولاد حقیقی بھی جب ہی اولاد ہوتی ہے کہ اتباع کرے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔ مَنْ سَلَكَ طَرِيقِي فَهُوَ آلِي۔ گو بعض لوگوں نے مَنْ سَلَكَ طَرِيقِي کو عام لیا ہے کہ جو شخص بھی متبع ہو وہ آل میں داخل ہے خواہ نسبتاً آل ہو یا نہ ہو۔ مگر میرے خیال میں اتنا عام نہیں ہے بلکہ صرف آل کو عام ہے۔ پس مطلب یہ ہے کہ اولاد نسبتی میں معتدبہ آل وہ ہے کہ اتباع کرے۔ یعنی شرف تو صرف اولاد ہونے سے بھی ہوگا لیکن پورا شرف اسی وقت ہوگا کہ جب اتباع ہو۔ تو مَنْ سَلَكَ آل ہی کے لئے ہے مگر آل ہی میں ایک قید معتبر ہے کہ معتدبہ درجہ میں شرف اسی وقت ہوگا۔ بہر حال انبیاء کی اولاد بھی وہی مقبول ہے کہ جو متابعت رکھتی ہو۔ ورنہ ایسا ہے جیسے غلط لکھا ہوا قرآن کہ اس کا نہ ادب ہے نہ بے ادبی۔ ادب تو اس لئے نہیں کہ وہ صحیح قرآن نہیں ہے اور بے ادبی اس لئے نہیں کی جائے گی کہ کچھ تو قرآن کے اجزاء ہیں ——— تو انبیاء کی زیادہ نظر اس پر ہے کہ دین کا نفع ہو۔ اور آل ہو تو ایسی ہو کہ وہ ان کے قدم بقدم چلے تو ابراہیم علیہ السلام نے اپنی ذریۃ کے لئے یہ دعا کی اور اس سے گویا ہم کو یہ سبق سکھلایا کہ اپنی اولاد کے لئے دنیا سے زیادہ اہتمام دین کا کرنا چاہیے۔

اولاد کی دینی تربیت

اب ہم کو سبق لینا چاہیئے اور دیکھنا چاہیئے کہ ہم کہاں تک اپنی اولاد کے حق میں ابراہیم علیہ السلام کے طریقے پر چلتے ہیں میں یہ نہیں کہتا کہ لوگ اپنی اولاد کے حقوق ادا نہیں کرتے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ زیادہ توجہ محض دنیا پر ہے۔ اس کی زیادہ کوشش ہوتی ہے کہ اولاد چار پیسے کمانے کے قابل ہو جاوے۔ اور جب اس قابل بنا دیتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ ہم ان کے حقوق واجبہ ادا کر چکے۔ آگے اپنی اصلاح یہ خود کر لیں گے۔ اور وجہ اس کی زیادہ تر یہ ہے کہ لوگوں کے دلوں سے دین کی وقعت بالکل نکل گئی ہے۔ اس لیئے ہمہ تن دنیا پر جھک پڑے ہیں۔

اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دنیا کی ضرورتوں کی خبر نہ تھی اس لیئے اُن کو دنیا کی طرف توجہ نہیں ہوئی تو عقل اور نقل دونوں اس شبہ کی تکذیب کر رہے ہیں۔ نقل تو یہی سابق دُعا جو اپنی اولاد کے لیئے انہوں نے فرمائی وَارْزُقْ اَھْلَہٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ اور عقل اس لیئے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام حق سبحانہٗ وتعالیٰ کے نائب ہیں اور جیسے حق سبحانہٗ وتعالیٰ معاش اور معاد دونوں کی تربیت فرماتے ہیں حق سبحانہٗ وتعالیٰ کے نائب بھی دونوں کی تربیت فرماتے ہیں کیونکہ ان حضرات کو اصلاح کے لیئے بھیجا جاتا ہے۔

معاش اور معاد کی اصلاح

اصلاح اُس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ معاش اور معاد دونوں کی اصلاح نہ کی جاوے۔ نیز تاریخ اور انبیاء علیہ السلام کی تعلیم میں

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء کو عقلِ معاش بھی کامل ہوتی ہے مگر لوگ اس میں غلطی کرتے ہیں۔ عقلِ معاش ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ نوکریوں اور صنعتوں کے طریقے تبلا دیں۔ لوگ یہی سمجھ کر بزرگوں پر اعتراض کرتے ہیں کہ یہ لوگ دنیا سے بے خبر ہیں باوجودیکہ دنیا کی ضرورت یقینی ہے مگر یہ ادھر متوجہ نہیں ہوتے۔ صاحبو! یہ تو تسلیم کرتے ہیں کہ دنیا کی ضرورت ہے لیکن اوّل یہ غور کیجئے کہ ضرورت کس کو کہتے ہیں۔ دوسرے معاش کے طریقے تبلانا اور اس پر ترغیب دینا یہ علماء کا کام نہیں ہے۔

دیکھو! حکیم عبدالعزیز اور حکیم عبدالمجید اپنے فن کے ماہر تھے اور اُن کا کام یہ تھا کہ وہ امراض کی تشخیص کریں۔ اب فرض کرو کہ ایک مریض اُن کے پاس آیا۔ حکیم صاحب نے نبض دیکھ کر تپ دق تجویز کی اور اس کے لئے نسخہ لکھ دیا۔ جب وہ نسخہ لے کر چلا تو رستے میں ایک موچی ملا اور اس مریض کی کیفیت دریافت کی۔ اس نے کہا کہ حکیم صاحب نے تپ کہنہ تجویز کیا ہے۔ کہنے لگا کہ حکیم صاحب نے جوتے کے متعلق کچھ کہا۔ اس نے کہا کہ جوتے کے متعلق تو کچھ نہیں کہا کہنے لگا کہ وہ حکیم نہیں ہیں۔ اُن کو اتنی ضرورت کی تو اطلاع نہیں۔ یہ نہ دیکھا کہ ایک شخص جوتے لئے بیٹھا ہے اور یہ ننگے پیر ہے۔ آخر اس کو جوتا پہننا چاہیئے یا نہیں۔

اب میں پوچھتا ہوں کہ اس موچی کی نسبت آپ کیا فتویٰ دیں گے۔ کیا اُس کو عقلاء میں شمار کیا جاوے گا ــــ ہرگز نہیں۔ بلکہ پاگل کہا جاوے گا اور کہا جاوے گا کہ اس نے طبابت کی حقیقت کو نہیں

سمجھا اور اس کے فرائضِ منصبی پر اُس کو اطلاع نہیں البتہ حکیم پر اُس وقت الزام تھا کہ وہ نسخے کے اندر بلا وجہ یہ کہہ دیتے کہ جُوتا نہ پہننا اور جب کہ وہ اس سے سکوت کرتے ہیں تو اُن پر کوئی الزام نہیں۔ وہ اپنے فرضِ منصبی کو ادا کر چکے۔

تو علماء پر دنیا کی ترغیب نہ دینے کا الزام اس وقت ہو سکتا تھا کہ جب اُن کا فرضِ منصبی ترغیب دینا ہوتا یا وہ دنیا حاصل کرنے اور اُدھر متوجہ ہونے سے روکتے۔ اور اگر کہیے کہ علماء تو روکتے ہیں تو میں کہوں گا کہ یہ روکنا بلا وجہ نہیں۔ اس روکنے کی ایسی مثال ہے کہ جیسے حکیم عبد المجید کسی کو دیکھیں کہ اُس نے اس طرح جوتی سلوائی کہ ٹانکے کھال کے اندر سے نکالے گئے ہیں تو وہ اس طرح سے جُوتا سلوانے کو ضرور روکیں گے کہ زخم کی سمیت تمام بدن میں دوڑ جانے کا احتمال ہے۔ آپ لوگ بھی دنیا کی جوتیاں اس طرح سلوا رہے ہیں کہ آپ کا دین برباد ہو رہا ہے۔ لہٰذا اب اُن پر فرض ہے کہ وہ آپ کو منع کریں۔ تو یہ منع کرنا بے وجہ نہ ہوا ؎

اگر بینم کہ نابینا و چاہ ست
اگر خاموش بنشینم گنا ہست

غرض علماء کی نسبت یہ تجویز کرنا کہ وہ دنیا کی ترغیب دیں، غلط ہے اور منبع اس کا یہ ہے کہ سلف کو اپنی طرح معاش و معاد کا جامع سمجھا جاتا ہے حالانکہ یہ غلط ہے۔ بتلایئے کسی نبیؑ نے کسی ریفارمر نے کہیں دنیا کے حاصل کرنے کے طریقے لکھے ہیں؟ ایک جگہ بھی نہیں البتہ اخلاق اعمال معاشرت پر گفتگو کی ہے۔ یہ کسی نے نہیں بتلایا

کر یوں ہل چلتا ہے اور اس طرح بو یا جاتا ہے۔ انبیاء اور سلف کا یہ کام نہ تھا۔ ہاں معاش کا وہ حصّہ جو مضر معاد ہو اُس کو بتلا کر منع فرما دیا ہے اور اُس میں گفتگو کرنا ایسا ہے جیسے طبیب کسی مریض کو گوشت کھانے سے منع کرے۔ تو حکیم کا کام بحالتِ ضرر منع کرنے کا تو ہے لیکن گوشت کے پکانے کا طریقہ بتلانا یہ حکیم کا کام نہیں۔ پس معاش کے متعلق انبیاء کی جو گفتگو ہے وہ یہ ہے کہ نافع کو مجملاً بتلا دیا اور مضر کو منع کر دیا۔ غرض انبیاء علیہ السلام نے اپنی اولاد کے لئے اس کی رعایت کی ہے کہ دینی نفع اُن کو زیادہ پہنچے اور دنیاوی نفع کے واسطے جو رعایت رکھی ہے اُس سے اُن حضرات کا مذاق معلوم ہوتا ہے۔

قلتِ اہتمامِ دین

ابراہیم علیہ السلام فرماتے ہیں مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ۔ اے اللہ! میرے اہلِ بلد کو ثمرات دے۔ مگر سب کو نہیں بلکہ اہلِ ایمان کو۔ تو فرمانبردار اولاد کے لئے دعا کی۔ اس سے اندازہ کیجیے کہ اُن کی نظر میں دین کس قدر عزیز ہے کہ باغی کے لئے دُعا بھی گوارا نہیں۔ اگرچہ خدا تعالیٰ نے تخصیص نہیں فرمائی بلکہ یہ فرمایا کہ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا۔ یعنی کچھ دنوں کے لئے دنیا میں کفار کو بھی عیش دوں گا تو اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کو عام فرمایا مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بوجہ کفار کے باغی ہونے کے اُن کے لئے دُعا نہیں فرمائی۔ اس سے حضرات انبیاء علیہم السلام کے مذاق کا پتہ چلتا ہے یہی اہل اللہ کا ذوق ہے اور ہونا چاہیئے کہ باغیوں پر کچھ رحم نہ کریں نہ اُن کے لئے دعا کریں۔ اور خدا تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام

کا قول نقل فرما کر چونکہ کفار کے لئے دعا کرنے کا حکم نہیں فرمایا اس سے معلوم ہوا کہ وہ ذوق مقبول ہے۔ تو یہی مذاق ہونا چاہئے کہ مطیعین کے لئے دُعا کریں اور باغیوں کو خدا کے سپرد کریں۔ خیر یہ جملہ معترضہ تھا۔

مقصود یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے جو دُعا کی ہے اُس کا مضمون قابلِ غور ہے اور اس وقت اس کا بیان کرنا مناسب معلوم ہوا۔ چونکہ ہم میں اس وقت ایک بہت بڑا مرض ہے کہ بحیثیت مسلمان ہونے کے وہی اصلی مرض پیدا ہو گیا ہے یعنی قلتِ اہتمام دین۔ اور یہ وہ مرض ہے کہ اس کی بدولت آج ہم مسلمان کہلانے کے قابل نہیں رہے۔ اس کی بدولت اکثر حصہ دین کا ہم سے نکل گیا۔ دیکھو مالدار وہ شخص کہلاتا ہے جس کے پاس کافی سے بھی کچھ زیادہ مال ہو اور جس کے پاس دو چار پیسے ہوں وہ مالدار نہیں کہلاتا، ورنہ چاہیے کہ ساری دنیا مالدار کہلانے لگے۔ حالانکہ ایسا نہیں بلکہ دو قسمیں کہی جاتی ہیں ایک غریب ایک امیر۔ تو جیسے مالدار وہ شخص ہے جس کے پاس وافر روپیہ ہو، اسی طرح ایماندار بھی وہی ہے جو عقائد اور اعمال وغیرہ میں پوری طرح شریعت کا متبع ہو۔ اور یہ ایمان کچھ ایمان نہیں ہے جس کو اکثر لوگوں نے

مَنْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ

سے سمجھ رکھا ہے۔ اگرچہ یہ کلمہ واقع میں صحیح ہے لیکن اس وقت اس کو پیش کر کے جو مقصود ثابت کیا جاتا ہے اُس کے اعتبار سے کلمۃ حق ارید بہ الباطل کہا جا سکتا ہے۔ تو پہلی غلطی تو یہ ہے کہ اعمال

کو نا قابل شمار سمجھتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ خود ایمان کے کلمہ میں بھی اختصار کیا ہے یعنی اکثر لوگوں کا یہ خیال ہے کہ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کہنے کی بھی ضرورت نہیں (نَعُوْذُ بِاللّٰہِ) میں نے خود یہ تقریریں چھپی ہوئی دیکھی ہیں کہ رسالت پر ایمان لانے کی ضرورت نہیں ہے اور اس حدیث سے استدلال کیا ہے۔

مجھ سے ایک سفر میں اس کے متعلق ایک صاحب نے دریافت کیا کہ وہ بھی اس مرض میں مبتلا تھے۔ میں نے کہا آپ یہ بتلایئے اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میں یٰسین پڑھتا ہوں تو اس یٰسین پڑھنے کے کیا معنی ہیں۔ آیا یہ کہ صرف یہ کلمہ پڑھتا ہوں یٰسین یٰسین یا یہ کہ ساری سورت پڑھتا ہوں۔ کہنے لگے کہ یٰسین پڑھنے کے معنی تو ساری سورۃ پڑھنے کے ہیں۔ میں نے کہا کہ اسی طرح لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ پڑھنے کے معنی سارا کلمہ پڑھنے کے ہیں۔ دلالت کے لئے صرف ایک جز کا اطلاق کافی ہے۔ دوسرے جز پر بوجہ ملازمت خود دلالت ہو جائے گی۔

ان لوگوں کے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ پڑھنے کے معنی سمجھنے پر مجھے ایک واقعہ یاد آیا۔ ریاست رام پور سے ایک طالب علم نے میرے پاس خط بھیجا کہ مجھ کو فلاں تردّد ہے۔ اس کے لئے کوئی دُعا بتلا دیجئے۔ میں نے لکھا کہ لاحول پڑھا کرو۔ چند روز کے بعد وہ مجھ سے ملے اور پھر شکایت کی۔ میں نے پوچھا اس سے قبل میں نے کیا بتلایا تھا۔ کہنے لگے کہ لاحول پڑھنے کو بتلایا تھا سو میں پڑھتا ہوں اتفاقاً میں نے یہ سوال کیا کہ کس طرح پڑھا کرتے ہو۔ کہنے لگا یوں کہا کرتا ہوں۔ لاحول لاحول لاحول وہلم جرا۔

تو جیسے یہ بزرگ لاحول پڑھنے کے یہ معنی سمجھے کہ صرف لفظ لاحول کو پڑھ لیا جائے حالانکہ لاحول اس پورے کلمہ کا لقب ہے اسی طرح ان لوگوں نے بھی لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ سے صرف یہی جملہ سمجھا حالانکہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ سے وہی مراد ہے جس کے ساتھ محمد رسول اللہ بھی ہو۔ لہٰذا اس سے استدلال نہیں ہو سکتا۔ نیز دوسرے دلائل پر بھی تو نظر ہونی چاہیے۔ مشکوٰۃ میں کتاب الایمان کی پہلی حدیث میں ہے شَہَادَۃُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ۔ تو اس انہماک فی الدنیا کے سبب سے اس قسم کی غلطیاں کر رہے ہیں۔ پس اس کا علاج یہ ہے کہ دین کی طرف توجہ کریں اور علوم دینیہ حاصل کریں۔

انکارِ رسالت کا نتیجہ

اسی خیال کے ایک اور صاحب مجھے ملے۔ کہنے لگے کہ رسالت کے اقرار کی ضرورت نہیں ہے صرف توحید کا اقرار نجات کے لئے کافی ہے۔ میں نے کہا اوّل تو دلائل عقلیہ و نقلیہ جو رسالت کے ضروری ہونے پر قائم ہیں وہ تمہاری مکذب ہیں۔ دوسرے رسالت کا انکار کرنے سے خدا تعالیٰ کی خدائی کا بھی انکار ہو جاتا ہے اس واسطے کہ خدا تعالیٰ کے ماننے کے یہ معنی نہیں کہ ان کو صرف موجود مان لیں بلکہ معنی یہ ہیں کہ ان کو کمالِ ذات و صفات میں یکتا سمجھے کیونکہ یہ مسئلہ اجماعیہ ہے کہ اگر ذات کا قائل ہو لیکن صفات کا قائل نہ ہو تو وہ کافر ہے۔ اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے کوئی شخص بادشاہ کو بادشاہ تو مانے لیکن اس کے اختیاراتِ شاہی نہ مانے تو کیا ایسے شخص کی نسبت یہ کہا جاوے گا کہ اس نے بادشاہ کو مانا ـــــ کبھی نہیں۔ تو

خدا تعالیٰ کے ماننے اور توحید کے مقرر ہونے کے معنی یہ ہیں کہ ہر صفت کمال کے ساتھ علیٰ وجہ الکمال اتصاف سمجھے۔ کہنے لگے کہ بے شک یہ تو ضروری ہے۔ میں نے کہا کہ صفاتِ کمال میں سے ایک صفت صدق بھی ہے اس کے ساتھ بھی متصف ماننا ضروری ہوگا۔ کہنے لگے کہاں ضروری ہوگا۔ میں نے کہا کہ قرآن شریف میں موجود ہے مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ ط پس اس کا ماننا ضروری ہوا اور جو اس کو نہ مانے گا وہ موحد بھی نہ ہوگا کیونکہ اس نے خدا تعالیٰ کے صدق کو نہ مانا جس کا ماننا ضروری تھا۔ اور میں نے کہا کہ دس برس کی مہلت جواب کے لئے دیتا ہوں۔ یہ تو عقائد میں اختصار تھا جس کی مثالیں آپ نے سن لیں۔

اعمال میں اختصار کا اثر

اسی طرح اعمال میں بھی اختصار کر لیا ہے کہ بعض تو اعمال کی فرضیت ہی کے منکر ہو گئے اور بعض منکر تو نہیں مگر عملاً مثل منکرین کے ہیں تو ان دونوں قسم کے لوگوں کی غلطی قرآن کی آیات سے ثابت ہوتی ہے۔

رہا مَنْ قَالَ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ دَخَلَ الْجَنَّۃَ۔ سو اس کے معنے کے لئے ایک مثال عرض کیا کرتا ہوں کہ اگر کوئی شخص کسی سے نکاح کرے تو نکاح میں محض ایجاب و قبول دو لفظ ہوتے ہیں۔ پس اگر اس ایجاب و قبول کے بعد بیوی اپنے خورونوش کے لئے طلب کرے اور شوہر کہے کہ میں نے ان چیزوں کا دینا قبول نہیں کیا تھا، تو وہ اس کا کیا جواب دے گی۔ ظاہر ہے کہ یہی جواب دے گی کہ اگرچہ

تم نے ہر ہر چیز کو علیحدہ علیحدہ قبول نہیں کیا لیکن میرا قبول کرنا ان سب چیزوں کا قبول کرنا ہے۔

اب میں ان معترضین سے پوچھتا ہوں اگر آپ بھی اس مجلس گفتگو میں موجود ہوں تو کیا کہیں گے؟ یہی کہیں گے کہ یہ ایک قبول ہی سب کا قائم مقام ہے۔ تو جب لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کہہ لیا تو سارے عقائد اور اعمال کا ذمہ لے لیا۔ تو اس حدیث کا یہ مدلول ہے۔ اب چاہے ایمان کا جزو اعمال کہا جائے یا اس سے خارج مگر لازم لیکن ایمان میں اختصار سخت غلطی ہے۔ ایمان جب ہی کہلائے گا کہ جب اس کی شان پائی جائے۔

ہم لوگ مسلم کہلاتے ہیں مگر غور کرنے کے قابل یہ ہے کہ ہماری حالت اسلام سے کس قدر قریب ہے اور اس کے کتنی مناسب ہے جیسے میں نے مثال دی ہے کہ مالدار اسی کو کہتے ہیں جس کے پاس ہر قسم کا سامان ضرورت سے زیادہ ہو۔ یہی حالت اسلام کی ہے تو ہم کو اپنی حالت دیکھنی چاہیے کہ کس قدر بے اعتنائی ہو گئی ہے کہ نہ عقائد کی پروا، نہ اعمال کی فکر۔ نہ حسن معاشرت کا خیال، نہ بداخلاقی پر رنج۔

یہ حالتِ موجودہ دیکھ کر اس وقت یہ آیت تلاوت کی گئی ہے اور میں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اس کو نقل کیا تا کہ یہ معلوم ہو جائے کہ یہ مدت سے تجویز شدہ بھی ہے۔ اگرچہ اس کی ضرورت نہ تھی لیکن اس وقت مذاق کچھ ایسا بدل گیا ہے کہ اپنی شریعت میں خواہ کسی امر کی کتنی بھی تحسین کی گئی ہو لیکن اس وقت تک اس کو

نہیں مانا جاتا جب تک کہ گذشتہ تاریخ میں بھی اُس کی کوئی نظیر نہ ہو۔ اس لئے میں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قول نقل کر دیا سو دیکھ لیجئے کہ دعائے ابراہیمی میں کن کن اجزائے ایمان کو ضروری کہا گیا ہے۔

دعائے ابراہیمی کی شرح

فرماتے ہیں کہ اے اللہ! ہماری اولاد میں ایک رسول بھیجئے جن کی یہ صفت ہو کہ ان لوگوں کو آپ کے احکام سنا دیں اور یہ شان ہو کہ ان کو کتاب اور حکمت تعلیم کریں اور ان کا تزکیہ کریں رذائل سے۔ بے شک آپ قادر ہیں اور حکیم ہیں کہ موافق حکمت کے کرتے ہیں اور ایسا کرنا مصلحت ہے تو آپ اس کو ضرور قبول فرمائیں گے اس آیت کے ترجمے سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ رسول کی تین صفتیں اس آیت میں بیان کی گئی ہیں۔ اور ان رسول سے مراد ہمارے حضور انور صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم ہیں۔ اس لئے کہ داعی حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیل ہیں۔ لہٰذا ضرور ہے کہ یہ رسول ان دونوں حضرات کی اولاد میں ہونا چاہیئے۔ اور ہر چند کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں حضور صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کے علاوہ بھی متعدد انبیاء ہوئے مگر وہ بسلسلۂ حضرت اسحاق علیہ السلام کے ہوئے ہیں۔ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے سلسلے میں صرف ہمارے حضور صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم ہی ہیں۔ لہٰذا آپؐ ہی مراد ہوئے۔

دُعا کے درمیان میں بعثتِ رسول کی دُعا کرنا ایک بڑی رحمتِ کاملہ کا مانگنا ہے۔ ورنہ یہ بھی ممکن تھا کہ یوں کہتے، ان کو پاک کیجئے

اور ان کو کتاب دیجیئے اور ان کو قبول کیجیئے لیکن تعلیم بواسطۂ وحی اس تعلیم سے افضل ہے جو کہ بلا واسطۂ وحی کے بذریعہ الہام کے ہو اگر بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم بلا واسطہ زیادہ قرب کا ذریعہ ہے اور اسی وجہ سے اکثر عوام اور بعض خواص کی بھی رائے قائم ہو گئی ہے اور یہاں تک اس کا اثر ہوا ہے کہ انبیاء کی تعلیم کی وہ قدر نہیں کی جاتی جس قدر کسی بزرگ کی تعلیم کی قدر ہوتی ہے۔

میرے اُستاد مولانا فتح محمد صاحبؒ کے پاس ایک شخص آیا اور اپنی عسرت اور قرض کو بیان کیا اور کہا کہ کوئی دعا بتلا دیجیئے کہ قرض ادا ہو جائے۔ مولانا نے فرمایا کہ یہ پڑھا کرو۔

اَللّٰهُمَّ اكْفِنِىْ بِحَلَالِكَ عَنْ حَرَامِكَ وَاَغْنِنِىْ بِفَضْلِكَ عَمَّنْ سِوَاكَ۔

اور اس کے ساتھ یہ بھی فرما دیا کہ یہ حدیث میں وارد ہوئی ہے حدیث کا نام سن کر اُس شخص کی یہ کیفیت ہوئی کہ جیسے سرد پڑ گیا اور کہنے لگا کہ حدیث میں تو بہت سی دعائیں ہیں آپ اپنے پاس سے کوئی چیز بتلائیے جو سینہ بسینہ چلی آتی ہو۔ یہ فاسقانہ کلمہ سُن کر مولانا کو بہت ہی غصہ آیا اور آپ نے فرمایا کہ تو حضورؐ کی تعلیم پر دوسروں کی تعلیم کو ترجیح دیتا ہے۔

تو یہ اُسی خیال کا اثر ہے جس کے باعث حضورؐ کی تعلیم پر کفایت نہ ہوئی۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ جاہل عابد جس شوق سے وظیفہ یا نفلیں پیر کی بتلائی ہوئی پڑھتے ہیں، قرآن شریف اور پانچ وقت کی نماز اس شوق سے نہیں پڑھتے۔ ایک شخص نے مجھ سے فخراً کہا۔ اگرچہ کسی

وقت کی نماز قضا ہو جائے لیکن پیر کا بتلایا ہوا وظیفہ کبھی قضا نہیں ہوتا
اس کے معنی یہ ہیں کہ حضورؐ سے اس قدر تعلق نہیں ہے جس قدر کہ
پیر سے ہے۔ اگرچہ یہ ضرور ہے کہ اگر پیر سے تعلق نہ ہو تو حضورؐ سے
بھی کم تعلق ہوگا۔ لیکن یہ تو نہیں ہو سکتا کہ حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم
کے تعلق سے بھی بڑھ جائے۔ ع

گر فرقِ مراتب نہ کنی زندیقی

افضل تعلیم

غرض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ الہام بلا واسطہ ہے اور وحی بواسطہ
ہے تو جس میں واسطہ کم ہوگا اس میں زیادہ قرب ہوگا۔ مگر شیخ اکبر نے
لکھا ہے کہ تعلیم بواسطہ تعلیم بلا واسطہ سے زیادہ افضل ہے۔ وجہ
یہ ہے کہ یہ دیکھنا چاہیے کہ تعلیم بواسطہ میں واسطہ کس کا ہے اگر واسطہ
کسی معمولی شخص کا ہو تو بے شک بلا واسطہ تعلیم افضل ہے لیکن جب کہ
حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا واسطہ ہے تو اتنے بڑے واسطہ کے
ذریعے سے جو تعلیم ہوگی وہ افضل ہوگی۔

راز اس میں یہ ہے کہ جو علم بلا واسطہ وحی کے ہے اس میں
غلطی کا احتمال بوجہ نقصان استعداد کے زیادہ ہے اور بواسطہ وحی
تعلیم میں غلطی کا احتمال نہیں ہے۔ رہا حضورؐ سے ہم تک پہنچنے کا واسطہ
سو اُن میں چونکہ ثقات ہیں اُن میں غلطی کا احتمال نہیں ہے ایک تو یہ
تفاوت ہے۔

دوسرے ایک لطیف تفاوت ہے وہ یہ کہ حضور صلے اللہ
علیہ وآلہ وسلم کو خدا تعالیٰ نے رحمت بنا کر بھیجا ہے تو جو تعلیم حضورؐ

کے واسطہ سے ہو گی۔ اُس میں ابتلاء کا احتمال نہیں ہو گا۔ برخلاف بلا واسطہ کے کہ اُس میں احتمال ابتلاء کا ہوتا ہے۔

ایک شخص نے خواب میں دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُس کو فرما رہے ہیں کہ شراب پی۔ اُس نے علماء سے کہا۔ اُنہوں نے کہا کہ شراب حرام ہے تجھ کو خواب پورا یاد نہیں رہا۔ میں کہتا ہوں کہ ممکن ہے کہ شراب سے مراد محبت الٰہی ہو۔ تو دیکھئے چونکہ بلا واسطہ یہ تعلیم تھی اُس میں ابتلاء ہوا کہ دیکھئے یہ سمجھتا ہے یا نہیں۔ اور حضورؐ کے ذریعہ سے جو علوم ہوتے ہیں اُن میں یہ بات نہیں ہوتی۔

یہی وجہ ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جو شخص خواب میں دیکھے تو اُس میں یہ احتمال نہیں ہو سکتا کہ یہ شیطان ہو گا۔ کیونکہ آپؐ کی شان محض ہدایت کی ہے۔ لہٰذا اُس میں یہ اختلاط نہیں ہو سکتا۔ بزرگوں نے لکھا ہے کہ شیطان خواب میں آکر یہ کہہ سکتا ہے کہ میں خدا ہوں لیکن یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں نبی ہوں۔ وجہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ حکمتِ ابتلاءؑ کے لئے صفتِ مضل کے ساتھ بھی متصف ہیں۔ دوسرے اوّل صورت میں تنبیہ ہو جانا ممکن ہے کیونکہ خدا تعالیٰ منزّہ ہے اور جس کو خواب میں دیکھا منزّہ نہیں اور دوسرے میں ممکن نہ تھا۔ اس لئے آپؐ کے واسطے کو تمام خطرات سے محفوظ رکھا۔ تو معلوم ہوا کہ حضورؐ کا واسطہ ایک بڑی نعمت ہے۔

لہٰذا ابراہیم علیہ السلام نے بجائے کتاب وغیرہ براہ راست مانگنے کے حضورؐ کو واسطہ قرار دیا۔ نیز اس میں ایک حکمت یہ بھی ہے کہ انسان کی طبیعت اس پر مجبور ہے کہ اپنے بنی نوع کو دیکھ

کر اقتدا کرتے ہیں یعنے اُن کو ایک نمونے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور یہی فرق ہے اس میں اور جانوروں میں کہ جانوروں کو ضروریات کی تعلیم کی حاجت نہیں کیونکہ جانوروں میں جو کچھ کمالات ہیں وہ سب طبعی ہیں اکتسابی نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بطخ کا بچہ پیدا ہوتے ہی تیرنے لگتا ہے۔ اور ایک بڑے سے بڑے تیراک شخص کا بچہ تیراک نہ ہوگا کیونکہ کمالات انسان کے طبعی نہیں بلکہ اُن کو ایک نمونہ دیکھنے کی ضرورت ہے ــــــ اور ضرورتِ نمونہ ہی باعث ہے کہ انسان کو تعلیم کتُب سے بھی اس قدر نفع نہیں ہوتا جس قدر کاملین کی صحبت سے ہوتا ہے۔ یہ ایسی چیز ہے کہ ہر شخص کو اس کی ضرورت ہے۔

تعلیم و تربیت کے آداب

اکثر لوگ اپنی اولاد کے لئے تمام آسائشوں کی فکر کرتے ہیں مگر اس کی ذرہ پروا نہیں کرتے کہ صحبت بھی نیک ہو بلکہ اکثر بد اخلاق معلموں کے سپرد کر دیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اگرچہ یہ ناقص ہیں لیکن ابھی بچپن ہے کیا حرج ہے۔ حالانکہ یہ تجربہ ہے کہ اگر مبادی خراب ہوں تو مقاصد بھی خراب ہوتے ہیں۔ یاد رکھو کہ خاک از تودۂ کلاں بردار۔ یہ ضرور ہے کہ اگر کامل سے سیکھے گا تو کامل نہ ہوگا لیکن ذی استعداد تو ہو جائے گا۔ کیونکہ کامل آدمی فن کی حقیقت کو ظاہر کر دیتا ہے بخلافِ ناقص کے۔ اور یہ تو علمی ضرر ہے جس پر کم و بیش توجہ بھی ہے مگر بڑا ضرر یہ ہے کہ ناقص کی صحبت میں اخلاق بالکل برباد ہوتے ہیں۔ اس پر لوگوں کو ذرا توجہ نہیں۔

ہمارے ہاں ایک معلّم ہیں۔ اُن کی نسبت سُنا گیا ہے کہ وہ اپنے لڑکوں کو دوسرے معلّم کے ہاں بھیجتے ہیں کہ جاکر اُس کے مکتب کی پٹائیاں توڑ ڈالیں۔ بتلائیے جب بچپن ہی سے یہ حالت ہوگی تو بڑے ہو کر اُن کی کیا اصلاح ہوگی مگر اس پر بالکل خیال نہیں۔ بلکہ اکثر کہتے ہیں کہ بچّہ وہی ہے جو کہ شوخ ہو حالانکہ شوخی دوسری چیز ہے اور شرارت دوسری چیز ہے۔

غرض انسان اپنے ابنائے نوع سے سبق لیتا ہے جو حالت دوسرے کی دیکھتا ہے وہی خود اختیار کرتا ہے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ میں اپنے گھر کے لوگوں کو علاج کرانے کے لیئے ایک طبیب کے پاس لے گیا اُن کو میں نے دیکھا کہ بے حد متحمل تھے باوجود دیکہ بے حد نازک مزاج تھے تو میں چونکہ اُن کے پاس جاتا تھا اس لیئے میرا غصّہ کم ہو گیا تھا۔ میں نے غور کر کے دیکھا تو معلوم ہوا کہ محض پاس بیٹھنے کا اثر ہے۔ تو بہت اچھا طریقہ تربیت کا صحبت ہے۔

اب لوگ سمجھتے ہیں کہ اپنی عمر کو پہنچ کر خود ہی سنبھل جائیں گے یہ غلط ہے بلکہ جب بچّہ بولنے پر بھی قادر نہیں ہوتا اسُی وقت سے اُس کے دماغ میں دوسروں کی تمام حرکات منقش ہوتی ہیں اور وہ اُن سے متاثر ہوتا ہے۔ اسی واسطے حکماء نے لکھا ہے کہ بچّہ کے سامنے کوئی حرکت خلافِ تہذیب نہ کرنی چاہیئے۔ راز اس میں یہی ہے کہ انسان کے دماغ کی مثال پریس کی سی ہے کہ کاپی لکھ کر جب لگاؤ تو چھپ جائے گا۔ اسی طرح جو چیز دماغِ انسان کے روبرو ہوتی ہے وہ اُس میں منقش ہو جاتی ہے اگرچہ اس وقت شعور نہیں

ہوتا لیکن اس انتقاش کے لئے شعور کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر ہم پریس میں انگریزی چھاپ لیں اور پھر انگریزی سیکھ لیں تو چند روز کے بعد ضرور پڑھ لیں گے۔ علیٰ ہذا۔ بچہ اگرچہ اس وقت نہیں سمجھ سکتا لیکن بڑا ہو کر سمجھے گا۔

چنانچہ ایک عاقل عورت نے یہ کہا ہے کہ پانچ چھ برس کے بعد بچہ قابلِ تربیت نہیں رہتا۔ بلکہ ہر حالت پختہ ہو جاتی ہے۔ وہ کہتی تھی اگر پہلے بچے کو درست کر دے تو اُس کے بعد کے سب بچے اُسی سانچے میں ڈھل جائیں گے۔ غرض معلوم ہوا ہوگا کہ صحبت کا کیا اثر ہے۔

تو جناب باری تعالیٰ کی بڑی رحمت ہے کہ ابراہیم علیہ السلام سے یوں دُعا کرائی کہ ان میں ایک پیغمبر بھیجیے اور پھر آپ کو مبعوث فرمایا کہ آپ نمونہ ہوں۔ سو بعض نے آپ کو دیکھا اور بعض نے آپ کی سیرت دیکھ کر آپ کی حالت معلوم کی اور اسی طرح آپ ہمارے بھی پیشِ نظر ہیں اور اس اعتبار سے اگر فِیْکُمْ رَسُوْلُہٗ عام لیا جائے تو درست ہوگا۔

اسوۂ حسنہ کا اتباع

واقعی آپ کی سیرت کو دیکھ کر جس قدر آسانی سے ہم اتباع کر سکتے ہیں قوانین کلیہ کو دیکھ کر نہیں کر سکتے تھے اور اسی سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جب آپ ہمارے لئے نمونہ ہیں تو ہم سے بھی بازپرس ہوگی کہ تم اس نمونے کے موافق بن کر کیوں نہیں آئے۔

اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے ہم کسی درزی سے اچکن سلائیں

اور نمونے کے لیے اپنی اچکن اُس کو دے دیں۔ تو اس اچکن دینے کے معنی یہی ہوتے ہیں کہ جدید اچکن کی کاٹ تراش سلائی وغیرہ سب اس پہلے کے مطابق ہو۔ اور اگر ایسا نہ ہو بلکہ تراش وغیرہ میں فرق ہو جائے تو درزی کو مستحق عتاب سمجھا جاتا ہے۔ اس عتاب کے جواب میں اگر وہ یہ کہنے لگے کہ زیادہ تر تو موافق نمونے کے ہے اور لِلْاَکْثَرِ حُکْمُ الْکُلِّ تو ہرگز یہ جواب مسموع نہیں ہوتا۔

تو جو برتاؤ آپ نے اُس درزی سے کیا اُسی کے لیے آپ خدا تعالیٰ کے سامنے تیار ہو جایئے اور سوچ لیجیے کہ جب آپ خدا تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہوں گے اور نمونہ نبویؐ پر پورے نہ اُتریں گے تو کس سخت عتاب کے سزاوار ہوں گے۔ اسی کو خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ

کہ بالکل اُس نمونے جیسے بن جاؤ۔ نماز ایسی ہو جیسے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تھی، روزہ وہی ہو۔ نکاح شادی کا طرز وہی ہو۔ وضع وہی ہو۔ علیٰ ہٰذا ہر چیز میں وہی طرز ہو جو کہ حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا طرز تھا۔ یہ تو نمونہ ہے لیکن یہ خدا تعالیٰ کی رحمت ہے کہ اُس نے اس نمونے میں وسعت کر دی۔

یہ ایک شبہ کا جواب ہے یعنی آج کل اکثر لوگ کہتے ہیں کہ مولویوں نے اعتراض تو کر دیا کہ مَنْ تَشَبَّہَ بِقَوْمٍ فَھُوَ مِنْھُمْ مگر اب یہ بھی تو تبلائیں کہ حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ٹوپی کیسی تھی، کرتہ کیسا تھا۔ اور مقصود اس سے علماء کو خاموش کرنا ہوتا ہے اور اس

سے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ جو چاہو پہنو۔ نیز اس کی تائید میں "درعمل کوش و ہر چہ خواہی پوش" بھی پیش کیا کرتے ہیں۔

میں اس شبہ کا جواب دینا چاہتا ہوں کہ اگرچہ وضع وہی ہونا ضروری ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وضع تھی لیکن اس میں کچھ وسعت ہے۔ شرح اس کی یہ ہے کہ ہمیشہ سلاطین میں یہ قاعدہ ہوتا ہے کہ قوانین لباس میں وردی والوں کے لئے ماذون فیہ کے افراد منھی عنہ کے افراد سے کم ہوتے ہیں۔ مثلاً پولیس کی وردی ہے کہ افراد لباس کے بہت ہیں مگر اس قانون مجوزہ کی وجہ سے پولیس کو صرف ایک کی اجازت ہے کہ اس قسم کا لباس ہو اور منھی عنہ زیادہ ہے کیونکہ اس کے سوا سب لباسوں کی ممانعت ہے۔ چنانچہ اگر کسی کی وردی میں عمامہ نہ ہو تو وہ معتوب ہوگا کیونکہ وہ بھی وردی کا جزو ہے۔ اب ہمارے بھائی یہ چاہتے ہیں کہ قانونِ خداوندی بھی ایسا ہی تنگ ہو جائے کہ ایک ہی لباس اس میں رہے یعنی خاص قسم کی ٹوپی اور خاص طرز کی ازار وغیرہ وغیرہ۔ اور جب یہ بات نہیں ہے تو ان کے نزدیک ہر لباس جائز ہے۔

تو صاحبو ــــ وردی تو متعیّن ہے لیکن یہاں تعیّن کی یہ صورت ہے کہ منھی عنہ کم ہے اور ماذون فیہ زیادہ ہے یعنی جو لباس ناجائز قرار دیا گیا ہے اُس کو شمار کرا دیا اور اس کے ماسوا سب جائز رکھا گیا۔ تو یہ خدا تعالیٰ کی رحمت ہے۔ کیونکہ اگر یہ حکم ہوتا کہ ایک قبا ہو، ایک کرتہ ہو، ایک عمامہ ہو، تو جس شخص کے پاس اتنا کپڑا نہ ہوتا وہ کیا کرتا ــــ؟

آج کل بعض اسکولوں میں خاص وضع کی پابندی ہو گئی ہے لیکن یہ سخت مصیبت ہے۔ اگر کوئی کہے کہ ہم تو بہت امیر ہیں تو میں کہوں گا کہ کیا قوم کو ان ہی افراد میں حصر کیا جائے گا۔ لوگ اس میں بھی سخت غلطی کر رہے ہیں کہ قوم کے افراد امراء کو سمجھتے ہیں حالانکہ غرباء شمار میں زیادہ ہیں تو قوم غرباء کا نام ہو گا۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے گیہوں کا ڈھیر کہ اُس میں جو اور چنے بھی ہوتے ہیں مگر کثرت پر نظر کر کے اُس ڈھیر کو گیہوں کا ڈھیر کہا جاتا ہے۔

اسی سے یہ بھی معلوم ہو گیا ہو گا کہ قومی ہمدرد وہ ہو سکتا ہے جو کہ غرباء کے ساتھ ہمدردی کرے۔ اس زمانہ میں جو لوگ اپنے کو اپنے منہ سے ہمدردِ قوم کہتے ہیں وہ صرف اُمراء کے ساتھ ہمدرد ہیں نہ کہ غرباء کے ساتھ۔ حالانکہ جب تک غرباء کے ساتھ ہمدردی نہ ہو اُس وقت تک قومی ہمدردی کا دعوٰے بالکل غلط دعوٰے ہے۔ تو چونکہ یہ لوگ قوم کے معنی نہیں سمجھے اس لئے اپنی اس تجویز میں دقت اور تنگی اُن کو محسوس نہیں ہوئی اور خدا تعالیٰ نے اسی پر نظر کر کے ماذونات کو زیادہ اور منہیات کو کم فرمایا کہ حریر نہ ہو، زری نہ ہو، ٹخنے ڈھکے نہ ہوں، تشبّہ نہ ہو۔ علیٰ ہذا۔ اور ان کے ماسوا عام اجازت ہے کہ اَلبِسْ مَاشِئْتَ۔ تو وردی تو متعین ہوئی لیکن رحمت اور وسعت کے ساتھ۔ لہٰذا وہ اعتراض کہ اگر تشبّہ ناجائز ہے تو حضورؐ کا خاص لباس بتلانا چاہیے مندفع ہو گیا پس معلوم ہوا کہ ہم کو لباس میں بھی حضورؐ کے ساتھ مشابہ ہونا ضروری ہے لیکن

اس طرح کہ اُن منہیات میں سے ہمارے بدن پر کوئی کپڑا نہ ہو۔ پس جب ہمارے پاس یہ نمونہ موجود ہے تو خدا تعالیٰ ہم سے باز پرس کر سکتے ہیں۔

شادی کا نمونہ

اسی طرح خدا تعالیٰ نے شادی کا ایک نمونہ (یعنی حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کی شادی) ہم کو دکھلا دیا ہے کہ اُس میں نہ مہمان آئے تھے نہ لال خط گیا تھا۔ نہ ڈوم گیا تھا نہ نائی نہ واسطہ سے پیغام پہنچا بلکہ پیغام خود دولہا صاحب لے کر گئے تھے اور حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے بھیجے ہوئے تھے۔ اوّل حضرت فاطمہ زہراؓ سے حضرات شیخین نے پیغام دیا تھا لیکن ان کی عمر زیادہ ہونے کی وجہ سے حضورؐ نے عذر فرما دیا ــــــ اللہ اکبر، صاحبو! غور کرنے کی بات ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہم کو کیسے کیسے گہرے امور پر مطلع فرما دیا ہے۔ یعنی حضرات شیخین سے انکار فرما کر آپؐ نے یہ بتلا دیا کہ اپنی اولاد کے لئے شوہر کی ہم عمری کا لحاظ بھی ضرور کرو ــــــ ۱

ایک نوجوان عورت کی شادی ایک بوڑھے مرد سے ہو گئی تھی۔ وہ کہتی تھی کہ جب میرے سامنے آتے ہیں تو مجھ کو بہت شرم آتی ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے دادا آگیا۔ اور اکثر عورتیں عمر دل میں تفاوت ہونے کی وجہ سے آوارہ ہو جاتی ہیں کیونکہ اُن کا دل نہیں ملتا۔ بتلائیے حضرات شیخین سے زیادہ کون ہوگا۔ لیکن حضورؐ نے محض عمر کے تفاوت کی وجہ سے انکار فرما دیا۔

جب دونوں صاحبوں کو اس شرف سے مایوسی ہوئی تو ان دونوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا کہ حضورؐ نے ہم دونوں سے تو اس خاص وجہ سے انکار فرما دیا ہے۔ تم کم عمر ہو بہتر ہے کہ تم پیغام دو ——— جو لوگ شیخین پر حضرت علیؓ کے ساتھ عداوت رکھنے کا الزام رکھتے ہیں۔ اُن کو اس واقعہ میں غور کرنا چاہیے۔ غرض حضرت علیؓ تشریف لے گئے اور جا کر خاموش بیٹھ گئے۔ آپؐ نے فرمایا کہ مجھے معلوم ہے کہ جس غرض سے تم آئے ہو اور مجھے خدا تعالیٰ کی طرف سے حکم ہوا ہے کہ میں فاطمہؓ کا نکاح تم سے کردوں۔ منظوری کے بعد حضرت علیؓ چلے آئے۔ ایک روز حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دو چار اصحاب کو جمع کر کے خطبہ پڑھا اور نکاح پڑھ دیا۔ چونکہ حضرت علیؓ مجلس نکاح میں موجود نہ تھے اس لئے یہ فرما دیا کہ اگر علیؓ منظور کریں۔ حضرت علیؓ کو جب خبر ہوئی تو آپ نے منظور کیا۔ اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُمّ ایمن کے ساتھ حضرت فاطمہؓ کو حضرت علیؓ کے گھر روانہ کر دیا۔ نہ ڈولہ تھا نہ برات تھی۔

اگلے دن حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم خود تشریف لائے اور حضرت فاطمہ زہراؓ سے پانی مانگا۔ اُنہوں نے اُٹھ کر پانی دیا۔ آج ہم نے اس سادگی کو بالکل ہی چھوڑ دیا ہے۔ نکاح کے بعد ایک مدت تک دُلہن منہ پر ہاتھ رکھے بیٹھی رہتی ہے۔ میں کہا کرتا ہوں کہ بجائے منہ پر ہاتھ کے ہاتھ پر منہ رکھنا چاہیئے۔ بہر حال جو کچھ بھی کہا جائے منہ ڈھکا جاتا ہے اور وہ اس قدر پابند بنائی جاتی ہے کہ نماز وغیرہ کچھ بھی نہیں پڑھ سکتی۔ جس طرح بندے کو خدا کے ہاتھ میں ہونا چاہیئے

تھا اسی طرح وہ نائن کے ہاتھ میں ہوتی ہے اور کس قدر بے حیائی ہے کہ عورتیں منہ دیکھ کر فیس دیتی ہیں۔ تو آج کل پابندی کی یہ حالت ہے اور حضرت فاطمہ رضؓ نے اگلے ہی دن کام کیا اور پھر حضرت علی رضؓ سے فرمایا کہ پانی لاؤ۔ وہ بھی لائے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب پھر فاطمہ رضؓ پانی لائی تھیں حضرت علی رضؓ بھی موجود تھے۔ اب عورتیں اس فعل کو بالکل ناجائز سمجھتی ہیں۔ اسی طرح کی اور بھی جہالتیں ہیں۔

چنانچہ عورتوں کا یہ بھی خیال ہے کہ شوہر کا نام لینے سے نکاح ٹوٹ جاتا ہے اور شوہر کا نام لینا گویا بالکل ناجائز ہے۔ مگر عورتوں کو نام لینا تو بے ادبی ہے، زبان چلانا اور گستاخی کرنا بے ادبی نہیں ہے۔ شوہر سے لڑنا یا عورتوں کو گالیاں دینا گویا ناجائز نہیں ہے بعض عورتیں تو اس کی یہاں تک پابند ہیں کہ اگر قرآن میں وہ لفظ آ جائے تب بھی اس کو نہیں پڑھتیں گویا قرآن میں ان کے شوہر ہی کا نام لکھا ہے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ بعض عورتیں اس کے شوہر کا نام بھی نہیں لیتیں اور شوہر کے نام کے ہم وزن الفاظ بھی نہیں کہتیں لیکن معلوم نہیں کہ یہ ساری باتیں ناجائز ہو کر گستاخی کرنا کیسے جائز ہو گیا غرض حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شادی کر کے بھی دکھلا دی۔

غمی میں حضورؐ کی سیرت

حضورؐ نے غمی کر کے بھی دکھلا دی کہ آپؐ کے صاحبزادہ ابراہیم رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا۔ آپؐ نے نہ جزع فزع کیا نہ کسی کو اجازت دی۔ صرف آنسو نکلے اور یہ فرمایا کہ

اِنَّا بِفِرَاقِكَ يَا اِبْرَاهِيْمُ لَمَحْزُوْنُوْنَ

اور ایک جگہ تشریف فرما رہے۔ لوگ آکر تعزیت کرتے رہے۔ پس ہم کو بھی چاہیئے کہ تسلی دیں اور ثواب بخشیں۔ یہ دونوں امر مسنون ہیں اور باقی سب لغو ہیں۔ مثلاً دُور دراز کے مہمانوں کا آنا اور دسویں چالیسویں میں شریک ہونا۔ پھر عدّت کے ختم کے بعد اُس عورت کو عدّت سے نکالنے کے لئے جمع ہونا گویا وہ کسی کوٹھڑی میں بند تھی کہ یہ سب مل کر اُس کا قفل توڑیں گے۔

ضلع بلند شہر کے ایک رئیس کا انتقال ہوا۔ اُن کے صاحبزادے نے اس رسم کو توڑنا چاہا لیکن اس کی یہ صورت اختیار نہیں کی کہ کچھ نہ کریں بلکہ یہ کیا کہ حسبِ رسم تمام برادری کی دعوت کی اور بہت سے عمدہ عمدہ مرغن کھانے پکوائے ——— بڑے لوگوں پر ایک یہ بھی آفت ہے کہ جب تک وہ گھی کی نہر نہ بہا دیں اُس وقت تک اُن کا کرنا کچھ سمجھا ہی نہیں جاتا۔ غرباء بحمداللہ اس سے بری ہیں۔ میں جب ڈھاکہ گیا تو وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ یہاں سیر بھر گوشت میں سیر بھر گھی کھاتے ہیں۔ میں نے کہا کہ صاحب گھی کچھ زیادہ کھانے کی چیز نہیں ہے ورنہ جنت میں گھی کی بھی ایک نہر ہوتی جیسے دودھ و شہد کی نہریں جنت میں ہیں۔

غرض جب سب لوگ جمع ہو گئے تو ہاتھ دھلوا کر کھانا چنوا دیا اور سب کو بٹھلا دیا۔ اجازتِ شروع سے پہلے کہنے لگا کہ صاحبو! آپ کو معلوم ہے کہ میرے والدِ ماجد کا انتقال ہو گیا ہے اور والد ماجد کا سایہ سر سے اُٹھ جانا جیسے عظیم الشان صدمہ کا باعث ہوتا ہے ظاہر ہے۔ تو صاحبو! کیا یہی انصاف ہے کہ ایک تو میرا باپ مرے

اور اوپر سے تم لوگ مجھ کو لوٹنے کے لئے جمع ہو، تم کو کچھ شرم بھی آتی ہے؟ اس کے بعد کہا کہ کھائیے۔ لیکن سب لوگ اُسی وقت اُٹھ گئے اور یہ رائے ہوئی کہ ان رسوم کے متعلق علیحدہ بیٹھ کر غور کرنا چاہیئے۔ چنانچہ بہت سے آدمی جمع ہوئے اور باتفاق رائے ان کو موقوف کر دیا۔ اور وہ سب کھانا فقراء کو تقسیم کر دیا گیا۔

ہمارے جوار میں ایک قصبہ کیرانہ ہے۔ وہاں کے ایک حکیم صاحب فرماتے تھے کہ میرے پاس ایک گوجر آیا۔ اُس کا باپ بیمار ہو رہا تھا۔ کہنے لگا کہ حکیم صاحب جس طرح ہو سکے اب کی مرتبہ تو اس کو اچھا ہی کر دیجئے کیونکہ قحط بہت ہو رہا ہے۔ اگر بڈھا مر گیا تو مرنے کا تو چنداں غم نہیں مگر چاول بہت گراں ہیں، برادری کو کس طرح کھلاؤں گا۔

خیر غنیمت ہے آج کل ان رسوم کا مذموم ہونا تو اکثر نوجوان سمجھ گئے ہیں اور منع بھی کرتے ہیں۔ تو گویا زندوں کا غم مردے کے غم سے زیادہ ہوا۔ ان کی روک ٹوک زیادہ قابل مدح نہیں کیونکہ ان کی غرض اس روک ٹوک سے یہ ہوتی ہے کہ اگر بیوی کے خرچ سے بچے گا تو ہم کو ہارمونیم اور میز کرسی میں خرچ کرنے کا خوب موقع ملے گا۔ تو جس روک کا منشاء یہ ہو وہ قابلِ مدح نہیں ہے۔ لیکن خیر پھر بھی ان کی حالت اس خاص اعتبار سے دوسروں سے غنیمت ہے اس وقت واقعی عقول میں گونہ روشنی آ گئی ہے لیکن یہ روشنی ناکافی ہے کافی اُس وقت ہو گی کہ جب ضم ضمیمہ بھی ہو یعنی ایک عاقل کی عقل بھی ان کی عقل کے ساتھ اور اُس کی رہبر ہو اور عاقل وہ ہیں کہ جن

کی نسبت کہا گیا ہے کہ ؎

خلق اطفال اند جز مستِ خدا
نیست بالغ جز رہیدہ از ہوئے

تو عاقل وہی ہے جو رہیدہ از ہوئے ہو۔ بہر حال کہاں تک تفصیل کروں۔ خلاصہ یہ ہے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمارے لئے نمونہ ہیں۔ لہذا ہر ہر حالت میں ہم کو غور کرنا چاہیئے کہ ہم اس نمونے کے موافق ہیں یا نہیں۔

حضورؐ کا فقر

سلف صالحین نے تو یہاں تک کیا ہے کہ ایک درزی کے یہاں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت تھی ——— درمیان میں ایک جملہ معترضہ یاد آیا کہ ہماری شان خدا جانے کیا بڑھ گئی ہے کہ ہم غریبوں کے ہاں جاتے ہوئے عار کرتے ہیں بلکہ اُن کو بلاتے ہوئے بھی عار آتی ہے۔ اکثر دیکھا گیا کہ جو لوگ ذرا معزز عہدوں پر ہیں وہ اپنی برادری کے غریب لوگوں کو اپنے پاس بلاتے ہوئے اور اُن کے پاس بیٹھتے ہوئے عار کرتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھیے کہ آپ ایک غریب آدمی کے ہاں تشریف لے گئے اور اگر کوئی کہے کہ حضورؐ غریب تھے (نعوذ باللہ) تو سمجھ لو کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فقر اختیاری تھا۔ اضطراری نہ تھا۔ فقر وہ ہے کہ جس کا فقر اضطراری ہو ؎

شریف گر متواضع شود خیال مبند
کہ پائگاہ رفیعش ضعیف خواہد شد

حضرت ابراہیم بن ادھم رحؒ نے سلطنت چھوڑ دی تھی تو کیا اُن کو فقیر کہا جائے گا۔ اسی طرح حضور صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے بھی اپنے اختیار سے فقر اختیار کیا تھا اور اختیاری بھی کیسا کہ حضرت جبرئیل علیہ السّلام نے فرمایا کہ اگر آپ پسند فرمائیں تو خدا تعالیٰ آپ کے لیئے جبلِ اُحد کو سونا کر دیں کہ وہ آپ کے ساتھ ساتھ چلا کرے۔

شاید کوئی کہے کہ جبلِ اُحد کیوں کر چلتا۔ تو صاحبو! آپ کے نزدیک زمین متحرک ہے یا نہیں۔ تو جب زمین حرکت کر سکتی ہے تو جبلِ اُحد کے حرکت کرنے میں کیا محال لازم آتا ہے۔ اگر کہیئے کہ زمین کشش آفتاب کی وجہ سے چلتی ہے تو میں کہوں گا کہ حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے جسم مبارک میں بھی اگر کشش ہو تو کیا قباحت ہے۔ سائنس کے مسئلے ابھی ختم نہیں ہیں کشش کے لیئے جسم کا بڑا ہونا کچھ ضروری نہیں اور کشش تو محض آپ کی خاطر سے تنزل کر کے مان لی ہے ورنہ کشش کیا چیز ہے۔ جو شخص خدا کو مانتا ہے اُس کو کشش وغیرہ کے ماننے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

تو آپؐ نے فرمایا کہ اے جبرئیلؑ! میں تو یہ چاہتا ہوں کہ ایک دن پیٹ بھر کر کھاؤں اور ایک دن بھوکا رہوں۔ اور اگر غور کیجیئے گا تو معلوم ہوگا کہ حضورؐ کی اس تجویز میں کتنی عظیم الشان حکمت پنہاں ہے۔ بات یہ ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم جانتے تھے کہ میری اُمّت مجھ سے محبّت کرے گی۔ اگر میں دنیا لوں گا تو تمام اُمّت تحصیل دنیا کو سنّت قرار دے گی اور دنیا کے مفاسد سے بچنے کی قوت ہوگی نہیں۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ اُمّت ہلاک ہو جائے گی۔

اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے ایک کامل آدمی جو کہ سانپ پکڑنے کا منتر جانتا ہو، وہ باوجودیکہ اپنے ضرر سے بالکل مطمئن ہے لیکن اس خیال سے کہ مجھے پکڑتے دیکھ کر بچہ بھی سانپ کے منہ میں انگلی نہ دے دے خود بھی سانپ کو نہیں پکڑتا ـــــ پس حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمارے لیئے تکلیف برداشت کی تو کیا آپ کا فقر اضطراری فقر ہوگا ہرگز نہیں بلکہ فقر اختیاری تھا۔

وضاحتی حکایات

مجھے حضرت شاہ ابوالمعالیؒ کی حکایت یاد آئی۔ آپ کے ہاں اکثر فقر و فاقہ ہوا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ اُن کے پیر اُن کے ہاں مہمان ہوئے۔ اُس روز بھی اتفاق سے فاقہ تھا اور حضرت شاہ ابوالمعالیؒ مکان پر نہ تھے۔ گھر کے لوگوں نے پڑوس سے قرض منگانا چاہا لیکن وہاں سے قرض نہ ملا کئی جگہ آدمی کو بھیجا لیکن سب جگہ سے جواب ملا جب اُن کے پیر نے کئی بار آدمی کو آتے جاتے دیکھا تو دریافت فرمایا، معلوم ہوا کہ آج فاقہ ہے۔ آپ نے کچھ نقد اپنے پاس سے دیا اور فرمایا کہ جا کر بازار سے اناج لے آؤ اور جب لاؤ تو مجھے دکھانا چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ آپ نے ایک نقش لکھ کر اُس اناج میں رکھ دیا نقش کا رکھنا ایک پردہ تھا ورنہ یہ آپ کا تصرف تھا اور یہ اوپر سے ہوتی چلی آئی ہے۔ خدا تعالیٰ جب کوئی خارق پیدا کرتے ہیں تو اُس کو ناسوت کے پردے میں پیدا کرتے ہیں جیسے بارش وغیرہ کا ہونا اسی کے موافق اُنہوں نے بھی وہ تعویذ لکھ کر اناج میں رکھ دیا۔ اور فرمایا کہ اس میں سے لے کر پکایا کرو۔ چنانچہ مدت تک یکساں رہا اور

ختم نہ ہوا۔

حضرت شاہ ابوالمعالی صاحبؒ سفر سے واپس تشریف لائے اور یہ حالت دیکھی تو ایک روز فرمایا کہ مدت سے فاقہ نہیں ہوا اِس کی کیا وجہ ہے۔ صاحبزادی نے یہ سارا واقعہ عرض کیا۔ اب اس وقت حضرت پر سخت تنگی کا وقت ہے کہ اگر تعویذ سے کام لیں تو مذاق کے خلاف اور نہ کام لیں تو پیر کے تعویذ کی بے ادبی ہوتی ہے۔ واقعی یہ حضرات جامع اضداد ہوتے ہیں اس جامع بین الاضداد پر مجھے ایک اور حکایت یاد آئی۔

ہمارے حضرت قبلہ حاجی امداد اللہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ بیٹھے ہوئے تھے اور یہ مضمون بیان فرمارہے تھے کہ جس طرح راحت و آرام نعمت ہے اُسی طرح بلا بھی نعمت ہے کہ اُسی وقت ایک شخص آیا۔ اُس کا ہاتھ زخم کی وجہ سے خراب ہو رہا تھا اور سخت تکلیف میں مبتلا تھا اور کہا کہ میرے لئے دُعا فرمائیے۔ اس وقت میرے قلب میں یہ خطرہ گزرا کہ حضرت اس کے لئے کیا دعا کریں گے۔ اگر صحت کی دُعا کریں تب تو اپنی تحقیق سے رجوع لازم آتا ہے اور اگر دُعا نہ کریں تو اُس شخص کے مذاق کی رعایت نہیں ہوتی اور یہ شیخ کامل کے لئے ضروری ہے۔ آپ نے فرمایا کہ سب لوگ دُعا کریں کہ اے اللہ! اگرچہ ہم کو معلوم ہے کہ یہ تکلیف بھی نعمت ہے لیکن ہم لوگ اپنے ضعف کی وجہ سے اس نعمت کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ اس نعمت کو مبدّل بہ نعمتِ صحت فرما دیجئے۔

اسی طرح حضرت شیخ ابوالمعالیؒ نے فرمایا کہ نقش حضرت کا تبرک

ہے میرا سر اس کا زیادہ مستحق ہے۔ یہ کہہ کر اس کو تو اپنے سر میں باندھ لیا اور اناج کے لئے حکم دیا کہ اس کو صدقہ کر دیا جائے۔

تو جب حضورؐ کے ادنیٰ خدام کی یہ حالت تھی تو حضورؐ کو کون فقیر کہہ سکتا ہے اور جہاں حضورؐ کی یہ حالت تھی اس کے ساتھ یہ بھی تھا کہ ایک مرتبہ حضرت نے سو اونٹ بھی اپنی طرف سے ذبح فرمائے تھے۔ تو اب یہ شبہ نہ رہا کہ حضورؐ غریب تھے اور غریب ہونے کی وجہ سے تشریف لے گئے۔ بلکہ آپ سلطان تھے اعتقاداً بھی اور واقعتاً بھی۔ کیونکہ صلح، جنگ، قتال وغیرہ سب آپؐ کے حکم سے ہوتی تھی۔ اور باوجود اس کے پھر آپ درزی کے گھر تشریف لے گئے۔ اب ہم کو ان کے گھر جاتے بلکہ ان کو سلام علیکم کی اجازت دیتے بھی ننگ آتا ہے۔

کسی قصبے میں ایک حجام نے ایک رئیس صاحب کو السلام علیکم کہہ دیا تو رئیس صاحب نے اٹھ کر ایک چپت رسید کیا اور کہا کہ تو اس قابل ہو گیا ہے کہ ہم کو السلام علیکم کہے۔ حضرت سلامت کہا کر۔ جب نماز کا وقت ہوا تو اس نے نماز پڑھی اور ختم نماز پر بجائے السلام علیکم ورحمۃ اللہ کے پکار کر کہا حضرت سلامت ورحمۃ اللہ لوگوں نے پوچھا کہ یہ کیا حرکت ہے۔ کہنے لگا کہ آج میں نے السلام علیکم کہا تھا تو ایک چپت لگا۔ مجھے ڈر ہوا کہ نماز میں فرشتوں کو بھی سلام کیا جاتا ہے اور ان میں حضرت عزرائیلؑ بھی ہیں۔ اگر کبھی وہ خفا ہو گئے تو میرا دم ہی نکال دیں گے۔ تو جب ہمارے رؤسا کو سلام سے عار آتی ہے تو کھانا پینا تو بہت بڑی بات ہے۔

غربار کا خلوص

لکھنؤ کا واقعہ ہے کہ وہاں کے ایک عالم ایک سقے کے گھر تشریف لے جاتے تھے کہ ایک رئیس ملے پوچھا کہ مولانا کہاں جا رہے ہیں۔ مولوی صاحب نے فرمایا کہ اس سقے نے دعوت کی ہے۔ رئیس نے کہا لاحول ولا قوۃ آپ نے تو لٹیا ہی ڈبو دی۔ سقے کے گھر دعوت کھانے جاتے ہیں۔ مولوی صاحب نے کہا، ہاں صاحب ٹھیک ہے اور سقے سے کہا کہ اگر تو ان کو لے چلے تو میں بھی چلتا ہوں ورنہ میں بھی نہیں جاتا۔ وہ ان رئیس کے سر ہوا اور ہاتھ پاؤں جوڑ کر لے چلا۔

مولوی صاحب نے اس تدبیر سے یہ بات دکھلا دی کہ ان غربأ کا اصرار کس طرح کا ہوتا ہے اور ان کو کس درجہ خلوص ہوتا ہے۔ حقیقت میں امراء کو خبر نہیں ورنہ اگر ان کو بھی معلوم ہو جائے کہ غربأ کو اہل اللہ و علماء سے کتنی محبت ہے تو ان کو مجبور و معذور سمجھیں جیسے خود تھوڑے سے اصرار سے یہ رئیس مجبور ہو گئے۔ محبت وہ چیز ہے کہ

عشق را نازم کہ یوسف را ببازار آورد
ہمچو صنعا زاہدی را او بزنار آورد

تو اگر کسی بڑے شخص کو غریب کے گھر پہنچا دے تو کیا تعجب ہے۔ اس کے عجیب و غریب تصرفات ہوتے ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ امراء کو ان کی اطلاع نہیں کیونکہ لوگوں کو ان سے محبت ہی نہیں ہے۔ ان کی اگر تعظیم بھی کرتے ہیں تو ایسی کہ جیسے بھیڑیے کی تعظیم

کرتے ہیں یا اگر کھڑے ہوتے ہیں تو جیسے سانپ کے لئے کھڑے ہو گئے۔ متکبرین سمجھتے ہیں کہ ہماری تعظیم کی حالانکہ یہ تعظیم نہیں ہے بلکہ خوف ہے۔ تو چونکہ اُن سے کسی کو محبت نہیں ہوتی اس واسطے ان کو محبت کا اندازہ نہیں ہوتا اور اگر کسی کے ساتھ محبت ہو تو اُن کے ساتھ اُن کا وہی برتاؤ ہوتا ہے جو کہ علماء کا عوام سے۔

عرض وہاں جو پہنچے تو دیکھا کہ دو سو تین سو سقے کھڑے ہیں اور اُن کو دیکھتے ہی سب کے سب تعظیم کے لئے بڑھے۔ رئیس صاحب نے یہ عظمت و محبت کبھی عمر بھر میں بھی نہ دیکھی تھی۔ آخر کھانا آیا تو مولوی صاحب نے سقوں کو اشارہ کیا۔ انہوں نے نہایت اصرار و خوشامد سے کھلانا شروع کیا۔ آخر اس رئیس نے یہ منظر دیکھ کر کہا کہ مولانا میں نے آج دیکھا اور آج مجھ کو معلوم ہوا کہ عزت رئیسوں میں جانے سے نہیں بلکہ غریبوں کے گھر جانے میں ہے۔

تو جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی غرباء کی دعوت منظور فرما لیتے تھے۔ چنانچہ ایک درزی کے ہاں چلے گئے اور حضرت انس رضؓ ساتھ تھے۔ آخر وہ درزی کپڑا سینے بیٹھ گئے۔ آج کل اس کو بے تہذیبی سمجھتے ہیں کہ مہمان کے سر پر مسلط کیوں نہ ہوا۔

صاحبو ــــــ یوں سمجھ میں آتا ہے کہ جن امور کا نام آج تہذیب رکھا ہے، یہ اُن لوگوں کا کام ہے جن کو کوئی کام نہ ہو یا ہو تو دماغی کام نہ ہو ورنہ اگر کوئی دماغی کام ہو تو یہ آج کل کی تعظیم و تہذیب مثلاً میزبان کا مہمان پر مسلط ہو جانا اس قدر گراں گزرتا ہے کہ جس کی حد نہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے سر پر کوئی پہاڑ رکھ دیا لیکن اس

زمانے میں لوگوں کو یہ حرکتیں گراں نہیں گزرتیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسے لوگوں سے متعلق کوئی فکر کا کام نہیں۔ اگر کوئی فکر کا کام ہوتو ممکن نہیں کہ اس سے گرانی نہ ہو۔

اسی طرح اکثر لوگ اپنے نوکروں کو حکم کرتے ہیں کہ تم کھڑے رہو میں کہتا ہوں کہ اس طرح کھڑے رہنے سے اُن اُمراء کا دل نہیں گھبراتا۔ دوسرے اگر وہ بیٹھ جائیں تو کیا مضائقہ ہے۔ اُن کی شانِ ریاست میں کیا کمی آجاتی ہے ---- ؟

ان حرکتوں کا اثر یہ ہے کہ اُن سے تکبّر پیدا ہوتا ہے اور تکبّر خدا تعالیٰ اور بندے کے درمیان ایک بڑا حجاب ہے۔ خدا تعالےٰ نے کلام مجید میں ایک جگہ اپنے بندوں کی مدح فرمائی ہے تو سب سے پہلے صفت یہ فرمائی ہے۔

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ ھَوْنًا

اس کے بعد نماز اور اس کے بعد معاملات، اس کے بعد عقائد وغیرہ کو فرمایا ہے۔ اس ترتیب میں غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ سب سے اوّل تواضع کی صفت کو فرمایا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ اگر تواضع نہ ہو تو ایمان نہیں ہے۔ اسی طرح ایک مقام پر خدا تعالیٰ نے کفّار کی مذمّت فرمائی ہے تو اُس میں ظُلْمًا وَّ عُلُوًّا فرمایا ہے۔ غرض خدا تعالیٰ کو یہ بات بالکل ناپسند ہے کہ انسان بُت کی طرح بیٹھا رہے اور نوکر اُس کے سامنے کھڑے رہیں۔ اب چونکہ کھانے میں بھی اس قسم کے تکلّفات اور تصنّعات ہوتے ہیں لہٰذا اگر کوئی ایسا کرے جیسا اُس درزی نے کیا تو لوگ اُس کو بے تہذیب بتلادیں۔

تو حضرت انس رضؓ کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کدو کے ٹکڑے تلاش کر کے کھا رہے تھے۔ حضورؐ کو تلاش کرتے دیکھ کر اُس روز سے مجھے کدو سے محبت ہو گئی ہے۔ آپ نے دیکھا محبت ایسی چیز ہے۔ ہم کو یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے کہ ہم کو محبت نہیں ہے ورنہ محبت وہ چیز ہے کہ محبوب کی ہر ہر ادا محبوب ہو جاتی ہے۔

عظمت کا اثر

اس زمانہ میں عظمت سے اس کی مثال سمجھو۔ معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ ہندوستان میں ایک حاکمِ اعلیٰ لنگڑا کر چلتا تھا تو دلدادگانِ فیشن نے اُس کی تقلید میں لنگڑا کر چلنا شروع کر دیا تھا۔ اسی طرح ایک بادشاہ کی داڑھی گاؤدم تھی تو لوگ مدت تک اسی قسم کی داڑھی رکھتے تھے بلکہ شاید دعا کرتے ہوں کہ ہماری داڑھی بھی اسی قسم کی ہو جائے اور ہم لنگڑے ہو جائیں۔

تو دیکھیے عظمت سے اس زمانے میں تشبہ کا مسئلہ ایسا چلا کہ علماء منع کرتے کرتے عاجز آ گئے لیکن لوگوں پر کچھ اثر نہ ہوا۔ حالانکہ اس میں کوئی معذوری بھی نہیں ہے۔ بعض گناہ تو ایسے ہوتے ہیں کہ بظاہر اس میں معذوری بیان کی جا سکتی ہے جیسے رشوت کا دینا یا بعض اوقات میں لینا۔ اگرچہ واقعیت کے اعتبار سے اس میں بھی کوئی معذوری نہیں ہے لیکن وضع میں تو کوئی مجبوری وہمی بھی نہیں۔ مگر وضع کا چھوڑنا دشوار ہو رہا ہے۔ وجہ اس کی یہی ہے کہ عظمت نے اس کو محبوب بنا دیا ہے۔ تو اہلِ دنیا کی عظمت نے جب یہ رنگ

دکھلایا، تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عظمت کیوں یہ رنگ نہ دکھلاتی ــــــ!

صاحبو ــــ اس کا کوئی شافی جواب دیجئے کہ اطمینان ہو، ورنہ اپنی حالت درست کیجئے۔ کیا جواب ہے اس کا کہ حضورؐ کی عظمت ومحبت سے تو ذرا بھی رنگ نہ بدلے اور ایک بے دین کی ایسی عظمت ہو کہ اُس کی تقلید میں حلال وحرام کی بھی تمیز نہ رہے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر اس پر عذاب بھی نہ ہو صرف خدا تعالیٰ اپنے روبرو کھڑا کر کے یہ پوچھیں کہ حضورؐ کی عظمت تمہارے دلوں میں زیادہ تھی یا شاہانِ دنیا کی تو کیا جواب دو گے؟ اگر کہو کہ یہ اتباع عظمت کی وجہ سے نہیں، تو میں کہوں گا کہ بالکل غلط ہے بلکہ محض عظمت ہی کی وجہ سے ہے پس معلوم ہوا کہ لباس میں بھی حضورؐ کا اتباع کرنا چاہیے اور معاملات میں بھی ــــــ!

اور یہی معنی ہیں اس حدیث کے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ میری اُمت میں ۷۳ فرقے ہوں گے سب دوزخ میں جائیں گے مگر ایک، اور وہ مَآ اَنَا عَلَیْہِ وَاَصْحَابِیْ ہے۔ مَآ اَنَا عَلَیْہِ کے معنی یہ نہیں ہیں کہ بعینہٖ وہی لباس ہو بلکہ اگر قولی اجازت ہو تو اس پر عمل کرنے والا بھی عامل بالسنت ہے۔ تو یہ حکمت تھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ارشاد میں وَابْعَثْ فِیْہِمْ رَسُوْلًا یعنے یہ کہ آپ ایک نمونہ ہوں گے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس ضرورت کو محسوس فرما کر دعا کی کہ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِیْہِمْ رَسُوْلًا مِّنْہُمْ ــــــ الخ

یہ تو تمہید تھی۔ اب صرف یہ مضمون رہ گیا کہ حضورؐ کی کیا حالت

تھی اور وہ مہتم بالشان ہے کہ اس میں یہ بتلایا جائے گا کہ ہم میں اہتمام بشانِ دینی نہیں رہا۔ سو اس کو کسی دوسرے وقت بیان کر دیا جائے گا۔ اب خدا تعالےٰ سے دعا کیجیے کہ وہ ہماری اصلاح فرمائیں اور ہمیں توفیق عمل عطا فرمائیں۔ آمین ا

ضرورۃ العلم بالدین

ضرورتِ علمِ دین کے متعلق یہ وعظ ۵۔ ذیقعد سنہ ۱۳۲۹ھ
کو مدرسہ احیاء العلوم الہ آباد میں تقریباً دو ہزار کے مجمع
میں ہوا۔ پونے تین گھنٹے کھڑے ہو کر بیان فرمایا جسے
مولانا سعید احمد صاحب نے قلمبند فرمایا

اس وقت تمام عالم کے مسلمانوں کی حالت پر غور
کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ مسلمان ہیں، وہ
اسلام کے احکامات اور اس کی تعلیمات کو چھوڑ چھوڑ
کر اس سے دور ہو رہے ہیں اور نا مسلم لوگ اسلام
کی خوبیوں کی وجہ سے اس کی طرف متوجہ ہوتے چلے
جا رہے ہیں۔ یہ تمہید ہے اس دن کی جس دن کہ عجب
نہیں کہ ایسے مسلمان خارج از اسلام ہو جائیں اور
ایسے غیر مسلم مسلمان ہو جائیں ——— !

خطبۂ ماثورہ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

الحمد لله نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونومن
بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا و
من سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہٗ
ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا اللہ
وحدہٗ لاشریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا
محمدا عبدہٗ ورسولہ صلی اللہ تعالی علیہ وعلی
اٰلہ واصحابہ وبارک وسلم امابعد فاعوذ باللہ من
الشیطان الرجیم - بسم اللہ الرحمن الرحیم -
ربنا وابعث فیھم رسولا منھم یتلوا علیھم اٰیاتک و
یعلمھم الکتاب والحکمۃ ویزکیھم انک انت العزیز الحکیمۃ

قرآن کی حیثیت

یہ وہی آیت ہے جس کی تلاوت جمعہ کے روز کی گئی تھی اور اس کے متعلق بطور تمہید کے کچھ عرض کیا گیا تھا۔ اور اس کا خلاصہ یہ عرض کیا گیا تھا کہ اس حکایت میں یہ بات سُنا دی ہے کہ تمہاری یہ خصلت کہ اعتناء فی الدین میں قلت ہے اس کی اصلاح کی ضرورت ہے۔ کیونکہ قرآن شریف میں جتنی حکایتیں ہیں اُن سے مقصود جملِ انشائیہ ہیں۔ اگرچہ عنوان خبر کا ہے یعنی صرف حکایت من حیث ھی حکایت مقصود نہیں ہے اس لیے کہ قرآن شریف کوئی تاریخ کی کتاب نہیں ہے بلکہ وہ ایک روحانی مطب ہے جس میں امراض باطنی کا علاج بتایا گیا ہے۔ اور یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کیونکہ آج کل لوگوں نے قرآن کے مَا وَضَعَ لَہٗ کو بالکل نہیں سمجھا۔ قرآن میں وہ چیزیں تلاش کی جاتی ہیں جو کہ قرآن میں نہیں ہیں۔ کوئی اس میں سائنس ڈھونڈتا ہے کوئی جغرافیہ

تلاش کرتا ہے اور بہت زیادہ تعجب اُن لوگوں پر ہے جو اس کو قرآن سے ثابت کرتے ہیں۔ کیونکہ ڈھونڈتا وہ شخص ہے جو کہ جانتا نہیں۔ تو اُس پر تو یہی تعجب ہے کہ اُس نے ناواقفی سے غلطی کی۔ مگر جو لوگ ثابت کر رہے ہیں اُن پر زیادہ تعجب ہے کہ جان بوجھ کر غلطی کرتے ہیں۔ میں دیکھتا ہوں کہ جب کوئی فلسفے کی نئی تحقیق ظاہر ہوتی ہے تو اُس کو زبردستی قرآن مجید میں ٹھونس کر بڑے فخر سے بیان کیا جاتا ہے کہ قرآن نے تیرہ سو برس پہلے اس کی خبر دی ہے اور اس سے قرآن کی بلاغت ثابت کی جاتی ہے اور ان علوم کو اسلامی علوم کہا جاتا ہے۔ افسوس! ان علوم کو اسلامی علوم کہا جاتا ہے۔ میں بقسم کہتا ہوں کہ ان صاحبوں کو اسلامی علوم کی ہوا بھی نہیں لگی۔ صنعت اور سائنس سے انکار نہیں کیا جاتا مگر گفتگو یہ ہے کہ قرآن کو اس سے کیا تعلق۔ قرآن میں اگر اس کا ذکر ہے تو محض تبعاً۔ قرآن میں صرف ایک مضمون ہے اور وہ یہ ہے کہ اُس میں خدا تعالیٰ کے ساتھ قرب کے طریقے بتلائے گئے ہیں۔ ان طریقوں سے جس چیز کو تعلق ہے اُس کا ذکر مقصوداً یا تبعاً آ گیا ہے۔ مثلاً اعتقادات اور اعمال مقصود بالذات ہیں کیونکہ قرب کا طریقہ یہی ہیں اور بعض چیزیں جن کو من وجہ دخل ہے وہ تبعاً آ گئی ہیں۔

مثلاً قرآن نے توحید کا دعویٰ کیا۔ اس کی دلیل میں اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ——— الخ فرمایا جس سے مطلب یہ ہے کہ ان کائنات میں بھی توحید کے دلائل ہیں تو ان کائنات میں چند حیثیتیں ہیں۔

اوّل ان کا دلیل توحید ہونا۔

دوسرے اُن کے پیدا ہونے کے طریقے اور
تیسرے اُن کے تغیرات کے ڈھنگ۔

قرآن کو صرف پہلی حیثیت سے ان سے تعلق ہے۔ اس کے بعد اگر کوئی یہ سوال کرنے لگے کہ بادل کس طرح پیدا ہوتے ہیں اور بارش کیوں کر ہوتی ہے اور اسی قسم کے حالات، تو قرآن سے اس کا تلاش کرنا غلطی ہے بلکہ خود اس کی فکر میں پڑنا لغو ہے۔

حدیث میں ہے مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْکُہٗ مَالَا یَعْنِیْہِ۔ یہ ایسی کام کی بات حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بتلائی ہے کہ اگر اس پر کاربند ہوجائیں تو ہم بہت سی مشکلات سے نجات پاجائیں اور اس کا ذرا عنوان بدل دیا جائے تو اس کی حقیقت منکشف ہو جائے گی۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ حضورؐ اضاعتِ وقت سے منع فرمارہے ہیں۔ اس وقت لوگ علی العموم اضاعتِ اوقات کی قباحت اور حفاظتِ اوقات کے استحسان پر متفق اللسان ہیں لیکن اس پر عمل اگر کیا ہے تو شریعت نے کیا ہے۔ دوسرے محض دعویٰ ہی دعویٰ کرتے ہیں تو جس چیز میں کوئی معتد بہ فائدہ نہ ہو وہ لایعنی ہے۔

قرآن اور سائنسی علوم

اب فرمائیے کہ اگر کسی کو یہ ثابت بھی ہوگیا کہ بادل اس طرح بنتا ہے اور بارش یوں ہوتی ہے تو کیا نفع ہوگا اور اگر نہ معلوم ہوا تو اس پر کون سا کام اٹکا ہوا رہ جائے گا۔ محض ایک تحقیق ہے کہ جس میں نفس کو حظ ہے۔ دوسرے اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ ان تحقیقات میں کوئی دنیاوی نفع ہے تو گفتگو اس میں ہے کہ قرآن جس

امر کے لئے ہے اس کے ساتھ بھی اس کو کوئی تعلق ہے یا نہیں موٹی بات ہے کہ قانونِ شاہان میں تجارت اور زراعت سے بحث کی جاتی ہے مگر اس طرح کہ کون سی تجارت جائز ہے اور کون سی ناجائز تاکہ امن قائم رہے۔ یہ کسی قانون میں نہیں ہے کہ تجارت اس طرح کرنی چاہیئے اور نفع کی فلاں فلاں صورتیں ہیں۔ اگر قانون کی کتاب میں ساری باتوں کا ہونا ضروری ہے تو دکھلایئے کہ قانونِ گورنمنٹ میں یہ سب چیزیں کہاں ہیں ---؟

بس قرآن بھی ایک قانون ہے امن اور نجات کا اور وہ بھی یہ چاہتا ہے کہ دنیا میں امن قائم رہے اور آخرت میں نجات ہو۔ غرض قرآن ایک قانون ہے تو بڑے ظلم کی بات ہے کہ حکامِ ظاہری کے قانون میں تو ان مسائل سائنس کو تلاش نہ کیا جائے اور خدا تعالیٰ کے قانون میں ان تمام باتوں کو تلاش کیا جائے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قانون کی حقیقت کو سمجھے ہی نہیں۔

تو اس تقریر سے ثابت ہوا کہ جغرافیہ وغیرہ مقصود نہیں ہیں البتہ اگر ان کا ذکر ہوگا تو تبعاً ہوگا کسی ضرورت کی وجہ سے۔ اور بقاعدہ الضروری یتقدر بقدر الضرورۃ اُن کا ذکر بھی اسی قدر ہوگا جس قدر سے کوئی ضرورت متعلق ہے۔ چنانچہ سائنس وغیرہ کے متعلق جو گفتگو ہے محض اس قدر کہ یہ سب مصنوعات ہیں اور ہر مصنوع کے لئے ایک صانع کی ضرورت ہے۔ سو اس استدلال کے لئے اس کی ضرورت نہیں ہے کہ ان چیزوں کی حقیقت بھی دریافت ہو جائے بلکہ مجملاً اُن کا علم ہونا کافی ہے۔ بلکہ ان مسائل کو موقوف علیہ کہنا

مضر ہے۔ راز اس میں یہ ہے کہ ہر شخص جانتا ہے کہ مقدمات دلیل کے یا نظری ہوتے ہیں یا بدیہی اور نظری کا مرجع مقدماتِ بدیہیہ مسلّمہ ہوں گے۔ جب یہ سمجھ میں آگیا تو سمجھو کہ قرآن ھُدًی للناس ہے اور ہدی للمتقین ہے۔

قرآن فہمی کی صورت

لیکن ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ محض متقیوں کے لئے ہے اور غیر متقی کے لئے نہیں۔ اس آیت سے اکثر لوگوں کو دھوکا ہو جاتا ہے۔ نیز دوسری آیات میں بھی غلط سمجھ لیتے ہیں اور وجہ اس کی زیادہ تر یہ ہوتی ہے کہ قرآن کو فلسفی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ چنانچہ اس سفر میں مجھ سے ایک صاحب نے اس کے متعلق دریافت کیا۔ میں نے کہا کہ یہ تو کوئی بات نہیں۔ یہ محاورہ ہے مطلب یہ ہے کہ اب جو لوگ متقی نظر آتے ہیں یہ اسی کی بدولت متقی بنے ہیں۔ اس جواب سے وہ بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے کہ اب بالکل صاف ہو گیا۔ تو اس میں کوئی توجیہہ یا تاویل نہیں ہے۔ صرف بات یہ ہے کہ لوگ محاورات سے قطع نظر کر کے فلسفیانہ نظر سے دیکھتے ہیں۔ اسی واسطے ضروری ہے کہ قرآن کو تمام علوم فلسفیہ سے پہلے کسی محقق عالم سے پڑھ لیں۔ باقی ترے ترجمے کا خود مطالعہ کرنے سے قرآن حل نہیں ہوتا۔

مجھے خوب یاد ہے کہ ایک مرتبہ ایک وکیل میرے ہاں مہمان ہوئے۔ اُن کے پاس قانون تھا۔ میں نے اس کو دیکھا اور اُن کے سامنے اُس کی تقریر کی۔ تو کہنے لگے کہ اس کا یہ مطلب نہیں

ہے۔ اب اس سے اندازہ کر لیجئے کہ جب ہم اپنے ابنائے جنس کے تجویز کردہ قانون کی اردو عبارت کو مطالعہ سے بدون اس کے کہ کسی ماہر سے حاصل کریں حل نہیں کر سکتے تو قرآن شریف کو محض اس کا اردو ترجمہ دیکھ کر کیسے حل کر لیں گے۔

پس وہ لوگ جو محض ترجمہ کو دیکھ کر قرآن کے مطالب حل کرنا چاہتے ہیں کیسی بڑی غلطی میں مبتلا ہیں۔ اور پھر غضب پر غضب یہ ہے کہ ترجمہ بھی وہ دیکھا جاتا ہے جو بحیثیتِ ترجمہ بھی صحیح نہیں ہے۔ ترجمہ میں یہ ضروری بات ہے کہ قرآن کا مدلول باقی رہے اور آج کل کے ترجموں میں ان کو بامحاورہ کرنے کے درپے ہو کر اس کا بالکل خیال نہیں کیا جاتا۔ حالانکہ قرآن کے ترجمے میں بامحاورہ کے اتباع کی ضرورت نہیں کیونکہ قرآن کوئی ادب کی کتاب نہیں ہے اس کا فیصلہ علماء سے کرانا چاہیئے۔

ترجمہ قرآن کی ایسی مثال ہے جیسے نسخہ لکھنا۔ اگر کوئی غیر فصیح الفاظ میں نسخہ لکھے لیکن ادویہ سب ٹھیک ہوں تو نسخہ کار آمد ہے اور اگر نہایت فصیح بلیغ الفاظ میں لکھے لیکن ادویہ کا نام غلط لکھ دے تو نسخہ بیکار ہے۔

تو لوگ یہ غلطی کرتے ہیں کہ ترجمے میں محض محاورے کا اتباع کرتے ہیں گو اصل مدلول محفوظ نہ رہے۔ اس وقت اس قسم کے بہت سے ترجمے ہو گئے ہیں تعیین کی ضرورت نہیں ہے البتہ آپ لوگوں کو اتنا ضرور کرنا چاہیئے کہ جب تک علماء سے دریافت نہ کر لو، اس وقت تک کسی ترجمے کو بھی نہ دیکھو اور دریافت کرنے کے بعد بھی

اپنے دیکھنے پر اکتفا نہ کرو بلکہ کسی سے پڑھ لو۔ یہ صورت قرآن مجید کے صحیح سمجھنے کی ہے۔ غرض یہ ہے کہ اس وقت یہ غلطی عام ہو رہی ہے کہ قرآن کو پڑھتے ہیں لیکن سمجھ کر نہیں پڑھتے۔ اسی واسطے اشکالات ہوتے ہیں ورنہ کوئی بھی اشکال نہیں ہے۔ مثلاً ھُدًی لِلْمُتَّقِیْنَ ہی میں یہ سمجھ لیا کہ یہ صرف متقی کے لئے ہدایت ہے اور کسی کے لئے نہیں۔ حالانکہ یہ غلط ہے بلکہ تعلیم اس کی عام ہے اور دلائل بھی عام فہم ہیں۔ بیچ میں ایک جملہ معترضہ کہتا ہوں۔

آج کل کا مرض

وہ یہ کہ یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ جب قرآن مجید کے دلائل عام فہم ہیں تو ہر شخص کو اجتہاد کی اجازت ہونی چاہئے۔ چنانچہ آج کل اجتہاد کا ایسا زور ہے کہ لوگ محض ترجمہ دیکھ کر اجتہاد کرنا چاہتے ہیں ——— ،

میرے پاس ایک مرتبہ ایک مؤذن آیا اور کہنے لگا کہ قرآن شریف سے مسح ارجل بھی ثابت ہے اور شاہ عبدالقادر صاحبؒ کا ترجمہ لاکر دکھلایا۔ وہ ترجمہ اگرچہ صحیح اور بامحاورہ ہے لیکن اس کو بھی خود دیکھ کر سمجھنا مشکل ہے۔ اس میں لکھا تھا کہ دھوؤ اپنے منہ اور ہاتھوں کو اور ملو اپنے سروں کو۔ اس کے بعد ہے وَاَرْجُلَکُمْ اس کا عطف ہے اَیْدِیَکُمْ پر۔ اور وہ معمول ہے اِغْسِلُوْا کا ترجمے میں یہ لکھا تھا کہ اور پیروں کو۔ آپ کو بوجہ صرف ونحو نہ جاننے کے یہ تو معلوم نہیں ہوا کہ یہ کس کے ساتھ متصل ہے۔ آپ نے اس کو قریب کے ساتھ متصل کیا اور ظاہر ہے کہ جو شخص صرف ونحو

سے واقف نہ ہوگا وہ قریب ہی کے ساتھ متصل کرے گا۔ اور جاننے والا یہ دیکھ لے گا کہ اَرْجُلَکُمْ ہے منصوب لہٰذا مجرور کے ساتھ نہیں ہو سکے گا۔ یہ دوسری بات ہے کہ قرائت بھی دوسری لی جائے۔ اس وقت دوسرے قواعد سے اس عطف کا پتہ چلے گا۔ مجھ کو سخت پریشانی ہوئی کہ اس کو کیوں کر سمجھاؤں اور کیونکر کہوں کہ اس کا عطف اَیْدِیَکُمْ پر ہے کیونکہ یہ عطف ہی کو نہیں جانتا۔ آخر میری سمجھ میں یہ آیا کہ اس کے ساتھ دماغ تھکانا فضول ہے کیونکہ یہ اس کی استعداد سے بالکل باہر ہے۔

یہ بھی آج کل مرض ہو گیا ہے کہ لوگ اپنی استعداد سے زیادہ سوال کرتے ہیں۔ ایک انجینئر ملے اور مجھ سے سوال کیا۔ میں نے کہا کہ یہ بلاغت کے متعلق ہے آپ اس کو نہ سمجھ سکیں گے۔ کہنے لگے کہ واہ صاحب عالم تو وہ ہے کہ ہر شخص کو اُس کے فہم کے مطابق سمجھا دے۔ میں نے کہا کہ بہتر مجھے آپ اقلیدس کے مقالۂ اوّل کی پانچویں شکل سمجھا دیجئے لیکن اس طرح کہ نہ تو اصول موضوعہ کا حوالہ ہو نہ علوم متعارفہ کا واسطہ ہو۔ اگر اس طرح سمجھانا ممکن ہے تو میں اُس تقریر کے سننے کا بہت زیادہ مشتاق ہوں اور اگر کہئے کہ اس طرح سمجھانا ممکن نہیں تو میں کہوں گا کہ عالم اقلیدس وہی ہے جو ہر شخص کو اُس کے فہم کے موافق سمجھا دے۔

کہنے لگے کہ اچھا تو ہم کو کیا کرنا چاہئے۔ میں نے کہا کہ اگر شوق ہے تو انجینئری کو طاق پر رکھئے اور ہمارے پاس آکر میزان سے کتابیں شروع کیجئے۔ جب اس مقام تک تعلیم پہنچے گی، تو ہم

بتلائیں گے۔ کہنے لگے کیا ہم اب بڈھے ہو کر پڑھنے بیٹھیں گے میں نے کہا کہ اگر تحقیق کا شوق ہے تو اس کی تو یہی صورت ہے اور اگر یہ صورت منظور نہیں تو ہماری تقلید کیجئے اور جو کچھ ہم کہیں اُس کو مان لیجئے۔ اور یہ بات ایسی بدیہی ہے کہ ہر شخص اس کو جانتا ہے اور رات دن اسی کے موافق کارروائی ہوتی ہے۔

مثلاً ایک شخص بوڑھا آپ کے پاس ۲۰ روپیہ ماہوار کی تنخواہ چھوڑ کر آیا اور سولہ دن کی تنخواہ کی مقدار آپ سے پوچھے اور آپ نے حساب کر کے بتلا دی تو اگر وہ یہ کہے کہ سولہ دن کی تنخواہ کی یہ مقدار کیونکر ہو گئی، تو آپ اُس کو کیا جواب دیں گے۔ ظاہر ہے کہ یہی کہا جائے گا کہ تو فن حساب سے ناواقف ہے تیری سمجھ میں یہ نہ آئے گا۔ اور اگر تو سمجھنا چاہتا ہے تو ابتداء سے جمع تفریق، ضرب تقسیم وغیرہ سیکھ۔ اس کے بعد اس کی وجہ دریافت کرنا۔ اس پر اگر وہ یہ کہے کہ کیا میں بڑھاپے میں حساب سیکھوں گا تو آپ یہی جواب دیں گے کہ وجہ سمجھنے کے لئے تو اسی کی ضرورت ہے۔ اگر اس کی ہمت نہیں تو جو کچھ ہم کہتے ہیں اُس کو سچ سمجھو علی ہذا۔

ایسے ہی واقعات روزمرہ ہوتے رہتے ہیں۔ دیکھئے دنیوی امور میں کبھی کوئی نہیں الجھتا۔ ہمیشہ تقلید کی جاتی ہے اور دینی امور میں ہر شخص خود مجتہد ہے۔ طبیب کے پاس جاتے ہیں اور جو کچھ وہ کہتا ہے اُس کو بلا چون وچرا مان لیا جاتا ہے۔ کوئی نہیں پوچھتا کہ نسخے میں یہ دوا کیوں لکھی اور اس دوا کا یہ وزن کیوں لکھا۔ وجہ یہ ہے کہ اُس پر عمل کرنا منظور ہوتا ہے۔ جان کو عزیز سمجھتے ہیں

لکھو د کر ُید میں اندیشہ ہوتا ہے کہ طبیب بگڑ نہ جائے۔ اور دین پر عمل کرنا منظور نہیں۔ واللہ اگر دین پر عمل کرنا ہوتا تو غنیمت سمجھتے کہ ایسے لوگ موجود ہیں جو ہم کو سیدھا رستہ بتلا سکتے ہیں۔ کیونکہ جب انسان کو کوئی کام کرنا ہوتا ہے تو اُس کے متعلق عمل کے موافق علم ہو جانے کو بہت غنیمت سمجھا کرتا ہے یہ چون وچرا وہیں ہوتی ہے جہاں کام کرنا مقصود نہ ہو۔

مثلاً ایک شخص کو اسٹیشن جانا ہے اور رستے سے واقفیت نہیں تو اگر کوئی معمولی آدمی بھی کہے کہ چلو میں اسٹیشن پر پہنچا دوں تو بے تامل اُس کے ساتھ ہو لیتے ہیں کبھی یہ نہیں پوچھتے کہ تمہارے پاس کیا دلیل ہے کہ اس امر پر کہ جس رستے کو تم جا رہے ہو یہ اسٹیشن پر پہنچا دے گا۔ اور اسٹیشن سے زیادہ دُور نہ کر دے گا کیونکہ جانتا ہے کہ اس میں چون وچرا کا نتیجہ یہ ہو گا کہ خفا ہو کر یہ مجھے یہیں چھوڑ دے گا اور پھر میں نہ پہنچ سکوں گا۔

اسی طرح اگر کسی بڑے اسٹیشن پر یہ معلوم نہ ہو کہ دلی اور لکھنؤ کی جانے والی گاڑی کون سی ہے تو ایک قلی کے کہنے پر یقین آ جاتا ہے اور بغیر کچھ پس وپیش کئے ہوئے اُس کو مان لیا جاتا ہے اور اس مُفت کے علم کو غنیمت سمجھ کر قلی کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے ہاں اگر جانا ہی نہ ہو تو اُس میں نکتہ چینیاں نکالی جاتی ہیں اور اُس کو بنایا جاتا ہے کہ ہاں جناب تو یہ کیسے معلوم ہوا کہ کانپور کو یہی گاڑی جائے گی اور میں یہ کیونکر مان لوں کہ یہ دس بجے ہی چھوٹ جائے گی علیٰ ہذا۔

غرض جب تک استعداد محققانہ نہ ہو اُس وقت تک تقلید کرنی چاہیئے۔ اور جب ایسی استعداد ہو جائے تو وہ مبارک ہے اُس وقت جس قسم کے سوالات بھی (بشرطیکہ لغو نہ ہوں) چاہیں پیش کریں لیکن اس کی کچھ عادت ہو گئی ہے۔

چنانچہ اُس مؤذن نے مسح ارجل کے متعلق سوال کیا میں نے کہا کہ یہ کیسے معلوم ہوا کہ یہ قرآن ہے۔ کہنے لگا کہ علماء کے کہنے سے۔ میں نے کہا کہ جب قرآن کا قرآن ہونا علماء کے کہنے سے مان لیا تو اس کو بھی علماء کے کہنے سے مان لو کہ پیروں کا مسح نہیں ہے بلکہ غسل ہے۔ اور واقعی یہ موٹی بات ہے کہ جب علماء کے کہنے سے ایک عربی کتاب کو خدا کا کلام مان لیا تو ایک مسئلے کو علماء کے کہنے سے ماننے میں کیا تامل ہے۔

ایک شخص پرتاب گڑھ میں ملے اور فاتحہ خلف الامام کے متعلق سوال کیا۔ میں نے کہا کہ آپ کو دوسرے سب مسائل محقق ہو گئے۔ اُنہوں نے کچھ جواب نہ دیا۔ میں نے کہا کہ اچھا آپ مسلمان ہیں۔ پھر میں آپ سے دلیل پوچھوں گا اور دنیا بھر کے مذاہب کو پیش کر کے سب کی تردید کراؤں گا۔ اگر آپ ایک جگہ بھی جھجکے تو آپ مقلد ہیں۔ اور جب کہ آپ اصل مذاہب میں مقلد ہیں، تو فرعی مسائل میں تقلید کرتے کیوں عار آتی ہے۔

بات وہی ہے کہ اس وقت لوگوں کو کام کرنا مقصود نہیں ہے ورنہ کام کرنے والوں کی صورت ہی اور ہوتی ہے۔ اس لئے میں کہتا ہوں کہ ترجمہ اُس وقت تک کافی نہیں ہے جب تک کسی

عالم سے اُس کو پڑھ نہ لیا جائے۔ اگر خود پڑھنے کا شوق ہو تو لفظ ہی پڑھنے چاہئیں کیونکہ خود مطالعہ کرنے سے مطلب حل نہیں ہو سکتا۔ اس کی ایسی مثال ہے کہ اگر قانون میں امتحان دینا چاہیں اور کسی سے پڑھا نہ ہو تو ہرگز پاس نہ ہوں گے اور جب لکھنے بیٹھیں گے بیسیوں شبہے پڑیں گے اور اپنی سمجھ کو ہرگز کافی نہ سمجھا جائے گا۔ تو جب ایک معمولی قانون میں یہ حالت ہے تو قرآن ہی اس قدر سستا کیوں ہو گیا کہ ہر شخص اس میں محقق ہے اور اپنی ساری تحقیقات اس میں ختم کر دی گئی ہیں۔ علماء سے مزاحمت کی جاتی ہے۔

مضامین قرآن کی نوعیت

عرض میں یہ بیان کر رہا تھا کہ یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ جب قرآن بہت آسان ہے تو ہر شخص کو محقق بننے کی اجازت کیوں نہیں دی جاتی۔ تو بات یہ ہے کہ الفاظ اور ترجمہ آسان ہے لیکن اخذ اور استنباط بہت مشکل ہے۔ اس کے لئے اجتہاد کی ضرورت ہے اور اس کے لئے کچھ سامان کی ضرورت ہے اور وہ ہمارے پاس نہیں ہے۔ تو قرآن کا یہ جزو مشکل ہے باقی آسان۔ اور دلائلِ توحید بھی اس اعتبار سے آسان ہیں کہ جو شخص مجتہد بھی نہ ہو، وہ بھی ان کو سمجھ سکتا ہے۔

اب سمجھئے کہ اگر دلائلِ توحید میں سائنس کے مسئلے مذکور ہوتے تو توحید کا سمجھنا اُن کے علم پر موقوف ہوتا اور وہ خود نظری ہیں تو توحید بدون اُن کے سمجھے ہوئے ثابت نہ ہوتی اور مخاطب اُن دلائل کے عرب کے بادیہ نشین تک ہیں۔ تو وہ توحید کو کیسے جانتے۔ تو یہ نقصان

ہے قرآن میں مسائلِ سائنس کو داخل کرنے کا کہ اصل مقصود ہی اڑا جاتا ہے ۔۔۔۔۔

یہی وجہ ہے کہ گو قرآن میں جگہ جگہ سمٰوات اور ارض ہیں لیکن سمٰوات بہ صیغہ جمع اور ارض بہ صیغہ واحد لایا گیا تاکہ مقدمات میں شغب نہ ہونے لگے۔ پھر مستقل دلیل سے بتلا دیا کہ زمین بھی سات ہیں۔ چنانچہ بعض کو اس پر بھی اعتراض ہے کہ ہم تو سب جگہ پھرے ہم کو تو کوئی دوسری زمین نہیں ملی۔ اور ارض کا ترجمہ حدیث تعددِ ارض میں اقلیم کا کیا اور غضب تو یہ ہے کہ بعض اہل علم نے بھی یہ لکھا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ جب قرآن میں بعد سبع سمٰوات طباقاً کے من الارض مثلھن فرمایا ہے تو اقلیم ترجمہ کرنے کی گنجائش کہاں ہے۔ اور حدیث میں صاف آگیا ہے کہ سات آسمان ہیں اور ہر دو آسمان کے درمیان ۵۰۰ برس کی راہ ہے۔ پانچ سو برس سے مراد کثرت ہے۔ اس کے بعد زمین کے متعلق یہی فرمایا۔ اب اقلیم کی تاویل کیسے چل سکتی ہے رہا یہ اشکال کہ ہم کو دوسری زمین نظر نہیں آتی۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ ممکن ہے آپ نے اس کو کوکب سمجھا ہو۔ مثلاً ان ہی سیاروں میں سے چند سیارے ہوں۔

افسوس ہے کہ مسلمان اگر ایک بات کو اپنے لوگوں کے منہ سے سنتے ہیں تو یقین نہیں کرتے۔ اور اگر اسی بات کو دوسری قومیں کہہ دیتی ہیں تو صحیح سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ اسی زمین کے مسئلے کے متعلق علماء مدت سے کہہ رہے ہیں اور لوگ یقین نہیں کرتے اور اب چند روز سے جو دوسری قومیں مریخ کے بارے میں اپنے خیالات ظاہر

کر رہی ہیں جن سے بعض امور میں اُن کا مشابہ اس زمین کے ہونا معلوم ہوتا ہے، اُن کا یقین کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ دیکھئے کتنی بڑی اور کتنی نئی تحقیق ہے۔

غرض ممکن ہے کہ یہ سیارے ہی وہ زمین ہو اور کوئی دوسری مخلوق وہاں رہتی ہو جس کی تعیین ہم نہیں کر سکتے نہ ہم کو بتلایا گیا اور نہ اُس کی ضرورت۔ اور ہم کو اپنی تو خبر ہی نہیں دوسری مخلوق کی کیا خاک خبر ہو سکتی ہے۔ ہماری وہ حالت ہے ؎

تو کارِ زمیں را نکو ساختی
کہ با آسماں نیز پرداختی

ہماری وہ حالت ہے کہ جیسے ایک شخص ہے کہ اُس پر فوجداری کے بہت سے مقدمات قائم ہیں مگر وہ احمق اپنی فکر کو چھوڑ کر سارے الہ آباد کے مقدمات کی تحقیق کرتا پھرے۔ ظاہر ہے کہ اگر اُس کو ذرا بھی عقل ہوتی تو وہ ان سب کو چھوڑ کر اپنے مقدمات کی فکر کرتا اسی طرح جو لوگ دنیا بھر کی تحقیقات میں لگے ہوئے ہیں اور اپنی خبر نہیں لیتے حالانکہ اُن پر تعزیراتِ الٰہیہ کی بہت سی دفعات عائد ہو رہی ہیں۔ یہ اُن کی سخت نادانی اور غفلت ہے۔

غرض ہم کو بتلایا نہیں گیا لیکن ممکن ہے کہ کچھ مخلوق چاند اور مریخ وغیرہ میں ہو۔ پس نصوص کی تکذیب کی کوئی ضرورت نہیں۔ تو باوجودیکہ یہ بات ثابت تھی مگر پھر بھی قرآن میں ارضین نہیں فرمایا بلکہ ارض بصیغۂ واحد ارشاد فرمایا۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ مقصود صرف یہ ہے کہ ان مصنوعات

سے توحید پر استدلال کیا جائے اور استدلال مقدماتِ مسلّمہ سے ہوا کرتا ہے۔ تو اگر ارضین فرماتے تو اصل مقصود تو ثابت نہ ہو سکتا اور یہ مسئلہ گفتگو کے قابل ہو جاتا۔ اور اب یہ ہوا کہ جو لوگ واقف ہیں وہ لفظِ ارض ہی سے جو کہ اسم جنس ہے قلیل کثیر سب کو شامل سمجھ لیتے ہیں اور جو لوگ واقف نہیں وہ بھی بوجہ ایک ارض کے محسوس ہونے کے نفسِ استدلال کو بخوبی سمجھ گئے۔ تو معلوم ہوا کہ قرآن میں کسی ایسے مسئلے سے کام نہیں لیا گیا جس سے سامع کو اُلجھن ہو۔ تو اگر سائنس کے مسئلے اس میں ہوتے تو سامعین اُن کی تحقیق میں پڑ جاتے اور ہر شخص کو اُس کے آلات و ذرائع کی تحصیل ممکن نہ تھی تو ہر شخص ایک اُلجھن میں پڑ جاتا۔ نیز ان میں اختلاف اس قدر ہے کہ آج تک بھی کوئی بات محقق نہیں ہوئی۔ دیکھئے قطب تک پہنچنے میں جو کہ محسوس ہے کس قدر اختلاف ہے۔ پس مسائلِ محققہ کی بنا ان پر کیوں کر ہو سکتی ہے تو واجب ہے کہ قرآن کو سب سے خالی کیا جائے یہی قرآن کی خوبی ہے اور ہر فن کے لئے یہی بات خوبی کی ہوتی ہے۔ نحو کی خوبی یہ ہے کہ اُس میں طب کے مسئلے نہ ہوں۔ طب کی خوبی یہ ہے کہ اُس میں زراعت تجارت کے مسئلے نہ ہوں۔ اگر طب کی کتاب میں ہر ورق کے بعد زراعت اور تجارت کا بھی ایک ایک مسئلہ ہو تو تمام عقلاء اُس کو ہنسیں گے۔ اس لئے کہ طب کی کتاب میں ان مسائل کا ہونا بے موقع ہے۔

اس موقع پر مجھے یاد آیا ہمارے وطن میں ایک شاعر تھے اب اُن کا انتقال ہو گیا ہے۔ اُنہوں نے اپنا ایک دیوان مرتب کیا تھا

نہایت ہی بیہودہ، اُس میں ردیف ضاد نہ تھی۔ لوگوں نے کہا جناب اس میں ردیف ضاد نہیں ہے۔ کہنے لگے کہ دوسری کسی ردیف میں سے ایک غزل لے کر ہر شعر کے آخیر میں لفظِ مقراض بڑھادو اور ردیف ضاد میں لکھ دو۔ اب غور کیجیئے کہ اُن کی اس حرکت کو کس نظر سے دیکھا جارہا ہے۔ کیا آپ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ قرآن بھی ایسا ہی دیوان ہو کہ اُس میں تمام ردیفیں ہوں گو بے ربط ہوں۔

قرآن کی تعلیمِ امن

قرآن نے صرف دو چیزوں کا اہتمام کیا ہے ایک امنِ عام کہ اس دنیا میں رہ کر یہ حالت ہو کہ ؎

کسے را با کسے کارے نباشد

میں کہتا ہوں کہ جو امن قرآن نے سکھلایا ہے کسی قانون نے نہیں سکھلایا لیکن افسوس ہے کہ اس وقت لوگ مسلمانوں کو شورش پسند کہتے ہیں حالانکہ اگر موازنہ کر کے دیکھا جائے تو مسلمانوں سے زیادہ امن پسند اور عافیت جُو کوئی قوم دنیا میں نہیں ہے۔ مثال کے طور پر ایک جزئی بیان کرتا ہوں۔ جمعہ کے متعلق فرماتے ہیں :

اِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ

وہ مجمع جو کہ محض خدا تعالیٰ کی عبادت کے لئے اور خدا تعالیٰ کے سامنے سر جھکانے کے لئے جمع ہوا ہے اُس کو بھی یہ حکم ہو رہا ہے کہ جب اپنا کام کر چکو تو جمع رہنے کی کوئی ضرورت نہیں سب منتشر ہو جاؤ کیونکہ ممکن ہے فضول اجتماع سے کوئی خرابی پیدا ہو گے فرماتے ہیں وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ۔ جس سے مقصود یہ ہے کہ

منتشر ہو کر بھی اِدھر اُدھر مارے مارے نہ پھرو۔ کیونکہ اس میں پھر فساد کا احتمال ہے۔ بلکہ رزقِ حلال کی تلاش میں لگو۔ پھر فرماتے ہیں وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا یعنے خدا تعالیٰ کو بہت یاد کرو کیونکہ اصل مقصود یہی ہے کہ خدا تعالیٰ کا قرب حاصل ہو۔ تو حق تعالیٰ کے اس کلام سے معلوم ہوا کہ مجمع بلا ضرورت نہ ہونا چاہیئے اور اگر کسی ضرورت سے ہو تو ضرورت کے ختم ہو جانے پر سب کو منتشر ہو جانا چاہیئے۔ غور کیجیئے کہ نمازیوں کا مجمع جس میں شورش و فساد کا احتمال ہی نہیں ہے مگر چونکہ خدا تعالیٰ جانتے ہیں کہ انسان ضعیف ہے۔ عجب نہیں کہ اس میں تُو تُو مَیں مَیں ہو جائے اگرچہ جُوتی پیزار نہ ہو۔ اس لئے حکم فرما دیا کہ سب منتشر ہو جاؤ۔

غرض ایک تو قرآن میں امن کی رعایت ہے دوسرے خدا تعالیٰ کی رضا جوئی۔ ان دو امر کے سوا اگر کوئی تیسرا مسئلہ آ گیا ہے تو وہ اُن کے تابع ہو کر آیا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ قرآن میں ان کے سوا اور کوئی مسئلہ نہ ڈھونڈھنا چاہیئے۔ علیٰ ہٰذا اگر حکایتیں قرآن میں ہیں تو وہ بھی ان ہی کی خادم ہو کر ذکر کی گئی ہیں کہ فلاں قوم نے یہ کیا تھا تو اُن کو یہ سزا ملی اور فلاں قوم نے یہ کیا تھا تو اُن کو یہ اجر ملا ہم اگر ایسا کریں گے تو ہم کو بھی ایسی ہی سزا یا اجر ملے گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جہاں جُمل خبریہ ہیں اُن سے مقصود جُمل انشائیہ ہی ہیں ـــــ،

چنانچہ اس مقام پر بھی یہی ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کی دُعا نقل فرمائی۔ جس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ اغتناء فی الدین نہایت

ضروری ہے۔ جس کی تفصیل آیت میں ہے۔ ترجمہ آیت کا یہ ہے کہ اے ہمارے رب! ہماری اولاد میں سے ایک رسول پیدا کر کہ وہ اُن کو تیری آیات سنادے اور اُن کو کتاب اور حکمت کی تعلیم کرے۔ اور اُن کو پاک کرے ——— اس حکایت کے نقل کرنے سے مقصود یہ ہے کہ اے سننے والو سمجھ جاؤ کہ ضروری چیزیں یہ ہیں جن کا اہتمام حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کیا اور سمجھ کہ ہم سے دُعا کی۔

اب سمجھنا چاہیئے کہ وہ ضروری چیزیں کیا ہیں۔ سو وہ منفصلاً تو تین چیزیں ہیں۔ یَتْلُوْا اور یُعَلِّمُ اور یُزَکِّیْ۔ اور مجملاً ایک چیز ہے جس کو دین کہتے ہیں۔ کیونکہ یہ سب دین ہی کے شعبے ہیں اس لئے کہ دین مرکب ہے دو چیزوں سے ایک علم اور دوسرا عمل جیسے فنِ طب کہ اُس میں اوّل علم کی ضرورت ہوتی ہے پھر عمل کی ———

رُوحانی امراض کی تشخیص

تو قرآن بھی حقیقت میں طبِ روحانی ہے کہ اُس میں روحانی امراض کے علاج کے قواعد اور جزئیات بتلائے گئے ہیں۔ امراض خواہ متعلق قلب کے ہوں یا جوارح کے۔ اور امراضِ قلب کا مرض ہونا حواس سے معلوم نہیں ہوتا بلکہ وجدان سے معلوم ہوتا ہے اور جب تک وجدان صحیح نہیں ہوتا اُس وقت تک اس کی اطلاع بالدلیل ہوتی ہے۔

وہ دلیل یہ ہے کہ اطاعتِ خداوندی صراطِ مستقیم ہے اور

صراطِ مستقیم سے خارج ہونا اعتدال سے خارج ہونا ہے کیونکہ خطِ مستقیم ایک ہی خط ہوتا ہے یعنی اگر دو نقطوں کے درمیان بہت سے خطوط سے اتصال کیا جائے تو اُن خطوط میں خطِ مستقیم ایک ہی ہوگا جو کہ سب سے اقصر ہو۔ باقی سب ٹیڑھے ہوں گے اور اعتدال سے خارج ہونا مرض ہے۔ تو خدا تعالیٰ کی نافرمانی کرنا مرض ہوا اور اس سے معلوم ہوا ہوگا کہ سب طریقوں سے مختصر طریق اور اقصر طریق شریعتِ اسلامی ہے۔ تو اس اعتدال سے جب کوئی خارج ہوگا وہ مریض کہلاوے گا اور قرآن میں اس کو مرض کہا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ۔ اس کی تفسیر جب تک کہ وجدان صحیح نہ ہو سمجھ میں نہیں آسکتی کیونکہ اس کے مرض ہونے کی صفت امر باطن ہے جو حواس سے ادراک نہیں ہوتا۔ لیکن جب وجدان صحیح ہو جاتا ہے تو اُس کا مرض ہونا وجدان سے معلوم ہو جاتا ہے۔ جیسے امراض ظاہری کی حالت ہے کہ بعض اوقات وجدان سے معلوم ہو جاتا ہے اور بعض اوقات نہیں ہوتا۔ تو جیسے امراضِ طبیہ میں بعض امراض وجدانی ہیں اسی طرح امراض باطنی بھی وجدانی ہیں کہ جب وجدان صحیح ہوتا ہے تو اُن کا ادراک ہوتا ہے۔

اس کا ایک امتحان بتلاتا ہوں۔ وہ یہ کہ جب کوئی گناہ ہو جائے تو دیکھئے کیسی تکلیف اور رنج ہوتا ہے۔ اور اپنے نفس کو انسان کیسی ملامت کرتا ہے۔ اگر کوئی کہے کہ ہم کو تو کبھی نہیں ہوتا دن رات گناہ کرتے ہیں لیکن کچھ بھی تکلیف و رنج کا احساس نہیں ہوتا۔ تو میں کہوں گا کہ اس کا سبب یہ ہے کہ ابتدا سے آج تک یہ شخص مرض

ہی میں مبتلا ہے۔ صحت کبھی نصیب ہی نہیں ہوئی کہ اس کی راحت کا احساس ہو۔ اور اُس سے مرض گناہ کی کلفت کا احساس ہو۔ اس شخص کی ایسی مثال ہے جیسے ایک اندھا مادر زاد کہ اُس کو یہی ادراک نہیں ہو سکتا کہ میں اندھا ہوں کیونکہ عمٰی عدم البصر کو کہتے ہیں تو جس کو بصر کا ادراک نہ ہو اُس کو عمٰی کا ادراک کیوں کر ہو گا۔ تو مریض بھی اپنے کو ویسا ہی سمجھے گا اور مرض کی کلفت بھی اُسی کو ہو گی جس نے کبھی صحت دیکھی ہو۔ پس جو شخص یہ کہتا ہے کہ ہم کو تو کبھی تکدر نہیں ہوتا۔ تو وجہ اس کی یہ ہے کہ اُس کو کبھی انشراح ہی نہیں ہوا۔ اُس کو چاہیئے کہ انشراح پیدا کرے۔ اُس کے بعد دیکھے کہ اگر کبھی کوئی گناہ ہو جاتا ہے تو اُس میں کس قدر تکلیف ہوتی ہے۔

کم از کم یہی کرے کہ امتحان ہی کے لئے ایک ہفتہ کی رخصت اپنے معمولی کاموں سے لے اور کسی صاحب برکت کے پاس جا کر رہے اور اُس سے اللہ کا نام پوچھ کر جس طرح وہ بتلاوے ایک ہفتہ تک کام میں مشغول رہے۔ کام میں مشغول ہونے کے بعد دیکھے گا کہ دل کی ایک نئی حالت ہو گئی جو کہ اس سے قبل نہ تھی۔ اس کو محفوظ رکھئے۔ پھر دیکھئے کہ پہلی حالت اور اس جدید حالت میں کوئی فرق ہے یا نہیں۔ واللہ آپ دیکھیں گے کہ پہلی حالت نہایت مکدر تھی اور اب ایک صحت نصیب ہو گئی ہے اور ایک قسم کا انشراح قلب ہے۔

اسی لئے میں نے کہا تھا کہ جب وجدان صحیح ہو جاتا ہے، تو اس سے اس کا مرض ہونا معلوم ہو جاتا ہے۔ تو اس کی کوشش کیجیے کہ

وجدان صحیح ہوتا کہ مرض کا مرض ہونا تو معلوم ہو جائے کہ اس کے بعد علاج پر توجہ ہو۔ دیکھئے اگر معمولی زکام ہو جاتا ہے تو اس کے لئے کس قدر اہتمام کیا جاتا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ اتنا بڑا مرض ہم کو لگ رہا ہے کہ ہماری روح اُس میں تحلیل ہو رہی ہے لیکن ہم کو ذرا فکر نہیں ہے۔

قرآن نے ہم کو اس کا علاج بتلایا ہے اور ایسے مضار پر اطلاع دی ہے۔ تو قرآن مطب روحانی ہے۔ اس میں صرف دو چیزیں ہیں ایک علم اور دوسرا عمل۔ یُزَکِّیْ میں عمل کی طرف اشارہ ہے اور یُعَلِّمُ میں علم کی طرف۔ حاصل یہ ہوا کہ اے سننے والو! اہتمام کے قابل دو چیزیں ہیں علم اور عمل۔ انہی کا اہتمام حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا۔

پھر علم میں دو مرتبے ہیں۔ ایک الفاظ اور ایک معانی۔ کیونکہ کسی چیز کے جاننے کی شان یہ ہوتی ہے کہ اُس میں کچھ الفاظ ہوتے ہیں اور کچھ اُن الفاظ کے معانی۔ خواہ اردو میں ہوں یا عربی میں، خواہ باقی علم ہو یا کتاب سے، تو گویا ترتیب کسی فن کے جاننے کی یہ ہوتی ہے کہ اوّل الفاظ کا تحقق ہوتا ہے اور پھر دلالت علی المعانی اور پھر اُن کی حقیقت کا انکشاف اور پھر عمل مثلاً اگر کسی طبیب سے کوئی نسخہ دریافت کیا تو اوّل اُس کے الفاظ معلوم ہوئے۔ پھر اُن الفاظ سے معانی پر دلالت ہوئی۔ پھر اُن کی حقیقت کا انکشاف ہوا۔ ان سب مراتب کے بعد اُس نسخے پر عمل کیا گیا۔ یہی ترتیب عقلی دین میں بھی ہے۔

دین کی آسانی

خدا تعالیٰ کی رحمت ہے کہ اُس نے دین کی کوئی عجیب مشکل نہیں بنائی بلکہ جو ترتیب ہمارے روزمرہ امور میں ہے وہی ترتیب اُس میں بھی رکھی کہ سہولت ہو۔ حالانکہ دین وہ چیز ہے کہ اگر اس کا ڈھنگ بالکل نرالا اور سخت بھی ہوتا تب بھی اُس کو بکوشش حاصل کرنا چاہیئے تھا۔ کیونکہ دین کے حاصل کرنے میں ہمارا ہی نفع ہے نہ کہ خدا تعالیٰ کا اور نہ حاصل کرنے میں ہمارا ہی نقصان ہے ——— جیسے کوئی طبیب کڑوا نسخہ لکھ دے تو اُس کے پینے سے جو کچھ نفع ہوگا مریض کو ہوگا اور نہ پینے سے بھی جو کچھ ضرر ہوگا مریض کو ہوگا۔ چنانچہ خدا تعالیٰ نے اس مضمون کو دو ٹوک کر کے فرما دیا ہے کہ

مَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ط

اور قرآن میں بہت سی جگہ یہ مضمون آیا ہے کہ ہمارا نہ کوئی نفع تمہارے ایمان سے اور نہ کوئی ضرر تمہارے کفر سے۔ اور یہ فرمانا ایسا ہے جیسے کوئی طبیب کہنے لگے کہ اگر تم دوا پیو تو ہمارا کیا نفع اور نہ پیو تو ہمارا کیا ضرر۔ بلکہ حکیم کو تو ایک گونہ نفع بھی ہے۔ خدا تعالیٰ کو تو کچھ بھی نفع نہیں۔ اس واسطے کہ خدا تعالیٰ کے لئے استکمال بالغیر محال ہے۔ ہر چیز اُن کے افادۂ وجود کی محتاج ہے مگر وہ کسی امر میں کسی کے محتاج نہیں ہیں۔ آفتاب عالمتاب عطر خانہ اور گھورہ سب پر روشن ہے۔ لیکن نہ اُس کو عطر خانہ سے خوشبو پہنچتی ہے نہ گھورے سے بدبو۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

ما بری از پاک و ناپاکی ہمہ
وز گرانجانی و چالاکی ہمہ

کہ ہم تو ایسے مقدس ہیں کہ پاکی سے بھی پاک ہیں۔ پاکی سے پاک ہونے کے معنی یہ ہیں کہ جیسی پاکی تم سمجھتے ہو ہم اُس پاکی سے پاک ہیں۔ کیونکہ انسان کتنی بھی تقدیس کرے لیکن احصاء غیر ممکن ہے حضور صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم فرماتے ہیں۔

لآ احصی ثناء علیک انت کما اثنیت علی نفسک

واقعی بڑی سے بڑی تعریف اور تقدیس بھی اُس کے واقعی تقدس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔ اس کی مثال مولانا نے بیان فرمائی ہے کہ ؎

شاہ را گوید کسے جولاہہ نیست
ایں نہ مدح ست او مگر آگاہ نیست

یعنی اگر کوئی شخص بادشاہ کی یہ تعریف کرے کہ آپ اتنے بڑے آدمی ہیں کہ جولاہے نہیں ہیں تو کیا اس کو کوئی مدح کہے گا — ہرگز نہیں اسی طرح ہمارے فہم کے موافق ہمارے نفع کے لئے تسبیح کو مشروع قرار دیا گیا ہے۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

من نگردم پاک از تسبیح شاں　　　پاک ہم ایشاں شوند دُر فشاں

یعنی لوگوں کی تسبیح اور تقدیس سے ہم پاک نہیں ہو گئے بلکہ اس سے وہی پاک ہو گئے۔ غرض خدا تعالیٰ کی شان یہ ہے کہ وہاں نہ نفع پہنچے نہ ضرر۔ حدیث میں ہے کہ اگر ساری دنیا مطیع ہو جائے، تو خدا تعالیٰ کی سلطنت میں اتنا بھی اضافہ نہیں ہوتا جتنا مچھر کا پر۔ برخلاف یہاں کے سلاطین کے کہ جس قدر رعایا اطاعت کرے سلطنت زوردار ہے اور اگر رعایا اطاعت نہ کرے تو سلطنت کمزور ہے۔ وجہ یہ ہے

کہ دُنیا کے بادشاہ رعایا کے بنائے ہوئے ہیں اور خدا تعالیٰ خود بالذات کامل ہیں۔ لہٰذا رعایا کو خود اپنے نفع کی فکر کرنی چاہیئے۔ اللہ تعالےٰ کو اُن کی عبادت سے کچھ بھی نفع نہیں ہے۔

غرض طبیب کہ جس میں بوسائطِ بعیدہ نفع کا احتمال ہے جب اُس طبیب کو حق ہے وہ جیسا نسخہ چاہے تجویز کرے۔ تو خدا تعالےٰ کو اُس سے زیادہ حق ہے کہ جیسا قانون چاہئے مقرّر کرتے کیونکہ وہ حاکم علی الاطلاق بھی ہیں اور اُس میں ہمارا ہی نفع بھی ہے مگر یہ اُن کی رحمت ہے کہ اُنہوں نے نہایت آسانی اور سہولت رکھی ہے۔ مگر افسوس ہے کہ لوگ اس پر عمل کرتے بھی جان چُراتے ہیں۔ علماء سے درخواست کی جاتی ہے کہ احکام میں کچھ آسانی کر دو۔ گویا یہ سمجھتے ہیں کہ احکامِ شریعت کی تبدیل و تغییر بالکل علماء کے ہاتھ میں ہے۔

مجھے ایک بڑھیا کا واقعہ یاد آیا ہے کہ جب وہ حج کو گئی اور صفا مروہ کے درمیان سعی کرنے لگی تو دو تین پھیرے کر کے مطوّف سے کہنے لگی کہ اب تو مجھ سے نہیں ہو سکتے۔ خدا کے لئے اب تو مجھے معاف کر دو۔ تو جیسے وہ بڑھیا یہ سمجھتی تھی کہ مطوّف کے معاف کر دینے سے معاف ہو جائیں گے۔ اسی طرح یہ لوگ بھی سمجھتے ہیں۔

ایک رئیس والیِ ملک ایک بڑے حاکم سے ملنے کے لئے گئے یہ رئیس بہت دُبلے ہو رہے تھے۔ اُس حاکم نے پوچھا کہ آپ اس قدر دُبلے کیوں ہو رہے ہیں؟ اُنہوں نے کہا کہ آج کل رمضان کا مہینہ ہے۔ روزہ رکھنے کی وجہ سے دُبلا ہو رہا ہوں۔ کہنے لگا کہ آپ اپنے پادریوں سے کمیٹی کرا کے اُن کو فروری کے مہینے میں کیوں نہیں کرا

لیتے۔ اُنہوں نے کہا کہ جناب اس قسم کے اختیارات آپ ہی کی کمیٹی کو ہیں۔ ہمارے علماء کی کمیٹی کو ایسے اختیارات نہیں ہیں۔

غرض پہلے تو غیر قومیں اس قسم کی درخواستیں پیش کرتی تھیں۔ مگر افسوس ہے کہ اب مسلمان بھی اس قسم کی درخواستیں پیش کرنے لگے ہیں بلکہ یہاں تک ستم ہونے لگا ہے کہ لوگ درخواست سے گزر کر رائے دینے لگے ہیں کہ ضرور ایسا کرنا چاہیئے۔

میں ایک مرتبہ لاہور گیا تو بہت سے خیر خواہانِ قوم نے یہ طے کیا کہ اس وقت سود کے مسئلہ پر گفتگو ہو جانی چاہیئے۔ چنانچہ ان کی خواہش پر گفتگو کی گئی لیکن جلسہ گفتگو کا خاص تھا یعنی صرف علماء تھے سب لوگ مشتاق تھے کہ دیکھئے کیا تجویز ہوتا ہے۔ حالانکہ وہاں اس کے سوا کیا تجویز ہو سکتا تھا جو کہ تیرہ سو برس سے چلا آرہا ہے اس واسطے کہ اہلِ علم میں سے کس کی وہ ہمت ہو سکتی تھی جو کہ آج کل کے نوجوان ہمت کرتے ہیں۔

چنانچہ ایک صاحب نے ایک رسالہ میں حَرَّمَ الرِّبٰوا میں یہ تحریف کی کہ ربٰوا کو بضمِ را کہا اور اس کے معنی اُچکنے کے لئے۔ میں کہتا ہوں کہ اس سے سیدھی بات تو یہ تھی کہ زنا ہی کہہ دیتے کیونکہ زنا عربی کا لفظ تو ہے۔ رُبا تو عربی کا لغت بھی نہیں بلکہ ربودن سے فارسی کا لغت ہے۔ ربا رسمِ خط کا اشکال سورۂ بالضمِ الرّا بھی واؤ سے نہیں ہے۔

اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے مشہور ہے کہ ایک شخص اپنی ماں کو کچھ نہ دیتا تھا۔ اس نے جا کر ایک عالم سے شکایت کی۔ اُنہوں نے

لڑکے کو بلا کر اس کا سبب پوچھا۔ کہنے لگا اگر قرآن شریف میں ماں کا حق کہیں نکل آئے تو میں ضرور دوں گا۔ چونکہ یہ بالکل جاہل تھا۔ اس لئے ان کو فکر ہوئی کہ کوئی ایسی سبیل ہو کہ اس کی سمجھ میں بھی آجائے آخر کہنے لگے کہ تو نے کچھ قرآن بھی پڑھا ہے۔ اس نے کہا کہ دو چار سورتیں پڑھی ہیں۔ کہنے لگے کہ تَبَّتْ یَدَآ اَبِیْ لَہَبٍ پڑھی ہے اس نے کہا ہاں۔ جب اس نے تبت پڑھی اور اس میں مَا کَسَبَ پڑھا تو کہنے لگے کہ دیکھ اس میں تو لکھا ہے کہ ماں کا سب یعنی سب کچھ ماں ہی کا ہے تیرا کچھ بھی نہیں۔ لڑکے نے کہا کہ مولوی صاحب اب دیا کروں گا۔ تو انہوں نے تو ایک ثابت شدہ مسئلے کو اس جاہل کے ذہن نشین کرنے کے لئے محض ظرافت کے طور پر ایک اردو کے جملے کو قرآن کا جزو کہا تھا۔ لیکن اس ظالم نے قرآن میں صریح تحریف کی کہ ربوا کو حلال کرنے کے لئے اس کی حرمت کو قرآن سے اڑانا چاہا۔

قرآن میں تحریف کی کوشش

غرض ہر شخص قرآن اور احکام شریعت کے متعلق ایک نئی رائے اور تجویز رکھتا ہے گویا قرآن ایک بچوں کا کھیل ہے کہ ؏

ہر کہ آمد عمارتِ نو ساخت

آج کل کی اصلاح ایسی ہے جیسے کہ ایک بڑھیا نے بادشاہی باز کی کہ وہ اتفاقاً اس کے ہاتھ آگیا تھا اصلاح کی تھی۔ یعنی جب اس نے دیکھا کہ اس کے ناخن بھی بہت بڑھ رہے ہیں اور چونچ بھی ٹیڑھی ہے تو بہت کڑھی اور کہنے لگی کہ تو کس بے رحم کے ہاتھ

گرفتار ہو گیا تھا جس نے نہ نیز سے ناخنوں کی خبر لی نہ تیری چونچ کو درست کیا۔ تو کس طرح کھاتا ہو گا کس طرح چلتا ہو گا۔ اور یہ کہہ کر اُس کے ناخن اور چونچ سب قینچی سے کاٹ دیئے۔ تو جیسے اُس نے باز شاہی کی اصلاح کی تھی، ایسے ہی یہ لوگ بھی قرآن میں اصلاح کرتے ہیں۔

آخر جب وہ مجلس ختم ہوئی اور وہ مضمون شائع ہوا تو اُن لوگوں نے بہت افسوس کیا اور کہنے لگے کہ افسوس اب تک بھی علماء کو ہوش نہیں آیا کہ اتنی ضرورت ہے اور یہ لوگ ابھی تک اُس کو ناجائز ہی کہتے ہیں۔ میں نے ایک بیان میں کہا کہ ظالمو! اگر تم کو اپنی عاقبت ہی خراب کرنا ہے تو حلال کہہ کر ابد الآباد کے لئے تو برباد نہ ہو۔ تمہاری مخترعہ ضرورتیں تو اس طرح بھی پوری ہو سکتی ہیں کہ حرام سمجھو اور مبتلا رہو اور خدا تعالیٰ سے معافی چاہتے رہو۔ اپنی حرکت پر نادم رہو اور میں نے کہا کہ یاد رکھو اگر دنیا بھر کے علماء متفق ہو کر ربوا کو حلال کہہ دیں تو جو لوگ اس کو حرام سمجھتے ہیں وہ اس وقت بھی حلال نہ سمجھیں گے۔ ہاں یہ ضرور ہو گا کہ علماء کو گالیاں دیں گے کہ یہ پڑھ لکھ کر اور سمجھ بوجھ کر برباد ہوئے۔ اس واسطے کہ اس دین کا حافظ خدا تعالیٰ ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ کسی خاص جماعت کی تحریف کرنے سے یہ دین محرّف ہو سکے۔ اس دین میں انقلاب کا اگر کسی درجے میں اندیشہ تھا تو حضورؐ کی وفات پر تھا اور جب کہ حضور صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کی وفات پر بھی دین میں انقلاب نہ ہوا تو اب قیامت تک کے لئے اطمینان ہے۔ اب اس میں بگڑنے کا احتمال ہو ہی نہیں

سکتا۔ تو اگر کوئی مولوی اس میں تحریف کرنا چاہے تو نتیجہ وہی ہوگا جو اس وقت کے محرّفین کا ہو رہا ہے یعنے مردود عنداللہ وعندالناس ازیں سو راندہ ازاں سو ماندہ ؎

(نہ خدا ہی ملا نہ ربوا ہی ملا   نہ ادھر کے ہوئے نہ ادھر کے ہوئے)

غرض یہ حالت ہو رہی ہے کہ طرح طرح کے تصرفات اور تکلفات قرآن میں کیئے جاتے ہیں اور ہر شخص اپنے کو محقق فی الدّین سمجھتا ہے حالانکہ ترقی یافتہ قوم نے جن کی ہمارے بھائی تقلید کرتے ہیں اس کی بھی تحقیق کر لی ہے کہ ہر شخص ہر چیز کا ماہر نہیں ہو سکتا۔ ایک فن کا ماہر دوسرے فن میں دوسرے شخص کا مقلّد ہے ۔۔۔۔،

دیکھیئے ۔۔۔۔ اگر ایک بڑا سائنس دان کسی مکان میں قیام کرے اور کوئی انجینیر آکر کہے کہ دو گھنٹے کے اندر یہ مکان گر جائے گا تو وہ فلسفی اس کے کہنے سے فوراً مکان خالی کر دے گا۔ اور باوجود بہت بڑا فلسفی ہونے کے اس انجینیر کی تقلید کرے گا اور اس تقلید میں اس کو کچھ بھی عار نہ ہوگی۔ اور جب یہ مسئلہ مسلّم ہے تو اس کے موافق تو ضرور عمل کرنا چاہیئے اس واسطے کہ یہ آپ ہی کے پیشوا لوگوں کی تحقیق ہے۔

غرض یا تو محقق بنئے اور اس کا سامان کریئے۔ جہل کو دور کیجیئے اور علم سیکھیئے کیونکہ یہ ساری خرابی کم علمی کے سبب سے ہے اور یا تقلید کیجیئے کہ جو لوگ جاننے والے ہیں۔ وہ جو کچھ کہہ دیں اس کو صحیح سمجھیئے اور عمل کیجیئے۔ پس دین میں تسہیل کی غرض سے

اپنی رائے سے کام نہ لیجئے۔ دین مکمل ہے اور سہل بھی ہے۔

علم وعمل کی کمی

چنانچہ اس مقام پر اصلاح کی ترتیب کس قدر سہل ہماری فطرت کے موافق رکھی ہے کہ اوّل علم کی طرف اشارہ کیا پھر عمل کی طرف۔ سو اس آیت میں ان ہی دو چیزوں یعنی علم وعمل کو بیان کیا گیا ہے اور چونکہ علم کے دو شعبے ہیں جیسا کہ میں نے پہلے بیان کیا اس لئے گویا اس آیت کی مدلول تین چیزیں ہوئیں الفاظ اور معانی اور عمل اور ہم کو ان تینوں کا حاصل کرنا ضروری ہوا۔

اب دیکھئے کہ ہم نے ان تینوں جزوں کے ساتھ کیا معاملہ کر رکھا ہے۔ سو عمل تو قریب بالکل ہی مفقود ہے اور علم کا جو طریقہ ہے وہ مفقود ہے اور اس اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ علم بھی مفقود ہے لیکن خیر تھوڑا بہت مشغلہ ہے گو دنیا ہی کے لئے ہو اور جن لوگوں کو تحقیقِ حقیقت ہے وہ کچھ تھوڑا بہت عمل پر بھی متوجہ ہیں مگر ایک جزو ایسا ہے کہ اُس کو بالاتفاق سب نے چھوڑ رکھا ہے یعنی خدمتِ الفاظِ قرآن جو کہ علم کے دو شعبوں میں سے ایک شعبہ ہے۔ چنانچہ آج کل کے عقلاء کا تو اس پر اجماع ہو گیا ہے کہ قرآن کے پڑھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ چنانچہ اپنے بچوں کو قرآن نہیں پڑھاتے اور کہتے ہیں کہ بچے کے اتنے دن کیوں ضائع کئے جائیں۔ میں کہتا ہوں کہ اگر تلاوت ایک بیکار اور فضول چیز ہے تو قرآن میں جو جا بجا تلاوت کی فضیلت آئی ہے اور حکم فرمایا گیا ہے اور تلاوت کرنے والوں کی مدح فرمائی

گئی ہے، کیا یہ سب ترغیب اور حکم محض بیکار چیز پر ہے ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے۔

اُتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ ط

دوسری جگہ فرماتے ہیں۔

يَتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ

کیا قرآن کے یہ اجزا عمل کرنے کے لئے نہیں محض دیکھنے کے لئے ہیں؟ اور کیا یہ حالت پیدا کر کے ہم لوگ صاحبِ کتاب کہلانے کے مستحق ہیں ——؟

صاحبو —— اگر کسی شخص کے پاس بہت سا مال ہو اور وہ اس کو کسی ایسی جگہ رکھ دے کہ اس سے منتفع نہ ہو سکے تو کیا اس شخص کو مالدار کہیں گے۔ پس ایسی حالت میں جیسا وہ صاحبِ مال ہے ایسے ہی آپ صاحبِ کتاب ہیں۔ افسوس آپ نے ایک عظیم الشان دولت کو چھوڑ دیا ہے اور پھر آپ کو ذرا غم نہیں ہے۔ حالانکہ اگر دینی پہلو سے دیکھا جاوے تب تو قرآن ہی میں یہ حکم موجود ہے اور اگر کسی کو قرآن میسر نہ ہو تو میں عقلی قواعد کی رُو سے پوچھتا ہوں کہ آیا علومِ دینیہ کا باقی رہنا ضروری ہے یا نہیں۔ یقیناً اس کا جواب یہی دیا جائے گا کہ ضروری ہے۔ اور جب ضروری ہے تو چونکہ قرآن ان کا منبع ہے اس کا محفوظ رہنا بھی ضروری ہوگا ورنہ وہ کون سی صورت ہے کہ علم بدون الفاظ کے باقی رہ سکے۔ اگر کہو کہ عربی ہی کی کیا ضرورت ہے تو میں کہوں گا کہ ترجمہ کبھی کامل نہیں ہو سکتا کیونکہ بعض الفاظ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ وہ ذو وجوہ ہوتے ہیں

اور اُن کی مختلف تفسیریں ہوتی ہیں۔ اب اگر الفاظ کو نہ لیا جائے تو اُن کی وہ حالت ہوگی جو کہ آج کل توریت و انجیل کی حالت ہو رہی ہے کہ طالب حق کو اصل احکام معلوم ہی نہیں ہوتے معلوم ہوا کہ اصل الفاظ کا باقی رہنا نہایت ضروری ہے۔

اگر کہو پڑھنے کی کیا ضرورت ہے تو سمجھو کہ اگر پڑھنا چھوٹ جائے تو قرآن کا لکھنا اور چھپنا اور فروخت ہونا سب چھوٹ جائے اور قرآن کہیں بھی دستیاب نہ ہو۔ یہ بات اس وقت آپ کو ہلکی معلوم ہوتی ہے مگر ایک صدی کے بعد آپ دیکھئے کہ کیا حالت ہوگی۔ اور اگر دستیاب بھی ہو تو صحیح لکھا جانا اور صحت معلوم ہونا یہ سب اسی تلاوت اور حفظ کی بدولت ہے۔ اس وقت علوم دینیہ کی جو گت ہو رہی ہے ظاہر ہے۔ تو اگر تلاوت بھی بالکل ترک کر دی جائے اور لوگوں کے ذہن سے قرآن اُتر جائے اور پھر کسی لفظ یا آیت میں اختلاف ہو تو کون شخص فیصلہ کرے۔ بلکہ میں کہتا ہوں کہ علوم دینیہ اگر باقی بھی رہیں تب بھی پڑھنا چھوڑ دینے کی صورت میں قرآن مجید کی صحت نہیں ہو سکتی۔

مجھے اپنے بچپن کا قصہ یاد ہے کہ ایک مرتبہ میں نماز میں قرآن سُنا رہا تھا اور والد ماجد مرحوم سُن رہے تھے۔ میں اس زمانے میں صرف و نحو کی چھوٹی چھوٹی کتابیں پڑھا کرتا تھا۔ جب میں نے یہ آیت پڑھی۔

فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُعَذِّبُ عَذَابَهُ أَحَدٌ

تو يُعَذِّبُ کی ذال کو مفتوح پڑھا اور اپنے ذہن میں عَذَابَهُ

کی ضمیر کا مرجع نائب فاعل انسان کو اس سے قبل آیت میں مذکور ہے قرار دیا اور کسرِ ذال کی کوئی توجیہہ سمجھ میں نہ آئی۔ والد صاحب مرحوم نے لوٹا کا۔ میں نے پھر وہی پڑھا۔ انہوں نے مکرر لوٹا کا۔ میں نے پھر وہی پڑھا۔ انہوں نے تیسری بار پھر لوٹا کا تو میں نے بکسرِ ذال پڑھا لیکن دل میں یہ خیال رہا کہ والد صاحب نے صحیح نہیں بتلایا۔ جب سلام پھیرا، تو انہوں نے پوچھا کہ تم اتنا اصرار کیوں کرتے ہو۔ میں نے کہا کہ کسرہ کے معنی نہیں بنتے اس لئے غلط ہے۔ قرآن دیکھا گیا تو کسرہ نکلا۔ مارے وہم کے اور قرآن دیکھا۔ سب میں وہی کسرہ۔ آخر اپنی غلطی ظاہر ہوئی ــــ۔

یہ مثال کے طور پر اپنا ایک واقعہ بیان کر دیا ہے۔ اسی طرح اور بہت سی غلطیاں ہوتی ہیں لیکن حفظ کی بدولت وہ سب صحیح ہو جاتی ہیں۔ اور اگر حافظ باقی نہ رہیں تو باوجود علماء کے ہونے کے بھی تحریف ممکن ہے۔ تو یہ سب حافظوں کی بدولت ہے کہ قرآن صحیح موجود ہے۔ اب فرمایئے کہ حفظ کی کتنی ضرورت ثابت ہوئی بلکہ میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ اگر حفظ کرنے کا سلسلہ بند ہو جائے اور پڑھنا پڑھانا چھوٹ جائے۔ اور قرآن کے صحیح نسخے موجود ہوں تب بھی صحیح نہیں پڑھے جا سکتے۔

اس کی تائید کے لئے میں ایک واقعہ بیان کرتا ہوں۔ میرے بھائی ریل میں سوار تھے اور ایک تفسیر اُن کے ہاتھ میں تھی جو کہ ٹائپ کے چھاپے کی چھپی ہوئی تھی۔ ایک صاحب بہادر بھی اسی درجے میں سوار تھے۔ بھائی سے کہنے لگے کہ میں اس کتاب کو دیکھ سکتا ہوں

اُنہوں نے کہا کہ دیکھئے۔ آپ نے تفسیر کو اٹھا کر دیکھا۔ اوّل ہی الٓمّٓ نکلا۔ صاحب بہادر نے بہت دیر تک اُس کو سوچا۔ جب سمجھ میں نہ آیا تو بھائی سے پوچھتے ہیں یہ کیا ہے؟ آلو؟ بھائی نے تفسیر ہاتھ سے لے لی اور کہا کہ یہ آپ کے دیکھنے کی نہیں۔

اب میں کہتا ہوں کہ اپنی اس تجویز پر اُس روزِ بد کو سوچ کر دیکھئے کہ جب کہ آپ بھی اس انگریز کی طرح الٓمّٓ کو آلو پڑھنے لگیں گے واللہ! جب تک کسی پڑھے ہوئے سے نہ پڑھا جائے ممکن ہی نہیں کہ الٓمّٓ یا اس کے مثل دوسرے الفاظ کو صحیح پڑھ دیا جاوے آخر یہ کس طرح معلوم ہو گا کہ تلفظ میں الف لام را علیحدہ علیحدہ پڑھے جائیں گے۔ اور اگر کوئی کہے کہ اس کے صحیح پڑھنے کی ضرورت ہی کیا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ ایسے لوگوں سے جو اس حد تک پہنچ چکے ہوں اس وقت ہماری گفتگو نہیں ہے۔

حفظِ قرآن کی ضرورت

ایک اور دلیل حفظِ قرآن کے ضروری ہونے کی بیان کرتا ہوں اور یہ دلیل اس وقت کے مذاق کے اعتبار سے بہت عجیب دلیل ہے۔ اس کے لئے اوّل دو مقدمے سنیئے۔

پہلا مقدمہ یہ ہے کہ جتنی ارضی و سماوی کتابیں ہیں ان میں کوئی کتاب بھی ایسی نہیں ہے کہ وہ یاد ہو کر یاد رہ سکے۔ اور اگر کسی نے یاد بھی کر لیا تو بہت بڑے حافظے کی ضرورت ہے۔ اور قرآن شریف بہت جلد یاد ہو جاتا ہے اور بہت تھوڑی عمر میں لڑکے اُس کو حفظ کر لیتے ہیں۔

چنانچہ قصبہ پانی پت میں تو اگر دس برس کا بچہ حفظ نہ کر لے تو کہتے ہیں کہ کیا بوڑھا ہو کر حفظ کرے گا اور اکثر لڑکیاں بھی وہاں کی حافظ ہوتی ہیں اور سبع کی جاننے والی لڑکیاں متعدد ہیں اور قرآن کے حفظ کے ایسے عجیب و غریب قصے ہیں کہ لوگ سن کر تعجب کرتے ہیں۔

چنانچہ میرے ایک دوست برودان کے رہنے والے ہیں انہوں نے تین ماہ سے بھی کم میں قرآن حفظ کر لیا تھا۔ ایک اور میرے دوست نے اپنے پیر یعنے میرے اُستاد کو خواب میں دیکھا کہ انہوں نے اُن کو اپنے سینے سے لگایا اور اُن کے سینے میں ایک نور داخل ہوا۔ انہوں نے ایک معبّر سے بیان کیا۔ انہوں نے تعبیر یہ دی کہ تم کو قرآن حفظ ہو جائے گا۔ چنانچہ انہوں نے یاد کرنا شروع کیا۔ سو چھ ماہ میں اچھا خاصا حفظ ہو گیا۔

ایک اور قصہ یاد آیا۔ ایک واعظ مظفر نگر میں وعظ کہہ رہے تھے۔ ایک آیت میں قصداً رُکے اور حاضرین سے خطاب کیا کہ اس مجلس میں جتنے حافظ ہوں کھڑے ہو جائیں تا کہ میں اُن سے یہ آیت پوچھ سکوں۔ اس کو سُن کر ایک جماعت کثیر کھڑی ہو گئی اُنہوں نے کہا کہ صاحبو! مجھ کو آیت یاد ہے۔ میں نے صرف یہ دکھلانا چاہا کہ مسلمانوں کے اس اتفاقی اور مختصر مجمع میں جہاں خاص حفاظ ہی کو جمع نہیں کیا گیا ایسی تعداد سے مذہبی کتاب کے برزبان یاد رکھنے والے موجود ہیں۔ کیا دوسری کوئی قوم قصداً جمع کر کے بھی اس قدر تعداد اپنی مذہبی کتاب کے حافظوں کی دکھلا سکتی ہے۔ غرض قرآن مجید

بہت سہولت سے یاد ہوتا ہے۔ ایک مقدمہ تو یہ ہوا۔

دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ اس زمانے میں عقلاء اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ نیچر ہر زمانے میں اس چیز کو پیدا کرتا ہے جس کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں اس کو شرعی اصطلاح میں کہتا ہوں کہ خدا تعالےٰ ہر زمانے میں اس چیز کو پیدا کرتے ہیں جس کی ضرورت ہوتی ہے۔

ان دونوں مقدموں کے ممہّد ہونے کے بعد میں کہتا ہوں کہ کیا وجہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے یہ مادّہ طبیعت میں ودیعت کیا ہے کہ قرآن شریف بہت جلد یاد ہو جائے۔ معلوم ہوا کہ فطرۃً اس کے حفظ کی ضرورت ہے۔ تو صاحبو! اپنے نیچر کی مخالفت نہ کرو۔

سُنا ہے کہ نول کشور کے ہاں ایک پتھر پر قرآن لکھا ہوا نالی پر رکھا ہوا تھا۔ مولوی حبیب الرحمٰن صاحب سہارنپوری نے اُسے دیکھا تو اُس سے کہا، منشی صاحب! یہ تو ہمارے اور آپ کے دونوں کے نزدیک معظّم ہے۔ ہمارے نزدیک قرآن ہونے سے اور آپ کے نزدیک پتھر ہونے سے کہ مادّہ بُت کا ہے۔

اسی طرح میں کہتا ہوں کہ جو لوگ رسولؐ کے متبع ہیں اُن پر رسولؐ کے کہنے سے اور جو لوگ نیچر کے متبع ہیں اُن پر نیچر کے کہنے سے اس کی حفاظت ضروری ہے۔ پس ثابت ہوا کہ حافظ بننا ضروری ہے۔ ہاں آپ ڈریئے نہیں۔ مَیں یہ نہ کہوں گا کہ ہر شخص حافظ ہو البتہ ہر شخص پر حفظ کو ضروری سمجھنا ضروری ہے۔ مگر ضروری سمجھنے کی یہ علامت نہیں کہ صرف منہ سے کہنے لگو کہ ہم ضروری سمجھتے ہیں بلکہ اس کا ضروری ہونا دل میں رچ جانا چاہیئے۔ اور

اس کا پتہ آثار سے خود بخود چل جاتا ہے۔

دیکھئے اگر شراب نہ پی ہو تو کبھی وجد اور بے ہوشی نہیں ہوگی اگرچہ زبان سے کتنا بھی کہا جائے کہ شراب پی ہے۔ اور جب پی جائے گی تو فوراً ہی اُس کا اثر بھی ظاہر ہوگا اگرچہ اُس کو کتنا ہی روکا جائے۔

تو محض یہ کہہ دینا کہ ہم ضروری سمجھتے ہیں کافی نہیں ہے بلکہ دل سے ضروری سمجھنا چاہئے جس پر آثار بھی مرتب ہوں اور عمل بھی ہو اور اگر کہئے کہ یہ کیا ضروری ہے کہ سارے کام ہم کریں ضروری بھی ہم ہی سمجھیں اور اُس پر عمل بھی ہم ہی کریں۔ دنیا میں اور لوگ بھی تو ہیں۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہر چیز اپنے لوازم کے ساتھ ثابت ہوتی ہے۔ پس ضروری سمجھنا بھی جب کبھی متحقق ہوگا اپنے لوازم کے ساتھ متحقق ہوگا اور وہ عمل ہے۔

اس اعتراض پر مجھے ایک حکایت یاد آئی۔ حضرت مولٰنا محمود حسن صاحب سلمہٗ کے ہاں ایک طالب علم تھے نہایت ہی کم سمجھ۔ ایک مرتبہ سبق میں اُنہوں نے مولانا سے ایک سوال کیا جو متضمن ایک دعویٰ کو تھا۔ مولانا نے فرمایا کہ اس کی دلیل بیان کرو۔ تو آپ فرماتے ہیں کہ کیا ضرور ہے کہ سارے کام ہم ہی کریں۔ دعویٰ بھی ہم ہی کریں دلیل بھی ہم ہی بیان کریں۔ پس دعوٰے ہم نے کر دیا ہے دلیل آپ بیان کر دیں۔

اب غور کیجئے کہ اس حکایت پر سب کو ہنسی آتی ہے لیکن اپنے اس خیال پر کہ جب ہم حفظِ قرآن کو ضروری سمجھتے ہیں تو ہم کو عمل کی

کیا ضرورت، ہنسی نہیں آتی۔ حالانکہ دونوں واقعے ایک ہی مرتبے میں ہیں۔ صاحبو۔ غور کرنے کا مقام ہے کہ اگر سب کے سب اسی پر متفق ہو جائیں کہ ہم کو محض ضروری سمجھ لینا کافی ہے اور اس سمجھنے پر عمل ایک بھی نہ کرے تو آخر قرآن کو حفظ کون کرے گا؟ کیا یہود اور نصاریٰ کریں گے؟ اور اس وقت جو رنگ پلٹ رہا ہے اور زمانے کی رفتار میں جو تغیر ہو رہا ہے اس پر نظر کر کے یہ بھی بعید نہیں معلوم ہوتا۔ اگرچہ ابھی تک اس تغیر کی ابتدائی حالت ہے کہ سنبھالنے سے سنبھل سکتی ہے لیکن اگر اس پر توجہ نہ کی گئی تو پچاس برس کے بعد بالکل ہی نئی حالت ہوگی۔ اس واسطے کہ اس وقت مسلمانوں نے اکثر قرآن کو پڑھنا چھوڑ دیا ہے اور دوسری قوموں نے بغرض اعتراض کرنے کے پڑھنا شروع کیا ہے۔ تو اگر یہی رفتار رہی تو چند روز میں عجب نہیں کہ مسلمانوں کو اسلام سے بُعد اور ان کفار کو اسلام سے قرب ہوتا جاوے۔

دنیا کی حقیقت

اسلام سے بُعد کا پہلا زینہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر اور دین کو چھوڑ کر صرف دنیا کے حاصل کرنے پر متوجہ ہو رہے ہیں اور تحصیل دین کو مخل دنیا سمجھ رہے ہیں اور واقعی حقیقت یہ ہے کہ دنیا تو حلال دین کے ساتھ سایہ کی طرح ہے۔ اگر کوئی سائے کو پکڑنا چاہے تو اس کی صورت یہی ہے کہ اصل چیز کو حاصل کرے تو دنیا بھی جبھی حاصل ہو سکتی ہے کہ جب دین کو مضبوطی کے ساتھ اختیار کیا ہو۔ آج افسوس ہے کہ فلسفہ و حقیقت شناسی کی اتنی بڑی ترقی ہے لیکن لوگ دنیا کی

حقیقت میں ذرا غور نہیں کرتے۔ محض مال اور جاہ کی طلب کو اصل مقصود سمجھتے ہیں حالانکہ یہ امر دیکھنے کے قابل ہے کہ مال کیوں مقصود ہے اور جاہ کیوں مطلوب ہے۔

سو مال تو جلبِ منفعت کے لئے مطلوب ہے اور جاہ دفعِ مضرت کے لئے۔ یعنی ہم کو بڑائی کی اتنی ضرورت ہے کہ ظالموں کی دستبُرد سے محفوظ رہیں۔ دیکھئے سقے چمار وغیرہ بیگار میں پکڑے جاتے ہیں لیکن جو معزز لوگ ہیں وہ نہیں پکڑے جاتے کیونکہ وہ ذی جاہ ہیں اور جاہ ایک قدرتی قلعہ ہے۔ تو یہ دونوں چیزیں جلبِ منفعت اور دفعِ مضرت کے لئے ہیں۔ پس مال اس قدر کافی ہے کہ جس سے ہم منافع حاصل کر سکیں۔ اب لوگوں نے نفسِ مال کو معبودِ مطلق بنا رکھا ہے۔ تو یہ کتنی بڑی فلسفی غلطی ہے۔

صاحبو — اصل مقصود محض دین ہے۔ جب وہ حاصل ہو جاتا ہے تو دوسرے مقاصد خود بخود حاصل ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ دیکھ لیجئے کہ جو لوگ خدا کے کام میں لگے ہیں ان میں کوئی بھی پریشانی میں مبتلا نہیں بلکہ میں کہتا ہوں کہ اہل اللہ اس قدر آسائش میں ہیں کہ اہلِ دنیا کو بھی اتنی آسائش نصیب نہیں ہے اور امتحان اس کا یہ ہے کہ اوّل ایک بڑے سے بڑے دنیا دار کے پاس ایک مہینہ رہئے۔ اس کے بعد اہل اللہ میں سے کسی کے پاس ایک مہینہ بھر رہ کر دیکھئے۔ پھر دونوں کی حالت میں موازنہ کیجئے۔ آپ کو صاف معلوم ہو گا کہ وہ دنیا دار طرح طرح کے افکار میں مبتلا ہے اور یہ دین دار پریشانی سے محفوظ و مامون ہے — یہ تو مال کی غایت تھی۔

رہی جاہ، اُس میں بھی اہل اللہ اہل دنیا سے زیادہ بڑھے ہوئے ہیں۔ عزّت جس چیز کا نام ہے وہ انہی حضرات کو نصیب ہے کیونکہ عزّت دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک تو عزّت زبان سے اور ایک دل سے۔ اہل دنیا کی جو کچھ عزّت ہوتی ہے وہ محض زبان اور ہاتھ پیر سے ہوتی ہے۔ یعنی لوگ ظاہر میں اُن کی عزّت کرتے ہیں دل میں کسی قسم کی وقعت اُن کی نہیں ہوتی اور اہل اللہ کی عزّت دل سے ہوتی ہے۔

دوسرے اہلِ دنیا اور اہلِ اللہ میں اس سے بھی زیادہ ایک فرق ہے اور وہ ایک تمدّنی مسئلہ ہے۔ یعنی معزّز وہ شخص کہلائیگا کہ جو اپنی قوم میں معزّز ہو۔ ایک مقدّمہ تو یہ ہوا۔ دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ مجموعِ مرکّب میں قوم وہ جماعت ہے جس کے آحاد زیادہ ہوں۔ جیسے کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ گیہوں کا ڈھیر وہ کہلائے گا جس میں گیہوں زیادہ ہوں۔ اس پر قیاس کر کے اب میں پوچھتا ہوں کہ مسلمانوں میں زیادہ افراد کن لوگوں کے ہیں؟ غرباء کے یا امراء کے؟ ظاہر ہے کہ غرباء مسلمانوں میں زیادہ ہیں۔ تو مسلمانوں کی قوم غرباء کی جماعت کا نام ہوگا۔ اب دیکھنے کی بات یہ ہے کہ غرباء میں کس کی عزّت زیادہ ہے۔ اہل اللہ کی یا اہل دنیا کی۔ ہر شخص جانتا ہے کہ اہل اللہ کی عزّت غرباء میں زیادہ ہے۔ تو قوم کے نزدیک معزّز اہل اللہ ہوئے۔ تو اس تمدّنی مسئلے سے ثابت ہو گیا کہ مال اور جاہ سے جو امر مقصود ہے وہ اہل اللہ ہی کو حاصل ہے۔

بعض لوگ ایسے ہیں کہ وہ دنیا کو تمام مقصود نہیں کہتے لیکن دین

اور دنیا دونوں کا جامع بننا چاہتے ہیں اور اس کو بہت بڑی خوبی اور کمال سمجھا جاتا ہے مگر یہ جمع ایسا ہوتا ہے جیسے کہ ایک شخص سارے زنانے کپڑے پہن کر اُن کے ساتھ ایک ٹوپی بھی پہن لے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص اُس کو دیکھے گا ایک مسخری عورت کہے گا۔ جو لوگ جامع بن رہے ہیں اُن کو دیکھ لیجئے کہ غالب اُن کے اوپر دنیا ہی ہے مسلمان کے جامع ہونے کے معنی تو یہ ہونے چاہئیں کہ اُس پر دین غالب ہو اور حسب ضرورت دنیا بھی لیتا ہو۔ غرض مسلمانوں کے لئے یہ ضروری ہے کہ اُن میں سب کے سب دیندار ہوں۔

اہتمام خدمت دین

چونکہ معاش کی بھی ضرورت ہے۔ اس لئے کچھ افراد اس میں بھی لگیں اور کچھ افراد ایسے بھی ہونے چاہئیں کہ وہ محض خادمِ قوم ہوں کیونکہ اگر سب کے سب تحصیلِ معاش ہی میں پڑ جائیں تو دین کا سلسلہ آگے کو نہیں چل سکتا۔ مثلاً سر رشتۂ تعلیم ہی کو لیا جائے کہ اگر اُس میں کوئی نہ جائے تو ساری نوکریاں بند ہو جائیں گی۔ اسی طرح دین کے کام میں بھی اگر کوئی نہ لگے تو یہ کام بند ہو جائے گا۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ایک جماعت محض خادمانِ دین کی ہو کہ یہ لوگ اس کے سوا اور کوئی کام نہ کریں۔ اور میں اس کی ایک نظیر رکھتا ہوں کہ قانونی حکم ہے کہ جو شخص ملازم سرکار ہو وہ دوسرا کام نہیں کر سکتا۔ چنانچہ اگر کسی نے کیا تو اُس کو یا ملازمت چھوڑنے پر مجبور کیا گیا اور یا اُس کو دوسرے کام کے ترک کرنے پر مجبور کیا گیا۔

علیٰ ہذا سید صاحب کو دیکھئے کہ اُن کو دنیا کی دھن تھی تو اُس

میں کیا حالت تھی کہ اپنی زندگی اور آسائش سب اُس میں صرف کر دی۔ میں کوئی چیز نہیں ہوں لیکن یہ حالت ہے کہ جب کبھی کوئی رسالہ لکھتا ہوں تو راتوں کو نیند نہیں آتی۔ پنسل کاغذ پاس لے کر سوتا ہوں اور راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر جو کچھ یاد آتا ہے اس کو لکھتا ہوں۔ تو اگر ایسے شخص کو کوئی دوسرا کام دے دیا جاوے تو نتیجہ یہ ہو گا کہ یہ بھی خراب ہو گا اور وہ بھی۔

ایک شاعر کی حکایت مشہور ہے کہ وہ نماز پڑھ رہا تھا کہ ایک مصرعہ سوجھا۔ فوراً نماز توڑ دی اور اُس مصرعے کو لکھا۔ اگرچہ اُس کی یہ حرکت پسندیدہ نہ تھی لیکن اس سے یہ معلوم ہو گیا ہو گا کہ جب کسی کام کی دُھن ہوتی ہے تو کیا حالت ہو جاتی ہے۔ تو اس سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ ایک جماعت کا ایسا ہونا ضروری ہے کہ وہ دین کے کام کے سوا اور کوئی کام نہ کرے۔

اس جماعت پر یہ الزام بھی بالکل خلافِ انصاف ہے کہ یہ قوم کے محتاج ہیں البتہ اگر وہ تم سے مانگیں تو اُن کو جو چاہو سو کہو۔ سو بحمد اللہ اُن کا تو یہ مذاق ہے کہ ایک بزرگ سے کسی نے پوچھا کہ تم کہاں سے کھاتے ہو؟ کہنے لگے کہ ہم خدا کے مہمان ہیں اور مہمانی تین دن کی ہوا کرتی ہے اور اِنَّ یَوۡمًا عِنۡدَ رَبِّکَ کَاَلۡفِ سَنَۃٍ مِّمَّا تَعُدُّوۡنَ۔ حضرات واللہ! اس وقت بھی ایسے خدا کے بندے موجود ہیں کہ لوگ اُن کو دیتے ہیں اور وہ نظر بھی نہیں کرتے۔ اور اُن کی وہ حالت ہے کہ ؎

دلا رامے کہ داری دل درو بند
دگر چشم از ہمہ عالم فرو بند

وہ ایک ہی ذات میں ایسے منہمک ہیں کہ کسی دوسرے کی طرف التفات ہی نہیں ہوتا۔ شاہِ نیمروز نے ایک بزرگ کو لکھا (دیکھئے اس حکایت سے معلوم ہوگا کہ دینے والے درخواست کرتے ہیں اور لینے والے صاف انکار کر دیتے ہیں) کہ میں چاہتا ہوں اپنا آدھا ملک نیمروز آپ کے حوالے کر دوں۔ آپ نے جواب میں تحریر فرمایا ؂

چوں چترِ سنجری رُخ بختم سیاہ باد
در دل اگر بود ہوسِ مُلکِ سنجرم
زانکہ کہ یافتم خبر از مُلکِ نیم شب
من مُلکِ نیمروز بیک جَو نمے خرم

غور کیجئے کہ اُدھر سے اصرار ہے اور اِدھر سے سُوکھا جواب کہ ہم کو کوئی ضرورت نہیں۔ اور اس میں تصنع نہیں تھا ورنہ اثر کیوں ہوتا۔ تو جب وہ آپ سے مانگتے نہیں تو آپ کو کیا فکر ہے۔ اور جب یہ بات ہے تو آپ کیوں پوچھتے ہیں کہ یہ کہاں سے کھائیں گے

اور اگر کہئے کہ یہ تو شافی جواب نہ ہوا کیونکہ اس میں یہ تو پتہ ہی نہ چلا کہ آخر کہاں سے کھائیں گے۔ تو صاحبو یہ جواب تو میں نے معترضین کی رعایت کرکے دے دیا تھا۔

خادمِ دین کی خدمت

لیجئے اب میں اصلی جواب دیتا ہوں لیکن اس میں معترضین کی رسوائی ہوگی۔ اس جواب کے لئے اوّل میں ایک مثال پیش کرتا ہوں کہ اگر کسی شخص نے نکاح کیا اور جب بیوی اُس کے گھر آئی تو وہ

بیوی سے پوچھنے لگا کہ تم نے نکاح تو کر لیا مگر یہ تو بتلاؤ کہ تم کھاؤ گی کہاں سے۔ تو وہ بیوی اُس کو کیا جواب دے گی۔ ظاہر ہے کہ یہ جواب دے گی کہ میاں میں تمہاری جیب سے لے کر کھاؤں گی۔ اور کہے گی کہ تم کو یہ پوچھتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ اس سوال سے خود اپنی بے عزتی ظاہر کر رہے ہو۔ اور یہ جواب نہایت سچا اور حق جواب ہو گا۔

جب یہ مثال سمجھ میں آ گئی تو اب میں اس سوال کا جواب دیتا ہوں کہ یہ لوگ انہی معترضین کی جیبوں سے وصول کر کے کھائیں گے۔ اور اس سوال سے یہ معترضین اپنی قلعی کھول رہے ہیں کہ ہم میں حمیت نہیں ہے کہ خادمانِ دین کی خدمت کو ضروری نہیں سمجھا اور وجہ اس کی یہ ہے کہ یہ شرعی مسئلہ ہے کہ جو شخص کسی کام میں محبوس ہو اُس کا نان نفقہ اُس پر واجب ہوتا ہے۔ چنانچہ بیوی کا نان نفقہ اسی لئے شوہر پر واجب ہے۔ چنانچہ اگر وہ از خود اپنے گھر چلی جائے تو شوہر پر اُس کا نفقہ واجب نہیں رہتا حالانکہ بیوی اس وقت بھی رہتی ہے۔ اسی طرح قاضی کا نفقہ بیت المال میں سے دیا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ لوگوں کی ضرورت میں محبوس ہے۔

اب دیکھئے کہ بیت المال کس چیز کا نام ہے۔ سو بیت المال کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کے مال کا مجموعہ اور بلفظِ دیگر مسلمانو کا چندہ ہوتا ہے۔ مگر چندہ ذلیل لفظ ہے اور بیت المال اور خزانہ معظم لفظ ہے لیکن حقیقت ایک ہی ہے۔ چنانچہ بادشاہ کو جو خزانہ شاہی سے تنخواہ ملتی ہے وہ خزانہ کیا چیز ہے۔ کیونکہ خزانہ بھی مسلمانوں

کے پیسہ پیسہ دو دو پیسہ کے مجموعہ کا نام ہے۔ تو اگر یہ ذلت ہے تو بادشاہ نے بھی یہی کیوں لیا۔ نیز تمام حکام کو جو تنخواہ ملتی ہے وہ اسی مد میں سے ملتی ہے کیونکہ وہ اس قدر محبوس اور مجبور ہوتے ہیں کہ اگر کوئی دوسرا کام کریں تو مجرم سمجھے جاتے ہیں۔

اور لیجیئے جب کسی کو گواہی میں طلب کیا جاتا ہے تو اُس کو خوراکی دی جاتی ہے اور اس کی مقدار متفاوت ہوتی ہے یعنے بڑے آدمی کے لئے زیادہ اور ادنے درجے کے لیئے کم۔ اس میں بھی وہی راز ہے کہ اس مدت تک یہ شخص مَنْ لہ الشہادۃ کے کام میں محبوس رہا۔ یہ مسئلہ ایسا بدیہی ہے کہ کفار تک نے بھی اس کو سمجھا۔ تو خادمانِ قوم جب قوم کے کام میں لگے ہیں تو وہ بھی اپنا خرچ قوم سے لیں گے اور اگر یہاں نہ ملے گا تو خدا تعالیٰ کے ہاں نالش کر کے لیں گے۔ غرض عقلاً نقلاً دونوں طرح یہ مسئلہ ثابت ہے مگر چونکہ ہماری قوم کو اُس وقت تک تسلی نہیں ہوتی جب تک کہ دوسری اقوام کو بھی کوئی کام کرتے نہ دیکھ لیں۔ اس لئے ایک تیسری دلیل بھی بیان کرتا ہوں۔

آپ کو معلوم ہے کہ آریہ اپنے مذہب کی اشاعت میں بہت سرگرم ہیں۔ اُنہوں نے یہ طے کر لیا ہے کہ ایک جماعت اُن میں مذہب ہی کی حمایت کرنے کے لئے رہے اور تمام قوم اُن کی متکفل ہو۔ صاحبو، افسوس کی بات ہے کہ ایک ایسی قوم جس کے پاس مذہبی جماعت نہ تھی اُس نے مذہبی جماعت تیار کرنے کی کوشش کی اور تمہارے پاس ایک عظیم الشان جماعت موجود ہے

اور تم اُس کو توڑنے کی فکر میں ہو۔ لیکن یاد رکھو کہ اگر تم نہ بھی کفالت کرو بلکہ تمام لوگ اس جماعت کے مخالف ہو جائیں اور سب اس کو دینا اور مدد کرنا بند کر دیں تب بھی یہ جماعت قائم ہی رہے گی۔ اور مولوی کھاتے ہی رہیں گے۔

اگر کہئے کہ کیوں کر کھاتے رہیں گے اور کہاں سے اُن کو ملے گا تو لیجئے میں بتلاتا ہوں کہ کہاں سے اُن کو ملے گا۔ قرآن شریف میں ارشاد ہے۔

هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ط
فَمِنْكُمْ مَّنْ يَّبْخَلُ فَاِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ ط وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ
وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَ
كُمْ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ۔

حاصل ترجمہ یہ ہے کہ تم کو انفاق فی سبیل اللہ کے لئے بلایا جاتا ہے مگر بعضے بخل کرتے ہیں اور اس بخل سے اپنا ہی نقصان کر رہے ہو ورنہ خدا تعالیٰ غنی ہے۔ اور تم محتاج ہو۔ اگر تم اس سے بے توجہی کرو گے تو خدا تعالیٰ تمہارے بدلے دوسری قوم پیدا کر دیں گے جو کہ دین کی خدمت کرے گی۔ اب اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ قوم کہاں سے پیدا ہو گی۔ تو اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ روزانہ یہ سلسلۂ تخلیق جاری ہی ہے۔ اور دوسرا جواب یہ ہے کہ اس وقت تمام عالم کے انسانوں کی حالت میں غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ مسلمان ہیں وہ اسلام کے احکامات اور اس کی تعلیمات کو چھوڑ چھوڑ کر اس سے دور ہو رہے ہیں اور نا مسلم لوگ

اسلام کی خوبیوں کی وجہ سے اُس کی طرف متوجہ ہوتے چلے جارہے ہیں اور جزئیاتِ شرع کے اسرار و حکم تک بیان کرنے کا اُن کو خیال ہے۔

چنانچہ ایک ڈاکٹر نے مٹی کے ڈھیلے سے استنجا پاک کرنے کے متعلق کہا ہے کہ مٹی بہت سے قروح کا علاج ہے۔ تو پیشاب میں جو مادّہ تیزاب کا ہے اس کی مضرّت روکنے کے لئے مٹی کا استعمال مصلحت ہے۔

اسی طرح ایک اور ڈاکٹر نے کہا ہے کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد دیکھا کہ آپؐ نے فرمایا ہے کہ اگر کُتّا برتن کو چاٹ جائے تو اُس کو سات مرتبہ دھو ڈالو۔ ان سات مرتبہ میں ایک مرتبہ مٹی سے بھی دھو ڈالو۔ اس ارشاد میں مجھے یہ خیال ہوا کہ مٹی سے دھونے کو کیوں فرمایا۔ کیا سات مرتبہ پانی سے دھونا کافی نہیں۔ آخر بہت دنوں کی چھان بین اور تلاش کے بعد یہ معلوم ہوا کہ مٹی میں ایک جزو نوشادر کا بھی ہے اور نوشادر لعاب کلب کی سمیّت کا دافع ہے۔ مگر ہر جگہ وہ میسّر نہیں۔ اس لئے حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے ایسی چیز ارشاد فرمائی جو کہ ہر جگہ میسّر ہو اور آسانی سے میسّر ہو یعنے مٹی۔ تو مسلمانوں کی وہ حالت ہے اور غیر مسلموں کی یہ حالت ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمہید ہے اُس دن کی جس دن کہ عجب نہیں کہ ایسے مسلمان خارج از اسلام ہوجائیں اور ایسے غیر مسلم مسلمان ہوجائیں۔ اور اگر مسلمانوں کو اس امر کا خیال ہے کہ یہ

روزِ بد نہ دیکھنا پڑے اور حفاظتِ اسلام کی سعادت تمہارے نام رہے تو سنبھلو اور کام میں مشغول ہو جاؤ۔ مسلمانوں کا ہرا بھرا کھیت سوکھتا ہے لیکن اب بھی کچھ نہیں گیا۔ اگر ذرا سی توجہ بھی یہ کریں تو کافی ہوگا۔ ورنہ مجھے اس وقت کی حالت سے سخت اندیشہ ہے۔

غرض یہ معلوم ہو گیا کہ خادمانِ دین کی خدمت اور اُن کی مدد خود غیب سے ہوگی۔ اب جس کا جی چاہے اپنے نفع کے لئے اس سعادت کو حاصل کرے اُن کو کسی خاص شخص یا خاص جماعت کی کوئی ضرورت نہیں۔ اُن کی وہ حالت ہے کہ ع

گر نستانی بستم میرسد

اور میں اہلِ انجمن اور اہلِ مدارس کو بھی یہی رائے دیتا ہوں کہ وہ مانگنا بالکل چھوڑ دیں۔ انشاء اللہ جس دن یہ ایسا کریں گے خدا تعالیٰ اُن کو بہت کچھ دیں گے۔ ارشاد ہے۔

وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ط

تو ایک خاص جماعت تو ایسی ہونی چاہیے مگر ہر شخص چونکہ خادمِ دین نہیں ہو سکتا اس لئے اکثر کو یہ کرنا چاہیئے کہ ؎

چو باز باش کہ صیدے کنی و لقمہ دہی
طفیل خوارہ مشو چوں کلاغِ بے پر و بال

یعنے یہ لوگ کمائیں اور دوسروں کی مدد کریں۔

اہل اللہ خوار نہیں

اس حالت سے کوئی اہل اللہ کو طفیل خوار نہیں کہہ سکتا کیونکہ

وہ سرکاری لوگ ہیں۔ دیکھئے گورنر جنرل کو کثیر التعداد رقم ہر مہینے ملتی ہے حالانکہ بظاہر اُس کو کوئی ایسا بڑا کام نہیں کرنا پڑتا۔ لیکن محض اس لئے کہ اُس کا کام دماغی کام ہے۔ تو حضرات اہل اللہ پر جو گزرتی ہے اور جو دماغ سوزی اُن کو کرنی پڑتی ہے اگر آپ پر وہ گزرے تو چند روز میں جنون ہو جائے۔ اور یہیں سے یہ بات بھی معلوم ہو گئی ہو گی کہ اہل اللہ پر اپاہج ہونے کا الزام بھی بالکل غلط ہے وہ ہرگز اپاہج نہیں ہوتے۔ ہاں وہ بدن کے اعتبار سے اپاہج ہیں سو یہ فخر ہے۔ اُن کی یہ شان ارشادِ خداوندی میں مذکور ہے۔

اُحْصِرُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيعُونَ ضَرْبًا فِي الْأَرْضِ۔

تو یہ عدمِ استطاعت مایۂ فخر ہے۔ نیز یہ خود کہتے ہیں کہ ؎

ما اگر قلاش و گر دیوانہ ایم
مستِ آں ساقی و آں پیمانہ ایم

یہ اگر طفیلی ہیں اور ان کا جسم گو معطل ہے لیکن اُن کی رُوح ایک بہت بڑے کام میں ہے۔ ان کی رُوح نے اُس بارِ گراں کو اٹھایا ہے جس کے اٹھانے کی پہاڑ بھی تاب نہیں لا سکتا اور زمین آسمان سے بھی نہیں اُٹھ سکا۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

لَوْ أَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْآنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَأَيْتَهُ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ۔

اور دوسری جگہ ارشاد ہے۔

إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ
فَأَبَيْنَ أَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ ط

توجس کی روح اتنا بڑا بارِ گراں اٹھائے ہوئے ہے وہ اپاہج کیسے کہا جا سکتا ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے ؎

اے ترا خارے بپا نہ شکستہ کے دانی کہ چیست
حالِ شیرانے کہ شمشیر بلا بر سر خورند

آپ کو کیا خبر ان پر کیا گزرتا ہے۔ صاحبو! وہ اس مشقت میں ہیں جس کا ایک نمونہ یہ ہے۔

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ أَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ۔

غور کیجئے کہ حضور پُر نور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کیا گزرتی ہوگی جو یہ لفظ فرمایا گیا۔

حفاظتِ قرآن کی ذمہ داری

تو اکثر لوگ ایسے ہونے چاہئیں کہ وہ تحصیل معاش کی طرف متوجہ ہوں لیکن دیندار ہونا ان کا بھی ضروری ہے اور احکامِ شریعت پر چلنا اور دین کی حفاظت کرنا ان کو بھی لازم ہے۔ محض ضروری سمجھنے پر بس کرنا کافی نہیں۔

دیکھئے اگر ایک جائیداد کئی آدمیوں میں مشترک ہو کہ ایک کے اس میں آٹھ آنے ہوں، دوسرے کے چار آنے، تیسرے کے دو آنے، چوتھے کا ایک آنہ۔ اور کوئی ظالم اس جائیداد پر دست برد کرے تو کیا ایک آنہ کا شریک خاموش ہو کر بیٹھے گا۔ ہرگز نہیں اس سے معلوم ہوا کہ مشترک چیز کی حفاظت تمام شرکاء کو چاہئے! اسی

طرح قرآن شریف مسلمانوں کی مشترک جائیداد ہے۔ اس لئے اس کی حفاظت بھی سب کو کرنی چاہیئے

اگر کہیئے کہ مشترک نہیں تو مہربانی کر کے یہ لکھ کر دے دیجئے کہ ہم اس کو شائع کر دیں۔ پھر ان لوگوں سے ہم ہرگز اس کی حفاظت کا خطاب نہ کریں گے اور انشاء اللہ کوئی بھی نہ کرے گا۔ اور جب یہ گوارا نہیں تو معلوم ہوا کہ آپ کے ذمہ بھی ضروری ہے ورنہ دوسروں کو بھی اس کا حق ہے کہ وہ آپ سے جبراً اس کی حفاظت کرائیں خواہ مال لے کر یا کسی دوسرے طریقے سے۔

اب لوگ یہ چاہتے ہیں کہ چین و آرام تو ہر طرح کا ہم کو رہے اور مصیبت و مشقت دوسروں پر رہے۔ ہم جس طرح چلیں، مولوی ہمارے تابع ہو جائیں اور ہمارے جادۂ موصل الی المقصد سے سرمو ہم کو نہ ہٹائیں۔ میں ایسے لوگوں سے کہا کرتا ہوں کہ پرانے مولوی تو تمہارے قابو سے نکل چکے ہیں وہ تمہارے تابع نہیں ہوں گے ان سے یہ امید رکھنی تو فضول ہے البتہ تم اپنی اولاد کو پڑھاؤ۔ وہ تمہارے کہنے میں ہو گی۔ ان سے اپنی مرضی کے موافق کام لینا مگر ہم نے آج تک کسی ہمدرد قوم کو نہ دیکھا کہ اس نے قومی ہمدردی میں اپنی اولاد کو پڑھایا ہو کیونکہ سمجھتے ہیں کہ علم دین پڑھ کر ہماری اولاد کو یہ بڑے بڑے عہدے کہاں سے مل سکیں گے۔ اور اگر کسی نے اپنی اولاد میں سے کسی کو علم دین کے لئے تجویز بھی کیا ہے تو اس کو جو سب میں احمق اور کودن ہے۔ سبحان اللہ! کیا علوم شریعت کی قدر کی ہے۔ صاحبو! غور کیجئے کہ جب سارے الو ہی پڑھیں گے

تو وہ تو اُلّو ہی رہیں گے۔

مولوی منفعت علی صاحب سلمہ سے ایک شخص نے کہا کہ کیا وجہ علماء میں اب رازیؒ و غزالیؒ پیدا نہیں ہوتے۔ انہوں نے کہا کہ اُس وقت انتخاب کا قاعدہ یہ تھا کہ قوم میں جو سب سے ذہین اور ذکی ہو وہ علوم دین کے لئے منتخب ہوتا تھا اور اب انتخاب کا یہ قاعدہ ہے کہ جو سب میں احمق اور غبی ہو وہ اس کے لئے تجویز ہوتا ہے۔

دلیل اس کی یہی ہے کہ اب بھی جو ذہین و ذکی پڑھتے ہیں وہ غزالیؒ اور رازیؒ سے کم نہیں ہوتے۔ میرے ساتھ چلو اور علماء کی حالت دیکھو تو معلوم ہو جائے گا کہ اس وقت بھی غزالیؒ اور رازیؒ موجود ہیں اور ہر زمانے میں پیدا ہوتے ہیں لیکن عدد میں کم ضرور ہیں اور وجہ اس کی یہی ہے کہ جو لوگ قابل ہیں وہ تو ادھر متوجہ نہیں ہوتے ورنہ میں سچ کہتا ہوں کہ اگر بیس آدمی ایسے پڑھیں، تو اُن میں پندرہ غزالیؒ اور رازیؒ ضرور نکلیں گے۔ اب بیچارے غریب غرباء، جولاہے، دُھنیئے پڑھتے ہیں۔ اُن کی جیسی سمجھ ہوتی ہے ویسے ہی نکلتے ہیں۔ اور یہ ہو نہیں سکتا کہ غریب غرباء کے بچوں کو نہ پڑھایا جائے۔ کیونکہ امراء نے خود چھوڑا اور ان سے ہم چھڑا دیں تو پھر علمِ دین کس کو پڑھائیں۔ نیز غریب غرباء کیا کریں۔ انگریزی تو پڑھ نہیں سکتے کیونکہ اُس کی تعلیم نہایت گراں ہے اور عربی ہم نہ پڑھائیں تو یہ بےچارے تو بالکل ہی کورے رہے۔

علمِ دین کی ارزانی

واقعی علمِ دین ایسی عجیب چیز ہے کہ اُس میں محنت بھی کم اور خرچ بھی کم۔ برخلاف انگریزی کے علمِ دین کی ارزانی دیکھئے کہ اگر کوئی شخص میزان سے اخیر تک ایک کتاب بھی نہ خریدے تو ہر کتاب اُس کو میسّر آسکتی ہے۔ اور ایسے بہت سے لوگ ہیں جنہوں نے تمام درسیات مدرسوں سے مستعار ہی لے کر پڑھی ہیں۔ آپ ایک شخص کو بھی نہیں بتلا سکتے کہ جس نے بی اے تک پڑھا ہو اور اُس کو قریب قریب کل کتابیں نہ خریدنی پڑھی ہوں۔ اس سے معلوم ہوا کہ دینی تعلیم نہایت ارزاں اور دنیاوی تعلیم نہایت گراں ہے۔ اس پر مجھے اپنے بھائی کا ایک مقولہ یاد آیا۔

ایک مرتبہ اُنہوں نے والد صاحب سے کہا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ آپ مجھ سے تو حساب لیتے ہیں اور بڑے بھائی سے نہیں لیتے حالانکہ میرا خرچ بھائی سے بہت زیادہ ہے۔ مجھ کو تو اگر ایک قلم کی ضرورت ہو تو وہ بھی آٹھ آنے کو آئے گا اور وہ تو چھپّر میں سے ایک سٹیا نکال قلم بنالیں تو کارروائی ہوسکتی ہے۔

تو دیکھئے کس قدر ارزاں ہے اور یہی دلیل ہے اس کے معزز ہونے کی۔ کیونکہ فطرت کا قاعدہ ہے کہ جتنی ضرورت کی چیز ہوتی ہے اتنی قدر سستی ہوتی ہے۔ اور ہر جگہ میسّر آسکتی ہے۔ اور جس قدر بیکار ہوتی ہے اتنی قدر گراں اور کم یاب ہوتی ہے۔ یہ خدا تعالےٰ کی عجیب قدرت ہے اسی پر غور کرکے دیکھئے تو معلوم ہو کہ عربی کی کیا قدر ہے اور انگریزی کی کیا قدر ہے۔ یعنی عربی کی طرف زیادہ توجہ

ہونی چاہیئے کیونکہ وہ زیادہ ضرورت کی چیز ثابت ہوئی اور انگریزی کی طرف کم۔ اور کم متوجہ ہونے کی اجازت بھی دینداروں کے لئے ہے۔ ورنہ جن کے دین بگڑ جانے کا ڈر ہے اُن کو تو انگریزی سے قطعاً روکا جائے۔ وہ انگریزی کو بالکل چھوڑ دیں صرف عربی کی طرف متوجہ ہوں۔ یہاں تک اصلاح یا حفاظت دین کی ضرورت کے واسطے عربی کا ضروری ہونا ثابت ہوا۔

علومِ عربیہ کی اہمیت

اب میں اخیر درجہ کہتا ہوں کہ اگر خدا کے لئے عربی نہ پڑھو تو کم سے کم انگریزی ہی کے لئے عربی ضرور پڑھ لو۔ توضیح اس کی یہ ہے کہ علومِ عربیہ کے پڑھنے سے استعداد میں ترقی ہوتی ہے اور اس استعداد سے انگریزی تعلیم میں بہت مدد ملتی ہے۔ میرے سب سے چھوٹے بھائی بغرض ٹریننگ مراد آباد میں گئے وہاں اُن کی ذہانت کی یہ حالت تھی کہ تمام لوگ متحیر تھے حتیٰ کہ اُن کے ماسٹر بھی اُن کی ذہانت سے عاجز تھے۔

ایک دفعہ یہ واقعہ ہوا کہ رمضان المبارک کا زمانہ قریب آ گیا اور ٹریننگ کے لڑکوں نے چاہا کہ کسی حافظ کو بلا کر ایک قرآن سنیں۔ پرنسپل سے پوچھا تو جواب ملا کہ یہ امر جدید ہے، اجازت نہیں ہو سکتی۔ بھائی نے کہا کہ اگر قدیم ہوتا تو اجازت مل جاتی؟ کہا گیا ہاں۔ بھائی نے کہا کہ آپ کے قاعدے سے تو لازم آتا ہے کہ کبھی کوئی امرِ قدیم پایا ہی نہ جائے کیونکہ ہر قدیم کسی وقت جدید تھا اور جدید ہونا مانعِ اجازت ہے۔ جب اُس کی اجازت نہ ہوگی، وہ

قدیم کب بن سکے گا۔ پرنسپل حیران رہ گیا۔ آخر اُنہوں نے کہا کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دارومدار اجازت کا قدیم ہونے پر نہیں ہے بلکہ اس پر ہے کہ اُس میں کوئی مفسدہ نہ ہو تو اس میں کیا مفسدہ ہے پرنسپل نے اجازت دے دی۔

یہ محض عربی کی استعداد کی بدولت تھا کیونکہ اس میں احتمال آفرینی کی استعداد ہو جاتی ہے۔ ایسے بہت سے قصے اُن کے ہوئے نیز اُن کے سوا میں نے بہت سے واقعے دیکھے۔ اس لئے میں کہتا ہوں کہ اگر خدا کے لئے عربی نہیں پڑھتے تو اپنی انگریزی ہی کے لئے پڑھ لو۔ شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ ایسے علمِ دین کے پڑھنے سے کیا فائدہ کہ اس کی ترغیب دی جارہی ہے۔ سو سمجھو کہ علمِ دین وہ چیز ہے کہ ایک نہ ایک دن یہ اپنا اثر ضرور کرتا ہے اور اُس شخص کو اپنا بنا لیتا ہے ایک بزرگ فرماتے ہیں۔

تَعَلَّمْنَا الْعِلْمَ لِغَیْرِ اللّٰہِ فَاَبَی الْعِلْمُ اِلَّا اَنْ یَّکُوْنَ لِلّٰہِ ــــ

میں سچ کہتا ہوں کہ علمِ عربی وہ علم ہے کہ ہر چیز کو اس سے انجلا ہو سکتا ہے۔ اخلاق بھی اس سے درست ہوتے ہیں۔

میں ایک انگریزی خوان کی حکایت بیان کرتا ہوں اس سے اندازہ کرو کہ اُن پر علمِ دین نے کیا اثر کیا اور کیا یہ اثر نری انگریزی تعلیم سے آسکتا ہے اور وہ اثر کس قدر ضروری ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ میں جس زمانے میں کانپور میں پڑھاتا تھا ایک روز حسبِ معمول پڑھا رہا تھا کہ ایک نائب تحصیلدار آئے اور اپنے لڑکے کے لئے

ایک اُستاد کی ضرورت ظاہر کی۔ اُس وقت جو طالب علم مجھ سے پڑھ رہے تھے۔ میں نے عربی زبان میں اُن سے دریافت کیا تاکہ یہ نہ سمجھیں۔ میری گفتگو شروع کرتے ہی وہ کہنے لگے کہ جناب کے عربی میں گفتگو کرنے سے یہ معلوم ہوا کہ اس وقت کی گفتگو کو مجھ سے پوشیدہ رکھنا منظور ہے لیکن میں عربی سے واقف ہوں۔ اس لئے یہ بہتر ہے کہ میں یہاں سے اُٹھ جاؤں۔ اُن کے اس کہنے سے مجھے بے حد شرمندگی ہوئی اور یہ خیال ہوا، اللہ اکبر! میں نے تو ان کے ساتھ کیا برتاؤ کیا اور اُنہوں نے میرے ساتھ کیا برتاؤ کیا۔ آخر میں نے اُن سے کہا کہ جناب یہ میری غلطی تھی۔ واقع میں کوئی پوشیدہ بات نہ تھی۔ اب میں اردو میں گفتگو کرتا ہوں۔

اب میں دو باتیں اس کے متعلق پوچھنا چاہتا ہوں۔ اوّل تو یہ کہ کیا بدون علمِ دین کے یہ اثر پیدا ہو سکتا ہے۔ سو ظاہر ہے کہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ دوسری بات یہ پوچھتا ہوں کہ یہ اثر نہایت ضروری ہے یا نہیں۔ ظاہر ہے نہایت ضروری ہے کیونکہ ہم کو یا ہم جائز نہیں کہ ہم کسی کے اسرار پر مطلع ہوں۔ غرض تہذیب، اخلاق، تعلیم انگریزی ہر ایک کے لئے علمِ دین کی ضرورت ہے۔ حاصل یہ ہے کہ علمِ دین کی جس میں قرآن بھی داخل ہے ہر شخص پر حفاظت ضروری ہے یہ تو ضرورت کے متعلق گفتگو تھی۔

الفاظِ قرآن کی اہمیت

اب ایک سوال اور رہ گیا ہے جو اکثر لوگوں کی زبان پر آیا کرتا ہے۔ وہ یہ کہ قرآن کو اگر پڑھا جائے تو نرے الفاظ کے پڑھنے

سے کیا نفع؟ اس سوال کا ایک جواب تو ہو گیا کہ اس کے پڑھنے کی ضرورت ہے اور ضرورت کے ہوتے کسی جدید نفع کا ہونا ضروری نہیں۔ کیا اگر کسی شخص کو پیاس لگی ہو اور وہ پانی پینا چاہے اور کوئی شخص اس سے کہے کہ پانی پینے سے کیا فائدہ، تو اس کو یہ کہہ دینا کافی نہیں کہ اس وقت اس کی ضرورت ہے اگرچہ کوئی جدید فائدہ مرتب نہ ہو۔ اور اگر بالخصوص نفع ہی تلاش ہے تو لیجئے نفع بھی بیان کئے دیتا ہوں مگر پہلے یہ بتلائیے کہ نفع کس کو کہتے ہیں۔ کیونکہ منشاء اشتباہ یہی ہے کہ نفع کو منحصر سمجھ لیا ہے صرف ایک ہی میں کیونکہ اکثر یہ کہتے ہیں کہ جب سمجھ ہی میں نہ آیا تو طوطے کی طرح رٹنے سے کیا فائدہ۔ معلوم ہوا کہ محض سمجھنے کو نفع سمجھتے ہیں۔ سو اس میں ہے گفتگو۔

میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ ایک شخص امتحان دینا چاہے تحصیلداری کا اور اس میں یہ قانون ہو جائے کہ جو شخص فلاں کتاب سنا دے گا وہ پاس ہو جائے گا اگرچہ اس کتاب کو نہ سمجھے۔ تو اگر ایسا قانون واقع میں ہو جائے تو کیا اس قانون کے مقرر ہونے کے بعد آپ سوال کریں گے کہ اس کتاب کے حفظ کرنے سے کیا فائدہ ۔ ہرگز نہیں۔ تو معلوم ہوا کہ فائدہ صرف سمجھنے میں منحصر نہیں بلکہ اور بھی منافع ممکن ہیں۔ البتہ اگر قرآن میں اس کے سوا کوئی نفع نہ ہوتا تو یہ سوال متوجہ ہو سکتا تھا اور جب کہ دوسرے منافع ہیں تو یہ سوال نہیں ہو سکتا۔

آخرت کا مسئلہ

چنانچہ حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کہ جن کی شان یہ ہے کہ ؎

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود
گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

ارشاد فرماتے ہیں کہ جس نے قرآن کا ایک حرف پڑھا اُس کے لئے دس نیکیاں لکھی گئیں۔ تو جب ایک ایک حرف پر دس نیکیاں لکھی گئیں تو پورے قرآن پر کس قدر نیکیاں لکھی جائیں گی۔ تو یہ کتنا بڑا نفع ہوا۔ اور اگر کوئی کہے کہ نیکیوں کو کیا کریں تو سمجھو کہ نیکیاں اس وقت تم کو بیکار نظر آتی ہیں لیکن جب تم دارِ دنیا سے چل کر دارِ عقبےٰ میں پہنچو گے تو معلوم ہو گا کہ حسنات کیسا کارآمد سکہ تھا۔

دیکھو، اگر ایک شخص مکہ جارہا ہو اور بمبئی میں پہنچ کر اُس کو کسی نے خاص مکہ کا رائج الوقت سکہ دیا۔ تو اگرچہ یہ سکہ بمبئی یا عدن میں نہیں چلتا لیکن چونکہ وہ جانتا ہے کہ میں چار دن بعد مکہ پہنچ جاؤں گا اس لئے یہ نہیں کہتا کہ میں اس کو کیا کروں۔ اور اگر کہے تو اُس کو یہی جواب دیا جاتا ہے کہ آٹھ دن کے بعد دیکھ لینا کہ تم اُس کو کیا کرو گے۔

اس وقت حسنات بیکار معلوم ہوتے ہیں لیکن جب قیامت کے میدان میں کھڑے ہو گے اور لوگوں کے اعمالنامے وزن کئے جارہے ہوں گے اور اُن کے موافق جزا مل رہی ہو گی اور تم تہیدست ہو گے اُس وقت معلوم ہو گا کہ حسنات کیا چیز تھیں۔ فرماتے ہیں ؎

کہ بازار چندانکہ آگندہ تر
تہیدست را دل پراگندہ تر

اگر کسی عمدہ بازار میں کسی مفلس کو بھیج دیا جائے تو اُس کو انتہائی پراگندگی حاصل ہو گی کیونکہ جدھر نظر پڑے گی اچھی اچھی قیمتی چیزیں نظر آئیں گے۔ اور ساتھ ہی ساتھ اپنا افلاس اور تہیدستی بھی یاد آئے گی اس لئے حسرت بھی بڑھتی جائے گی۔ بالخصوص جب کہ بازار جاتے وقت اُس سے کہا گیا ہو کہ کچھ نقد لیتے جاؤ اور وہ چھوڑ کر چلا گیا ہو۔

پس یہی حالت میدانِ قیامت میں ان لوگوں کی ہو گی اور وہ ایسا وقت ہو گا کہ سوائے اس سکہ کے اور کوئی سکہ کام نہ دے گا کیونکہ کوئی چیز یہاں سے ساتھ ہی نہ جائے گی۔ چنانچہ فرماتے ہیں

وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ
وَّتَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ۔

کہ تم اکیلے آئے ہو اور جتنی چیزیں ہم نے تم کو دی تھیں سب پسِ پشت چھوڑ آئے اور اگر لاتے بھی تو کیا ہوتا۔ چنانچہ ارشاد ہے کہ اگر تمام زمین کے خزانے بھی اس وقت مل جاتے تو انسان اپنی جان کا فدیہ دیتا لیکن اُس سے قبول نہ ہوتا۔ تو اب اس کا جواب معلوم ہو گیا کہ نیکیوں کو کیا کریں گے۔ یعنی اُس وقت اُن کی قدر ہو گی وہاں نیکیوں کی یہ حالت ہو گی کہ سب چیزوں سے زیادہ عزیز ہوں گی۔۔۔۔

حتیٰ کہ ایک شخص کے اعمال وزن کیے جائیں گے تو اُس کے

گناہ اور نیکیاں دونوں برابر ہوں گی۔ حکم ہوگا کہ اگر ایک نیکی کہیں سے لے آؤ تو تمہاری مغفرت ہو جائے گی۔ یہ سن کر بہت خوش ہوگا کہ بھائی، بیٹا، باپ، ماں وغیرہ دوست احباب بہت لوگ ہیں کوئی تو ضرور ہی دے گا۔ چنانچہ یہ سوچ کر سب کے پاس جائے گا اور سب کے سب انکار کر دیں گے۔ سخت پریشان ہوگا اور بالکل مایوس ہو جائے گا کہ ایک شخص سے ملاقات ہوگی اور وہ اس کی حالت کو دیکھ کر پوچھے گا کہ کس فکر میں ہو۔ یہ کہے گا کہ ایک نیکی کی تلاش میں ہوں کیونکہ مغفرت میں ایک نیکی کی کمی ہے لیکن کوئی شخص نہیں دیتا۔ یہ سن کر وہ کہے گا کہ جب صرف ایک نیکی کی کمی مانع مغفرت ہو گئی تو میرے پاس تو صرف ایک ہی نیکی عمر بھر کی ہے باقی تمام معاصی۔ وہ ایک نیکی کیا کام آسکے گی۔ اچھا لو میں وہ نیکی تم کو دیتا ہوں کہ تمہاری مغفرت ہو جائے۔ چنانچہ یہ شخص نہایت خوش و خرم اس نیکی کو لے کر جائے گا اور اس کی مغفرت ہو جائے گی اور اس کے ساتھ ہی اس نیکی دینے والے کی بھی مغفرت ہو جائے گی۔

اس مضمون سے آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ نیکی کتنی قدر کی چیز ہے اور میدان قیامت میں اس کی کیا کچھ ضرورت ہوگی اور یہ کیسی نایاب ہوگی۔ اس وقت معلوم ہوگا کہ اگر کسی نے قرآن کا ایک ختم دنیا میں کر لیا تھا تو اس سے کیسا کچھ فائدہ اس کو ہوا اور کتنی نیکیاں اس کے صحیفۂ اعمال میں لکھی گئیں۔ اور اس سے بھی زیادہ واضح مثال میں سمجھئے۔

اسکولوں میں لڑکوں کو اقلیدس پڑھائی جاتی ہے۔ بیس لڑکوں میں ایک بھی بمشکل ایسا ہوتا ہے کہ مسائل اقلیدس کو سمجھ سکے لیکن امتحان کے زمانے میں بغیر سمجھے ہی اس کو رٹ لیتے ہیں اور اسی کی بدولت پاس ہو جاتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ بے سمجھے محض رٹ لینا بھی مفید ہے۔

تو صاحبو! کیسے افسوس کی بات ہے کہ دنیا کے معاملات میں جو باتیں مسلّم ہیں وہی باتیں دین کے معاملات میں پیش کی جائیں تو تردد یا انکار کیا جاتا ہے تو ہجے تو صحیح اور رواں غلط۔ ہم لوگوں کی وہ حالت ہو رہی ہے کہ جیسے ایک شخص نے تَبَّتْ یَدَآ اَبِیْ لَہَبٍ شروع کی تھی ہجے تو کئے ت ب زبر تب اور ب ت زبر بت کہا اور رواں پڑھا تو بطخ۔ اسی طرح اس وقت لوگ فرداً فرداً ہر مقدمے کو تسلیم کرتے اور مانتے ہیں لیکن مجموعہ مقدمات سے جو نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ بمنزلہ رواں کے ہے اُس کو نہیں مانتے۔ کیسی ہٹ دھرمی اور تعصب ہے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ جب سارے مقدمات مسلّم ہوں تو نتیجہ مسلّم کیوں نہ ہو۔ ضرور مسلّم ہونا چاہیئے۔ ــــــ پس معلوم ہوا کہ قرآن کا پڑھنا اگرچہ بے سمجھے ہو نہایت ضروری ہے اُس کی حفاظت کی وجہ سے۔ اور نہایت مفید ہے اجر جزیل کے مرتب ہونے کی وجہ سے۔

تعلیم قرآن کا صحیح وقت

سب سے اوّل مسلمان کے بچے کو قرآن پڑھانا چاہیئے

کیونکہ یہ تجربہ ہے کہ تھوڑی عمر میں علوم حاصل کرنے کی استعداد تو ہوتی نہیں تو قرآن مفت برابر پڑھ لیا جاتا ہے ورنہ وہ وقت بیکار ہی جاتا ہے۔ اور بعضے لوگ بڑی عمر کے بھروسے کہ یہ خود پڑھ لے گا نہیں پڑھاتے۔ سو مشاہدہ ہے کہ زیادہ عمر ہو جانے کے بعد نہ خیال میں وہ اجتماع رہتا ہے نہ اس قدر وقت ملتا ہے نہ وہ سامان بہم پہنچتے ہیں۔ فکرِ معاش الگ ستاتی ہے۔ اہل وعیال کا جھگڑا الگ چپکتا ہے۔ خیالات میں انتشار پیدا ہو جاتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اتنے موانع کے بعد کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ اور اگر کسی ایک دو نے کر لیا تو وہ قابلِ اعتداد نہیں۔ ایسے مستثنیات ہر جگہ میں ہوتے ہیں مگر یہ حکم کی کلیتہً کو مبطل نہیں اور جب بڑے ہو کر پڑھنا مشکل بلکہ قریب ناممکن ہے تو عجب نہیں کہ اگر یہی حالت رہی جو اب ہے تو چند روز میں مسلمانوں کے بچوں کو نماز میں قرآن پڑھنے کے لیے آریوں اور عیسائیوں سے قرآن پوچھنا پڑے ——،

مسئلہ استیذان کی حکمت

آپ شاید اس کو تعجب کی نظر سے دیکھیں لیکن غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ موجودہ رفتار کا یہ مآل چنداں عجیب نہیں۔ دیکھئے احکامِ شریعت کو آپ نے چھوڑا اور دوسری قوموں نے ان کی خوبیاں دریافت کر کے ان کو اختیار کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آج آپ بہت سے اسلامی احکام کو اسلامی احکام نہیں سمجھتے بلکہ انگریزوں یا کسی دوسری قوم کی خصوصیاتِ معاشرت میں سے سمجھتے ہیں اور

اُن سے لے لے کر عمل کرتے ہیں۔

از آں جملہ مسئلہ استیذان ہے کہ شریعت مطہرہ کا یہ حکم ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے شخص کے مکانِ خلوت میں اگرچہ وہ مکان مردانہ ہی ہو اُس وقت تک داخل نہ ہو جب تک کہ صاحبِ مکان سے اجازت نہ لے لے۔ واقعات اور تجارب سے اس کی خوبی دریافت کر کے تمام متمدّن قوموں نے اس پر عمل شروع کر دیا لیکن مسلمان اس کو معاشرتِ یورپ کی خصوصیات سے سمجھتے ہیں۔ اُن کو یہ خبر نہیں کہ یہ حکم شریعتِ مطہرہ کا ہے اور دوسروں نے یہیں سے لیا ہے۔ حالانکہ یہ ایسا صریح حکم ہے کہ صاف صاف قرآن میں موجود ہے۔

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَهْلِهَا ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ۔

اور راز اس مسئلے میں یہ ہے کہ اس پر عمل کرنے سے اتفاقِ قومی باقی رہتا ہے۔ کیونکہ اتفاق کی جڑ صفائی قلب ہے اور صفائیِ قلب اُس وقت تک باقی رہتی ہے کہ جب ایک سے دوسرے کو تکلیف نہ ہو۔ اور مسئلہ استیذان پر عمل نہ کرنے سے بسا اوقات تکلیف ہوتی ہے اور تکلیف موجبِ تکدّر ہے اور تکدّر مورثِ نفاق و افتراق ہے۔ اور جب اس مسئلے پر عمل کیا جائے گا تو ہرگز یہ نوبت نہ آئے گی۔ کیونکہ فرض کیجئے ایک شخص نے آپ سے اجازت چاہی آپ نے بے تکلف کہہ دیا کہ میں اس وقت کام میں ہوں یا آرام

کرنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ جو قومیں اس مسئلے کو برت رہی ہیں وہ اسی کی بدولت دیکھ لیجیے کہ کس قدر آرام میں ہیں۔

علیٰ ہٰذا اور بہت سے دوسرے مسائل ہیں کہ وہ ہمارے اسلام نے بتلائے تھے اور آج ہم نے ان کو چھوڑ دیا ہے اور دوسری قوموں نے ان پر عمل کیا ہے۔ اور اب اگر ہم ان پر عمل کرتے ہیں تو دوسروں سے اخذ کر کے اور ان کی چیز سمجھ کر عمل کرتے ہیں تو ان احکام کی طرح مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں قرآن بھی دوسروں سے پوچھ کر پڑھنے کی نوبت نہ آجاوے۔ اور اگر ایسا خدانہ کرے ہو تو کیا مسلمانوں کی غیرت اس کو گوارا کرے گی۔ اگر نہیں تو کیوں ابھی وقت سے اس کا تدارک نہیں کیا جاتا۔ صاحبو! یاد رکھو ؎

سر چشمہ باید گرفتن بہ میل
چو پُر شد نہ شاید گزشتن بہ پیل

جب سر سے پانی گزر جائے گا تو اُس وقت کوئی تدبیر کارگر نہ ہو سکے گی۔

دماغی کمزوری کا عذر

ان ساری باتوں کے علاوہ قرآن مجید کے الفاظ اس قدر شیریں اور باحلاوت ہیں کہ ان کی طرف خود کشش ہونی چاہیئے۔ اگر اس پر ثواب وغیرہ کا وعدہ بھی نہ ہوتا تب بھی اس کو یاد کرنا چاہیے تھا بعض لوگ کہتے ہیں کہ حفظ کرنے سے دماغ کمزور ہو جاتا ہے۔ اس لئے ہم اپنے بچوں کو حفظ نہیں کراتے کیونکہ کمزوری دماغ کے بعد وہ کسی دوسرے کام کے نہیں رہتے۔ اس کے جواب میں ایک دم اگر

کا قول نقل کر دینا کافی ہے۔

ایک ڈاکٹر نے مجھ سے کہا ہے کہ دماغ صرف قوتِ فکریہ سے کمزور ہوتا ہے۔ حفظِ الفاظ سے نہیں ہوتا۔ کیونکہ حفظ دماغ کی اصلی ریاضت نہیں وہ صرف زبان کی ریاضت ہے۔ اور دماغ کی ریاضت غور و فکر ہے۔ تو حفظ سے دماغ نہ تھکے گا۔ اگر تھک سکتی ہے تو زبان اور زبان تھکتی نہیں۔

دوسری بات انہوں نے یہ بھی کہی کہ قرآن اس وقت یاد ہو جاتا ہے کہ بچہ اس وقت تک کچھ بھی نہیں کر سکتا یعنے اس کے دماغ میں کسی کام کے کرنے اور غور و فکر کی قابلیت ہی نہیں ہوتی۔ اور اگر زبردستی اس وقت کسی دوسرے کام میں لگا دیئے جاتے ہیں تو نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مضرتیں اٹھاتے ہیں۔

پس معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص اعتدال کی رفتار سے چلے، تو قرآن شریف اس وقت حفظ ہو جائے گا جس وقت تک کہ وہ خود بھی بچے کو کسی فکر کے کام میں نہ لگائے۔ اور اگر فرض بھی کر لیا جائے کہ دماغ کمزور ہو جائے گا تو میں کہتا ہوں کہ دماغ کس کا ہے؟ صاحبو! کتنی شرم کی بات ہے کہ خدا تعالیٰ کا عطا کیا ہوا دماغ ساری عمر اپنے لئے اس کو صرف کیا جائے اور خدا تعالیٰ کے لئے دو چار سال بھی نہ دیئے جائیں۔ غرض جس پہلو سے بھی دیکھا جائے قرآن کا یاد کرنا نہایت ضروری ثابت ہوتا ہے۔ اور ایک بڑا فائدہ اس میں یہ ہے کہ اس کے حفظ سے دوسرے علوم نہایت درجہ آسان ہو جاتے ہیں۔

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کے پاس جب کوئی اپنے بیٹے کو لاتا تو دریافت فرماتے کہ اس نے قرآن شریف حفظ کیا ہے یا نہیں۔ اگر وہ حافظ ہوتا تو فرماتے کہ انشاء اللہ یہ پڑھ لے گا اور اگر حافظ نہ ہوتا تو وعدہ نہیں کرتے تھے۔ یوں فرماتے تھے کہ میں بھی دعا کروں گا تم بھی دعا کرنا۔

واقعی یہ تجربہ بھی ہے کہ جو لوگ حافظ ہیں اکثر اُن کو دوسرے علوم بھی نہایت آسانی سے آجاتے ہیں لیکن اگر حافظ بناؤ تو اُس کا خیال رکھو کہ اُن کو یاد بھی رہے۔ کیونکہ اکثر لوگ انگریزی میں اس قدر کھپ جاتے ہیں کہ ماں باپ کی ساری کوشش اور اپنے بچپن کی تمام محنت رائگاں جاتی ہے اور ایسے ہی لوگ ہیں جن کی بدولت عقلائے وقت کو یہ مہمل خیال پیدا ہوا کہ قرآن پڑھنا وقت ضائع کرنا ہے۔ اس لئے اس کے بقائے حفظ کا ضرور خیال رکھو اور کوئی وقت روزانہ اس کی تلاوت کا نکال لو۔

اگر کہو کہ کثرتِ کام سے وقت نہیں ملتا تو میں کہتا ہوں کہ اگر تم کو کوئی بیماری لگ جائے اور ڈاکٹر اس بیماری میں یہ تجویز کرے کہ ایک گھنٹے تک روزانہ صبح کو قرآن پڑھا کرو تو اس وقت تمہارے پاس کہاں سے وقت نکل آئے گا۔ تو تھوڑی دیر کے لئے دین کو ایسا ہی سمجھ کر اس کے لئے وقت نکال لیا کرو۔

(یہاں پہنچ کر مجلسِ وعظ میں کاتب کے پاس کاغذ نہ رہا اور حاضرین میں سے کسی سے دستیاب بھی نہ ہوا۔ مجبوراً آگے مضمون نہ لکھا جا سکا اور بیچ میں چھوڑنا پڑا۔ اِنّا للہِ)

ضرورۃ العلماء

علماء دین کی ضرورت کے متعلق یہ وعظ خورجہ چوپال جناب حکمت اللہ خاں صاحب میں ۸- جمادی الثانی سنہ ۱۳۳۰ھ کو بروز اتوار قریباً دو صد سامعین کی موجودگی میں کھڑے ہو کر بیان فرمایا جو تین گھنٹوں میں ختم ہوا اور مولینا سعید احمد صاحب تھانوی نے قلم بند فرمایا۔

خدا تعالیٰ نے انسان کو عقل اس واسطے دی ہے کہ
اس سے وہ انجام کو سوچے۔ جب دنیا کے کاموں
میں انجام پر نظر رکھتے ہو جس میں رہنا محض موہوم ہے
تو آخرت کے انجام پر بھی نظر رکھنی چاہیئے جہاں
جانا یقینی ہے مگر افسوس کہ آخرت سے اس درجہ
غفلت ہو گئی ہے کہ وہ یاد ہی نہیں آتی ــــــ :

خطبۂ ماثورہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ نحمدہٗ ونستعینہٗ ونستغفرہٗ ونومن
بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا و
من سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہٗ
ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا اللہ
وحدہٗ لاشریک لہ ونشھد ان سیّدنا و مولانا
محمدًا عبدہٗ و رسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ
اٰلہ واصحابہ وبارک وسلم امابعد فاعوذ باللہ من
الشیطان الرجیم ۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم ۔
ادعوا ربکم تضرعًا وخفیۃ ط انہ لا یحب المعتدین ہ ولا تفسدوا
فی الارض بعد اصلاحھا وادعوہ خوفا وطمعا ط ان رحمت
اللہ قریب من المحسنین ہ

اہم ترین وجود

ہر چند کہ اس وقت میں نے دو آیتیں پڑھی ہیں جن کے سننے کے بعد یہ انتظار ہوگا کہ ان دونوں کی تفسیر بیان کی جائے گی۔ مگر اس وقت مقصود ان آیات کے مدلول میں سے صرف ایک ہی جزو کا بیان کرنا ہے یعنی لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ کا کہ اس سے ایک دعوے کا مستنبط کرنا ہے۔ باقی اس جزو کے سیاق و سباق کو اس دعوے کیلئے مؤید بنانا ہے۔ اور اس سیاق و سباق سے اس دعویٰ پر استدلال کرنا ہے۔

وہ دعویٰ جس کو ثابت کرنا ہے نہایت عجیب ہوگا مگر بالکل سچا اور مانوس اور واقع کے مطابق ہوگا۔ اور اگر غور کیا جائے گا تو معلوم ہوگا کہ وہ دعویٰ پہلے سے سب کے نزدیک مسلّم تھا مگر عدمِ تدبّر کی وجہ سے متکلم فیہ ہوگیا ہے بلکہ اس سے بڑھ کر بعض السنۂ پر

اس کی ضد کا دعویٰ ہونے لگا ہے لیکن اگر ذرا تدبر سے کام لیا جائے گا تو وہ دعوےٰ بالکل فطری معلوم ہوگا۔ علماء کے نزدیک تو اس کا فطری ہونا مسلّم ہی ہے لیکن مدعیانِ عقل کے نزدیک بھی اس سے انکار نہ ہو سکے گا۔ مگر پھر بھی اس دعوےٰ کو عجیب اس لئے کہا کہ اس وقت قلّتِ علم سے بکثرت لوگوں کو اس میں تعجب ہونے لگا ہے۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ وہ عقائد میں داخل ہوتا مگر اس وقت اس کی ضد عقائد میں داخل ہوگئی ہے تو چونکہ وہ عام خیالات کے خلاف ہے اور دنیا کا اکثر حصّہ اس وقت عامیوں ہی کا ہے۔ اس لئے وہ دعویٰ اس وقت عجیب ہو گیا۔

وہ دعویٰ اس سوال کا جواب ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ ضروری وجود کس کا ہے اور وہ ضرورت بھی دنیوی حیثیت سے جس کے لوگ طالب ہیں، نہ کہ دینی حیثیت سے جس کو ترک کر دیا گیا ہے اور اس قید سے ظاہر ہے کہ یہ سوال عام لوگوں کی نظر میں نہایت باوقعت و قابلِ اہتمام ہوگا کہ وہ کون سی چیز ہے کہ فلاحِ دنیوی کے لئے سب سے زیادہ ضروری ہے۔

علماء عوام کی نظر میں

سو جواب اس سوال کا یہ ہے کہ فلاحِ دنیوی کے لئے بھی سب سے زیادہ ضروری وجود جماعتِ علماء کا ہے اور اس دعویٰ کا عام خیالات کے خلاف ہونا ظاہر ہے کیونکہ عموماً لوگ ان کو نکما سمجھتے ہیں۔ پھر ان میں جو بے باک ہیں وہ تو صاف کہتے ہیں کہ یہ لوگ ایسے نکمّے ہیں کہ انہوں نے دوسروں کو بھی نکما کر دیا اور جو ذرا تہذیب

سے کام لیتے ہیں وہ عام مجمعوں میں تو ایسا نہیں کہتے مگر اس عقیدہ کے جو آثار ہیں وہ ان میں بھی پائے جاتے ہیں۔ اور جب آثار پائے جاتے ہیں تو وہ بھی عملاً مدعی ہیں اور دعوئے عملی، قولی دعویٰ سے زیادہ قوی ہوا کرتا ہے۔

مثلاً ایک شخص تو یہ کہے کہ میں پانی پیوں گا اور ایک جا کر پی ہی لے۔ تو اگرچہ دوسرے نے زبان سے پانی پینے کا دعویٰ نہیں کیا لیکن اس کا عمل پہلے کے لسانی دعویٰ سے زیادہ قوّت کے ساتھ اس کے دعویٰ کو ثابت کر رہا ہے۔ اور وہ آثار جو اس عقیدے کے خواص میں سے ہیں یہ ہیں کہ وہ شخص جو کہ اس مضمون کا کہ یہ جماعت نکمی ہے معتقد ہو گا وہ اس جماعت سے معرض ہو گا اور اس کی طرف متوجہ ہونے کو پسند نہ کرے گا بلکہ دوسروں کو بھی اس جماعت کے ساتھ تعلق رکھنے سے روکے گا۔

اب دیکھ لیجئے کہ عقلاء زمانہ میں یہ آثار پائے جاتے ہیں یا نہیں۔ سو ظاہر ہے کہ یہ آثار واقع ہو رہے ہیں۔ اس لئے میں کہتا ہوں کہ عام طور پر لوگ اس جماعت کو ناکارہ سمجھتے ہیں۔ اس لئے یہ دعویٰ کہ سب سے زیادہ ضروری وجود ان ہی کا ہے اس طور پر عجیب ہو گیا۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

اب میں اس دعوے کے اثبات کی تقریر کرتا ہوں۔ مگر اس دعوے کے اثبات سے پہلے میں ایک اور بات دفع توحش کے لئے یہ کہتا ہوں کہ اس کے ثابت کرنے سے مجھ کو یہ کوشش

کرنا مقصود نہیں ہے کہ سب مولوی ہو جائیں۔ ممکن تھا کہ اس جماعت کو سب سے زیادہ ضروری الوجود سن کر لوگوں کو یہ خیال پیدا ہوتا کہ اب یہ رائے دی جائے گی کہ سب لوگ مولوی ہو جاوے۔ اس لئے دفع وحشت کے واسطے ابھی سے کہے دیتا ہوں کہ میرا یہ مقصود نہیں ہے۔

بلکہ مقصود یہ ہے کہ مسلمانوں میں ایک ایسی جماعت بھی رہنا چاہئے اور دوسرے لوگوں کو اس جماعت سے وابستگی رہنا چاہئے۔ اب تو وحشت بالکل دور ہو جانا چاہئے کیونکہ سب کو مولوی نہیں بنایا جاتا۔ صرف اتنی اصلاح کی جاتی ہے کہ ان لوگوں کو بے کار نہ سمجھو۔ سو اس سے آپ کے کسی کام میں یا کسی قسم کی ترقی میں یا کسی نوکری میں کوئی فرق نہیں آتا۔ ہاں ایک غلط خیال میں جو آپ مبتلا ہیں اس سے وہ غلطی جاتی رہے گی نیز اس جماعت کے فیوض سے اس وقت جو آپ محروم ہیں جب آپ کو ان کے ساتھ وابستگی ہوگی تو آپ ان کے فیوض سے متمتع ہوں گے البتہ موجودہ حالت میں اور اس حالت میں ایک فرق ضرور ہوگا خواہ اس کو آپ دنیوی ضرر یا ترقی کی کمی سمجھ لیں تو ممکن ہے۔ اور وہ فرق یہ ہے کہ اس وقت آپ تعزیرات الٰہیہ کے بہت سے جرائم میں مبتلا ہیں وہ اس وقت چھوٹ جائیں گے۔ اس کو آپ نفع سمجھیں یا نقصان۔ آپ کے عادات میں بھی تغیر و تبدل ہوگا۔ لیکن نہایت لطف اور تدریجی نرمی کے ساتھ۔

اس کی تائید یہ ہے کہ آپ دیکھیں عقل کا فتویٰ یہ ہے کہ اگر

کوئی کسی جرم کا مرتکب ہو تو اس کو فوراً چھوڑ دینا چاہیئے لیکن قواعد شریعت بعض معاصی کی نسبت جو کہ جرائم ہیں یہ تجویز کرتے ہیں کہ چھوڑنے میں جلدی نہ کرو۔ پہلے کوئی اس کا بدل تجویز کر لو۔ اور اس زمانہ تک اپنے کو گنہگار سمجھ کر استغفار کرتے رہو۔ پھر جب دوسرا انتظام ہو جائے تو اس کو چھوڑ دینا۔ بھلا دنیا کا کوئی قانون بھی ایسا ہے جس میں یہ سہولت ہو۔ واللہ العظیم شریعت میں وہ حسن و جمال ہے، وہ لطف ہے کہ اس کی نسبت بے ساختہ یہ شعر زبان سے نکلتا ہے ؎

زفرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل میکشد کہ جا اینجاست

مگر افسوس کہ لوگوں نے کبھی شریعت کو تحقیق کی نظر سے نہیں دیکھا۔ اس لیئے وہ لوگوں کو ایک خونخوار دیو نظر آتا ہے۔ صاحبو! شریعت آپ کی دستگیری کرنے والی ہے۔ بعض جرائم تک میں مثلاً ناجائز نوکری میں یہ اجازت ہے کہ اگر اس وقت کوئی دوسرا انتظام نہیں ہو سکتا اور کوئی سبیل نہیں نکل سکتی تو پہلے اس کا انتظام کر کے چھوڑ دینا۔ اور اگر اس پر بھی شریعت سے وحشت ہوتی ہے تو ہم ذمہ دار نہیں۔

غرض علم و اہلِ علم کے ساتھ تلبس رکھنے سے کوئی دنیوی ضرورت و مصلحت فوت نہیں ہوتی۔ صرف جرائم کا انسداد ہوگا۔ اور وہ بھی اس لطف کے ساتھ۔ سو اس کی نسبت میرا یہ کہنا کہ اس جماعت کے ساتھ وابستگی کرنے سے اتنا نقصان ہوگا کہ یہ جرائم چھوٹ جائیں گے ایسا ہے جیسے کسی شاعر نے کہا ہے کہ ــ

ولا عیب فیہم غیر ان سیوفہم
بہن فلول من قراع الکتائب

یہ تو جملہ معترضہ کے طور پر تھا۔ اب اس دعوی کو عرض کرتا ہوں اور احتیاطاً پھر کہے دیتا ہوں کہ آپ اس دعوی سے متوحش نہ ہوں کہ شاید سب کو مولوی بنانا مقصود ہے۔ میں ہرگز سب کو مولوی نہیں بناتا البتہ جس غلط دعوے کے آپ معتقد ہیں کہ علماء کو نکما سمجھتے ہیں اس کو بدلنا چاہتا ہوں۔ واقعی ہمارے عقلاء میں بہت سے لوگ ایسے ہیں۔ جن کا یہ خیال ہے کہ اولاً علماء عموماً پھر ان میں وہ علماء خصوصاً جو کہ درس و تدریس میں مشغول ہیں محض بے کار ہیں کیونکہ واعظین کو تو بعضے کام کا سمجھتے بھی ہیں ——— سو کتنے افسوس کی بات ہے کہ جو کام سارے کاموں سے زیادہ ضروری ہو اُسی کو سب سے زیادہ بیکار کہا جائے۔

صاحبو ——— افسوس ہے کہ آپ کے ہم وطن ہندوؤں نے تو تعلیم کے اہم ہونے کو محسوس کیا کہ ان میں بکثرت لوگ امتحان سے فارغ ہو کر اس کی کوشش کرتے ہیں کہ ایک بڑی جماعت سررشتہ تعلیم میں داخل ہو۔ اس لئے کہ سب شاخیں اسی کی فرع ہیں۔ تو تعلیم میں اپنا دخیل ہونا ذریعہ ہے ترقی قومی کا۔ مگر ہم کو اب تک بھی اس کی خبر نہیں اور پھر بھی اپنے کو عاقل سمجھے ہوئے ہیں تعلیم کی حالت دوسرے کاموں کے مقابلہ میں ایسی ہے جیسے انجن کا پہیہ کہ اسی کے چکر پر تمام گاڑیوں کو حرکت ہوتی ہے۔ اگر اس کی حرکت بند ہو جائے تو تمام گاڑیوں کی حرکت بند ہو جائے گی۔ مگر اس کی

ضرورت کا احساس لوگوں کو اس واسطے نہیں ہوتا کہ جو چیز مدار کار ہوا کرتی ہے وہ اکثر لطیف زیادہ ہوتی ہے۔

جیسے گھڑی کا فنر اور بال کمانی کہ گنوار آدمی گھڑی کو دیکھ کر سب سے بڑی چیز اس کے گھنٹے کو سمجھتا ہے لیکن حقیقت شناس جانتے ہیں کہ گھنٹہ کی حرکت کا مدار فنر پر ہے۔ اگر فنر کی حرکت بند ہو جائے تو گھنٹہ کو ایک دفعہ بھی حرکت نہیں ہو سکتی۔

اسی طرح درس و تدریس سب حکموں کی روح ہے خواہ تقریر ہو خواہ تحریر، خواہ تصنیف، سب اسی تعلیم کی فرع ہیں مگر اس وقت سب سے زیادہ اسی کو بیکار سمجھ رکھا ہے اور علامت اس کی یہ ہے کہ عام طور سے لوگوں کی نظر میں علماء کی وقعت کم ہے اور اس علامت کی بڑی علامت یہ ہے کہ اپنی اولاد کے لئے علم دین بہت کم تجویز کیا جاتا ہے۔ پھر ان میں بعض لوگ ایسے بھی ہیں کہ وہ مدارس میں چندہ بھی دیتے ہیں اور مدارس دینیہ کی ضرورتِ بقاء کو بسا تسلیم کئے ہوئے بھی ہیں جن کے لئے اہلِ مدارس ان کے بڑے بڑے شکریئے ادا کرتے ہیں تاکہ ان کو زیادہ دلچسپی ہو لیکن واقع میں ان کو دلچسپی کچھ بھی نہیں ہوتی۔

فقر کی اہمیت

صاحبو ـــــ دلچسپی اس کو کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فقر محبوب تھا تو اپنی اولاد کے لئے بھی اس کو قولاً و عملاً اختیار کر کے دکھلا دیا۔ قولاً تو یہ کہ خدا تعالیٰ سے دعا کی اللّٰھم اجعل رزق آل محمد قوتاً۔ اور عملاً یہ کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا جو سب خاندان

سے زیادہ محبوب تھیں اور جن کے لئے آپ فرطِ محبت سے سیدھے
کھڑے ہو جاتے تھے اور جن کے لئے آپ نے یہ فرمایا کہ
سیدۃ[2] نساء اھل الجنۃ فاطمۃ رض۔ نیز حضرت علی رض نے جب نکاح
ثانی کا قصد فرمایا تو آپؐ نے یہ فرمایا کہ یؤذینی ما اذاھا[3]۔ اتنی پیاری
بیٹی نے جب ایک مرتبہ چکی چلانے سے ہاتھوں میں چھالے پڑ جانے
کی شکایت کی جس کو آج کل اس قدر عیب سمجھا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ
میں نے اپنے خاندان کی عورتوں کو بوجہ مصلحتِ صحت یہ رائے
دی کہ نئی لڑکیوں سے چکی پسواؤ کیونکہ اکثر امارت کے لئے بیماری
لازم ہو گئی ہے۔ وہ امیر بھی کیا ہوا جس کے پاس صحت جیسی خدا
کی نعمت نہ ہو اور وجہ اس کی یہی آرام طلبی ہے۔ اس لئے میں نے
جو کہا کہ تم ایسا کیا کرو تو ان میں سے بعض کہنے لگیں کہ خدا نہ کرے
تم ایسی فال کیوں نکالتے ہو۔ اور یہاں تک ہم لوگوں کی شان بڑھ
گئی ہے کہ اکثر عورتوں نے چرخہ کاتنا تک چھوڑ دیا۔

ہمارے وطن میں ایک عورت کا قصہ ہے کہ وہ چرخہ کات
رہی تھیں۔ اور اس زمانہ میں ان کی ساس مر گئی تھیں تو کوئی عورت
جو ان کے یہاں تعزیت کے لئے آتی تو آہٹ پاتے ہی چرخہ کو
اٹھا اور اندھے باولوں کی طرح ایک کوٹھڑی میں پھینک کر آگے
سے کواڑ بند کر دیتے تاکہ مہمان کو معلوم نہ ہو۔

---

[1] اے اللہ! اولادِ محمدؐ کا رزق بقدر کفایت مقرر فرما [2] اہل
جنت کی عورتوں کی سردار فاطمہ رض ہیں [3] تکلیف دیتی ہے مجھے وہ
چیز جو فاطمہ رض کو تکلیف دیتی ہے۔ (احمد حسن عفی عنہ)

غرض حضرت فاطمہ رضؓ کے ہاتھ میں چھالے پڑ گئے تھے حضرت علیؓ نے کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کوئی غلام لونڈی لے آؤ۔ تاکہ کچھ مدد دے۔ چنانچہ حضرت فاطمہ رضؓ حضورؐ کے پاس گئیں اپنی راحت کے لئے یا شوہر کے امتثال امر کے لئے جس وقت حضورؐ کے گھر پہنچیں تو حضورؐ تشریف فرما نہ تھے۔ یہ حضرت عائشہؓ سے کہہ کر چلی آئیں جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گھر میں تشریف لائے تو حضرت عائشہ رضؓ سے معلوم ہوا آپؐ حضرت فاطمہ رضؓ کے پاس تشریف لے گئے۔ اس وقت حضرت فاطمہ رضؓ لیٹی ہوئی تھیں آپؐ کو دیکھ کر اٹھنے لگیں تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرمایا کہ لیٹی رہو۔ غرض اس وقت پھر حضورؐ سے عرض کیا گیا۔ آپؐ نے فرمایا کہ اگر کہو تو غلام لونڈی دے دوں اور کہو تو اس سے بھی اچھی چیز دے دوں یہ سن کر حضرت فاطمہ رضؓ نے پھر یہ نہیں پوچھا کہ وہ اچھی چیز کیا ہے بلکہ فوراً عرض کیا کہ اچھی ہی چیز دیجئے۔ آپؐ نے فرمایا کہ سوتے وقت سُبْحَانَ اللہ تینتیس بار اور اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ تینتیس بار اور اللہُ اَکْبَرُ چونتیس بار پڑھ لیا کرو۔ بس یہ غلام اور لونڈی سے بھی بہتر ہے۔ اس خدا کی بندی نے خوشی خوشی اس کو قبول کر لیا۔

تو دیکھئے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فقر محبوب تھا تو اپنی اولاد کے لئے بھی آپؐ نے اس کو تجویز کر کے دکھلا دیا نیز ارشاد فرمایا کہ ہماری اولاد کے لئے زکوٰۃ حلال نہیں۔ کیا یہ ممکن نہ تھا کہ ایسے قوانین مقرر ہوتے کہ سب روپیہ انہی کو ملتا مگر ایسا نہیں ہوا تو دلچسپی اس کو کہتے ہیں۔

دین میں عدم دلچسپی

اب میں پوچھتا ہوں کہ جو لوگ چندہ دیتے ہیں کیا انہوں نے اپنے لڑکوں کے لیئے بھی کبھی اس تعلیم کو تجویز کیا ہے اب تو یہ حالت ہے کہ ریاست رام پور میں ایک صاحب نے اپنے ایک دوست کو جن کا لڑکا قرآن پڑھتا تھا انگریزی پڑھنے کی رائے دی۔ انہوں نے کہا کہ ذرا قرآن ختم ہو جائے تو انگریزی میں لگا یا جائے۔ انہوں نے پوچھا کتنا قرآن ہوا ہے اور کتنے روز میں ہوا ہے۔ انہوں نے کہا کہ نصف ہوا ہے تو وہ فرماتے ہیں کہ میاں دو برس تو ضائع کیئے اور دو برس بھی کیوں ضائع کرتے ہو۔ صاحبو! غضب تو یہ ہے کہ خدا کے قائل، آخرت کے قائل اور پھر یہ خیالات اور یہ مقالات۔

مجھے ایک دیندار فلسفی کا قول یاد آیا کہ انہوں نے ایک معتقد ارتقار کو لکھا تھا کہ ڈارون نے جو ارتقار کے مسئلہ کو مانا ہے اس کو تو یہ ضرورت پیش آئی کہ وہ خدا کا قائل نہ تھا تو جس امر میں اس کو مشاہدہ نہیں ہو سکا۔ اس کی بابت تخمین کی رائے قائم کر لی۔ انسان کا تکون بھی ایک واقعہ تھا اس کی نسبت بھی ایک رائے قائم کرنی پڑی تو انکار صانع کی صورت میں اس کا قائل ہونا چنداں بعید نہیں لیکن جو شخص خدا کا قائل ہے اس کو کیا ضرورت ہے کہ وہ اس تخمین پر چلے۔ اگر وہ یوں کہہ دے کہ خدا نے پیدا کیا تو اس میں کیا اشکال ہے۔ پس وجود صانع کا قائل ہو کر اس کا قائل ہونا سخت بعید ہے۔

اسی طرح میں کہتا ہوں کہ تعلیم قرآن کو بیکار اور تضیعِ اوقات کہنا اُس سے تو بعید نہیں جو آخرت کا قائل نہ ہو، مگر جو شخص آخرت کا قائل ہے اُس کی زبان سے ایسا نکلنا کہ قرآن کی تعلیم میں وقت کے صرف کرنے کو اضاعتِ وقت کہنا سخت عجیب ہے۔ کیا آخرت ہونے کی صورت میں اس کا ثمرہ نہ ملے گا؟

فکرِ آخرت کی ضرورت

صاحبو ــــ خدا تعالیٰ نے عقل اس واسطے دی ہے کہ اس سے انجام کو سوچے اور جیسا یہ انجام سوچنے کے قابل ہے کہ ہم آج پڑھ لیں گے تو کل ڈپٹی کلکٹری ملے گی، ایسا ہی اس آگے کا انجام بھی تو سوچنے کے قابل ہے کہ آخرت میں کیا ہوگا اور اگر کہو کہ آگے کوئی انجام نہیں تب تو پھر تم سے خطاب ہی نہیں لیکن چونکہ تم اگلے انجام کے بھی قائل ہو اس لئے پوچھا جاتا ہے کہ وہاں کیا ذخیرہ کی ضرورت نہ ہوگی؟ اور اگر ہوگی تو پھر قرآن کی تعلیم کو تضیع اوقات کس منہ سے کہا جاتا ہے ــــ افسوس کہ دنیا میں رہنا محض موہوم اور اس کے لئے یہ کوشش، اور آخرت میں جانا یقینی اور اس کے لئے سامان کی ضرورت نہ ہو اور اس کے سامان کو اضاعتِ وقت کہا جائے۔ اصل یہ ہے کہ خود آخرت ہی سے اس درجہ غفلت ہوگئی ہے کہ وہ یاد ہی نہیں آتی۔

ایک مرتبہ میں سہارنپور سے کانپور کو جاتا تھا۔ میرے ساتھ کچھ پونڈے (گنّے) بھی تھے۔ میں نے وزن کرانا چاہا۔ جو لوگ رخصت کرنے آئے تھے انہوں نے تورائے کی مخالفت کی ہی

مگر خود اسٹیشن والوں نے بھی کہا کہ آپ لے جائیں ہم گارڈ سے کہہ دیں گے، کوئی مزاحمت نہ کرے گا۔ میں نے پوچھا یہ گارڈ کہاں تک جائے گا۔ جواب ملا کہ غازی آباد تک۔ میں نے کہا، آگے کیا ہوگا؟ جواب ملا کہ آگے وہ گارڈ دوسرے گارڈ سے کہہ دے گا۔ میں نے کہا آگے کیا ہوگا؟ جواب ملا، پھر وہ کانپور تک برابر رہے گا اور کانپور آجائے گا۔ میں نے کہا آگے کیا ہو گا؟ جواب ملا بس آگے تو کانپور آجائے گا اور سفر ختم ہو جائے گا۔ میں نے کہا کہ نہیں اس سے آگے آخرت ہوگی، وہاں کون سے گارڈ مزاحمت سے بچائیں گے۔ سب چپ ہو گئے اور محصول لیا گیا ـــــ غرض آخرت ان اہل الرائے کو یاد نہ آئی۔

یہاں سے ایک جملہ معترضہ بھی قابلِ ذکر ہے۔ وہ یہ کہ اس قصہ میں جو باوجود اہلِ اختیار کی رعایت کے اس رعایت کو قبول نہیں کیا گیا اس کا سبب بجز اثر تعلیمِ شریعت کے کیا ہے۔ کیا آج کل کوئی مہذب ایسا کر سکتا ہے کہ اگر صاحبِ حق کو حق کی اطلاع بھی نہ ہو، تب بھی دوسرے کا حق ادا کرے۔ لیکن شریعت اس کو ضروری بتلاتی ہے۔ اب شریعت اور اپنی تہذیب مخترع کا مقابلہ کر کے دیکھ لیجئے۔ واللہ! ہم نے دیکھا ہے کہ غریب دین دار لوگ جن کو کم عقل سمجھا جاتا ہے وہ تو ان باتوں کا خیال رکھتے ہیں مگر ہمارے معزز جو عقلاء کہلاتے ہیں ذرا بھی خیال نہیں کرتے صاحبو! عاقل وہی ہے جو انجام پر بھی نظر کرے۔ پس جس میں دین نہیں وہ عاقل کیا ہو سکتا ہے۔ آج کل عقل اور دین میں منافات

سمجھی جاتی ہے حالانکہ ہمارے تمام بزرگ دنیا کی عقل کے ساتھ دین میں بھی ہمیشہ کامل ہوئے ہیں۔

ہرقل[1] نے حضرت عمرؓ کی نسبت سفیر اسلام سے پوچھا تھا کہ وہ کیسے شخص ہیں۔ اُس نے جواب دیا تھا کہ اُن کی حالت یہ ہے لَا یَخْدَعُ وَلَا یُخْدَعُ یعنے نہ کسی کو دھوکا دیتے ہیں نہ اُن کو کوئی دھوکا دے سکتا ہے۔ ہرقل نے کہا کہ اگر وہ ایسے ہیں تو اُن پر کوئی غالب نہیں آسکتا۔ کیونکہ جس میں دین اور عقل دونوں جمع ہوں اُس کی قوت کا مقابلہ ممکن نہیں ہوتا۔

یہ جملہ معترضہ ختم ہوا۔ بیان اس کو کر رہا تھا کہ آخرت سے بے خبری بے حد ہو گئی ہے اور اس بے خبری کی یہاں تک نوبت پہنچی ہے کہ جو باخبر ہو کر اس کی فکر کرتے ہیں اُن کو احمق سمجھا جاتا ہے ۔۔۔۔۔۔،

میرے ایک دوست جو بی اے تک تعلیم پائے ہوئے ہیں مگر دین دار ہیں اپنا واقعہ بیان کرتے تھے کہ ایک بار بوجہ تنگی وقت بدون اسباب وزن کرائے ہوئے ریل میں سوار ہو گئے۔ منزل مقصود پر پہنچ کر ٹکٹ کلکٹر سے اس کی اطلاع کی اور وزن کرا کر محصول دینا چاہا۔ ٹکٹ کلکٹر نے کہا کہ لے بھی جاؤ وزن کی کچھ ضرورت نہیں۔ اُنہوں نے کہا کہ آپ کو رعایت کا حق نہیں آپ مالک نہیں۔ اس کو تعجب ہوا اور اسٹیشن ماسٹر کے پاس لے گیا۔ اُنہوں نے وہاں بھی

---

[1] یہ روم کا نصرانی بادشاہ تھا ۱۲۔ احمد حسن عفی عنہ

یہی تقریر کی تو وہ دونوں باہم انگریزی میں یوں کہنے لگے کہ معلوم ہوتا ہے اس شخص نے شراب پی رکھی ہے ——— گویا دوسرے کا حق دینا ایسا عجیب امر ہے کہ حق دینے والے پر نشہ پینے کا شبہ ہوا۔ لیکن ہاں واقع میں وہ شراب محبت میں مدہوش تھے اور اسی کا نشہ اُن کو چور کئے ہوئے تھا۔

آخر اُنہوں نے کہا کہ جناب میں شراب پیئے ہوئے نہیں ہوں لیکن اسٹیشن والوں نے ہرگز محصول نہ لیا۔ مجبور ہو کر دوسرے طریقہ سے اُنہوں نے ادا کیا اور وہ طریق یہ ہے کہ اگر کسی ریلوے کا ہمارے ذمہ کچھ رہ جائے تو اس قیمت کا ٹکٹ اسی لائن کا لے کر تلف کر دیں اور اس ٹکٹ کو استعمال نہ کریں۔

اس قصہ کو میں نے اس واسطے بیان کیا کہ انجام پر بھی نظر ہونا چاہیئے۔ بالخصوص جب کہ دنیا کے کاموں میں انجام پر نظر کرتے ہو تو آخرت پر تو بہت ہی ضرور ہے۔ صاحبو ——— کیا موت کے انجام کا انکار ہو سکتا ہے۔ یہ تو وہ انجام ہے کہ اس سے کفار کو بھی انکار نہیں البتہ کفار میں ایک شر ذمہ قلیلہ، جو اہل ملت نہیں وہ البتہ آخرت کے منکر ہیں وھم لا اعتداد بھم غرض جب آخرت حق ہے اور اس کے لئے عمل کی ضرورت اور اس کے لئے علم اور تعلیم کی ضرورت پھر اس میں مشغول ہونا چہ معنی۔ مگر بہت لوگ پھر بھی اس کو اضاعت وقت سمجھتے ہیں اور اگر یہ اعتقاد بھی نہ ہو تو عمل تو اسی کے موافق ہے جس سے اعتقاد میں بھی ایک گونہ ضعف ثابت ہوتا ہے ورنہ اگر علم دین سے

دلچسپی ہے تو علماء کی بے وقعتی کی کیا وجہ؟ اور اگر ان کی وقعت بھی کی جائے تو اولاد کو علم دین نہ پڑھانے کی کیا وجہ؟ یہ آثار بُرے ہی عقیدے کے ہیں۔

محض اعتقاد کافی نہیں

علماء کی بے وقعتی کے متعلق بعضے یہ عذر کرتے ہیں کہ صاحب ہم نے وعظ سُنا اور معتقد بھی ہوئے مگر اخیر میں جو مولوی صاحب نے سوال کر دیا تو سارا اعتقاد ڈھل گیا۔ مگر میں کہتا ہوں کہ آپ کی مثال ایسی ہے کہ جیسے کوئی شخص حکیم عبدالعزیز صاحب وغیرہ سب کو اس وجہ سے چھوڑ دے اور سب کی بُرائیاں شروع کر دے کہ اُس نے عطائیوں کو دھوکا دیتے ہوئے دیکھا تھا۔ تو آپ اس کو صائب الرائے سمجھیں گے۔ اور کیا آپ نے بھی سب ہی حاذق اطباء کو چھوڑ دیا ہے۔ تو جن کی حکایتیں آپ نے یاد کر رکھی ہیں وہ واقع میں اناڑی عطائی ہیں۔ افسوس عطائیوں کے پھیل جانے سے آپ نے اطباء کو نہ چھوڑا مگر چند سائلوں کی وجہ سے محققین مولویوں کو چھوڑ دیا۔ مگر مولویوں کے نہ چھوڑنے سے میرا یہ مطلب نہیں کہ تم ان کے خالی معتقد رہو اور ان کے ہاتھ چوم لو۔ ہاتھ تو ہم خود تمہارے چوم لیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ علماء سے دین کا نفع حاصل کرو۔

اس وقت مولویوں کے ساتھ جو تمہارا خشک اعتقاد ہے اس کی ایسی مثال ہے جیسے مشہور ہے کہ دو کنجوس تھے۔ ایک نے دوسرے سے پوچھا کہ تم کھانا کیوں کر کھاتے ہو۔ اُس نے کہا

بھائی ہر مہینے ایک پیسہ کا گھی لے آتے ہیں اور سامنے رکھ کر اُس کو خطاب کرتے ہیں کہ ہاں تجھ کو کھا جاؤں گا۔ پورا مہینہ یوں ہی کاٹ دیتے ہیں پھر اخیر میں اس کو کھا لیتے ہیں۔ وہ بولا تم بڑے فضول خرچ ہو۔ ہم تو روٹی پکا کر جس گلی میں گوشت بھُننے کی خوشبو آتی ہو وہاں کھڑے ہو کر خوشبو سونگھنے جاتے ہیں اور روٹی کھا لیتے ہیں۔

تو یہ دونوں بھی گھی کے معتقد تھے اور ایک گونہ تلبس بھی تھا لیکن ان کو اس کا کیا نفع ہوا۔ ایسے ہی آپ کو نرے اعتقاد سے اور محض ادب و تعظیم سے کیا نفع ہوگا۔

اولاد کے لئے ضروری تعلیم

غرض یہ آثار ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ علماء کو بالکل بیکار چیز سمجھتے ہیں۔ مجھ سے ایک شخص کی گفتگو ہوئی۔ کہنے لگے کہ آپ نے اپنے بھتیجے کے لئے کیا تجویز کیا۔ میں نے کہا کہ عربی پڑھنا ہے تاکہ دین کی خدمت کرے۔ کہنے لگے مدرسہ دیوبند میں ہمیشہ سو ڈیڑھ سو آدمی فارغ ہو کر نکلتے ہیں وہ خدمتِ دین کے لئے کافی ہیں۔ آپ نے ان کے لئے انگریزی کیوں تجویز نہ کی کہ دنیوی ترقی کرتا۔ میں نے کہا کہ جناب خادمِ دین ہونا اگر خسارہ کی بات ہے تب تو کیا وجہ ہے کہ طلبائے دیوبند کے لئے یہ پست حالت پسند کی جائے بلکہ چلو ان کو یہ مشورہ دو کہ سب چھوڑ کر انگریزی میں مشغول ہو جاؤ۔ آخر وہ بھی قوم ہی کے بچے ہیں۔ اور اگر خادمِ دین ہونا کوئی نافع امر ہے تو کیا وجہ کہ میرے بھتیجے کے لئے اُس کو تجویز نہ کیا جائے آخر بالکل

خاموش ہو گئے۔

افسوس کی بات ہے کہ دیوبند کے طالب علم تو ایسے ذلیل کہ جس شغل کو آپ بالکل بے کار سمجھ رہے ہیں وہ تو اُن کے لئے تجویز کیا اور آپ کی اولاد ایسی محبوب و معزز کہ اُس کے لئے ڈپٹی کلکٹری اور تحصیلداری تجویز کی جائے۔ صاحبو! میں ڈپٹی کلکٹری وغیرہ سے منع نہیں کرتا لیکن یہ بھی تو دیکھئے کہ آپ نے اولاد کے لئے دین کی کیا فکر کی ہے۔ کیا آپ کو یہ اطمینان ہے کہ آپ کی اولاد دارِ آخرت میں نہ جائے گی۔ اور اگر جائے گی تو اُس کا کیا حشر ہو گا۔ اسی طرح یہ سوچئے کہ کیا خادمانِ دینی کی ضرورت نہیں اور اگر ضرورت ہے تو کیا سب مسلمانوں پر اس کا اہتمام ضروری نہیں۔ تو آپ نے کیا اہتمام کیا ——۔؟

اس موقع پر ممکن ہے کہ بعض لوگ خوش ہوں کہ ہم اس الزام سے بری ہیں کیونکہ ہم نے ایک بچہ کو عربی میں داخل کر دیا ہے لیکن یہ کوئی خوشی کی بات نہیں کیونکہ آپ نے جس معیار پر اس بچے کو انتخاب کیا ہے اس طرز پر وہ بچہ خود اس مقصود کے لئے کافی نہیں کیونکہ آج کل معیارِ انتخاب یہ ہے کہ جو سب سے زیادہ غبی اور کم عقل ہوتا ہے اُس کو عربی کے لئے تجویز کیا جاتا ہے حالانکہ دنیا کمانے کے لئے بڑے عالی دماغ ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ تو چکی پیسنا ہے جس کو تھوڑی سی مناسبت بھی ہو گی وہ بھی اس کو بخوبی کر سکتا ہے دماغ کی ضرورت زیادہ اس کام کے لئے ہے جس کے لئے انبیاء علیہم السلام بھیجے گئے —— اللہ اکبر! کتنا قلب موضوع ہو

گیا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ انبیاء کرام کیا چیز ہیں۔ صاحبو! دنیا کی عقل بھی ان کے برابر کسی کو نہیں ہوتی۔ ان حضرات کو ہر ایک قسم کا شرف عطا فرمایا جاتا ہے۔ تو جو کام نیابت انبیاء کا ہے اس کے لئے بھی تو ایسی ہی عقلِ کامل کی ضرورت ہے۔ اب بتلائیے کہ اولاد کا انتخاب کس قاعدے پر ہونا چاہیئے۔ اور بلنع لوگوں کے اس خیال کا کہ باکار اولاد کے لئے علمِ دین تجویز نہیں کرتے یہ ہے کہ یہ سمجھتے ہیں کہ عربی پڑھ کر لڑکا کھانے کمانے کے قابل نہیں رہے گا۔

کھانے کمانے کی حاجت

سو اوّل تو یہ غیر مسلّم ہے کیونکہ کھانا کمانا تو ایک محدود حاجت ہے تو اپنی حاجت کے لائق سب ہی کر لیتے ہیں۔ اور اگر بہت ہی کمایا تو خاص اس کے کام میں تو تھوڑا ہی آئے گا بلکہ جو اصلی مقصود ہے کھانے کمانے سے کہ جان کو لگے اس میں اکثر غرباء اکثر امراء سے بڑھے ہوئے ہیں۔

میں ایک امیر اور ایک غریب کی حکایت سناتا ہوں کہ وہ دونوں آپس میں دوست تھے اگر غریب تو بہت موٹا تازہ اور امیر صاحب نہایت دُبلے پتلے۔ ایک روز اُس نے اپنے غریب دوست سے پوچھا کہ یار تم کیا چیز کھاتے ہو کہ اس قدر توانا ہو رہے ہوا اُس نے کہا کہ میں کھانا تم سے لذیذ کھاتا ہوں امیر بولا بھائی وہ کھانا ہم کو بھی کھلاؤ۔ اُس غریب نے دعوت کر دی۔ وقت پر امیر اُس کے مکان پر پہنچے۔ ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ آخر جب دیر ہو گئی اور بھوک لگی تو بے تکلفی کے سبب کھانے کا تقاضا کیا۔ اُس نے وعدہ

کیا ابھی آتا ہے۔ پھر اور دیر ہوئی اور نہ زیادہ بھوک لگی، زیادہ تقاضا کیا اور وہ یوں ہی ٹالتا رہا۔ آخر جب وہ بہت ہی بیتاب ہوا اور سخت تقاضا کیا تو میزبان نے کہا کہ بھائی کھانا تو ابھی تیار نہیں لیکن دن کی باسی روٹیاں موجود ہیں، اگر کہو تو لے آؤں۔ اُس نے کہا کہ خدا کے لئے تم باسی ہی لے آؤ۔ چنانچہ وہ کچھ تھوڑے سے باسی ٹکڑے اور کچھ ساگ وغیرہ لایا۔ اُن کی تو بھوک کے مارے بُری حالت تھی بس ان ہی ٹکڑوں پر ٹوٹ پڑے اور نہایت مزے لے کر شکم سیر ہو کر کھائے۔ وہ غریب منع کر رہا ہے کہ صاحب زیادہ نہ کھایئے بہت مزے دار کھانا پک رہا ہے۔ اُس نے کہا کہ صاحب اب تو یہی بے حد مزے دار معلوم ہوتا ہے۔

تب اُس غریب نے کہا کہ صاحب جو مزے دار کھانا میں ہر روز کھاتا ہوں وہ یہی ہے۔ مطلب یہ تھا کہ میں اسی وقت کھاتا ہوں جب سخت بھوک لگتی ہے۔ اس لئے جو کچھ کھاتا ہوں جزو بدن ہوتا ہے اور تم محض ضابطہ پُری کرتے ہو کہ کھانے کا وقت ہوا، خادم نے آکر عرض کیا حضور کھانا تیار ہے، تم نے سُنا اور کھانے کے لئے آمادہ ہو گئے۔ اگرچہ اس وقت تم کو بھوک بھی نہ ہو۔

غرض اگر کسی نے بارہ سو تیرہ سو کمائے بھی تو کھانا تو اُس کا بھی جو کہ مقصود بالذات ہے محدود ہی ہو گا، ہاں کمانا غیر محدود ہو گا۔ مگر جب کہ کھانے کی غایت محدود ہے تو کمانے کا غیر محدود ہونا اُس کو کیا کارآمد ہوا۔ جب مقصود بالذات ہی کم ہے تو مقصود بالغیر کے زیادہ ہونے سے کیا نفع؟ سو اوّل تو اسی مقدمہ میں کلام ہوا کہ

مولوی ہو کر کما کھا نہ سکیں گے کیونکہ بقدر ضرورت تو سب ہی کما کھا لیتے ہیں اور اگر تسلیم بھی کر لیا جائے تو اس کو بھی ثابت کیجئے کہ وہ کمانا جو آپ لوگوں کے ذہن میں ہے یعنی نوکری، تجارت وغیرہ آیا وہ ضروری بھی ہے۔ اس کا اندازہ اس طرح ہو جائے گا کہ آپ کسی خادم دین کو بھوکا ننگا دکھلا دیجئے اور خدمت دین کی عام ہے خواہ وہ تدریس ہو یا وعظ ہو۔ یا کسی خادم دین کو ذلیل دکھلا دیجئے پھر جب یہ بھوکے ننگے بھی نہیں، ذلیل بھی نہیں، تو وہ کون سی چیز ہے جو خادمانِ دین میں کم ہے؟ اگر وہ کوئی چیز ہے تو آپ کی ہوسیں ہیں، تو ان کے لئے یہ جواب کافی ہے کہ ؎

حرص قانع نیست صائبؔ ورنہ اسبابِ معاش
آنچہ ما درکار داریم اکثرے درکار نیست

ترقی دنیوی مطلوب نہیں ہے

ذرا آپ اپنے ہی گھر میں جا کر اسباب کا جائزہ لیجئے تو نصف سے زیادہ وہ سامان نکلے گا جس کے استعمال کی کبھی نوبت بھی نہیں آتی اور چوتھائی سے زیادہ وہ نکلے گا کہ اس کی نسبت آپ کو آج تک یہ بھی خبر نہیں کہ وہ گھر میں بھی ہے۔ تو ایسے اسباب کے جمع کرنے کی آپ ہی بتلائیے کیا ضرورت ہے؟ اور اگر مراد آپ کی ناکارہ ہونے سے یہ ہے کہ وہ ترقی نہیں کر سکتا تو حضرت ایسا ناکارہ ہونا تو عین مطلوب اور آئین وفاداری ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

تا بدانی ہر کرا یزداں بخواند   از ہمہ کارِ جہاں بیکار ماند

اور فرماتے ہیں ؎

ما اگر قلاش وگر دیوانہ ایم　　　　مست آں ساقی و آں پیمانہ ایم

لیکن یہ تو مولانا رومی کا کلام ہے اس سے تو صرف اہل دل متاثر ہوں گے۔ اب میں آپ کے مسلمات سے ایک مثال دیتا ہوں کہ آپ کا ایک نوکر ہے۔ اس کو آپ دس روپے دیتے ہیں اور آپ کو اس پر اعتماد ہے۔ اتفاق سے کہیں باہر کا ایک شخص اس کو ملا اور اس سے پوچھا کہ تم کیا کرتے ہو اور تم کو کیا معاوضہ ملتا ہے۔ معلوم ہوا کہ نوکر ہیں اور دس روپے ملتے ہیں۔ اس کو سن کر اس مسافر نے کہا کہ تم میرے ساتھ چلو۔ میں تم کو بیس روپے دوں گا اور اس سے نصف کام تم سے لوں گا۔

اب دل میں ٹٹول کر بتلایئے کہ اس نوکر کے لئے خوبی اور فخر کی بات کیا ہے۔ آیا یہ کہ ترقی کا نام سن کر پھسل جائے یا یہ کہ صاف جواب دے دے اور کہہ دے کہ آپ مجھے بہکانے آئے ہیں۔ یقیناً آپ دوسری شق کو اس کے لئے خوبی سمجھیں گے۔

اب انصاف سے بتلایئے کہ اگر کوئی خدا کا نوکر ہے اور پانچ روپے میں گزر کرتا ہے اور اس حالت میں وہ ہزار روپے پر اس طرح لات مار دے کہ باوجود قدرت تحصیل اسباب کے وہ اسباب تعلیم معاش وغیرہ ترک کر دے تو اس کو کم حوصلہ اور محروم الترقی کیوں کہا جاتا ہے۔ صاحبو! اس کی قدر تو اور بھی زیادہ ہونی چاہیئے نہ یہ کہ اس کو خشک دماغ بتلایا جائے۔ صاحبو! جس کا نام آپ نے ترقی رکھا ہے اس کا خلاصہ واللہ محض غرض پرستی، خود پرستی ہے اگرچہ

اس کے پیچھے ساری عقل اور دین سلب ہو جائے۔ اسی کو کہتے ہیں

عاقبت سازد ترا از دیں بری ؎

ایں تن آرائی و ایں تن پروری

تو مولاناؒ کے قول سے اگر تسلی نہ ہوئی تھی لیکن آپ کے نوکر کی مثال سے تو تسلی ہو گئی ہو گی۔ صاحبو! جس سے دلچسپی نہیں ہوتی اس میں انسان ترقی نہیں کر سکتا ۔

انبیاء در کارِ دنیا جبر یند	اشقیا در کارِ عقبے جبر یند
انبیاء را کارِ عقبیٰ اختیار	اشقیا را کارِ دنیا اختیار

غرض اپاہج اور چست سب ہیں لیکن اہلِ دنیا کارِ دنیا میں چست اور کارِ عقبیٰ میں سست ہیں اور اہل اللہ کارِ دنیا میں سست اور کارِ عقبیٰ میں چست ہیں۔ اور اگر اب بھی تمہارے نزدیک فیصلہ نہیں ہوا تو سمجھ لیجئے کہ

اِنْ تَسْخَرُوْا مِنَّا فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُوْنَ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَيَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ۔

۔ اگر تم ہم سے تمسخر کرتے ہو تو ہم بھی تم سے ٹھٹھا کرتے ہیں جس طرح تم ٹھٹھا کرتے ہو۔ سو عنقریب معلوم کر لو گے کہ رسوا کرنے والا عذاب کس پر آتا ہے اور دائمی عذاب کس پر اُترتا ہے۔

اور ؎ فسوف ترىٰ اذا انكشف الغبار

افرس تحت رجلك ام حمار

کہ ایک شخص گدھے پر سوار ہے اور دوسرا اس کو کہتا ہے کہ تو گدھے پر سوار ہے مگر کثرتِ غبار سے اُس کو پتہ نہیں چلتا اور کہتا ہے کہ میں گھوڑے پر سوار ہوں۔ پہلا شخص جواب دیتا ہے کہ اچھا ذرا غبار بیٹھ جائے تو پھر تم کو معلوم ہو گا کہ تمہاری ران کے نیچے گدھا ہے یا گھوڑا۔

اسی طرح ہم کہتے ہیں کہ اگر آپ اس پر راضی نہیں تو ذرا صبر کیجئے سَیَعْلَمُوْنَ غَدًا مَّنِ الْکَذَّابُ الْاَشِرُ۔ ورنہ صاحبو، جب آپ کے ملازم کے لئے ترقی نہ چاہنا خوبی اور وفاداری ہے تو خدا کے نوکر کے لئے کیوں یہ خوبی اور وفاداری نہیں ہے۔ تو صاحب یہ ہے وہ نکما ہونا جس کی حقیقت آپ نے اعتراض کر کے خود کھلوائی۔ میں پھر کہتا ہوں کہ وہ نکما کہنے سے بُرا نہیں مانتا بلکہ خود اس پر فخر کرتا ہے اور کہتا ہے اُس کا کام یہ ہے ؎

عاشقِ بدنام کو پروائے ننگ و نام کیا
اور جو خود ناکام ہو اُس کو کسی سے کام کیا

صاحبو ــــ وہی نکمے تھے کہ اگر آج اُن کی جوتیاں مل جائیں تو سر پر رکھی جاتی ہیں۔

امراء کی دلچسپی کا اثر

بس یہ منشع تھا، علم دین سے بے رغبتی کا کہ لوگ ان کو بیکار سمجھتے ہیں اور اسی لئے اس سے مطلق دلچسپی نہیں ہے۔ ورنہ دلچسپی کی تو یہ علامت ہے کہ اس کو اپنے لئے اور اپنی اولاد کے لئے بھی

تجویز کرتے۔

مجھے عالمگیرؒ کی ایک حکایت یاد آئی ہے (یہ حکایت زبانی ہے کتابی نہیں) کہ ایک روز جامع مسجد میں انہوں نے طالب علموں کو دیکھا کہ سخت پریشان پھرتے ہیں اور خورد ونوش کی کوئی سبیل نہیں۔ سمجھے کہ سبب اس کا بے رغبتی امراء کی ہے۔ چاہا کہ اس کی اصلاح ہو۔ بس وضو کرتے ہوئے وزیر اعظم سے ایک مسئلہ پوچھا کہ اگر نماز میں فلاں شبہ ہو جائے تو کیا کرے؟ وزیر صاحب اس کا جواب نہ دے سکے۔ عالمگیرؒ نے ذرا غضب ناک نظر سے وزیر کی طرف دیکھا اور کہا تم کو یہ توفیق نہیں ہوتی کہ فقہ کے ضروری مسائل یاد کرو۔ وزراء وغیرہ سب تھرّا گئے اور فوراً ہی طلبا کی تلاش شروع ہو گئی اور روزانہ ان سے سیکھتے اور اس طرح سے وہ سب اطمینان کی حالت میں ہو گئے۔ پھر تو یہ حالت تھی کہ طالب علم ڈھونڈے نہ ملتے تھے حضرت مولانا شیخ محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ بیان فرماتے تھے کہ عالمگیرؒ کو بارہ ہزار حدیثیں یاد تھیں۔

دیکھئے جب امراء کو اس جماعت سے دلچسپی ہوئی گو بضرورت سہی تو اس کا یہ اثر ظاہر ہوا کہ ان سے مستفید ہونے لگے۔ اگر آپ کو بھی اس سے دلچسپی ہوتی تو کم از کم ہفتہ میں ایک ہی دن کسی عالم سے مسائل پوچھ لیا کرتے۔ اگر خود ان کے پاس نہ جاتے تو ان ہی کو اپنے پاس بلا لیتے۔ کیونکہ آج وہ رئیس کہاں رہے ہیں جو خود طالبانہ حاضر ہوں ــــــ؛

پہلے یہ حالت تھی کہ ہارون الرشید نے امام مالکؒ سے

درخواست کی کہ شہزادوں کو حدیث پڑھا جایا کیجیے۔ اُنہوں نے فرمایا کہ آپ ہی کے خاندان سے علمِ دین کی عزت ہوئی ہے اور آپ ہی بے عزتی کرتے ہیں۔ ہارون نے کہا کہ اچھا شہزادے وہاں ہی حاضر ہوں گے مگر اُس وقت عام رعایا سے الگ کر دیئے جایا کریں ——— آج بھی بعض رئیس جماعت میں نہیں آتے کہ خلط ملط سے لوگ ہمارا رُعب نہ کھائیں گے۔ صاحبو! ذرا سنبھلو، یہ طرز در پردہ حکمِ شریعت پر اعتراض ہے کہ ایسا مضر قانون تجویز فرمایا۔ دوسرے یہ بالکل غلط ہے کہ خلط ملط سے رُعب جاتا رہے گا۔ رُعب تو اُس وقت بھی ہوگا لیکن اُنس کے ساتھ ہوگا اب وحشت کے ساتھ ہے۔

ہیبتِ حق

خدا تعالیٰ کے احکام ایسے بے ڈھنگے نہیں ہیں کہ اُن کے مضر آثار ہوں۔ دیکھیے خلفائے راشدین کا کس قدر رُعب رعایا پر تھا لیکن اس کے ساتھ ہی دیکھ لیجئے کہ خلفاء کی طرف سے کیا تواضع ہوا کرتی تھی ———،

حتیٰ کہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے بر سرِ منبر فرمایا کہ اسمعوا و اطیعوا (تم سنو (حکمِ خلیفہ) اور اطاعت کرو) سامعین میں سے ایک شخص نے کہا کہ لا نسمع ولا نطیع (ہم نہیں سنتے اور نہ اطاعت کرتے ہیں) حضرت عمرؓ نے وجہ پوچھی، تو اُس شخص نے کہا کہ غنیمت کے چادرے جو آج تقسیم ہوئے ہیں سب کو نو ایک ایک ملا ہے اور آپ کے بدن پر دو ہیں۔ معلوم ہوتا ہے آپ نے تقسیم میں عدل نہیں کیا۔ آپ نے فرمایا بھائی، تو نے اعتراض میں بہت

جلدی کی۔ بات یہ ہے کہ میرے پاس آج کُرتہ نہیں تھا، تو میں نے اپنے چادرے کو آزار کی جگہ باندھا اور ابن عمرؓ سے اُن کا چادرہ مستعار لے کر اُس کو کُرتہ کی جگہ اوڑھا ہے۔

اس واقعہ سے آپ کو یہ بھی معلوم ہو گیا ہوگا کہ اُن حضرات میں بڑے چھوٹے سب برابر حصّے کے مستحق سمجھے جاتے تھے۔ آج بڑوں کا دوہرا حصّہ ہونا تو گویا لازمی امر ہے البتہ اگر مالک ہی دوہرا حصّہ دے تو کچھ مضائقہ نہیں ——— غرض تواضع کی تو یہ کیفیت تھی اور باوجود اس نرمی کے رُعب کی یہ حالت تھی کہ ایک مرتبہ آپ بہت سے صحابہؓ کے ساتھ جا رہے تھے۔ اتفاقاً پشت کی طرف جو آپ نے نظر کی تو جس جس پر نظر پڑی، سب گھٹنوں کے بل گر پڑے ؎

ہر کہ ترسید از حق و تقوےٰ گزید
ترسد از وے جن و انس وہر کہ دید

یعنی جو خدائے تعالیٰ سے ڈرے گا اُس سے سب ڈریں گے۔ اور اگر کسی کے رُعب میں کمی ہے تو تقویٰ کی کمی کی وجہ سے، ورنہ ضرور ہیبت ہوتی ہے ہاں وحشت اور نفرت نہیں ہوتی۔ اور اجتناب و عدم اختلاط کے ساتھ جو ہیبت ہوتی ہے وہ ایسی ہے جیسے لوگ بھیڑیئے سے ڈرتے ہیں کہ اگر اس مجلس میں بھیڑیا آجائے تو ابھی سب کھڑے ہو جائیں۔

تو جیسے آج کل رؤسا کو خیال ہے ایسا ہی ہارون الرشید کو یہ خیال ہوا کہ اگر شہزادے سب سے الگ پڑھیں گے تو اُن کا رُعب

باقی رہے گا۔ اس لئے امام مالکؒ سے عرض کیا کہ شاہزادوں کے ساتھ کسی کو نہ بٹھلائیے۔ امام صاحب نے فرمایا کہ یہ بھی نہیں ہوسکتا غرض آخر شہزادے ہی حاضر ہوا کرتے اور حدیث سُنا کرتے۔

تو اُس وقت تو بادشاہ ایسے تھے کہ ایک عالم نے ٹکا سا جواب دے دیا اور اُس کو بادشاہ نے قبول کر لیا لیکن آج وہ حالت نہیں ہے۔ اس وقت بھی علماء کو چاہیئے کہ اپنے کو ذلیل نہ کریں لیکن بہت زیادہ اجتناب بھی نہ کریں کہ اس میں اہل دنیا بالکل ہی محروم رہیں گے یعنے اگر کوئی شخص انتفاع دین کے لئے اہلِ علم کو قدر کے ساتھ بلائے تو چلا جانا مناسب ہے۔

دین کی دوستی

میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ عالموں کو بلا کر آپ اُن سے عربی پڑھیئے۔ اس میں تو آپ کو پھر عذر سوجھیں گے۔ سو میرا یہ مطلب نہیں کیونکہ بحمداللہ اُردو میں بھی ایسا کافی ذخیرہ مذہبی ہوگیا ہے کہ آپ کو عربی کی ضرورت نہ پڑے گی۔ لیکن یہ خوب یاد رکھئے کہ مذہبی کتابوں سے مراد علماء باعمل کی کتابیں ہیں نیچریوں کے خرافات مراد نہیں اگرچہ لقب اُن کا بھی مولوی ہو۔

مجھ سے ایک نائب تحصیلدار صاحب نے کہا کہ میں مذہبی کتابیں دیکھا کرتا ہوں۔ دریافت جو کیا تو معلوم ہوا کہ آپ نیا چرہ کی کتابیں دیکھتے ہیں۔ میں نے کہا کہ صاحب اگر آپ قانونِ گورنمنٹ یاد نہ کریں اور اخبار ہی دیکھا کریں تو کیا آپ گورنمنٹ کی عملداری میں رہ کر کام چلا سکتے ہیں ــــــ ہرگز نہیں۔ کیونکہ جو نصاب گورنمنٹ نے تجویز

کیا تھا آپ نے اُن کو نہیں دیکھا بلکہ اپنی طرف سے ایک نیا نصاب تجویز کر لیا۔ تو اسی طرح مذہب میں بھی وہ کتابیں دیکھئے جو مذہبی نصاب میں داخل ہیں۔

اس وقت لوگوں نے نصاب تعلیم بھی اپنی رائے سے تجویز کر لیا ہے۔ چنانچہ مردوں نے تو یہ نصاب مذکور تجویز کیا یعنی بددینوں کی تالیفات اور عورتوں نے موضوع قصّے کہانیوں کی کتابیں تجویز کیں جیسے معجزہ آل نبیؐ وغیرہ جس کا مہمل ہونا نام ہی سے ظاہر ہے کیونکہ معجزہ آل نبیؐ کا نہیں ہوتا۔

دوسرے اس میں حضرت علیؓ پر یہ الزام لگایا گیا ہے کہ انہوں نے حضرات حسنینؓ کو کسی فقیر کو ہبہ کر دیا تھا اور اُس نے کسی اور کے ہاتھ بیچ دیا تھا۔ اور ایسے قصّے پڑھنے والے تو جاہل ہی ہیں) ان جاہلوں سے بڑھ کر بعض مولویوں نے یہ غضب کیا ہے کہ نفع تجارت کے لئے وہ قصّہ چھاپا اور چونکہ موضوع کی اشاعت ناجائز ہے اپنے کو بری کرنے کے لئے اخیر میں یہ لکھ دیا کہ یہ قصّہ موضوع طبع ہوا اوّل تو آپ کو اس کی اشاعت کی کون سی دینی ضرورت تھی۔ پھر یہ کہ عوام تو موضوع کے معنے بھی نہیں سمجھتے۔ اگر لکھنا تھا تو یہ لکھتے کہ یہ قصّہ بالکل لغو اور جھوٹ ہے۔ اس کا پڑھنا جائز نہیں۔ لیکن اگر ایسا لکھتے تو وہ بکتا کہاں! خدا بچائے ایسے دین فروشوں سے۔ اسی لئے کہا ہے ؎

بد گہر را علم و فن آموختن ۔۔۔ دادن تیغ است دست راہزن

اب اگر کہو کہ پھر اس صورت میں تو انتخاب بہت مشکل ہوا تو واقعی

تم کو انتخاب مشکل ہے مگر کسی عالم سے انتخاب کرا لیجیے۔ یہ تو نصاب تعلیم میں گفتگو تھی مگر اس کے ساتھ ہی یہ اس سے زیادہ ضروری ہے کہ ابتداء ہی سے اپنی اولاد کو کسی بزرگ کی صحبت میں وقتاً فوقتاً رکھیئے اور خود بھی رہیے۔ اس کی صحبت میں خدا تعالیٰ نے اصلاح کا اثر رکھا ہے۔ اسی کو فرماتے ہیں ؎

قال را بگذار مردِ حال شو　　پیش مردِ کاملے پامال شو

صحبتِ نیکاں اگر یک ساعت است　　بہتر از صد سالہ زہد و طاعت است

ہر کہ خواہد ہم نشینی با خدا

گو نشیند در حضورِ اولیاء

مگر صحبت کا ہم لوگوں میں بالکل ہی اہتمام نہیں۔ میں نے ایک موقع پر اس کو ایک مستقل تقریر میں بیان کیا ہے اور اب پھر کہتا ہوں کہ جہاں اور تمام ضروریات اپنی اولاد کے لئے تجویز کی جاتی ہیں چند روز کے لئے اس کا بھی انتظام کر لیجئے کہ اس کو کسی بزرگ کے سپرد کر دیجئے اور کم سے کم ایک سال تک ان کے پاس ضرور رکھئے اگر کہئے کہ اس میں تو ان کی دنیوی تعلیم کا بڑا نقصان ہوگا۔ تو میں کہتا ہوں کہ اس کی یہ صورت کیجئے کہ ہر چھٹی میں چند روز رکھا کیجئے۔ اس طرح چند مرتبہ میں یہ مدت پوری ہو جائے گی۔ غرض صحبت کا بھی اہتمام ہو اور محقق علماء کے تجویز کردہ نصاب کی تعلیم ہو۔ اس طرح دین کی درستی ہو سکتی ہے۔ اگر فرصت کم ہو تو اردو ہی ورنہ وقت ملے تو عربی سے بھی نہ چوکئے کہ تجربہ و تحقیق کا یہی طریقہ ہے۔

علمِ دین کی خاصیت

میں تو ترقی کر کے کہتا ہوں کہ علومِ عربیہ اگر دین کے لیئے نہ پڑھائے جائیں تو دنیا ہی کی لیاقت اور استعداد کے لیئے پڑھایئے۔ میں نے دیکھا ہے کہ جو لوگ ایم، اے ہیں مگر عربی کی استعداد نہیں رکھتے اُن سے لیاقت میں عربی خواں جو انٹرینس بھی نہیں پڑھے، بڑھے ہوتے ہیں۔ تو اگر عربی کی تعلیم دین کے لیئے نہ ہو تو کم از کم دنیا ہی کے لیئے ہو۔ لیکن اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ میں علمِ دین کو دنیا کے لیئے حاصل کرنے کی رائے دیتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ علمِ دین کی خاصیت ہے کہ کبھی نہ کبھی اپنا اثر ضرور کرتا ہے اور حاصل کرنے والے کو دیندار بنا کر رہتا ہے۔ یہ سمجھ کر میں نے کہہ دیا ہے کہ خواہ دنیا ہی کے لیئے حاصل کرو غرض جس طرح ہو علمِ دین کا اہتمام کرو۔ گو اس کے ساتھ انگریزی بھی ہو۔ میں انگریزی تعلیم سے منع نہیں کرتا مگر اس وقت تو اسلام ہی کے لالے پڑ رہے ہیں۔ آخر اس کو بھی سنبھالنے کی ضرورت ہے یا نہیں۔ بس اس کی رائے دے رہا ہوں اور یہ دعوے کرتا ہوں کہ دنیا کے سنبھالنے کے لیئے بھی دین ہی کی ضرورت ہے۔ اس لیئے میں نے تمہید میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ سب سے زیادہ ضروری جماعت مولویوں کی ہے

فساد اور اصلاح

اب ان آیتوں سے اس کو ثابت کرتا ہوں تو سمجھیئے کہ ان دو آیتوں میں یہ بھی ارشاد ہے کہ لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا اور یہی جزو ہے جو اس وقت مقصود بالبیان ہے یعنی اصلاح کے بعد زمین میں فساد نہ پھیلاؤ۔

اب یہ دیکھئے کہ فساد کیا ہے اور اصلاح کیا ہے۔ اسی کے فیصلے کے لئے میں نے یہ دونوں آیتیں پوری پڑھ دی ہیں تاکہ سیاق وسباق سے اس کی تعیین ہو جائے تو پہلے تو یہ فرمایا ہے کہ

اُدْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً

اور بعد میں یہ فرمایا کہ

وَادْعُوهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا

اور دعا میں دو احتمال ہیں۔ یا تو دُعا کے وہی معنی ہوں جس کو عرف میں دُعا کہتے ہیں یا دُعا کے معنی عبادت کے ہوں کیونکہ قرآن میں دُعا کے معنے عبادت کے بھی آئے ہیں۔ چنانچہ بعض نے اُدْعُونِیۤ اَسْتَجِبْ لَكُمْ میں عبادت کے معنی لیئے ہیں اور بعض نے دُعا کو اپنے معنی میں رکھ کر لفظ عبادت کو جو اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ میں ہے دُعا کے معنوں میں لیا ہے۔ نیز دوسری جگہ ارشاد ہے وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ یَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔ یہاں دُعا بمعنی عبادت ہے۔ غرض دُعا دونوں معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

تو اس آیت میں اگر عبادت کے معنے لیئے جائیں تب تو خلاصہ یہ ہوگا کہ اوّل بھی عبادت کا حکم ہے اور بعد میں بھی۔ اور درمیان میں فساد کی ممانعت ہے۔ جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ عبادت نہ کرنا فساد ہے اور اس سے اصلاح کی بھی تعیین ہو گئی کہ بعد انتظام عبادت ترکِ عبادت نہ کرو۔

اگر دُعا کے معنی عبادت کے نہ لیئے جائیں بلکہ اپنے ظاہری معنی پر رکھا جائے تو اس وقت بظاہر یہ آیت اس دعوی کے اثبات

کے لئے مفید نہ ہوگی لیکن غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ اس صورت میں بہت زیادہ مفید ہے۔ کیونکہ عبادت دو قسم کی ہے۔ ایک تو وہ عبادت جس سے مقصود دین ہی ہے اور ایک وہ عبادت جس سے کبھی دنیا بھی مقصود ہوتی ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ پہلی عبادت اپنے عبادت ہونے میں زیادہ قوی ہے۔

اب سمجھئے کہ دعا عبادت کی ایسی فرد ہے کہ اس سے دنیا کی بھی طلب ہو سکتی ہے تو اس اعتبار سے دعا دوسرے درجے کی عبادت ہوگی تو جب اس کے ترک کو فساد فرمایا گیا ہے تو جو عبادت خالصہ ہے اس کا ترک تو کیوں موجب فساد نہ ہوگا۔ تو قرآن اس کا دعویٰ کرتا ہے کہ عبادت کا ترک کرنا موجبِ فساد فی الارض ہے اور انتظام عبادت کو اصلاح فی الارض فرما رہا ہے۔

باقی یہ کہ جس وقت یہ ارشاد ہو رہا ہے اس وقت بہمہ وجوہ اصلاح کہاں تھی جس کے بعد فساد سے منع فرماتے ہیں۔ کیونکہ کفار کی کثرت تھی جو ہر وقت فساد میں ہی رہتے تھے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ مراد اصلاح سے سامانِ اصلاح ہوگا یعنے بعثت نبی کریم کہ وہ سامان تھا اصلاح فی الارض کا۔ تو معنے یہ ہوئے کہ ہم نے یہ اصلاح کی کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھیج کر سامان اصلاح کر دیا۔ اگر تم ان کو چھوڑ دوگے تو تم فساد کروگے۔ یہ تو آیت کا مدلول ہوا جس کا حاصل یہ ہوا کہ عبادت یعنی دین نہ ہونا موجبِ فساد ہے۔ اب میں اس کو مشاہدہ سے ثابت کرتا ہوں۔

دین کی حقیقت

لیکن اوّل اس کو سمجھئے کہ دین کیا چیز ہے تاکہ آپ کو پھر مدلول آیت میں تعجب نہ ہو۔ تو دین حقیقت میں چند چیزوں کے مجموعے کا نام ہے مگر ہم لوگوں نے اس وقت دین کا یہ ست نکالا ہے کہ پانچ وقت کی نماز پڑھ لی اور بس۔ اور بعض نے تو یہ بھی نہیں رکھا بلکہ محض مَنْ قَالَ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ۔ اپنی مزعوم تفسیر کے اعتبار سے اُن کا مذہب ہے اور اس پر غضب یہ ہے کہ بعض نے مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کی بھی ضرورت نہیں سمجھی۔ میں نے اُس کی تفسیر دیکھی ہے کہ (نعوذ باللہ) رسالت کا ماننا نجات کا موقوف علیہ نہیں۔

صاحبو۔۔۔ مولوی اسی کو روتے ہیں کہ آپ کے گھر میں آگ لگی ہے لیکن آپ کو خبر نہیں۔ صاحبو! غضب ہے کہ غیر قومیں تو اسلام کی تعریف کرتی چلی جاتی ہیں اور ہم اسلام کو چھوڑتے چلے جاتے ہیں۔ غرض چونکہ ہم لوگوں نے دین کا ست نکال لیا ہے، اس لئے میں بتلاتا ہوں کہ دین واقع میں چند چیزوں کا نام ہے اور وہ پانچ چیزیں ہیں۔

۱۔ عقائد ۲۔ عبادات ۳۔ معاملات

۴۔ آداب معاشرت ۵۔ اخلاق باطنی

یعنی یہ کہ تکبر نہ ہو، ریا نہ ہو، تواضع ہو، اخلاص ہو، قناعت ہو، شکر ہو، صبر ہو وعلی ہذا۔ پس ان پانچ چیزوں کا نام دین ہے۔ اس وقت کسی نے کسی کو، کسی نے کسی کو چھوڑ رکھا ہے۔ کسی نے اعمال کو چھوڑا، کسی نے معاملات کو، کسی نے معاشرت کو۔ اس طرح سے کہ

اپنی معاشرت کو چھوڑ کر غیروں کی معاشرت کو اختیار کر لیا ہے اور بعض نے اخلاق باطنی کو چھوڑ دیا ہے بلکہ ان اخیر کے دو جزو کو تو قریب قریب سب ہی نے چھوڑ دیا ہے۔

اس تفصیل کے بعد حاصل آیت کا یہ ہوا کہ دین کو یعنی ان پانچ چیزوں کو اصلاح فی الارض میں اور ان پانچوں کے اخلال کو افساد فی الارض میں دخل ہے۔ بس اب اس کو دیکھ لیجئے مشاہدۃً کہ اصلاح فی الارض میں جُدا جُدا ہر ایک کا کیا دخل ہے۔ سو بعض کا دخل تو بیّن ہے۔ مثلاً اخلاق کہ ان کا اثر امن عام میں بیّن ہے اور ذرا سے غور سے معاملات کا اثر بھی امن عام میں ظاہر ہو جاتا ہے۔ کیونکہ احکامِ معاملہ کا حاصل حقیقت یہ ہے کہ کسی کا حق ضائع نہ کیا جائے پس معاملات کو بھی اتفاق میں بڑا اثر ہے۔ بشرطیکہ وہ شریعت کے موافق ہوں کیونکہ آپ کی رائے ان مصالح کی رعایت نہیں کر سکتی۔ جن کی شریعت نے کی ہے۔ جیسے پھل فروخت کرنا کہ آپ نے قبل از وقت پھل فروخت کئے تو اس صورت کو شریعت نے حرام کیا ہے۔ کیونکہ پھل آنے سے پہلے فروخت کرنے میں معدوم کی بیع ہے اور بیع معدوم میں کسی نہ کسی کا ضرر ضرور ہوتا ہے اور شریعت کے موافق کرنے میں کسی کا ضرر نہیں۔ اور جب کسی کا ضرر نہیں تو امن قائم ہوگا۔ تو ان دونوں کا اثر تو دنیا کے انتظام میں صاف معلوم ہوتا ہے۔ باقی اور تین چیزوں کا امن عام میں دخیل ہونا سو یہ کم ظاہر ہے اس لئے اس کو بھی ثابت کرنا ضرور ہے کہ یہ تین چیزیں بھی امن عام میں دخیل ہیں

عقائد اور امن عامہ

سو اوّل یعنی عقائد کو تو یوں سمجھو کہ توحید اور رسالت اور معاد ام العقائد ہیں اور ان سب کو امن عام میں بڑا دخل ہے۔ آپ نے اخلاق اور معاملات کو تو امن عام میں دخیل مان ہی لیا ہے۔ اسی کی تسلیم سے یہ دعویٰ بھی ثابت ہو جائے گا۔

ایک مثال بطور نمونہ کے عرض کرتا ہوں کہ مثلاً اخلاق میں جھوٹ نہ بولنا، سچ بولنا، ہمدردی کرنا، خود غرضی نہ کرنا سب داخل ہے اور یہ اصول تمدن میں سے بہت بڑی چیزیں ہیں۔ جن پر تمام دنیا کا مدار ہے لیکن واقعات میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر یہ اخلاق دو شخصوں میں پائے جائیں جن میں ایک توحید و رسالت کا قائل ہو اور دوسرا اس کا قائل نہ ہو تو یقیناً دونوں میں بہت بڑا فرق ہوگا یعنی منکر توحید میں تو یہ اخلاق محدود العمر ہوں گے۔ اس طرح سے کہ جب تک ان اخلاق پر عمل کرنے میں اس کے دنیاوی منافع فوت نہ ہوں یا اُن کے خلاف عمل کرنے سے دوسروں کو خبر ہو کر رسوائی کا اندیشہ ہو اُس وقت تک تو ان اخلاق پر عمل کیا جائے گا اور اگر کوئی ایسا موقع آ پڑے گا کہ ان اخلاق پر عمل کرنے سے دنیوی ضرر ہوتا ہو اور اُن کے خلاف کرنے میں کسی کو خبر بھی نہ ہو جس میں اندیشہ بدنامی نہ ہو تو اس منکر توحید و رسالت کو کبھی ان اخلاق کے ترک کی پرواہ نہ ہوگی۔

ہم آئے دن دیکھتے ہیں کہ جب کبھی بے دین سلطنتوں میں آپس میں معاہدہ ہوتا ہے تو اس کی پابندی اسی وقت تک کی جاتی ہے

جب تک اپنے منافع حاصل ہوتے ہیں یا خلاف کرنے میں اپنا ضرر ہوتا ہے۔ اگر خلاف کرنے میں اپنا ضرر نہ ہوتا ہو تو عہد شکنی میں ذرا بھی پس وپیش نہیں ہوتا۔

بافرض کرو کہ دو شخص ہم سفر ہوں جن میں ایک کے پاس ایک لاکھ روپے کے نوٹ ہوں اور دوسرا ایسا ہو کہ اس پر فاقے گزرتے ہوں۔ اتفاق سے وہ متمول انتقال کر جائے اور دوسرے رفیق سفر کو ان نوٹوں کے لے لینے کا موقع ملے اور عاقل بھی یہ اتنا بڑا ہو کہ بلا تکلف ان کو فروخت کر سکے اور اس مرحوم کے ورثہ میں بھی صرف ایک نابالغ بچہ ہو اور ان نوٹوں کی کسی اور کو خبر بھی نہ ہو کہ اس شخص کے پاس یہ ذخیرہ ہے۔ اس صورت میں اخلاق اور نفس میں سخت کشاکشی ہو گی۔ اخلاق کا فتویٰ تو یہ ہوگا کہ یہ روپیہ اُس وارث کو دینا چاہیے اور نفس کا فتویٰ یہ ہوگا کہ جب اس روپے کے رکھ لینے میں کوئی بدنامی نہیں، کسی قسم کا اندیشہ نہیں تو پھر ان کو کیوں نہ رکھ لیا جائے۔ اس کشاکش میں میں نہیں سمجھتا کہ نری اخلاقی قوت انسان کو اس عظیم مہلکہ سے بچالے۔

پس جس شخص کو نری اخلاقی تعلیم ہوئی ہے وہ ہرگز اس خیانت سے نہیں بچ سکتا۔ البتہ جو اخلاقی تعلیم کے ساتھ خدا اور قیامت کا بھی قائل ہے وہ اس سے بچ سکتا ہے۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اگر میں یہاں بچ گیا اور مجھے دنیا میں خمیازہ بھگتنا نہ پڑا تو قیامت میں تو ضرور ہی بھگتنا پڑے گا۔

اسی طرح ایک اور جزئی یاد آئی کہ میرے پاس اکثر ایسے ٹکٹ آجاتے ہیں کہ ڈاک خانہ کی مہر سے بچے ہوئے ہوتے ہیں اگر میں ان کو استعمال کر لوں تو کوئی بھی بازپرس نہیں کرسکتا کیونکہ نہ میرے پاس ڈاک خانہ والے ہوتے ہیں نہ کوئی دوسرا دیکھنے والا ہوتا ہے لیکن محض خدا کے خوف سے اکثر میں سب سے اوّل ان ہی کو چاک کر کے پھینک دیتا ہوں۔ اس کے بعد خط پڑھتا ہوں۔ علیٰ ہذا اگر روزمرّہ کے واقعات کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ دوسروں کے حقوق کی پوری حفاظت جب ہی ہوسکتی ہے جب دل میں خدا کا خوف ہو۔

یہ مثال نمونہ کے طور پر بیان کی ورنہ غور سے معلوم ہوگا کہ تمام مسائل تمدّن میں اس کی ضرورت ہے کہ مبداء و معاد کا معتقد ہو۔ اس کی تفصیل کے لئے رسالہ مآل التہذیب دیکھنے کے قابل ہے اس میں دکھلایا ہے کہ اس مخترع تہذیب کا مآل دنیا ہی میں ہونے والا ہے۔ انہوں نے ایک ایک مفسدہ کو لکھا ہے اور ختم پر ہر جگہ یہ کہہ دیتے ہیں ۔ فَوَیۡلٌ یَّوۡمَئِذٍ لِّلۡمُهَذَّبِیۡنَ ۔ (پس سخت عذاب ہوگا قیامت میں (دنیے) مہذبین کو) غرض امنِ عام اور تمدّن اس وقت باقی رہ سکتا ہے جب اخلاق درست ہوں اور اخلاق کی کامل درستی جب ہو سکتی ہے کہ عقائد درست ہوں۔

اعمالِ شرعیہ اور امنِ عامہ

اب اعمال کا دخل لیجئے ۔ یہ بھی انشاء اللہ اخلاق کی ضرورت تسلیم کر لینے سے ثابت ہو جائے گا ۔ سب کو معلوم ہے کہ اخلاق

میں بڑی چیز تواضع ہے۔ اس کے نہ ہونے سے تمام عالم میں فساد پھیلتا ہے کیونکہ فساد کا منبع ہے نااتفاقی اور نااتفاقی تکبر سے پیدا ہوتی ہے کیونکہ اگر تکبر نہ ہو اور آپ مجھ کو بڑا مانیں اور میں آپ کو بڑا مانوں تو نااتفاقی کی کوئی وجہ نہیں۔ تو اتفاق کے لیے تواضع کے پیدا کرنے اور تکبر کے مٹانے کی ضرورت ہے اور اس تواضع کی عادت نماز سے خوب ہوتی ہے۔ نفس کا یہ خاصہ ہے کہ اگر کہیں اس کو ذلت نہ سکھلائی جائے تو اس میں فرعونیت پیدا ہو جاتی ہے اور نماز میں اول ہی سے اللہ اکبر کی تعلیم ہے تو جو شخص پانچ وقت زبان سے اور دل سے اللہ اکبر کہے گا اور جوارح سے رکوع اور سجدہ کرے گا زمین پر پیشانی رکھے گا وہ کیوں کر اپنے کو بڑا سمجھے گا۔

اگر کہو، اس سے تو یہ ہوگا کہ اپنے کو خدا سے بڑا نہ سمجھے گا لیکن دوسروں سے تو بڑا نہ سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں۔ جواب یہ ہے کہ یہ ناتجربہ کاری کا اعتراض ہے۔ دیکھو اگر تحصیلدار اپنے جوشِ حکومت میں تحصیلداری کر رہا ہو اور اچانک لفٹننٹ گورنر آ جائے، تو خود ان کے ذہن میں بھی وجداناً سب اختیارات مسلوب سے ہونے لگتے ہیں۔ اس وقت اگر کوئی حضور بھی کہہ دیتا ہے تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے کسی نے گولی مار دی۔

تو جس کے دل میں خدا کی عظمت ہوگی وہ اپنے کو چیونٹی سے بھی مغلوب اور ناتواں سمجھے گا۔ کیونکہ بڑوں کے سامنے ہوتے ہوئے چھوٹوں پر بھی حکومت نہیں رہتی۔ تو اللہ اکبر کی تعلیم وہ ہے کہ اس سے تکبر کی بالکل جڑ کٹ جاتی ہے اور پھر اس سے نااتفاقی کا جاتا

رہنا لازمی ہے۔

علیٰ ہذا قوت بہیمیہ سے سینکڑوں فساد لڑائی جھگڑے دنیا میں ہوتے ہیں اور روزے سے قوت بہیمیہ ٹوٹتی ہے۔

اسی طرح زکوٰۃ کہ اس سے لینے والے کے علاوہ دوسروں کو بھی زکوٰۃ دینے والے کے ساتھ محبت ہوتی ہے۔ دیکھو حاتم طائی سے بوجہ سخا کے سب کو محبت ہے اور اتفاق کا منبع یہی محبت ہے۔ تو دیکھو زکوٰۃ کو اتفاق میں کتنا بڑا دخل ہے۔

علیٰ ہذا حج پر غور کیجیے کہ اس میں ساری دنیا کے آدمی ایک شغل میں، ایک زمانہ میں، ایک مکان میں جمع ہوتے ہیں اور تمام سامان تکبر سے خالی ہو کر ایک عظیم الشان دربار میں حاضر ہوتے ہیں جس کو اتفاق واتحاد میں بہت دخل ہے جیسا اوپر مذکور ہوا اور اسی اتفاق فی الخیال کا اثر ہے کہ دوسرے مجمعوں میں جن کو مجمع حجاج سے کچھ بھی نسبت نہیں ہوتی، بہت سی وارداتیں ہو جاتی ہیں اور وہاں بہت کم حادثے پیش آتے ہیں۔

البتہ اکثر لوگ شاید بدوؤں کے شاکی ہوں گے۔ سو اصل میں ان کا مقصود سلب و قتل نہیں ہے بلکہ وہ ایک درجہ میں حجاج کی بے پروائی کا انتقام لیتے ہیں۔ ان کی حالت بالکل یہاں کے گاڑی بانوں کی سی ہے کہ اگر گھاس دانہ زیادہ دے دیا تو خوش ہیں ورنہ پھر دیکھئے کیسے پیر پھیلاتے ہیں، ویسے ہی اگر بدوؤں کی مدارات کی جائے، ان کو انعام کے طور پر کچھ زیادہ دے دیا جائے تو وہ بہت آرام پہنچاتے ہیں۔ اور یہ جو سننے میں آتا ہے کہ بدو بھخر

مار کر مال چھین لیتے ہیں۔ تو اوّل تو ایسا بہت کم ہوتا ہے اور اگر ہوتا بھی ہے تو ایسے بدوؤں کے ہاتھ سے جو اس مجمع کے نہیں بلکہ دادیوں میں دیہات کے لوگ پھیلے رہتے ہیں وہ ایسی حرکتیں کرتے ہیں اور وہ بھی اس وقت جب کہ خود اپنی حفاظت نہ کرے کہیں قافلے سے آگے پیچھے رہ جائے۔ غرض حج کو اتفاق وامن میں بہت بڑا دخل ہے جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اعمال حج از سرتا پا تواضع سے پُر ہیں۔

معاشرتِ شرعیہ اور امنِ عامہ

اب رہی معاشرت۔ سو تأمل سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے جتنے طریقے ناجائز ہیں وہ سب کے سب وہی ہیں جن سے تکبّر ٹپکتا ہے مثلاً ناجائز وضع سے شریعت نے منع کیا ہے۔ سو جتنی ناجائز اوضاع ہیں ان سب میں تکبّر ہے۔ جو لوگ خلاف شریعت وضع رکھتے ہیں وہ غور کر لیں کہ اس وقت ان کے دل کی کیا حالت ہے اور اس حالت کو یاد رکھیں اور پھر ایک ہفتہ شریعت کے موافق وضع اور لباس اختیار کر کے اس کا اثر دیکھیں۔ اُن کو زمین و آسمان کا فرق معلوم ہو گا۔ یہ تو سمجھ میں آنے والی تقریر ہے۔

ایک دوسری تقریر یہ ہے جو ان تینوں میں مشترک ہے وہ یہ کہ ہر چیز میں ایک خاصیت ہوتی ہے پس اسی طرح اعمال میں بھی ایک خاصیت ہے اور عقائد میں بھی اور معاشرت میں بھی اور وہ یہ ہے کہ ان سب سے قلب میں ایک نور پیدا ہوتا ہے اور اس نور سے اس کی وہ حالت ہو جاتی ہے۔ المسلم من سلم المسلمون من

لسانہ ویدہ (مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان سلامت رہیں یعنی اُن کو کچھ ایذا نہ دے۔)

اب میں ایک اور بات کہتا ہوں جو تمام اجزائے دین کو عام ہے۔ وہ یہ کہ دین کی یہ غرض ہی نہیں کہ دنیاوی نفع ہو بلکہ مقصود اس سے رضائے حق ہے اور جب خدا تعالیٰ راضی ہوں گے تو وہ خود ہی اس کی تمام مصالح دنیویہ کی رعایت فرمائیں گے۔

مَنْ یَّتَّقِ اللّٰہَ یَجْعَلْ لَّہٗ مَخْرَجًا وَّیَرْزُقْہُ مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ۔

جو اللہ سے ڈرتا ہے تو وہ اس ڈرنے والے کے لئے رہائی (آفات دارین) کرتا ہے اور ایسی جگہ سے روزی پہنچاتا ہے جہاں اس کا گمان بھی نہیں ہوتا۔

پس دین کی درستی کو اس طرح دنیا کی درستی میں دخل ہوا مگر دین کے کام اس نیت سے بھی نہ کرنا کہ خدا راضی ہو گا تو دنیا کے کام بنیں گے بلکہ صرف اس لئے کہ ؎

دلآرامے کہ داری دل درو بند
دگر چشم از ہمہ عالم فرو بند

اور جو مصلحتیں سامنے آئیں بھی تو یہ پڑھ دو کہ ؎

مصلحت دید من آنست کہ یاراں ہمہ کار
بگزارند و خم طرۂ یارے گیرند

رند عالم سوز را با مصلحت بینی چہ کار
کار ملک ست آنکہ تدبیر و تحمل بایدش

ہمیں مصلحتوں سے کیا لینا مگر حاصل ضرور ہوں گی۔ وفادار نوکر وہ ہے کہ آقا کی رضامندی کو اپنی مصلحت پر مقدم رکھے اور کوئی کام اس کی مرضی کے خلاف نہ کرے ورنہ اس کو خودغرض اور خودکام کہا جائے گا۔ پھر آقا اپنے کرم سے خود ہی اس کی مصلحتوں کی رعایت فرمائے گا۔ اور اگر دیکھا جائے تو راحت بھی اسی میں ہے کہ کسی کے حکم کا تابع رہے چاہے مصلحت سمجھ میں آئے یا نہ آئے اور اگر ہر کام میں مصلحت سوچتا رہے تو کام کچھ بھی نہ کر سکے گا۔ چنانچہ اگر کوئی شخص اہلمد کچہری کام کرنے کی حالت میں بھی ہر وقت تنخواہ کے روپے کے مصارف و مداخل کے حساب میں لگا رہے تو یقیناً کچہری کا سارا کام برباد ہو جائے گا۔

جیسے ایک کاتب کی حکایت ہے کہ بیوی کو خط لکھ رہے تھے۔ ایک چڑیا نے بیٹ کر دی تو آپ نے اس چڑیا کو ایک گندی گالی دی۔ چونکہ اس گالی میں مشغولی زیادہ ہوئی تو وہی گالی خط میں بھی لکھی گئی۔ وہاں جو خط پہنچا تو تعجب ہوا اور وجہ پوچھی کہ مجھ سے کیا قصور ہوا۔ آخر سارا قصہ لکھا۔ تو یہی حال ہے مصالح کے مشتغل کا کہ مقصود کام کا ستیاناس ہو جائے۔

حاصل یہ کہ اگر آدمی کام کے وقت ثمرات پر نظر رکھے تو وہ خود کام سے حجاب ہو جاتے ہیں۔ حضرت سڑک کوٹنے والا مزدور اگر کوٹتے وقت پیسوں کی فکر میں رہے تو ضرور کہیں چوٹ کھائے گا اگر چوٹ سے بچنا ہے تو اس وقت مزدوری پر بالکل نظر نہ کرے بلکہ کام پر نظر کرے۔ مگر دنیا کے کاموں میں تو لوگ ان قواعد کو ضروری سمجھتے ہیں اور دین کے کاموں میں ان سے کچھ کام

نہیں لیا جاتا حالانکہ ضروری بات ہے۔

میں نے تین تقریریں کیں۔ ہر تقریر سے یہ ثابت ہو گیا کہ دین کی اطاعت کو امنِ عام میں بہت دخل ہے۔ اور یہ تین تقریریں اس لیے کیں کہ مذاق مختلف ہیں۔ یہ قواعد دینیہ کی خوبی ہے کہ ان سے ہر مذاق کے پسند پر دین کا حسن ثابت ہو گیا۔ تو دین گویا اس شعر کا مصداق ہی ہے ؎

بہارِ عالم حسنش دل و جان تازہ میدارد
برنگ اصحاب صورت را ببُو ارباب معنی را

غرض جس پہلو سے چاہو پرکھ لو پرکھا لو۔ الحمدللہ یہ بات ثابت ہو گئی کہ امن کی صورت اگر ہے تو احکامِ خداوندی کی پابندی سے ہے۔ اور اگر کہو کہ بہت قومیں مسلمان نہیں ہیں اور وہ پابند احکام نہیں ان میں امن کیسے قائم ہے۔ تو میں اجمالی جواب تو پہلے دے چکا ہوں۔ اور اس اجمال کی تفصیل کو مآل التہذیب پر حوالہ کرتا ہوں پتہ مطبع نظامی۔ کانپور۔ اس کے نو مقالے ہیں۔ وہ قابل اس کے ہیں کہ اپنے بچوں کو پڑھائیے۔ غرض یہ بات بلاشبہ ثابت ہو گئی کہ امنِ عام کی بقاء محض دین پر ہے۔

بغاوت کا انجام

اس سے اس حدیث کا مطلب بھی سمجھ میں آ گیا ہو گا کہ:۔

لا تقوم الساعۃ حتیٰ لا یقال فی الارض اللہ اللہ۔

جب تک کوئی بھی اللہ اللہ کہنے والا موجود ہے قیامت نہ آئے گی۔

ہوئی۔ اور اس کے حامل علماء ہیں۔ تو اب بتلاؤ کہ یہ جماعت دنیا میں سب سے زیادہ ضروری ہوئی یا سب سے زیادہ بیکار؟

اگر کسی مقدمہ میں کوئی خدشہ رہا ہے تو بسم اللہ میں ہر وقت حاضر ہوں۔ میں نے کوئی شاعری نہیں کی۔ نہ کسی کی طرف داری کی اور صاف کہہ دیا کہ ان میں بعض بد نام کنندہ نیکاں بھی ہیں۔ وہ ہماری بحث سے خارج ہیں لیکن اگر وہ بھی اپنی اصلاح کر کے اس مقبول جماعت میں آنا چاہیں تو بسر و چشم آئیں ؂

ہر کہ خواہد گو بیا و ہر کہ خواہد گو برو
دار و گیر و حاجب و درباں دریں درگاہ نیست

لاکھ برس کا عابد اگر مچلے تو کان پکڑ کر باہر اور اگر لاکھ برس کا کافر آئے تو بسم اللہ۔

طلباء اور عوام

صاحبو ـــ امید ہے کہ مسلمانوں کو اس بیان سے حقیقت حال منکشف ہو گئی ہو گی۔ اب میں نہایت ادب سے تھوڑا سا خطاب طالب علموں کو کرتا ہوں کہ آپ کی ضرورت محض علم و عمل کی وجہ سے ہوئی ورنہ آپ کوئی چیز نہیں۔ اور یاد رکھو جتنا لطیف کھانا ہوتا ہے اس میں زیادہ اور جلدی بد بو ہو جاتی ہے۔ پس جس طرح آپ بحالت درستی نافع الوجود ہیں اسی طرح نادرستی میں مضر اور سبب فساد بھی ہوں گے۔ اس لیے آپ کو بھی اپنی اصلاح کرنا ضرور ہے اور آپ کی اصلاح کے دو طریق ہیں۔ ایک تو یہ کہ زمانہ تحصیل میں استاد دیندار ڈھونڈیئے۔ بد دین استاد ہرگز اختیار نہ کرو۔ یہی طالب علمی

اور مختصر وجہ اس کی یہ ہے کہ اسلام طاعت ہے اور کفر بغاوت ہے تو دنیوی سلطنتوں کا تو یہ قاعدہ ہے کہ اگر کسی شہر میں باغی زیادہ ہوں تو شہر پر توپ خانہ لگا دیا جاتا ہے۔ خدا تعالیٰ بھی اگر یہی کرتے تو اکثر اوقات توپ لگے ہوتے۔ مگر یہ خدا تعالیٰ کی رحمت ہے کہ اُس نے یہ قانون مقرر کیا کہ اگر کُل باغی ہوں مگر صرف ایک غیر باغی ہو، تو اُس کی بدولت تمام عالم محفوظ رہے گا۔ ہاں جب بغاوت عام ہو جائے اُس وقت پھر ہلاک عام بھی ہو گا۔

یہیں سے ایک اور بات بھی سمجھ میں آ گئی کہ بہت سے لوگ جن کو آپ حقیر سمجھتے ہیں جیسے اللہ اللہ کہنے والے غربا وہ آپ کی بقا کے سبب ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے اس خلق کا اتباع ہم کو بھی کرنا چاہیے کہ ایک کے لیے سب کی رعایت فرمائی۔ شیخ فرماتے ہیں۔ ع

مراعاتِ صد کُن برائے یکے

اور فرماتے ہیں۔ ع

خورند از برائے گلے خارہا

یعنی ایک پھول کے لیے دس جگہ کانٹوں میں اُلجھتے ہیں تو ہم کو بھی ایسے لوگوں کے لیے مشقتیں اٹھانا چاہئیں۔ غرض جب ان میں سے ایک بھی نہ رہے گا۔ اُس وقت توپ لگ جائے گی کہ گھر کا گھر گر پڑے گا۔ تو تمدن اور امن، اطاعت ہی سے ہے۔

اب یہ بھی سمجھو کہ اطاعت ایک عمل ہے اور عقلی مسئلہ ہے کہ عمل بدون علم کے ہو نہیں سکتا۔ تو امنِ عام کے لیے علمِ دین کی ضرورت

وقت ہے تخم پاشی کا۔ پھر اس کے بعد کچھ دنوں پڑھ کر کسی اہل اللہ کی چندے صحبت اختیار کرو۔ تب البتہ تم خادمِ دین بن سکو گے۔ پھر لوگ تمہارے قدم دھوئیں گے۔

غیر اہلِ علم کو خطاب

پھر یہی جماعت غیر اہلِ علم سے خطاب کرتا ہوں کہ اگر کوئی صاحب علم ایسا نہ ہو تو اس کو چھوڑ دو۔ اور اس کو نہ دیکھو، وہ سرکاری آدمی نہیں مگر یہ یاد رہے کہ وہ کام کا آدمی بھی ان ہی ناکاروں میں ملا جلا ہوا ہے اور اس کی تلاش کے لئے البتہ ان سب کی بھی خدمت کرو ان ہی میں وہ مل جائے گا۔ ع

مُراعاتِ صد کُن برائے یکے

کا یہی مطلب ہے۔

شیخ نے حضرت ابراہیمؑ کی حکایت لکھی ہے کہ وہ بغیر مہمان کے کھانا نہ کھاتے تھے ایک دن مجوس مہمان ہوا جس نے کھانے پر بسم اللہ نہ کہی۔ آپ نے ناراض ہو کر اُٹھا دیا۔ فوراً وحی سے ارشاد ہوا کہ ؎

گر آدمی بُرد پیش آتش سجود | تو واپس چرا میکشی دستِ جُود
خورش دہ بگنجشک و کبک و حمام | کہ شاید ہمائے در افتد بدام

؎

چو ہر گوشہ تیر نیاز افگنی
بنا گاہ بینی کہ صیدے کنی

جب شکاری شکارِ ہما کرتا ہے تو چیل اور کوؤں کو نہیں اڑاتا اُن ہی کے ساتھ ہما بھی پھنس جاتا ہے۔

اسی طرح اگر ہم انتخاب کر کے تعلیم دیں اور ان میں عیب نکالیں گے جیسا کہ آج کل لوگ طالب علموں میں عیب نکالتے ہیں تو بخدا بہت سے اچھے اچھے بھی دولت علم سے محروم رہ جائیں گے کیونکہ بہت لوگوں کو دیکھا ہے کہ اوّل اوّل ان میں قابلیت نظر نہیں آتی مگر بعد میں اُن کے جوہر کھلتے ہیں۔ بس ان سب کی خدمت کرو انہیں میں سے لعل و جواہر بھی نکل آئیں گے۔

ایک بادشاہ زادے کا لعل شب کو جنگل میں گر پڑا تھا، تو حکم دیا کہ سب کنکروں کو جمع کر لو۔ روشنی میں چھانٹ لیں گے انہیں کنکروں میں سے وہ لعل پا گیا۔

تو آپ اپنے انتخاب[ف] سے ہمیں معاف کیجئے اور آپ ان پر اعتراض نہ کیجئے البتہ اگر تم طالب علموں کے ساتھ اولاد کا سا برتاؤ کرو اور اپنی اولاد سمجھو اور پھر شفقت و خیر خواہی سے ان کی بے عنوانی پر ان کو تنبیہ بھی کرو۔ پھر دیکھو وہ بھی سمجھیں گے کہ ؎

آں را کہ بجائے تست ہر دم کرمے
عذرش بنہ ار کند بعمرے ستمے

[ف] یہ عدم انتخاب اس طالب علم کے اعتبار سے ہے جس کا صرف غیر نافع ہونا محتمل ہو۔ باقی جس کا مضر دین ہونا معلوم ہو جائے اس کو متبوع ہونے کے درجے تک ہرگز نہ پڑھائیں البتہ اپنے عمل کے لائق اس کو بھی تعلیم دینا فرض ہے ۱۲ منہ

غرض اولاد کو جس درجے کی تنبیہ کرتے ہو اس کی اجازت ہے اور اس سے زائد اجازت نہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ بہت بڑی ضرورت دنیا میں اہل علم اور دین کی ہے ان کے ساتھ وابستہ ہو جاؤ مگر وابستگی کے یہ معنے نہیں کہ چندہ میں روپیہ دے کر بے فکر ہو جاؤ۔ روپیہ تو خدا دے گا بلکہ اُن سے کھُل کر ملو اور اُن سے مسئلے پوچھتے رہو تاکہ تم کو دین اور اہل دین کی محبّت بڑھے اور تمہارے لئے یہ وعدہ صادقہ پورا ہو جائے کہ اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ (آدمی قیامت میں اس کے ساتھ ہوگا جسے دنیا میں دوست رکھتا ہے) اور اگر تم کو ان کی محبت ہو گئی تو انشاء اللہ تعالیٰ خدا تعالیٰ سے بھی تم کو محبّت صادقہ ہو جائے گی۔ اور بعض لوگ خود تو علماء کی طرف متوجہ ہوتے نہیں اور شکایت کرتے ہیں کہ علماء ہماری خبر نہیں لیتے ——— تو صاحبو! مریض طبیب کے پاس جایا کرتا ہے، طبیب مریض کے پاس از خود نہیں جایا کرتا۔ کیا وجہ ہے کہ سول سرجن کی شکایت نہیں کی جاتی کہ ہماری خبر نہیں لیتا۔ صاحبو! سول سرجن کی شکایت تو ناجائز اور علماء کی شکایت جائز ———!

صاحبو ——— تم نے علماء کو اپنی خبر کب دی۔ اگر تم دو دفعہ جا کر اُن کو اپنے مرض کی خبر دو گے، تو وہ ایسے شفیق ہیں کہ چار دفعہ خود آئیں گے۔ اب تو مولوی اس لئے بھی بچتے ہیں کہ ان کا از خود متوجہ ہونا خود غرضی پر محمول ہوگا۔ مشہور مقولہ ہے۔

نعم الامیر علٰے باب الفقیر و بئس الفقیر علٰے باب الامیر۔

وہ امیر اچھا شخص ہے جو فقیر کے دروازے پر حاضر ہو اور وہ فقیر بُرا ہے جو امیر کے دروازے پر جائے۔

تو یہ معنی ہیں وابستگی کے اور جب آپ وابستہ ہوں گے تو وہ بھی آپ سے زیادہ متوجہ ہوں گے اس سے ملاپ پیدا ہو گا۔ مگر ابتداءً اس کی اہل دنیا کی طرف سے ہونا چاہیئے اور اس وابستگی کے ساتھ اپنے بچوں کو بھی علم دین پڑھائیے۔

غرض یہ چیزیں ضروری الوجود ہیں، ان کی فکر کیجئے۔ اب ختم کرتا ہوں۔ خدا تعالٰے سے توفیق علم و عمل کی دعا کیجئے۔

اسبابُ الغفلہ

اولاد و اموال کی محبت کے متعلق یہ وعظ مسجد محلہ بیر
غائب مرادآباد میں بعد عصر ۲۵۔ صفر ۱۳۳۱؁ھ کو ہوا۔ جو
ایک گھنٹہ پندرہ منٹ میں ختم ہوا۔ اور مولانا احمد سعید
صاحب تھانوی نے قلمبند فرمایا۔

انسان یہ سمجھتا ہے کہ جو کچھ اُس کے پاس ہے وہ ہمارا مال ہے ہم جہاں چاہیں، اڑائیں! مگر یہ اُس کی غلطی ہے انسان کے پاس جو کچھ ہے، وہ حق تعالٰے کا ہے، جس کا وہ محض امین ہے کہ جہاں خدا تعالیٰ کی اجازت ہو، وہیں صرف کرنے کا اختیار ہے۔ اور جہاں ممانعت ہے، وہاں اس کو ہرگز اختیارِ صرف نہیں ہے ———!

خطبۂ ماثورہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الحمد للہ نحمدہٗ ونستعینہٗ ونستغفرہٗ ونؤمن
بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا و
من سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہٗ
ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا اللہ
وحدہٗ لاشریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا
محمدًا عبدہٗ ورسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ
اٰلہ واصحابہ وبارک وسلم امابعد فاعوذ باللہ من
الشیطان الرجیم ۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم ۔

یاایھا الذین اٰمنوا لا تلھکم اموالکم ولا اولادکم عن
ذکر اللہ ومن یفعل ذلک فاولئک ھم الخسرون ۝

مذاق کی رعایت

قبل اس کے کہ اس آیت کے متعلق کچھ بیان کیا جائے، اتنا سُن لینا ضروری ہے کہ اس وقت کے بیان سے زیادہ تر مستورات کو فائدہ پہنچانا مقصود ہے اور چونکہ مستورات درسیات کم پڑھتی ہیں یا بالکل نہیں پڑھتیں۔ نیز ان کو اہل علم کی صحبت بہت کم میسر ہوتی ہے اس لئے ان کا فہم سادہ ہوتا ہے۔ تو ان کی رعایت سے اس وقت مضامین بھی سادہ بیان کئے جائیں گے۔ پس ممکن ہے کہ اس وقت کے بیان میں اہلِ علم کو حظ نہ حاصل ہو سکے۔ اور حظ مقصود بھی نہیں۔ دیکھئے دوا سے تحصیل حظ کا کون قصد کیا کرتا ہے بلکہ دوا سے اصل مقصود صحت ہوتی ہے گو وہ کیسی ہی بدمزہ ہو مگر مقصود میں معین و مفید ہونے کی وجہ سے گوارا کی جاتی ہے۔ اسی طرح وعظ بھی اصلاحِ نفس کے لئے بمنزلہ دوا کے ہے اس میں بھی حظ مقصود نہ ہونا چاہیے

اور نہ بیان کرنے والے کو اس کا اہتمام کرنا چاہیئے۔ ہاں اگر مقصود میں خلل نہ ہو تو ایسے مضامین علمی کا بھی درمیان میں بیان کر دینا مضائقہ نہیں جن سے اہل علم کو حظ حاصل ہو۔ جیسے اطباء بھی دوا کے ساتھ مصری یا شربت ملا دیا کرتے ہیں تاکہ طبیعت اُس کو سہولت سے قبول کرے لیکن اس وقت چونکہ مستورات مخاطب ہیں اور زیادہ مقصود ان کو نفع پہنچانا ہے اور ان کو مضامین علمیہ سے دلچسپی یا حظ حاصل نہیں ہوتا اس لئے مضامین علمیہ کو قصداً بچایا جائے گا۔ ہاں استطراداً اور تبعاً کوئی بات آجاوے تو ممکن ہے۔

گو اس وقت جو بیان بھی ہوگا وہ ایسے مضامین نہ ہوں گے جن سے مردوں کو نفع نہ ہو، اُن کو بھی ان سے نفع ضرور ہوگا اور کم سے کم یہی نفع ہوگا کہ وہ یہ مضامین وقتاً فوقتاً اپنی مستورات کو سنا سکیں اور بتلا سکیں لیکن چونکہ روئے سخن زیادہ تر مستورات ہی کی طرف ہوگا اس لئے میں نے پہلے سے مردوں کو متنبہ کر دیا کہ اس وقت کے بیان میں ان کے مذاق کی رعایت نہ ہوگی بلکہ مستورات کے مذاق و فہم کی زیادہ رعایت ہوگی۔ کیونکہ شاید کسی کو مضامین علمیہ کا انتظار ہو تو وہ اس انتظار میں نہ رہے بلکہ محض مقصود پر نظر رکھے۔

اس تمہید کے بعد اب بیان شروع کرتا ہوں۔ گو اس وقت زیادہ تفصیل کا موقع نہیں کیونکہ وقت بہت تنگ ہے۔ عصر کے بعد مغرب ہی تک بیان کرنے کا ارادہ ہے اور ظاہر ہے کہ اس قلیل وقت میں زیادہ تفصیل نہیں ہو سکتی۔ اس لئے اس وقت اختصار کو ملحوظ رکھ کر صرف مضامین کثیر الوقوع بطور قواعد کلیہ کے بیان کئے جائیں گے

گے۔ جزئیات کا احاطہ اوّل تو ویسے بھی مشکل ہے پھر وقت زیادہ نہیں ——،

صدورِ معاصی کے اسباب

خلاصہ یہ ہے کہ اس وقت مجھ کو ایک خاص حالتِ مذمومہ کے متعلق گفتگو کرنا ہے جس میں عموماً ہم سب مبتلا ہیں اور خصوصاً مستورات کو اس کی زیادہ نوبت پیش آتی ہے۔ چنانچہ ترجمہ آیت ہی سے اس خاص حالت کا پتہ چل جائے گا کہ اس حالت مذمومہ میں ابتلاء عام ہے یا نہیں۔ اس آیت میں حق تعالیٰ شانہ نے مسلمانوں کو مال واولاد کی وجہ سے غفلت میں پڑ جانے سے منع فرمایا ہے اور اس بات پر آگاہ فرمایا ہے کہ جو لوگ ان چیزوں کی وجہ سے غفلت میں پڑ جائیں گے وہ خسارہ میں ہیں۔ اب آپ اپنی حالت میں غور کریں تو معلوم ہو جائے گا کہ معصیت کا زیادہ سبب اکثر مال و اولاد ہی کا تعلق ہوتا ہے۔ حق تعالیٰ اسی سے روکتے ہیں کہ ایسا نہ ہو کہ مال و اولاد تمہارے لئے ذکر اللہ سے غفلت کا سبب ہو جاویں۔

یہاں ذکر اللہ سے مراد طاعت اللہ ہے۔ چونکہ طاعات کی وضع ذکر اللہ ہی کے لئے ہے اس لئے ذکر بول کر طاعت مراد لی جاتی ہے (اور کنایہ میں نکتہ یہ ہے کہ جس طرح معصیت کا سبب غفلت ہے جس پر لَا تُلْهِكُمْ میں دلالت ہے اور غفلت کا سبب دنیا کے ساتھ قلب کا تعلق ہوتا ہے جس پر اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ دلالت کرتا ہے۔ جس سے مراد مجموعہ دنیا ہے اور ان دونوں کی تخصیص لفظی کی یہ وجہ ہے کہ یہ دونوں دنیا کے اعظم افراد ہیں۔ اسی طرح طاعت

کی بجائے ذکر اللہ کہنے میں اس پر دلالت ہے کہ طاعات کا سبب غفلت کا مقابل ہے یعنی ذکر۔ اور ذکر کا سبب خدا کے ساتھ دل کا متعلق ہونا ہے۔ جس پر اضافت ذکر الی اللہ سے دلالت ہو رہی ہے) تو اس سے یہ بات مفہوم ہوئی ہے کہ مال و اولاد اکثر طاعت سے غفلت کا سبب ہوا کرتے ہیں۔ اور جب طاعت سے غفلت ہو گی تو وہ معصیت ہو گی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ معصیت کا زیادہ سبب مال و اولاد کا تعلق ہے۔ اور جب یہ زیادہ تر معصیت کا سبب تھے جبھی تو حق تعالیٰ نے ان کی وجہ سے غفلت میں پڑنے کی ممانعت فرمائی کیونکہ حق تعالیٰ حکیم ہیں اور حکیم کا کوئی کلام حشو و زائد نہیں ہوتا پس دنیا بھر کی چیزوں میں سے اموال و اولاد کو خاص طور پر ذکر فرمانا اس کی صاف دلیل ہے کہ ان دونوں کو غفلت عن الطاعات یعنی صدور معاصی میں زیادہ دخل ہے۔

دوسرے قاعدہ یہ ہے کہ خدا و رسولؐ کے کلام میں تصریح کے ساتھ ممانعت اسی چیز سے ہوتی ہے جس میں ابتلاء زیادہ ہو، جو کثیر الوقوع ہو۔ اور جس میں ابتلاء نہ ہو اس کا وقوع زیادہ ہو اس سے بالتصریح ممانعت نہیں کی جاتی۔ کیونکہ اس سے تصریح کے ساتھ ممانعت کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔

مثلاً شریعت میں شراب پینے کی تو ممانعت ہے لیکن پیشاب پینے کی ممانعت نہیں ہے کیونکہ شرب خمر میں ابتلاء کی کثرت تھی اور شرب بول میں کوئی مبتلا نہ تھا۔ اس لئے اول سے صراحۃً منع کیا گیا اور دوسرے سے صراحۃً منع نہیں کیا گیا۔ پس کسی چیز سے صراحۃً ممانعت کرنا اس کی

دلیل ہے کہ یہ کثیر الوقوع ہے۔

تو حق تعالیٰ کا اموال و اولاد کی وجہ سے غفلت میں پڑنے کی ممانعت فرمانا ہی اس کی دلیل ہے کہ یہ زیادہ تر معصیت کا سبب ہوتے ہیں۔ تو خود کلام اللہ بھی اس کو بتلا رہا ہے اور مشاہدہ بھی۔ چنانچہ اپنی حالت میں غور کرنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ مال و اولاد کی وجہ سے کتنے گناہ ہوتے ہیں۔

مال و اولاد کے درجے

تفصیل اس کی یہ ہے کہ مال میں عمل کے دو مرتبے ہیں۔ ایک درجہ حاصل کرنے کا اور ایک اس کو محفوظ رکھنے کا۔ اسی طرح اولاد میں بھی یہ دو مرتبے ہیں۔ ایک اولاد حاصل کرنے کا دوسرے ان کی حفاظت کا۔ اور ایک تیسرا مرتبہ اور ہے لیکن یہ مرتبہ اموال و اولاد میں دونوں کے لئے جدا جدا ہے۔ پہلے دو مرتبوں کی طرح مشترک نہیں ہے۔ چنانچہ مال میں تو تیسرا مرتبہ صرف کرنے کا ہے اور اولاد میں تیسرا مرتبہ ان کے لئے آئندہ کی فکر کرنے کا ہے۔

غرض تین درجے عمل کے مال میں ہیں اور تین درجے اولاد میں ہیں۔ مال میں تو تین عمل یہ ہیں۔

۱۔ مال کا پیدا کرنا۔

۲۔ مال کی حفاظت کرنا۔

۳۔ مال کا صرف کرنا۔

اور اولاد میں تین درجے عمل کے یہ ہیں۔

۱۔ اولاد کا حاصل کرنا۔

۲۔ پھر اس کی حفاظت کرنا۔

۳۔ پھر اس کے لئے آئندہ کی فکر کرنا۔

تو کل چھ مرتبے ہوئے جو کہ حقیقت میں اعمال کے درجے ہیں اب ان چھ مرتبوں میں بہت مختصر انداز سے اپنی حالت کو دیکھ لیا جائے تو معلوم ہو گا کہ ان میں ہمارا برتاؤ کیا ہے اور ان میں ہم کتنے گناہوں کا ارتکاب کرتے ہیں۔ مثلاً مال میں تین مرتبے تھے ایک حاصل کرنا۔ دوسرے حفاظت کرنا۔ تیسرے صرف کرنا۔ اب دیکھئے یہ مال کتنے ناچ نچاتا ہے۔ سب سے اوّل مرتبہ مال حاصل کرنے کا ہے اسی کو دیکھئے کہ اس میں کس قدر بے احتیاطیاں ہوتی ہیں۔ جب کوئی یہ نیت کر لیتا ہے کہ اتنا مال اپنے پاس آنا چاہیئے پھر حرام وحلال کی تمیز بہت مشکل ہے پھر جیسا بھی کچھ ہو احتیاط نہیں کرتا۔

میں اپنی حالت کہتا ہوں کہ میں نے اکثر احوال میں ہدیہ لینے کے لئے کچھ شرائط و قواعد مقرر کر رکھے ہیں۔ مثلاً پہلی ملاقات میں ہدیہ نہیں لیتا۔ اور جب تک خلوص ومحبت کا علم نہ ہو جائے اس وقت تک نہیں لیتا۔ اور ان سب کے بعد یہ قاعدہ کر رکھا ہے کہ کسی سے اس کی ایک دن کی آمدنی سے زیادہ نہیں لیتا۔ مثلاً کسی کی تیس روپے ماہوار آمدنی ہے تو اس سے ایک دفعہ میں ایک روپے سے زیادہ نہیں لیتا اور ایک دفعہ کے بعد دوسرے ہدیہ میں ایک ماہ کا فاصلہ ضروری کر دیا ہے تاکہ کوئی ایک مہینہ میں ایک دن کی آمدنی سے زیادہ نہ دے سکے۔ لیکن جب کوئی ضرورت پیش آتی ہے اور کوئی خاص مقدار رقم کی اس کے لئے ضروری سمجھی جاتی ہے تو پھر آنکھ بند کر کے لے

لیا جاتا ہے۔ اس وقت یہ قواعد و شرائط ملحوظ نہیں رہتے۔ افسوس تو یہ ہے کہ بعض اوقات اپنی ذات کو بھی اس رقم سے کوئی نفع حاصل نہیں ہوتا بلکہ کسی دوسرے ہی کی نیت سے کچھ رقم جمع کرنا مقصود ہوتا ہے اس میں بھی احتیاط نہیں کی جاتی۔

تحصیلِ مال میں بے احتیاطی

مثلاً کسی نیک کام کے لیئے رقم جمع کی جائے اور یہ تجویز کر لیا جائے کہ اس کے واسطے اتنی رقم جمع ہونی چاہیئے، تو اب حلال و حرام کی کچھ پرواہ نہیں ہوتی۔ غضب یہ ہے کہ جو لوگ اپنی ذات کے واسطے لینے میں احتیاط کرتے ہیں، وہ بھی نیک کاموں کے واسطے لینے میں اتنی احتیاط نہیں کرتے۔ چنانچہ اب کے چندۂ بلقان میں میں نے دیکھا ہے کہ جو محتاط لوگ رنڈی بھڑووں کا روپیہ کبھی نہ لیتے تھے انہوں نے اس چندہ میں ان کا روپیہ بلا تامل لے لیا۔

اسی طرح مدرسوں اور انجمنوں کے چندوں میں کوئی بندۂ خدا ہوگا جو احتیاط کرتا ہوگا ورنہ مشکل ہے۔ اس میں محتاط لوگ بھی یوں سمجھتے ہیں کہ اپنے لیئے تو احتیاط کرنا ممکن ہے کیوں کہ اس میں احتیاط کرنے سے اگر آمدنی کم ہوئی تو اپنی ذات پر تھوڑی سی دقت برداشت کر لیں گے کہ ایک وقت کھایا دوسرے وقت نہ کھایا۔ لباس عمدہ نہ پہنا گھٹیا ہی پہن لیا، مگر یہاں مدرسوں اور انجمنوں کے چندہ میں یا قوموں کے چندہ میں احتیاط کیسے کریں۔ یہاں تو دس ہزار کا پورا ہونا ضروری ہے۔ اس سے کم میں کام ہی نہیں چل سکتا اور اتنی بڑی رقم تو اسی طرح پوری ہو سکتی ہے کہ جہاں سے جو ملے لے لیا جائے پھر نفس

یوں سمجھتا ہے کہ یہ تو خدا کا کام ہے ہمارا ذاتی کام تھوڑا ہی ہے اس میں تھوڑی سی چشم پوشی بھی کر لی جائے تو کچھ حرج نہیں۔

واقعی مولویوں کا نفس بھی مولوی ہوتا ہے اور درویشوں کا نفس درویش۔ تو وہ یوں اُن کو تاویلیں بتا دیتا ہے حالانکہ یہ بڑی غلطی ہے کیونکہ اپنے نفس کے لئے گناہ کرنے میں مقصود تو کچھ حاصل ہو جاتا ہے۔ کم سے کم اپنے پاس روپیہ ہی آتا ہے اور دین کے کام میں گناہ کرنے سے تو مقصود بھی حاصل نہیں ہوتا کیونکہ دین کے کام سے تو رضائے حق ہی مقصود ہے سو معصیت میں وہ کہاں؟ اور روپیہ اپنے کو نہ ملنا تو ظاہر ہی ہے کیونکہ وہ دوسروں کو پہنچ گیا۔ بس تم خواہ مخواہ بیچ میں خالی ہاتھ بھی رہے اور گناہ میں بھی مبتلا ہوئے۔ تو ایسے کام میں تو اور بھی زیادہ احتیاط کرنا چاہئے۔

اب میں کہتا ہوں کہ جب ہم جیسوں کو خدا کے کام میں تحصیل مال کے لئے اتنی وسعت ہو جاتی ہے اور اس میں ہم سے اتنی بے احتیاطیاں ہوتی ہیں جہاں اپنے کو کچھ حاصل بھی نہیں ہوتا، تو جہاں اپنے نفس کے لئے مال حاصل کرنا مقصود ہو وہاں تو کس قدر بے احتیاطیاں ہوں گی۔ کیونکہ وہاں تو مال سے اپنے آپ کو بھی نفع حاصل ہوتا ہے ظاہر ہے کہ اپنا کام نکالنے کے لئے تو کچھ بھی حلال حرام کی پرواہ نہ ہوگی بالخصوص جب کہ صرف کام نکالنا ہی مقصود نہ ہو بلکہ کچھ جمع کرنا بھی منظور ہو۔ اب تو بے احتیاطیوں کا دروازہ بہت ہی وسیع ہوگا۔ ہاں اگر کسی کو مال جمع کرنے کی پرواہ نہ ہو تو البتہ وہ احتیاط کر سکتا ہے چنانچہ دین داروں میں تو بفضلہ تعالیٰ ایسے بہت ہیں جن کو مال جمع کرنے

کی پرواہ نہیں ہوتی۔ مگر دنیاداروں میں ایسے بہت کم ہیں۔ ان کی تو ہر وقت یہی نیت ہوتی ہے کہ اتنا سرمایہ جمع ہونا چاہیئے، اتنی جائیداد ہونی چاہیئے۔

پھر اس کے لئے نہ سود ورشوت سے دریغ ہوتا ہے نہ قرض لے کر مار لینے سے، نہ قرض لے کر انکار کرنے سے، نہ بہنوں کا حق دبانے سے، نہ کسی کی زمین غصب کر لینے سے۔ غرض پھر وہ طرح طرح کے گناہ مال جمع کرنے کے لئے کرتے ہیں اور حلال وحرام کی کچھ تمیز نہیں رہتی ــــــ،

حفاظتِ مال کے لئے حیلہ سازیاں

یہ تو حاصل کرنے کا حال تھا۔ اب آگے رہ گیا حفاظت کرنا۔ تو مال کی حفاظت تو پوری پوری جب ہوتی ہے کہ نہ زکوٰۃ دے نہ صدقہ فطر دے، نہ کسی کو اللہ واسطے کچھ دے۔ بہت دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ کسی سائل کے متعلق یہ معلوم ہو گیا کہ واقعی محتاج ہے لیکن محض اس لئے نہیں دیتے کہ مال کم ہو جائے گا۔ بعض لوگ زیور میں زکوٰۃ نہیں دیتے حالانکہ ہمارے امام صاحبؒ کے نزدیک زیور میں زکوٰۃ واجب ہے۔ مگر اس میں لوگوں نے دوسرے مجتہدوں کی آڑ پکڑ لی ہے ان کے نزدیک واجب نہیں۔ سو خوب سمجھ لو کہ محض حظِ نفس کے لئے کسی دوسرے امام کا مذہب اختیار کر لینا یہ دین نہیں بلکہ اتباع نفس اور تلاعب بالدین ہے (یعنی دین کو کھیل بنانا ہے)۔

علامہ شامیؒ نے ایک بزرگ کا قول لکھا ہے کہ ان کے سامنے ایک شخص نے کسی عالم کا واقعہ بیان کیا جو حنفی تھے کہ انہوں نے ایک

محدث کو اُن کی لڑکی کے نکاح کا پیام دیا۔ تو اُس نے کہا کہ میں پیام منظور کر سکتا ہوں مگر تم حنفی اور میں محدثین کے طریقہ پر ہوں۔ اس طرح نباہ نہیں ہوگا۔ اگر تم امام ابو حنیفہ رح کی تقلید کو ترک کر کے محدثین کا مذہب اختیار کر لو تو پھر مجھے کچھ عذر نہ ہوگا۔ چنانچہ اس عالم نے اس شرط کو مان لیا اور نکاح ہو گیا۔

سائل نے اُن بزرگ سے پوچھا کہ اس صورت میں ترکِ تقلید جائز تھی؟ فرمایا مجھے اندیشہ ہے کہ مرتے وقت اس شخص کا ایمان نہ سلب ہو جائے کیونکہ جس مذہب کو یہ اب تک حق سمجھے ہوئے تھا اور حق سمجھ کر ہی اُس کی تقلید کرتا تھا اُس کو اس نے محض ایک ہوائے نفس کے لئے ترک کر دیا ہے۔ تو اُس کا ایمان بچنا بہت مشکل ہے۔ اَعَاذَنَا اللّٰہُ مِنْہُ (اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَعُوْذُ بِکَ مِنَ الْحَوْرِ بَعْدَ الْکَوْرِ وَ مِنَ الْعَمٰی بَعْدَ الْبَصَرِ وَمِنَ الضَّلَالَۃِ بَعْدَ الْھُدٰی اٰمِیْن)

اسی طرح بعض لوگوں نے محض اپنا مال بچانے کے لئے زیور کے مسئلہ میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب لے لیا ہے۔ اس میں تو شافعی ہو گئے پھر دوسری جگہ اگر کہیں اڑ گڑے میں پھنسے، تو وہاں ابو حنیفہ رح کا قول لے لیتے ہیں۔ اس وقت حنفی بن جاتے ہیں۔ تو ان کا نفس ایسا ہے جیسے شترمرغ کہ صورت میں اونٹ کے بھی مشابہ ہے اور پردار ہونے کی وجہ سے پرندہ بھی ہے۔ اب اگر کوئی اونٹ سمجھ کر اُس پر بوجھ لادنا چاہے تو اپنے کو پرندہ کہتا ہے اور اس طرح جان بچاتا ہے۔ اور اگر کوئی پرندہ سمجھ کر یہ کہے کہ ذرا اوپر کو اُڑ کر دکھا، تو کہتا ہے میں تو اونٹ ہوں بھلا کہیں اونٹ بھی اڑا کرتا

ہے؛ حضرت فرید الدین عطار رحؒ اسی کو کہتے ہیں ؎

چوں شتر مرغے شناس ایں نفس را
نے کشد بار و نہ پرّد بر ہوا
گر بپر گوئیش ، گوید اشترم
ور نہی بارش بگوید طائرم

تو واقعی نفس کی یہی کیفیت ہے کہ یہ اپنے اوپر بات آنے ہی نہیں دیتا۔ بس کبھی کچھ بن گیا کبھی کچھ بن گیا۔ بعضوں کا نفس تو دنیا کے پردہ میں ایسی چالاکیاں کرتا ہے اور بعض دین کی آڑ میں یہ حرکتیں کرتے ہیں۔ بس کسی سے سُن لیا تھا کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک زیور میں زکوٰۃ نہیں: تو وہ زکوٰۃ سے بچنے کے لئے شافعی بن گئے۔ یہ تو دینداروں کا حال ہے جو خلاف شرع کام کرنے سے اپنے نزدیک بہت بچتے ہیں اور جہاں اس کی ضرورت نہیں وہاں تو کچھ بھی پروا نہیں ان کی طرف سے چاہے کسی مذہب میں جائز ہو یا ناجائز ہو سب برابر ہے ان کو تو اپنے کام سے کام ـــــ تو یہ حفاظتِ مال میں ہمارا برتاؤ ہے۔

خرچ کرنے میں عدم احتیاط

اب تیسرا مرتبہ رہا صرف کرنے کا۔ اس میں انسان یہ سمجھتا ہے کہ ہمارا مال ہے جہاں ہم چاہیں اڑائیں مگر یہ اس کی غلطی ہے انسان کے پاس جو کچھ ہے وہ حق تعالیٰ کا ہے جس میں وہ محض امین ہے کہ جہاں خدا تعالیٰ کی اجازت ہو وہاں صرف کرنے کا اختیار ہے اور جہاں ممانعت ہے وہاں اس کو ہرگز اختیارِ صرف نہیں ہے۔

اب سمجھو کہ بعض جگہ خرچ کرنا گناہ بھی ہے جیسے ناچ رنگ میں اور تفاخر کی رسموں میں۔ مگر بہت لوگ یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ کمانے میں تو احتیاط کی ضرورت ہے لیکن خرچ کرنے میں کیا ضرورت ہے اس خیال کا منشا یہی ہے کہ انسان اپنے کو صرف کرنے میں خود مختار سمجھتا ہے۔ جس کا غلط ہونا ابھی معلوم ہو چکا۔ اور اس غلط خیال کے بعد بعض کو تو خرچ کرنے میں یہاں تک وسعت ہے کہ ناچ و رنگ میں بھی صرف کرنے سے باک نہیں کرتے۔ اور بعض اتنی وسعت تو نہیں کرتے، وہ ناچ و رنگ میں مال خرچ کرنے کو برا سمجھتے ہیں لیکن رسوم فخر میں صرف کرنے سے ان کو بھی باک نہیں۔ جن سے غرض صرف یہی ہوتی ہے کہ نام ہو اور افسوس یہ ہے کہ بعض دین دار و مقتدار بھی ان رسوم میں روپیہ صرف کرنے کو برا نہیں سمجھتے اور کہتے ہیں کہ اس میں حرج کیا ہے۔ کھلانا اور پلانا اور برادری کو جمع کر کے دعوت دینا کیوں ناجائز ہو گیا۔

میں کہتا ہوں کہ جناب ذرا اس کی غرض تو دیکھئے۔ لوگوں کی نیت پر تو نظر کیجئے کہ اس دعوت اور دھوم دھام میں نیت کیا ہوتی ہے۔ نیت صرف تفاخر اور ریا ہی کی ہوتی ہے کہ ہمارا نام ہو لوگ کہیں کہ بڑے حوصلہ کا آدمی ہے اور جب یہ نیت ہے تو بتلائیے کہ یہ افعال کہاں جائز رہے۔ کیونکہ مباحات کا قاعدہ یہ ہے کہ وہ فی نفسہٖ جائز ہیں لیکن ان کو بری نیت سے کیا جائے تو ناجائز ہو جاتے ہیں مگر افسوس اب تو یہ بات بھی لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی کہ نام و نمود کا قصد کرنا کوئی برا کام ہے۔ اس میں بھی گفتگو اور بحث

کی جاتی ہے۔

جس کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں کو علمِ دین کی خبر نہیں۔ حدیث و قرآن کو پڑھتے نہیں اور جو پڑھتے ہیں وہ اکثر سمجھتے نہیں۔ حدیث کو دیکھئے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

مَنْ لَبِسَ ثَوْبَ شُهْرَةٍ أَلْبَسَهُ اللّٰهُ ثَوْبَ الذُّلِّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ۔

یعنی جو کوئی شہرت اور نام کے لئے کپڑا پہنے گا اللہ تعالےٰ اُس کو لباس ذلّت پہنائیں گے۔ حالانکہ کپڑے میں کچھ زیادہ خرچ بھی نہیں ہوتا۔ مگر شہرت کے لئے اتنا خرچ کرنا بھی جائز نہیں۔ پھر جہاں اسی غرض کے لئے ہزاروں پہ پانی پھر جاوے، وہ رسمیں کیسے جائز ہو سکتی ہیں۔

معین علی المعصیت

(یہ وعید تو نام و نمود کا قصد کرنے والے کے لئے ہے) جس سے ان رسموں میں روپیہ برباد کرنے کا عدم جواز ظاہر ہے اور اسی سے دوسروں کے لئے بھی ان رسموں کی شرکت ناجائز ہونا معلوم ہو سکتا ہے کیونکہ وہ معین علی المعصیت ہیں۔ اگر لوگ ایسی رسموں میں شرکت نہ کریں تو کسی کو ان میں روپیہ برباد کرنے کا موقع ہی نہ ملے۔ دوسری ایک حدیث میں شرکت کرنے والوں کے لئے بھی صاف ممانعت وارد ہے۔ حدیث میں ہے کہ

نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ طَعَامِ الْمُتَبَارِيَيْنِ اَنْ يُّؤْكَلَ رَوَاهُ اَبُوْدَاؤُدَ مَرْفُوْعًا وَ

قَالَ مُحْیُ السُّنَّۃِ وَالصَّحِیْحُ مُرْسَلٌ وَالْمُتَبَارِیَانِ الْمُتَفَاخِرَانِ بِالطَّعَامِ قَالَ الْخَطَّابِیُّ وَاِنَّمَا کُرِہَ ذٰلِکَ لِمَا فِیْہِ مِنَ الرِّیَاءِ وَالْمُبَاھَاۃِ وَلِاَنَّہٗ دَاخِلٌ فِیْ جُمْلَۃِ مَا نُھِیَ عَنْہُ مِنْ اَکْلِ الْمَالِ بِالْبَاطِلِ اھ (کذا فی عون المعبود ص۴۰۲ ج۳-)

یعنی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ایسے دو شخصوں کا کھانا کھانے سے منع فرمایا ہے جو باہم فخر کے لئے کھانا کھلاتے ہیں اور ظاہر ہے کہ ممانعت کی علت فخر وریا کے سوا کچھ نہیں۔ تو ایسی تقریبات کی شرکت اس سے صراحۃً ممنوع ہو گئی جن میں دعوت وغیرہ سے فخر وریا کا قصد ہو۔

قَالَ الْاِمَامُ الشَّعْرَانِیُّ فِی الْعُھُوْدِ الْمُحَمَّدِیَّۃِ اُخِذَ عَلَیْنَا الْعَھْدُ الْعَامُّ مِنْ رَّسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنْ لَّا نَتَخَلَّفَ عَنِ الْاِجَابَۃِ اِلَی الْوَلَائِمِ اِلَّا بِعُذْرٍ شَرْعِیٍّ اِلٰی اَنْ قَالَ وَمِنْ عُذْرِنَا فِیْ ذٰلِکَ الْاَکْلِ وُجُوْدُ شُبْھَۃٍ فِی الطَّعَامِ اَوْ عَدَمُ صَلَاحِ النِّیَّۃِ فِیْ عَمَلِہٖ ثُمَّ ذَکَرَ الْحَدِیْثَ نَھٰی رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَنْ طَعَامِ الْمُتَبَارِیَیْنِ اَنْ یُّؤْکَلَ اھ (ص۲۱۹)

نام اور نمود اور ریاء کا برا ہونا کون نہیں جانتا۔ تو اگر ان رسومات میں اور بھی کچھ خرابی نہ ہو تو یہ کیا کچھ کم خرابی ہے کہ ان میں لوگوں کی نیت درست نہیں ہوتی اور اگر کسی کو خود ان کی برائی محسوس نہ ہو تو ہمارے لئے یہ دلیل کافی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نام ونمود اور

ریاء کے لئے کوئی کام کرنے سے منع فرمایا ہے۔ یہ تو ایک نیت کی خرابی تھی۔ پھر ان رسوم کے واسطے جو سودی قرض لیا جاتا ہے اور بے موقع اسراف کیا جاتا ہے، یہ گناہ الگ رہے اور یہ تو عام اور مشترک واقعات تھے۔

اب میں خاص عورتوں کو خطاب کرتا ہوں کہ ذرا وہ بھی دیکھ لیں کہ مال حاصل کرنے میں وہ کیا کیا کچھ گناہ کرتی ہیں۔ عورتیں خود تو کمانے کے قابل نہیں ہیں مگر کمانے والوں کو گناہوں میں زیادہ تر یہی مبتلا کرتی ہیں۔ ان کے منہ میں یہ زبان ایسی ہے کہ مردوں سے سب کچھ کرا لیتی ہے۔ بس انہوں نے پہلے سے نیت باندھ لی کہ ایک جوڑا ایسا بڑا بھاری اپنے پاس ہونا چاہیے۔ اب وہ مرد جو گھر میں آیا یعنی شوہر اور انہوں نے فرمائش کی۔ اور کہنے کا طریقہ ان کو ایسا آتا ہے کہ مرد کے دل میں بات گھستی چلی جاتی ہے اب وہ ان کی فرمائش پوری کرنے کے لیے رشوت ستانی اور ظلم سب کچھ کرتا ہے کیونکہ حلال آمدنی میں اتنی گنجائش کہاں جو عورتوں کی فرمائشیں پوری ہو سکیں۔ پس ظاہر میں تو عورتوں کے پاس یہ بات کہنے کو ہے کہ ہم تو کمانے کے قابل نہیں ہیں۔ مرد کماتے ہیں اور کمانے میں جو کچھ گناہ ہوتا ہے، وہ مردوں ہی کے ذمہ ہے مگر اس کی خبر نہیں کہ مردوں کو حرام کمائی پر کون مجبور کرتا ہے۔ میں سچ کہتا ہوں کہ زیادہ تر عورتوں کی فرمائشیں ہی مردوں کو حرام آمدنی اور رشوت ستانی وغیرہ پر مجبور کرتی ہیں۔ پس مردوں کے ان سب گناہوں کا سبب یہی ہیں، اس لیے یہ بھی اس گناہ سے نہ بچ

نہیں سکتیں۔

میں مردوں کو متنبہ کرتا ہوں کہ عورتوں کی فرمائشوں کا زیادہ ترسبب ان کا باہم ملنا جلنا ہے۔ جب یہ محفلوں میں جمع ہوتی ہیں تو ایک دوسرے کو دیکھ کر حرص کرتی ہے کہ کاش میرے پاس بھی فلاں جیسا زیور اور کپڑا ہو۔

میں نے ایک کورٹ انسپکٹر کو دیکھا ہے کہ ان کی تنخواہ چار سو یا پانچ سو روپے تھے مگر ابتداء میں ان کی یہ حالت تھی کہ اپنی تنخواہ کا زیادہ حصہ اپنے غریب عزیزوں پر صرف کرتے تھے۔ بہت سے محتاجوں کی انہوں نے ماہوار تنخواہیں مقرر کر رکھی تھیں اور اپنے اوپر بہت کم خرچ کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کے گھر میں کھانا پکانے والی کوئی ماما بھی نہ تھی۔ بی بی اپنے ہاتھ سے گھر کا سارا کام کرتی تھی، نہ بیوی کے پاس کچھ زیور تھا، نہ بڑھیا کپڑے تھے۔ بے چاری اپنے ہاتھ سے آٹا تک پیستی تھی۔ آخر ان کی بدلی سہارنپور ہوئی اور ایک سررشتہ دار کے پاس کرایہ کا مکان لیا۔ کچھ دنوں تو وہ اسی حال میں رہے جس میں پہلے سے تھے۔ پھر ایک دن سررشتہ دار صاحب کے گھر والوں نے فرمائش کی کہ کورٹ انسپکٹر صاحب کی بی بی ہمارے پاس بہت دنوں سے رہتی ہیں۔ ہمارا ان سے ملنے کو جی چاہتا ہے اوّل تو انہوں نے اپنی بی بی کے بھیجنے سے انکار کیا مگر اصرار کے بعد بھیجنا پڑا۔

میل جول کا اثر

اُس نے یہاں آ کر دیکھا کہ سررشتہ دار صاحب کی بی بی اور

بچیاں سر سے پیر تک سونے کے زیوروں میں لدی ہوئی ہیں اور گھر میں فرش فروش اور ساز سامان بہت کچھ ہے۔ کھانا پکانے والیاں ایک چھوڑ دو تین نوکر ہیں اور بی بی صاحبہ کوئی کام اپنے ہاتھ سے نہیں کرتیں۔ بس بیٹھی بیٹھی سب پر حکومت کرتی ہیں۔

اب اُس کی آنکھیں کھلیں کہ تنخواہ تو سررشتہ دار صاحب کی میرے میاں سے کم اور پھر ان کے یہاں ایسی اجگری (رونق) ہے اور میرے میاں کی اتنی بڑی تنخواہ اور میرے اوپر پلیتی برستی ہے وہاں سے آتے ہی اُس نے کورٹ انسپکٹر صاحب پر برسنا شروع کیا کہ تم مجھ کو بہت تنگ رکھتے ہو۔ تم سے کم تنخواہ والوں کی بیبیاں مجھ سے اچھی حالت میں ہیں اور میں اس مصیبت میں ہوں۔ مجھ سے کھانا نہیں پکایا جاتا، نہ میں آٹا پیسوں گی۔ پکانے والی نوکر رکھو اور مجھے بھی زیور اور لباس عمدہ بنا کر دو جیسا سررشتہ دار صاحب کی بی بی کا ہے۔ آخر بےچارے مجبور ہوئے اور سب کچھ کرنا پڑا۔

واقعی شیخ کامل کی صحبت ایسی ہی ہوتی ہے کہ ایک منٹ میں اپنا اثر دکھا دے۔ تو یہ عورتیں اس بارہ میں شیخ کامل ہیں کہ ذرا سی دیر میں دوسروں کو اپنا سا بنا لیتی ہیں۔

اس کے بعد وہ مجھ سے الہ آباد ملے تھے کہنے لگے جناب شیخ کامل کی تھوڑی دیر کی صحبت کا وہ اثر ہوا کہ میری سالہا سال کی صحبت کا اثر دم بھر میں زائل ہو گیا۔ اب نہ وہ خیرات رہی نہ صدقات رہے، ساری تنخواہ گھر ہی میں خرچ ہو جاتی ہے اور پھر بھی پورا نہیں ہوتا۔ بس رات دن زیوروں کی فرمائش ہے اور کپڑوں، برتنوں کا

رہتا ہے۔ چنانچہ آج کل مکان بنانے کی فرمائش کے پورا کرنے میں مشغول ہوں۔ اسی واسطے میں رائے دیتا ہوں کہ عورتوں کو آپس میں ملنے نہ دیا کرو۔ خربوزہ سے دوسرا خربوزہ رنگ بدلتا ہے ۔

نخست موعظت پیر صحبت اہل سخن ست
کہ از مصاحب ناجنس احتراز کنید

عورتوں کے عیوب

بلکہ پاس رہنے کی بھی ضرورت نہیں۔ ایک خربزہ دوسرے خربزہ کو دیکھ کر ہی رنگ پکڑ لیتا ہے۔ ان عورتوں کی نگاہ ایسی تیز ہوتی ہے کہ خدا کی پناہ۔ کہیں محفل میں جائیں گی تو ذرا سی دیر میں سب کے زیور اور لباس پر فوراً نظر پڑ جائے گی۔ اگر دس بیس مرد ایک جگہ بیٹھیں تو وہاں سے اٹھ کر ایک دوسرے کا لباس نہیں بتلا سکتے کہ کون کیسا کپڑا پہن رہا تھا کون کیسا، مگر عورتیں پانچ سو بھی ہوں تو ہر ایک کو دوسری کی پوری حالت، گلے اور کان تک کا زیور سب معلوم ہو جاتا ہے۔ کچھ تو دیکھنے والی کی نگاہ تیز ہوتی ہے پھر کچھ دوسری بھی دکھلانے کا اہتمام کرتی ہے۔ ہاتھ پاؤں کا زیور تو ہر ایک کو خود ہی نظر آجاتا ہے۔ اس کے دکھلانے میں تو اہتمام کی ضرورت نہیں البتہ گلے اور کان کا زیور دوپٹہ کی وجہ سے چھپا ہوتا ہے۔ تو اس کے لئے کبھی کان کھجلانے کے بہانہ سے دوپٹہ کو سرکایا جاتا ہے کبھی گرمی کے بہانہ سے گلا کھولا جاتا ہے تاکہ سب دیکھ لیں کہ اس کے کانوں میں اتنے زیور ہیں اور گلے میں اتنے۔

اب یہ سب کے زیور اور کپڑے دیکھ بھال کر گھر آئیں تو خاوند

کو پریشان کرنا شروع کیا کہ ہمیں بھی ایسا ہی بنا کر دو۔ اور غضب یہ کہ اگر وہ زیور جو دوسری کے پاس دیکھا ہے، اپنے پاس بھی ہو، لیکن دوسرے نمونہ کا ہو تب بھی پریشان کرتی ہیں کہ یہ بھدّا بنا ہوا ہے فلانی کا نمونہ اچھا ہے، ویسا بنوا دو۔ اب اگر خاوند ہزار کہے کہ اس میں پہلی گھڑائی کا نقصان ہے اور دوسری گھڑائی خواہ مخواہ ذرا سے نمونہ کے واسطے دینی پڑے گی، تو ایک نہیں سنیں گی۔

حالانکہ عقلاء نے زیور کی تجویز اس لئے نکالی ہے کہ یہ نقد کی قید ہے کہ اس سے رقم محفوظ ہو جاتی ہے یعنی مثلاً اگر ہم کو کسی وقت چار آنہ کی ضرورت ہو تو اس کے لئے روپیہ تو توڑ لیں گے مگر پانچ سو روپیہ کی چوڑیوں کو فروخت نہیں کر سکتے۔ تو روپیہ اکثر جمع نہیں رہ سکتا اور زیور سے رقم محفوظ ہو جاتی ہے۔ یہ ہے اصلی غرض زیور سے۔ یہی وجہ ہے کہ قصبات میں زیور زیادہ ہوتا ہے کیونکہ دیہاتی لوگ بنک وغیرہ میں رکھنا نہیں جانتے۔ اور جب یہ غرض ہے تو اس کا خوبصورت اور بدصورت ہونا کیسا۔ بلکہ اس غرض کے لئے تو اور بھدّا بنوا کر پہننا چاہیئے تاکہ کسی کی نگاہ اس پر نہ اٹھے اور کوئی لاگو نہ ہو جاوے۔ اور اگر بھدّا بھی نہ ہو تو خیر پہلی دفعہ خوبصورت بنوا لو۔ پھر جیسا بن جاوے اسی پر اکتفا کرو۔ بار بار توڑ پھوڑ میں علاوہ گھڑائی ضائع ہونے کے خود سونا بھی ضائع ہو جاتا ہے کیونکہ سنار ہر دفعہ اس میں کچھ نہ کچھ کھوٹ ضرور ملاتے ہیں جس سے دو تین دفعہ میں زیور کی مالیت آدھی رہ جاتی ہے مگر عورتوں کی بلا سے۔ وہ جانتی ہیں کہ مزدور لا کر دے گا جو چاہے فرمائش کر لو۔

پھر اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مجبوراً خاوند کو رشوت لینی پڑتی ہے تو اکثر رشوت لینے کا سبب یہ عورتیں ہی ہوتی ہیں۔ تو وہ یہ نہ سمجھیں کہ کمانے میں سارا گناہ مرد ہی کو ہوتا ہے بلکہ یہ بھی اس کے ساتھ عذاب بھگتیں گی۔

عورتوں میں ایک یہ بھی قاعدہ ہے کہ جب مرد سفر سے آئے تو اُس کی لیاقت یہ ہے کہ ان کے واسطے کچھ سوغات لے کر ضرور آئے اور جو رقم دے گیا تھا اُس کا حساب کتاب کچھ نہ لے اور اگر کوئی مرد حساب لیتا ہو کہ میں اتنا دے گیا تھا وہ کہاں خرچ ہو گیا، تو اُس پر فتویٰ لگتا ہے کہ یہ مرد بہت بُرا ہے ذرا ذرا سی چیز کا حساب لیتا ہے۔ بس ان کے یہاں سب سے اچھا وہ ہے جو بالکل زن مرید ہو کہ جو بیوی نے کہا فوراً پورا کر دیا اور رقم دے کر کچھ نہ پوچھے کہ تم نے کہاں خرچ کیا۔ اور یہ ساری خرابی حُبِ مال کی بدولت ہے جو عورتوں میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ یہ تو آمدنی کے متعلق ان کے گناہ تھے۔

اب رہے حفاظت کے متعلق۔ سو اُن کی تفصیل یہ ہے کہ اوّل تو اکثر عورتیں زکوٰۃ نہیں دیتیں کیونکہ روپیہ خرچ ہو گا۔ بعض دفعہ زیور کی زکوٰۃ نہ مرد دیتا ہے نہ عورت۔ مرد کہہ دیتا ہے کہ زیور عورت کا ہے اور عورت کہہ دیتی ہے کہ زیور مرد کا ہے میں کیوں زکوٰۃ دوں جس کا مال ہے وہ خود دے۔ مگر اس بہانہ سے خدا کے یہاں نہیں چھوٹ سکتے۔ آخر دونوں میں سے کسی کا تو ہے ہی۔ بس اُسی کے ذمہ زکوٰۃ ہے اور اگر دونوں کا ہے تو ہر ایک اپنے حصہ کی زکوٰۃ

ادا کرے (اور اگر واقعی نہ اُس کا ہے نہ اُس کا۔ تو پھر یہ مال خدا کا ہے اس کو وقف کے مصارف میں کسی مسجد یا مدرسہ میں لگا دینا چاہیئے یا غریبوں کو بانٹ دینا چاہیئے)

بعضی عورتیں مرد سے چھپا کر روپیہ جوڑا کرتی ہیں اس خیال سے کہ شاید مرد پہلے مر جاوے تو یہ رقم بعد میں میرے کام آئے گی۔ اب اگر اس کو مثلاً چالیس روپے ماہوار دیئے گئے تو اُس میں سے بیس خرچ کرتی ہیں اور بیس کو اٹھا کر جمع رکھتی ہیں (پھر اگر اتفاق سے مرد پہلے مر جاوے تو یہ جمع خالص انہی کے پاس رہتی ہے اس کی کسی کو خبر نہیں کرتیں۔ یاد رکھو یہ ناجائز ہے۔ اگر کچھ جمع کرنا ہو تو مرد کو اس کی اطلاع کر دو۔ اور اس سے یہ رقم اپنے واسطے مرض موت سے پہلے ہبہ کرا لو۔ اس طرح تو یہ رقم تمہاری ملک ہو جاوے گی ورنہ اس میں سب وارثوں کا حق ہے اور تنہا عورت کو اس کا مالک بننا حرام ہے)

بعضی عورتیں رقمیں جوڑ جوڑ کر خاوند سے چھپا کر اپنے گھر والوں کو بھرا کرتی ہیں۔ کسی بہانہ سے باپ کو دے دیا۔ کسی بہانہ سے ماں بہن کو دے دیا۔ یہ بھی سخت گناہ ہے۔ مرد کے مال میں عورت کے عزیزوں کا شرعاً کوئی حق نہیں۔ اگر اُن کو دینا ہو تو مرد سے پوچھ کر دینا چاہیئے اور اگر تم پوچھو گی تو مرد ایسے عالی حوصلہ ہوتے ہیں کہ ضرورت کے موافق دینے دلانے سے اکثر انکار نہ کریں گے۔ خاوند جو مال عورت کو بالکل بطور ملک کے دے ڈالے، اس میں سے بلا اجازت صرف کرنا تو عورتوں کو جائز ہے اور جو مال اس کو ہبہ نہ کرے بلکہ گھر کے خرچ کے واسطے دے یا جمع کرنے کے لئے دے اس میں سے بلا اجازت صرف

کرنا ہرگز جائز نہیں حتیٰ کہ سائل کو دینا بھی جائز نہیں۔ (ہاں اگر اُس نے اجازت دے رکھی ہو کہ تھوڑا بہت سائلوں کو دے دیا کرو تو اس وقت اتنی مقدار کا دینا جائز ہے جو عرفاً سائلوں کو دی جایا کرتی ہے)

عورتیں اور چندہ

میں نے دیکھا ہے کہ عورتیں چندہ کے بارے میں بہت سخی ہوتی ہیں۔ جہاں انہوں نے صدقہ کے فضائل کسی کے وعظ میں سُنے اور زیور نکالنا شروع کیا تو یاد رکھو جو زیور خاص تمہاری مِلک ہو اُس میں سے دینے کا تو مضائقہ نہیں مگر جو زیور شوہر نے محض پہننے کے لیے دیا ہو۔ اُس کو چندہ میں دینا بدون خاوند کی اجازت کے جائز نہیں مگر عورتیں اس باب میں بہت سخی ہیں اور لینے والے بھی اس کی پرواہ نہیں کرتے بلکہ قصداً عورتوں میں اس لیے وعظ کہتے ہیں تاکہ زیور وصول ہو۔

میں نے اب کی مرتبہ اپنے یہاں جو مستورات میں چندۂ بلقان کے لیے وعظ کہا تو یہ کہہ دیا تھا کہ عورتوں سے زیور نہ لیں گے اور اگر کوئی مرد زیور لایا تو اُس میں خوب کھود کرید کی کہ یہ زیور تمہاری ملک ہے یا بیوی کی اور اگر بیوی کی ہے تو اُس نے خوشی سے دیا ہے یا تمہارے کہنے سے اور اگر اُس نے از خود دیا ہے تو تمہاری بھی رائے ہے یا نہیں۔ جب اچھی طرح معلوم ہو جاتا کہ میاں بیوی دونوں کی رضامندی سے دیا جارہا ہے اس وقت قبول کیا جاتا۔

عورتیں بعض دفعہ خاوند کے مال میں تصرّف کرتے ہوئے یہ سمجھتی

ہیں کہ وہ اجازت دے دے گا اور بعض دفعہ وہ خاموش ہو بھی جاتا ہے مگر بعض مرتبہ خوب خفا ہوتا ہے اور میاں بی بی میں اچھی طرح تو تو میں میں ہوتی ہے۔ کانپور میں ایک دفعہ کسی بی بی نے مراد آبادی حقہ ایک مدرسہ کے جلسہ میں عاریۃً دے دیا۔ خاوند نے بے حد سختی کی غرض جب تک اجازت صراحۃً نہ ہو یا ظنِ غالب نہ ہو، اس وقت تک عورتوں کو چندہ میں کچھ نہ دینا چاہیئے اور یہ تو اُس صورت میں تفصیل ہے کہ خاوند کا مال دیا جائے۔

خاوند سے مشورہ کی ضرورت

اگر خاص عورت ہی کا مال ہو تو گو اُس میں اجازت خاوند کی ضرورت نہیں مگر اس سے مشورہ کر لینا ضرور چاہیئے۔ نسائی میں ایک حدیث ہے

اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا یَجُوْزُ لِاِمْرَاۃٍ

ھِبَۃٌ فِیْ مَالِھَا اِذَا مَلَکَ زَوْجُھَا عِصْمَتَھَا اِلَّا بِاِذْنِ زَوْجِھَا

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نکاح کے بعد عورت کو اپنے مال میں سے ہبہ کرنا بدون اجازت زوج کے جائز نہیں! اس میں بعض علماء نے اضافت بادنیٰ ملابست مانی ہے اور مالھا سے مراد مالِ زوج لیا ہے لیکن اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کو اس پر محمول کیا جاوے کہ عورتیں ناقصات العقل ہوتی ہیں۔ اگر یہ اپنے مال میں خود مختار ہوں گی تو نہ معلوم کہاں کہاں روپیہ برباد کریں گی۔ اس لئے آپ ناقص العقل طبقہ کو حکم فرماتے ہیں کہ تم اپنے مال میں بھی جو تصرف کرو، اس میں اپنے مرد سے مشورہ کر لیا کرو، تو یہ بات جی کو لگتی ہے اور اس میں بڑی مصلحت یہ ہے کہ اس طرح برتاؤ کرنے میں میاں بی بی

میں اتحاد بڑھتا ہے اور مرد کو عورت سے محبت زیادہ ہوتی ہے کہ اس کو مجھ سے اتنا تعلق ہے کہ اپنے مال میں بھی کوئی کام بغیر میرے مشورہ کے نہیں کرتی اور اگر عورت اپنی جمع کو الگ رکھ کر اس میں اپنی رائے سے تصرف کرے تو اس صورت میں ایک قسم کی اجنبیت معلوم ہوتی ہے اس وجہ سے میرے نزدیک حدیث اپنے ظاہر پر محمول ہے اور مالھا سے مالِ زوج مراد لینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ (قُلْتُ قَالَ السِّنْدِیُّ فِیْ تَعْلِیْقِہٖ عَلَے النَّسَائِیِّ وَھُوَ عِنْدَ اَکْثَرِ الْعُلَمَاءِ عَلٰی مَعْنٰی حُسْنِ الْعِشْرَۃِ وَاسْتِطَابَۃِ نَفْسِ الزَّوْجِ وَاَخَذَ مَالِکٌ بِظَاھِرِہٖ فِیْ مَازَادَ عَلَے الثُّلُثِ۔)

توجب اس تفسیر کی بنا پر عورت کو اپنے مال میں بھی مرد سے مشورہ لینے کی ضرورت ہے تو شوہر کے مال میں تو کیسے ضرورت نہ ہوگی البتہ اگر کوئی ایسی معمولی چیز ہو جس میں غالب احتمال اجازت کا ہو تو خیر اور یہ بھی سائلوں کو دینے کے متعلق ہے۔ جب معمولی چیز دینے کے متعلق بھی اتنی احتیاط شرط ہے کہ غالب ظن اجازت کا ہو تو بھلا باپ ماں اور بہن بھائی کا گھر بھرنے کی کب اجازت ہوگی کیونکہ ان کو تو معمولی چیزیں نہیں دی جاتیں۔ ان کو ایک روٹی یا روٹی کا ٹکڑا کون دیتا ہے، وہاں تو نقد روپے یا کپڑوں کے جوڑے بھیجے جاتے ہیں جس میں غالب ظن یہ ہے کہ خاوند کو اطلاع ہو تو شاید اُسے ناگوار ہو۔ اور اسی وجہ سے اپنے عزیزوں کو عورتیں خفیہ خفیہ بھرتی ہیں اور خاوند کو ذرا بھی خبر نہیں ہونے دیتیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ غریب جتنا کچھ کماتا ہے سب دوسروں کو لگ جاتا ہے۔

شادی کے لئے موزوں رشتہ

اسی وجہ سے پہلے تو عقلاء کی یہ رائے تھی کہ غریب کی لڑکی سے شادی کرنا چاہیئے مگر ان واقعات کی وجہ سے اب بہت لوگوں کی رائے یہ ہے کہ غریب کی لڑکی ہرگز نہ لینی چاہیئے کیونکہ وہ اپنے ماں باپ کو غریب دیکھ کر شوہر کا سارا مال لگا دیتی ہے۔ خیر میں تو یہ رائے نہیں دیتا لیکن مجھ کو بتلانا یہ ہے کہ عورتوں کی بداحتیاطی کی وجہ سے یہ نوبت پہنچ گئی کہ اب بہت سے عقلاء غریب کی لڑکی لینے کو برا سمجھتے ہیں میری رائے تو یہ ہے کہ آدمی اپنے برابر کی لڑکی سے شادی کرے کیونکہ اگر اپنے سے زیادہ امیر کی لڑکی سے نکاح کیا تو گو وہ حریص نہ ہو گی نہ اپنے گھر والوں کو بھرے گی مگر بددماغ ہو گی اور شوہر کی اس کی نگاہ میں کچھ قدر نہ ہو گی اور غریب کی لڑکی سے کیا تو وہ حریص بھی ہو گی ہر ایک چیز کو دیکھ کر اس کی رال ٹپکے گی اور اپنے عزیزوں کو بھی بھرے گی۔

خیر یہ بات تو تجربہ کے متعلق ہے میرا مطلب یہ ہے کہ عورتیں مال کے صرف کرنے میں ایسی بے احتیاطیاں کرتی ہیں جن کی وجہ سے عقلاء کو یہ سوچ پیدا ہو گئی کہ امیر کی لڑکی لینا چاہیئے یا غریب کی یا برابر کی ــــــ۔

اور بڑا اگر عورتوں کو فضول خرچی سے روکنے کا یہ ہے کہ مال اور زیور پر ان کو قبضہ نہ دیا جائے۔ بس ضرورت کے موافق تھوڑا سا روپیہ ان کو دے دیا جائے۔ باقی کو مرد اپنے قبضہ میں رکھے۔ اسی طرح زیور اتنا دیا جائے جس سے اس کا ناک کان ڈھک جاوے۔

باقی سب شوہر کو اپنے پاس رکھنا چاہیئے (جب کبھی ضرورت پہننے کی ہو دے دیا جائے اور اس کے بعد پھر واپس لے کر رکھ لیا جائے اس طرح کرنے سے وہ فضول خرچی نہ کر سکے گی نہ چرا کر کسی کو دے سکے گی۔ پھر چاہے غریب کی لڑکی سے شادی کرو یا امیر کی لڑکی سے کسی سے کچھ خطرہ نہ ہوگا)

شادی بیاہ کا خرچ

ایک بے جا خرچ جو عورتوں اور مردوں سب کی شرکت سے ہوتا ہے بیاہ شادی کا خرچ ہے۔ گو یہ ہوتا ہے سب کی شرکت سے مگر اس میں بھی امام اور مقتدا عورتیں ہی ہیں، مردوں کو کچھ خبر نہیں ہوتی کہ شادی کے متعلق کیا کیا خرچ ہوتے ہیں۔ بس عورتوں سے پوچھ پوچھ کر سب کچھ کیا جاتا ہے۔ اس میں یہی حاکم ہوتی ہیں۔ بھلا کیا مجال جو ان کی منشاء کے خلاف کچھ بھی ہو سکے۔

میں نے کانپور میں دیکھا ہے کہ ایک صاحب کے یہاں بارات آئی مگر جب تک بیوی نے اجازت نہ دی۔ اس وقت تک بارات کو ٹھہرا نہیں سکے۔ مردوں میں تو ان حضرت کی بڑی ذلت ہوئی، مگر وہ بی بی پھولی نہیں سماتی تھی کہ دیکھا ہماری اجازت کے بغیر بارات بھی نہ ٹھہر سکی پھر اس کے بعد شادی میں یہ عورتیں ایسے بے تکے خرچ نکالتی ہیں جن سے مرد کا بیڑا ہو جاتا ہے اور اگر کسی وقت شوہر کہتا بھی ہے کہ ذرا سنبھل کر دیکھ بھال کر خرچ کرو تو بیوی صاحبہ کہتی ہیں کہ بہت اچھا میرا کیا حرج ہے میں کفایت شعاری سے کام کرنے لگوں گی۔ مگر پھر دیکھئے میں نہ جانوں کہیں برادری میں ناک کٹ جائے۔ بس ناک کٹنے

کے خوف سے مرد بھی خاموش ہو جاتے ہیں اور عورتیں اندھا دھند روپیہ برباد کرتی ہیں حالانکہ یہ محض اُن کا خیال ہی خیال ہے کہ سادگی کے ساتھ بیاہ کرنے سے ناک کٹتی ہے۔ ہم نے تو یہ دیکھا ہے کہ سادگی میں کچھ بھی ناک نہیں کٹتی اور زیادہ دھوم دھام کرنے میں ہمیشہ کٹتی ہے۔

حضرت مولانا مملوک علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی بیوہ لڑکی کی شادی اس طرح کی تھی جیسے کنواری کی کرتے ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ بیوہ کے نکاح کو ناک کٹی سمجھتے تھے۔ بعد نکاح کے مولانا نے نائی کو حکم دیا کہ آئینہ تمام برادری کو دکھلا دے سب اپنی اپنی ناکوں کو دیکھ لیں کہ کٹیں تو نہیں۔

تو اس رسم بد کی مخالفت سے مولانا کی عزت میں کیا فرق آیا۔ ان کی حالت یہ ہوتی ہے کہ اس دھوم دھام کو دیکھ کر دوسرے مال داروں کے دل میں حسد پیدا ہوتا ہے کہ یہ تو ہم سے بھی بڑھنے لگا۔ اب وہ اس کی کوشش کرتے ہیں کہ کسی طرح انتظام میں کوئی عیب نکالیں۔ اگر کچھ بھی انتظام میں کمی رہ گئی تو پھر کیا ٹھکانہ ہے ہر طرف اس کا پھر چاشن لیجئے ------ کوئی کہتا ہے میاں کیا ہمیں تو حقہ بھی نصیب نہ ہوا۔ دوسرا کہتا ہے میاں ہمیں پان کے پتہ سے بھی کسی نے نہ پوچھا۔ تیسرا کہتا ہے میاں بھوکے مر گئے رات کے دو بجے کھانا نصیب ہوا۔ جب انتظام نہیں ہو سکتا تھا تو اتنے آدمیوں کو بلایا ہی کیوں تھا ------ غرض اُس کم بخت کا تو روپیہ برباد ہوا اور ان کی ناک بھی سیدھی نہ ہوئی۔ بعض دفعہ حسد میں کوئی یہ حرکت کرتا ہے کہ پکتی دیگ میں ایسی چیز ڈال دیتا ہے جس سے کھانا خراب ہو جائے۔ پھر

اُس کا ہر محفل میں چرچا ہوتا ہے اور اچھی طرح ناک کٹتی ہے۔ اور اگر سارا انتظام عمدگی سے بھی ہو گیا تو نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کوئی بُرا نہ کہے تو بھلا بھی نہیں کہتا۔

حضرت مولانا گنگوہی قدس سرہٗ نے ایک مہاجن کی حکایت بیان فرمائی تھی کہ اُس نے اپنی لڑکی کی شادی میں بہت دھوم دھام کی تھی اور سارا انتظام بہت اچھا کیا اور جب بارات رخصت ہونے لگی، تو ہر باراتی کو ایک ایک اشرفی دی اور اپنے دل میں خیال کیا کہ آج سارے بارات والے میری ہی تعریف کرتے جائیں گے۔ چنانچہ وہ اپنی تعریف سننے کے لیئے اس راستہ میں جس سے بارات گزرنے والی تھی ایک جھاڑ کی آڑ میں جا بیٹھا۔

تھوڑی دیر میں بہلیاں گزرنا شروع ہوئیں۔ پہلے ایک گزری پھر دوسری پھر تیسری مگر سب میں سناٹا تھا کسی نے بھی لالہ صاحب کی تعریف میں ایک لفظ نہ کہا۔ آخر اسی طرح بہت سی بہلیاں خاموشی کے ساتھ نکل گئیں۔ لالہ جی کو بڑا غصہ آیا کہ یہ لوگ بھی عجب نمک حرام ہیں (بلکہ اشرفی حرام کہنا چاہیئے) کہ میں نے اتنا روپیہ ان پر خرچ کیا اور کسی نے منہ سے ایک لفظ بھی تعریف کا نہ نکالا۔

آخر اُس نے تھک کر گھر لوٹنے کا ارادہ کیا تو اخیر کی بہلیوں میں سے ایک شخص کی آواز آئی جو دوسرے سے کہہ رہا تھا کہ بھائی لالہ جی نے تو بڑی ہمت اور حوصلہ کا کام کیا کہ ہر آدمی کو ایک ایک اشرفی دی۔ لالہ جی کی ذرا جان میں جان آئی کہ کچھ تو محنت وصول ہوئی دوسرا بولا اوہو! اُس سسرے نے کیا کیا۔ اُس کے گھر میں تو اشرفیوں کے کوٹھے

بھرے ہوئے بھتے اگر دو دو بانٹ دیتا تو اُن کے یہاں کیا کمی آ جاتی یسمسرے سنے بانٹی بھی تو ایک ایک اشرفی۔ بس لالہ جی یہ جواب سُن کر اپنا سامنہ لے کے واپس چلے آئے۔

تو صاحب کتنا ہی خرچ کیجئے نام کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اوّل تو حسد کی وجہ سے لوگ الٹا بدنام کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور جو یہ بھی نہ ہوا تو یہ ہوتا ہے جو لالہ جی کے ساتھ کہ ایک ایک اشرفی بانٹی اور سمسرے ہی کہلائے۔ اور یہ بھی نہ ہو تو یہ ہوتا ہے کہ جب کہیں تذکرہ ہوتا ہے تو لوگ کہتے ہیں میاں کیا کیا جن کے پاس روپیہ ہوتا ہے وہ کیا ہی کرتے ہیں تو میں کہتا ہوں کہ جب اس قصّہ سے کچھ حاصل نہ وصول تو ان سب کو چھوڑ دینا چاہیے اور یہ حال ہونا چاہیے ؎

تَرَكْتُ اللَّاتَ وَالْعُزّٰى جَمِيْعًا

كَذٰلِكَ يَفْعَلُ الرَّجُلُ الْبَصِيْرُ

صرفِ مال کی خرابیاں

عورتوں میں ایک مرض یہ ہے کہ جب یہ شادی بیاہ کے خرچ مردوں کو بتلاتی ہیں اور خاوند پوچھتا ہے کہ اتنا خرچ میں کہاں سے کروں مجھ میں تو اتنی گنجائش نہیں ہے تو وہ کہتی ہیں، قرضہ لے لو شادی کا قرضہ رہا نہیں کرتا، سب ادا ہو جاتا ہے۔ خدا جانے یہ انہوں نے کہاں سے سمجھ رکھا ہے کہ شادی اور تعمیر کا قرضہ ادا ہو ہی جاتا ہے چاہے وہ سودی ہی قرضہ ہو اور چاہے خرچ بے تکا ہی ہو صاحب ہم نے تو ان قرضوں میں جائدادیں نیلام ہوتے دیکھی ہیں اور جب یہ نوبت پہنچ گئی۔ تو اب لوگ خود ہی ان کی بُرائی کچھ سمجھ گئے

ہیں مگر پھر بھی پوری عقل نہیں آئی۔ ہنوز بہت کچھ رسوم باقی ہیں یعنی گو آج کل شرک و بدعت کی رسمیں تو کم ہو گئیں لیکن تفاخر کی رسمیں بڑھ گئی ہیں۔ چنانچہ زیور اور لباس میں آج کل پہلے سے زیادہ خرچ کیا جاتا ہے پہلے تو سب سے بڑھیا کپڑا مشروع کا سمجھا جاتا تھا اور اب تو اطلس کمخواب، زری اور لٹسر اور سرج وغیرہ نہ معلوم کتنی قسم کے کپڑے بڑھیا بڑھیا ایجاد ہو گئے ہیں۔ اسی طرح برتنوں اور فرش و فروش میں قسم قسم کے تکلف پیدا ہو گئے ہیں۔ پہلے تو یہ حالت تھی کہ اس قسم کی بڑھیا چیزیں کسی ایک دو شخص کے یہاں ہوتی تھیں۔ شادی بیاہ میں سب لوگ ان سے مانگ کر کام نکال لیا کرتے تھے۔

چنانچہ ہمارے یہاں ایک رئیس تھے۔ ان کے یہاں ایک مراد آبادی حقہ تھا اور ایک بڑا سا فرش تھا اور کسی کے یہاں یہ چیزیں نہ تھیں تو شادی بیاہ کے موقع پر ساری برادری میں وہ حقہ اور فرش مانگا مانگا پھرتا تھا اور اب تو ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی کے یہاں یہ چیزیں موجود ہیں۔ تو آج کل ان تکلفات میں بہت کچھ روپیہ برباد ہو رہا ہے اور دیکھئے اگرچہ اس زمانہ میں بہت سے علماء نے ان رسوم کے مٹانے کی کوشش کی ہے اور بہت لوگ سمجھ بھی گئے ہیں لیکن اب بھی بہت سے بھدی عقل کے لوگ موجود ہیں۔

ایک صاحب نے "اصلاح الرسوم" سے یہ کام لیا کہ وہ کہتے تھے کہ ہم تو بہت سی رسموں کو بھول گئے تھے۔ خدا اصلاح الرسوم کے مصنف کا بھلا کرے کہ انہوں نے سب کو محفوظ کر دیا۔ اب ہم اس کتاب کو دیکھ دیکھ کر سب رسمیں کر لیتے ہیں حالانکہ اس کتاب میں رسموں کی

کی تردید کی گئی ہے اور سب کی خرابیاں دکھلائی گئی ہیں۔ مگر ان حضرت نے اس سے یہ کام لیا۔

اس کی تو ایسی مثال ہے جیسے کوئی شخص قرآن میں سے کفار کے اقوال چھانٹ لے۔ مثلاً اِنَّ اللّٰہَ ثَالِثُ ثَلٰثَۃٍ اور اَلْمَسِیْحُ ابْنُ اللّٰہِ۔ وعُزَیْرُ بْنُ اللّٰہِ اور اِتَّخَذَ اللّٰہُ وَلَدًا اور مَا اَنْزَلَ اللّٰہُ عَلٰی بَشَرٍ مِّنْ شَیْءٍ اور سَاُنْزِلُ مِثْلَ مَا اَنْزَلَ اللّٰہُ وغیرہ وغیرہ۔ اور ان اقوال کی تردید جو قرآن میں کی گئی ہے اُس کو چھوڑ دے اور یوں کہے کہ ہم کو قرآن سے بہت نفع ہوا کہ پہلے کفار کے اقوال ہم کو معلوم نہ تھے اب معلوم ہو گئے اور ایسے ایسے وظائف کفریہ ہاتھ لگ گئے، تو بتلائیے اس شخص کی حماقت میں کوئی شک ہو سکتا ہے۔ بس ایسا ہی نفع ان صاحب نے "اصلاح الرسوم" سے حاصل کیا۔

اس لیے میں کہتا ہوں کہ ابھی تک رسوم کی پوری اصلاح نہیں ہوئی بلکہ ایسے ایسے عقلمند بھی موجود ہیں۔ یہ وہ خرابیاں تھیں جو صرف مال میں ہوتی ہیں غرض مال میں ہمارے عمل کے تین درجے تھے ان میں جو خرابیاں مرد کرتے ہیں اور جو عورتیں کرتی ہیں وہ سب میں نے مختصراً بیان کر دی ہیں۔

زوجہ صالحہ کی شناخت

مگر اخیر میں اتنا اور کہتا ہوں کہ اگر عورتیں اس میں ہمت سے کام لیں تو بہت جلد یہ خرابیاں زائل ہو سکتی ہیں اور زائل نہ ہوں تو کم تو ضرور ہو جائیں گی۔ کیونکہ میں نے بتلا دیا ہے کہ مرد زیادہ تر مال کے گناہ میں عورتوں ہی کی وجہ سے مبتلا ہوتے ہیں۔ اگر یہ ذرا ہمت

کر کے زیور اور لباس کی فرمائشیں کم کردیں اور مردوں سے کہہ دیں کہ ہماری وجہ سے حرام کمائی میں مبتلا نہ ہونا تو پھر بہت کچھ اصلاح ہوجائے۔

حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی صاحبزادی کا جب نکاح ہوا تو اُن کے خاوند مولوی ابراہیم صاحب اس وقت ڈپٹی نہ تھے تنخواہ بھی زیادہ نہ تھی اس لیے بالائی آمدنی کی بھی کچھ احتیاط نہ تھی۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی صاحبزادی نے پہلے ہی دن ان سے صاف کہہ دیا کہ میں تمہارے گھر اس وقت تک کھانا نہ کھاؤں گی جب تک بالائی آمدنی سے تم توبہ نہ کرو گے۔ غرض ان اللہ کی بندی نے جاتے ہی خاوند سے توبہ کرائی اور عہد لیا کہ آئندہ سے رشوت کبھی نہ لی جائے۔

صاحبزادی صاحبہ کے متعلق ہمارے حضرت حاجی صاحب قدس اللہ سرہٗ نے پیشین گوئی کی تھی کہ یہ لڑکی بہت زاہدہ ہوگی۔ حضرت حاجی صاحب ایام غدر میں ایک مرتبہ گنگوہ تشریف لائے تھے۔ مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اس وقت موجود نہ تھے۔ حاجی صاحب نے قیام مولانا ہی کے یہاں فرمایا اور صاحبزادی صاحبہ کو بلا کر ایک روپیہ دیا۔ انہوں نے لے کر اُسے حاجی صاحب کے پیروں میں ڈال دیا۔ حضرت نے پھر دیا انہوں نے پھر ایسا ہی کیا۔ کئی دفعہ یہی قصہ ہوا اور انہوں نے نہیں لیا تو حضرت نے فرمایا کہ یہ لڑکی بہت زاہدہ ہوگی۔

چنانچہ واقعی بہت زاہدہ ہیں۔ ان کا ایک زہد تو یہی ہے کہ پہلے ہی دن خاوند کو رشوت سے روک دیا۔ حالانکہ اس وقت عورت کو روپیہ

کا لالچ ہوا کرتا ہے خصوصاً اس کو جسے ماں باپ کے یہاں سے بھی زیور کپڑا امیرانہ نہ دیا گیا ہو مگر بایں ہمہ اُن کو دنیا کی مطلق حرص نہ ہوئی بلکہ دین کا خیال غالب ہوا۔

اسی طرح کاندھلہ میں ایک بی بی تھیں۔ ان کے خاوند تحصیلدار تھے جن کے متعلق آبکاری کا انتظام بھی تھا۔ ان بی بی نے اپنے خاوند کی آمدنی کو ہاتھ تک نہیں لگایا، نہ اس میں سے زیور بنایا نہ کپڑا اور کمال یہ کیا کہ مقام ملازمت پر رہنے کے زمانہ میں غلّہ اور نمک اور سب چیز اپنے میکہ سے منگاتی تھیں اور شرافت یہ کہ شوہر کو اطلاع تک نہیں کی کہ اُن کو رنج نہ ہو۔

ہمارے ہاں ایک کاندھلہ کی بی بی تھیں۔ اُن کے شوہر کے یہاں کچھ زمین رہن تھی جس کی آمدنی وہ اپنے صرف میں لاتے تھے مگر ان کی بی بی نے رہن کی آمدنی میں سے کبھی ایک حبہ بھی نہیں کھایا۔

میں سچ کہتا ہوں کہ بعض عورتیں مردوں سے بھی زیادہ مضبوط ہوتی ہیں اس لئے جو عورتیں یہ کہتی ہیں کہ ہم مجبور ہیں جو خاوند لاتا ہے وہی کھانا پڑتا ہے یہ محض اُن کے لچر بہانے ہیں۔ اگر یہ زیور اور کپڑوں کی فرمائش نہ کیا کریں تو بہت سے مرد تو خود ہی رشوت سے توبہ کر لیں۔ اور اگر جو کوئی پھر بھی لے تو عورتیں ہمت کر کے ان سے کہہ دیں کہ ہمارے پاس رشوت کا مال نہ لانا صرف حلال تنخواہ کا روپیہ لانا ورنہ آخرت میں ہم تمہارے دامن گیر ہوں گے۔ دیکھئے پھر مردوں کی کتنی جلدی اصلاح ہوتی ہے۔

میں نے اپنے خاندان کے بزرگوں سے سُنا ہے کہ میری والدہ

(صاحب مرحومہ) نے سارا زیور اتار کر والد صاحب کے سامنے پھینک دیا تھا اور یہ فرمایا کہ یا تو اس کی زکوٰۃ دو، ورنہ اس کو اپنے پاس رکھو۔ میں نہ پہنوں گی۔ آخر مجبور ہو کر والد صاحب نے سب کی زکوٰۃ دی جب وہ زیور پہنا گیا۔

ذرا عورتیں اس طرح کر کے تو دیکھیں انشاء اللہ خود بخود مردوں کی اصلاح ہو جائے گی کیونکہ جس طرح بعض دفعہ مرد سے عورت کی اصلاح ہوتی ہے اسی طرح عورت سے بھی مرد کی اصلاح ہوتی ہے اور زوجۂ صالحہ تو وہی ہے جو مرد کو دین میں محتاط بنا دے نہ یہ کہ پہلے سے بھی زیادہ اور بے احتیاط بنا دے۔

اولاد کا وبال

یہ گفتگو تو مال کے متعلق تھی۔ اب دوسرا جزو قابل بیان رہ گیا۔ یعنی اولاد کے متعلق۔ سو اولاد میں بھی تین درجے ہیں اور ان میں بھی ہر درجہ میں ہم سے مختلف گناہ ہوتے ہیں۔ مختصر طور پر ان کو بھی سن لیجئے۔

سب سے پہلے تو اولاد کے پیدا ہونے میں اکثر لوگوں کی اور خصوصاً عورتوں کی یہ عادت ہے کہ کہیں منتر کراتی ہیں، کہیں گنڈے اور اس کی بھی پروا نہیں کرتیں کہ یہ شریعت کے موافق ہیں یا نہیں۔ اس میں بعض عورتیں یہاں تک بے باک ہیں کہ اگر کوئی ان سے یہ کہہ دے کہ تم فلانی کے بچہ کو مار ڈالو تو تمہارے اولاد ہو جائے گی تو وہ اس سے بھی دریغ نہیں کرتیں۔ بعض دفعہ کسی کے بچہ پر (ہولی دیوالی کے دنوں میں) جادو کرا دیتی ہیں یا خود کر دیتی ہیں۔ بعضی جاہل عورتیں سیتلا پوجتی ہیں۔ کہیں چوراہے پر کچھ رکھ دیتی ہیں محض اس غرض سے کہ اولاد پیدا ہو۔ پھر

وہ اولاد بعض دفعہ ایسی خبیث پیدا ہوتی ہے کہ بڑے ہو کر باپ ماں کو اتنا ستاتی ہے کہ وہ بھی یاد ہی کرتے ہیں۔ اس وقت وہ ایسی اولاد کو جس کی تمنا میں سینکڑوں گناہ کئے تھے ہزاروں کوسنے دیتے ہیں۔

زیادہ وجہ اولاد کے خبیث اٹھنے کی یہ بھی ہے کہ تمنا کی اولاد کے لاڈ پیار بہت کئے جاتے ہیں۔ بچپن میں ان کے اخلاق خراب کر دیئے جاتے ہیں کہ چاہے وہ کسی کو گالی دے لے یا کسی کو مار پیٹ لے لاڈ کی وجہ سے کوئی اُسے کچھ نہیں کہتا۔ اور کہنا سننا کیسا بعض عورتیں تو اس کی تمنا کرتی ہیں کہ ہمارا بچہ گالی دینے کے قابل ہو جاوے۔

چنانچہ ایک عورت نے منت مانی تھی کہ اگر میرے لڑکا ہو اور وہ ماں کی گالی کھا کر گھر میں آئے تو میں اللہ واسطے پانچ روپیہ کی مٹھائی تقسیم کروں گی۔ تو بھلا ایسی عورتیں اولاد کو گالی دینے سے کیا خاک روکیں گی۔ پھر وہ اولاد بڑے ہو کر ان کو بھی گالیوں سے یاد کرتی ہے اور بعضے لڑکے تو ایسے جلاد ہوتے ہیں کہ بیوی کے مقابلہ میں ماں کو لاٹھیوں سے کوٹتے ہیں۔ اس وقت یہ ساری تمنائیں خاک کے رستہ سے نکل جاتی ہیں خیر یہ گناہ تو بچہ کے پیدا ہونے میں کئے جاتے ہیں۔

اب وہ پیدا ہو گیا تو یہ حالت ہے کہ آج کان دکھ رہا ہے، آج ناک میں تکلیف ہے، آج کھانسی ہے، آج بخار ہے۔ گو ان امراض میں سب ہی مبتلا ہوتے ہیں مگر بچوں کی زیادہ نگہداشت کی جاتی ہے ان کے لئے بلایا جاتا ہے کہیں عامل کو اور بات بات کے لئے ٹوٹنے ٹوٹکے کئے جاتے ہیں اور یہ بھی کسی نے نہ کیا تو اس گناہ میں تو قریب قریب سبھی عورتیں مبتلا ہیں کہ بچہ ہونے کے بعد اکثر نماز نہیں پڑھتیں اور جو کوئی

نماز کو کہتا ہے تو جواب دیتی ہیں کہ بچوں کے ساتھ نماز پڑھنا کہاں ممکن ہے۔ ہر وقت تو کپڑے ناپاک رہتے ہیں۔ کبھی پاخانہ کر دیا، کبھی پیشاب کر دیا۔ پھر کپڑے بھی بدل لیں تو بچے گود سے نہیں اترتے۔ نماز کے لئے ان کو الگ کریں تو روتے دھوتے ہیں، چیختے چلاتے ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ مولویوں کے تو بچے نہیں ہوتے، انہیں اس مصیبت کی کیا خبر، ان کو تو بس نماز کے لئے تاکید کرنا آتا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ مولویوں کے بچے نہیں ہوتے تو مولونوں کے تو ہوتے ہیں۔ پھر ذرا جا کر دیکھ لو کہ وہ کس پابندی سے پانچوں وقت کی نمازیں پڑھتی ہیں اور بعض اللہ کی بندیاں نماز کے بعد تلاوتِ قرآن اور مناجاتِ مقبول اور اشراق تک کی بھی پابند ہیں۔ کیا ان کے اولاد نہیں؟ ایسی انوکھی اولاد تمہاری ہی ہے جس کے ساتھ نماز پڑھنا محال ہے

پھر میں کہتا ہوں کہ جس وقت تمہارا بچہ روتا ہوا اور گود سے ہرگز نہ اترتا ہو اگر اس وقت تم کو پیشاب یا پاخانہ کا تقاضا لگے تو بتلاؤ تم کیا کرو گی۔ کیا اس کو پلنگ پر روتا ہوا ڈال کر پاخانہ میں نہ جاؤ گی۔ یقیناً سب جاتی ہیں اور وہاں جا کر بعض دفعہ خوب دیر لگتی ہے اور بچہ کے رونے کی کچھ پروا نہیں کی جاتی تو کیا نماز کے لئے تم سے اتنا بھی نہیں ہو سکتا جتنا پیشاب پاخانہ کے لئے کرتی ہو؟ افسوس! ــــــ بس معلوم ہوا کہ یہ سب مہمل عذر ہیں۔

تیسری بات یہ ہے کہ آدمی جس کام کے لئے آمادہ ہو جاتا ہے اللہ تعالیٰ اس میں ضرور مدد فرماتے ہیں۔ تو جو عورتیں ایسے بہانے کرتی ہیں، وہ ذرا نماز شروع کر کے تو دیکھیں انشاء اللہ پھولوں ہلکی ہو جائیں گی۔

مگر اب تو ارادہ ہی نہیں کرتیں، اس لئے نہ کرنے کے سو بہانے ہیں، ورنہ ارادہ وہ چیز ہے کہ ایک وہ شخص جس سے بارش یا سردی میں خود اٹھ کر پانی بھی نہیں پیا جاتا اگر صاحب کلکٹر کا حکم اس حالت میں اس کے پاس پہنچ جائے کہ فلاں مقام میں ہم سے آ کر ملو تو وہ دو میل پیادہ چلا جاتا ہے لوگ حیرت کرتے ہیں کہ اس میں یہ قوت کہاں سے آ گئی۔ میں کہتا ہوں یہ ارادہ کی قوت ہے جس پر حق تعالیٰ نے امداد کا وعدہ فرمایا ہے۔

قضا کا کفارہ

تو جناب یہ عورتیں نماز کا ارادہ ہی نہیں کرتیں ورنہ کچھ مشکل بات نہ تھی۔ لیجئے میں ایک تدبیر بتلاتا ہوں جس سے بہت جلد نماز کی پابندی حاصل ہو جائے گی۔ وہ یہ کہ جب ایک وقت کی نماز قضا ہو تو ایک وقت کا فاقہ کرو۔ پھر دیکھیں نماز کیسے قضا ہوتی ہے۔ اگر کوئی کہے کہ نماز کی پابندی تو فاقہ سے ہو گی مگر فاقہ کی پابندی کیوں کر ہو گی، اس کی بھی تو کوئی ترکیب بتلاؤ کیونکہ یہ تو نماز سے بھی زیادہ مشکل ہے؛ فاقہ کس سے ہو سکتا ہے؛ تو میں کہتا ہوں کہ فاقہ میں تو کچھ کرنا ہی نہیں پڑتا بلکہ چند کاموں سے اپنے کو روکنا پڑتا ہے اور یہ اختیاری بات ہے کہ ایک کام مت کرو۔ کسی کام کا کرنا تو مشکل ہوتا ہے مگر نہ کرنا کیا مشکل ہے۔

اگر کسی سے یہ نہ ہو سکے تو وہ اپنے ذمہ کچھ جرمانہ مالی مقرر کر لے کہ اتنے پیسے فی نماز خیرات کیا کروں گی یا کچھ نمازیں مقرر کر لیں کہ ایک نماز قضا ہوئی تو مثلاً دس رکعتیں نفل جرمانہ کی پڑھا کروں گی۔ اس طرح چند روز میں نفس ٹھیک ہو جائے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔ ذرا عمل کر کے تو دیکھو۔

مستقبل کی غلط فکر

تیسری غلطی اولاد کی آئندہ کے لئے فکر کرنے میں کی جاتی ہے اس میں لوگ بڑی غرابیاں کرتے ہیں۔ اوّل تو تمام جائیداد ان کے نام کر دیتے ہیں اور لڑکیوں کو محروم کر دیتے ہیں اس کا سخت وبال ہے پھر مزا یہ کہ وہ جائیداد حرام طریقہ سے حاصل کی جاتی ہے کہیں رشوت سے کہیں سود سے، یہ وبال الگ رہا۔ پھر زندگی ہی میں اولاد کے نام داخل خارج کرا دیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ وہ دنیا ہی میں دیکھ لیتے ہیں کہ بعض دفعہ اولاد جائیداد کی مالک بن کر ماں باپ کو ایک دانہ بھی نہیں دیتی اور پیچھے تو ان کو ثواب کون پہنچاتا ہے کوئی بھول کر نام بھی نہیں لیتا۔ ہاں دو چار دن برادری کے دکھانے کو کچھ کر دیتے ہیں۔ سو اس سے والدین کو کچھ نفع نہیں ہوتا کیونکہ نیت ریا کی ہے۔ اور اپنے اوپر سے الزام و طعن کا دفع کرنا مقصود ہوتا ہے۔

پھر اس بے اعتنائی کے ساتھ یہ بھی تو نہیں کرتے کہ ماں باپ کو بھلا کر ان کے جمع ذخیرہ جائیداد سے خود ہی راحت اٹھا لیں۔ اگر اتنا بھی کریں تو خیر والدین کا کچھ مقصود تو حاصل ہو جائے۔ مگر وہاں یہ ہوتا ہے کہ ماں باپ کی رقم اور جائیداد کو دل کھول کر اڑایا جاتا ہے اور کہاں رنڈی بھڑووں میں، یار دوستوں میں۔ ماں باپ نے تو مصیبت جھیل کر، پیٹ اور تن کاٹ کر اور ایمان کھو کر، گناہ سر پر لاد کر مال و جائیداد جمع کی تھی صاحبزادہ نے اس کی یہ قدر کی کہ سب کی سب رذیل لوگوں میں اڑا دی (کیوں نہ ہو مال حرام بود بجائے حرام رفت)

اسی لئے ایک بزرگ کا ارشاد ہے کہ اپنی اولاد کے لئے کچھ

جمع نہ کرے اور اس کی وجہ یہ فرمائی کہ دو حال سے خالی نہیں یا تو یہ اولاد خدا کی دوست اور مطیع ہو گی یا دشمن و نافرمان۔ اگر دوست اور مطیع ہوئے تو خدا تعالیٰ اپنے دوستوں کو ضائع نہیں کیا کرتے۔ اس صورت میں تم کو ان کی فکر کی کوئی ضرورت نہیں اور اگر یہ خدا کے دشمن و نافرمان ہوئے تو خدا کی نافرمانی میں ان کو امداد دینا یہ کیا مناسب ہے۔

واقعی بات تو خوب فرمائی لیکن میرا یہ مطلب نہیں کہ سب لوگ ایسے ہی بن جاویں۔ یہ ان کی خاص حالت تھی جس میں سب کو اس حال کی تعلیم کی ہے بلکہ حدیث شریف میں تو اس کی ترغیب ہے کہ اپنی عیال کو غنی چھوڑنا اس سے اچھا ہے کہ ان کو بالکل خالی ہاتھ چھوڑ جاؤ۔ تو اولاد کے لئے کچھ اندوختہ چھوڑ جانا بُرا نہیں، مگر یہ تو نہ ہو کہ دوسرے کا گلا کاٹ کر ان کا کرتہ سیا جائے کہ رشوت اور سود سے ذخیرہ جمع کیا جائے، غریبوں کی زمین ناحق دبا کر اپنی جائداد کو بڑھایا جاوے اور کسی نے اگر یہ ظلم بھی نہ کیا تو دوسرا ظلم یہ کیا کہ بیٹیوں کو محروم کر کے سب زمین بیٹوں کے نام کر دی۔

یہ ہیں وہ گناہ جو مال اور اولاد کی وجہ سے ہم کرتے ہیں جن کو میں نے مختصراً بیان کر دیا۔ اس سے آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ مال و اولاد اکثر معصیت کا سبب ہو جاتے ہیں اس لئے حق تعالیٰ اس آیت میں ارشاد فرماتے ہیں کہ اے مسلمانو! یہ اموال و اولاد تم کو ذکر اللہ یعنی طاعت سے غافل کر کے معصیت کا سبب نہ بن جاویں اور جو ایسا کرے گا تو وہ زیاں کار ہے۔

اہلِ خسارہ

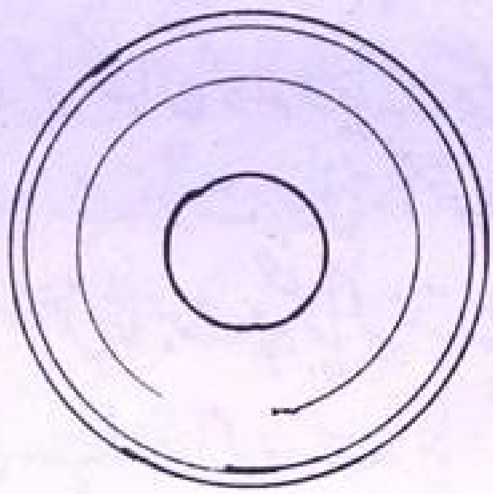
یہاں کیا اچھا لفظ ارشاد فرمایا ہے فاولٰئک ھم الخسرون۔ جس میں جیسا کہ ابھی مذکور ہوتا ہے اس طرف اشارہ ہے کہ ایسا شخص نفع کی چیز میں ٹوٹا اٹھانے والا ہوگا جس سے یہ معلوم ہو گیا کہ مال و اولاد فی نفسہٖ ضرر کی چیز نہیں۔ بلکہ اگر معصیت کا سبب نہ بنے تو واقع میں نفع کی چیز ہے اور یہ اشارہ اس وجہ سے ہے کہ خسارہ مطلق نقصان کو نہیں کہتے بلکہ نفع کی چیز میں نقصان ہونے کو خسارہ کہا کرتے ہیں۔ بہر حال ایسے لوگ خسارہ میں ہیں اور زیاں کار ہیں۔

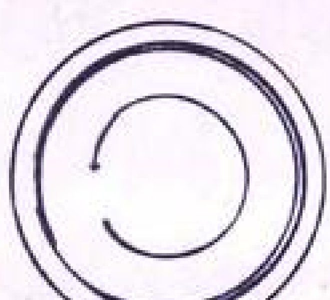
اطلاق خسارہ سے اس پر بھی دلالت ہے کہ صرف آخرت ہی میں نہیں بلکہ دنیا میں بھی یہ لوگ خسارہ ہی کے اندر ہیں۔ کیونکہ مال و اولاد کی ایسی محبت وبالِ جان ہو جاتی ہے اور مال و اولاد ایسے ہی شخص کے لئے معصیت کا سبب ہو جاتے ہیں جس کو ان سے ایسی محبت ہو۔ سو محبتِ مال کا وبالِ جان ہونا تو ظاہر ہے کہ ہر وقت آدمی کو اسی کی فکر رہتی ہے کہ آج اتنے روپے ہیں تو کل کو اتنے ہو جاویں۔ چنانچہ اپنی جان پر مصیبت ڈال ڈال کر روپیہ جوڑا جاتا ہے پھر رات کو اسے بار بار دیکھا جاتا ہے کہ اپنی جگہ پر ہے بھی یا نہیں۔ چوروں کے کھٹکے سے راتوں کی نیند اڑ جاتی ہے ـــــــــ اور اولاد کا وبالِ جان ہونا آپ کو اس حکایت سے معلوم ہو جائے گا کہ میں نے ایک والیِ ملک کی بیٹی کو دیکھا ہے کہ ان کو اپنے بیٹوں سے اس قدر محبت تھی کہ رات کو وہ سب کو ساتھ لے کر لیٹتی تھیں۔ جدا کر کے ان کو چین ہی نہ آتا تھا۔ پھر جب بچے زیادہ ہو گئے اور ایک پلنگ پر نہ آسکے تو انہوں نے پلنگ پر سونا چھوڑ دیا۔ سب

کو بے کر نیچے زمین میں فرش پر سویا کرتی تھیں اور اس پر بھی اعتبار نہ آیا بلکہ کسی پر ہاتھ رکھ لیتیں اور کسی پر پیر اور رات کو بار بار آنکھ کھلتی اور بچے کو ٹٹول کر دیکھ لیا کرتیں۔

واقعی یہ محبت تو عذاب ہی ہے پھر اگر ایمان بھی نہ ہوا تو دونوں عالم میں معذب ہے۔ اسی کو حق تعالیٰ فرماتے ہیں وَلَا تُعْجِبْكَ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ أَنْ يُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ أَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كَافِرُونَ کیونکہ ان کو نہ دنیا میں چین ملا نہ آخرت میں اور اگر ایمان ہوا تو خیر دنیا ہی بے لذت ہوئی۔ آخرت انجام کار انشاء اللہ پُر لطف ہو جاتے گی۔ غرض ثابت ہو گیا کہ محبت مال و اولاد کبھی معصیت کا سبب ہو جاتی ہے اور اس سے دنیا و آخرت دونوں کا خسارہ ہو جاتا ہے خواہ خسارہ محدود ہو یا غیر محدود والبتہ جو لوگ اعتدال کے ساتھ محبت کرتے ہیں اور حقوق الٰہیہ کو غالب رکھتے ہیں ضائع نہیں کرتے وہ ہر وقت لطف میں ہیں۔ بس اب میں ختم کرتا ہوں دعا کیجیے کہ خدا تعالیٰ ہم کو اپنی یاد سے غافل نہ فرمائیں اور مال و اولاد کو ہمارے لئے سبب فتنہ نہ بنائیں۔ آمین وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ سیدنا و مولانا محمد وعلی آلہ واصحابہ اجمعین وآخر دعونا ان الحمد للہ رب العلمین

وعظ ختم ہوا۔





مظاہر الآمال

انہماک فی الدنیا کی ترہیب اور استعداد للآخرت کی ترغیب
کے متعلق یہ وعظ بروز یکشنبہ یکم جمادی الثانی ۱۳۳۵ھ کو
تقریباً ۵۰۰ کے مجمع میں ہوا اور اڑھائی گھنٹے میں ختم
ہوا۔ اسے مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی نے قلمبند فرمایا

اعمالِ صالحہ کو حقیر سمجھنا سخت غلطی ہے۔ ہر عمل
قابلِ وقعت ہے۔ اپنے عمل کو اس حیثیت سے تو
کچھ نہ سمجھو کہ تم نے کیا ہے مگر اس کی اس حیثیت
سے قدر کرو کہ یہ نعمت حق تعالیٰ نے عطا فرمائی ہے

خطبۂ ماثورہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونومن
بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا و
من سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہٗ
ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا اللہ
وحدہٗ لاشریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا
محمداً عبدہٗ ورسولہ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ
اٰلہ واصحابہ وبارک وسلم امابعد فاعوذ باللّٰہ من
الشیطان الرجیم ۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم ۔

المال والبنون زینۃ الحیٰوۃ الدنیا والباقیات الصالحات
خیر عند ربک ثوابا وخیر املاً ہ

طلب دُنیا

ہر چند کہ یہ مضمون بارہا سُنا ہوگا اس آیت کے ظاہری مضمون کو سننے والوں نے سمجھ لیا ہوگا اور اسی کے ساتھ یہ بھی دل میں کہتے ہوں گے کہ پُرانا مضمون انہماک دنیا سے منع کرنے کا ہے اور شاید اس لئے اس کی وقعت بھی دل سے نکل گئی ہوگی کیونکہ آج کل نئے مضمون کی زیادہ وقعت ہوتی ہے جو پہلے سے نہ سُنا ہو۔

مگر میں کہتا ہوں کہ کسی چیز کا پرانا ہونا اس کی بے وقعتی کا سبب نہیں ہو سکتا اور اس کے لئے میں اسلام کو دلیل میں پیش کرتا ہوں کہ وہ بھی بہت پُرانا ہے تیرہ سو برس سے زیادہ کا ہو گیا ہے۔ اگر کوئی چیز پُرانی ہو کر بے وقعت ہو جاتی ہے تو کیا نعوذ باللہ اسلام کو بھی بے وقعت کہا جائے گا۔ اگر کوئی شخص اس کے لئے آمادہ ہو اور کسی سچے مسلمان سے تو مجھے اس کی امید نہیں۔ ہاں کوئی نام کا مسلمان

اس کے لیئے تیار ہو تو میں اُس سے کہوں گا کہ یہ حیلے حوالے کیوں کیئے جاتے ہیں۔ صاف یہی کہہ دو نا کہ ہم خدا تعالیٰ ہی کو چھوڑتے ہیں کہ وہ بھی بہت پرانے ہیں اَلْاَوَّلُ الَّذِیْ لَیْسَ قَبْلَہٗ شَیْءٌ۔ وہ تو ایسے قدیم ہیں کہ ان سے پہلے کوئی بھی نہیں۔ گو اس وقت کانوں سے آواز سنائی نہیں دیتی مگر سب کے دل سے دل میں آواز آرہی ہے کہ اسلام کو اور خدا تعالیٰ کو ہم نہیں چھوڑ سکتے۔ جب خدا تعالیٰ کو نہیں چھوڑا جاتا تو ان کے کلام کو کیوں کر چھوڑا جا سکتا ہے۔

اس لیئے میں تلبیس نہیں کرتا کہ کسی نئے مضمون سے شروع کر کے مقصود کی طرف رجوع کروں براہ راست پرانا ہی مضمون شروع کر کے اپنے مقصود کو صاف الفاظ میں کہتا ہوں کہ دنیا آخرت کے مقابلہ میں کچھ نہیں، ہیچ ہے، لاشے ہے، جیسے ستارے آفتاب کے سامنے کچھ نہیں اور کانسٹیبل والسرائے کے سامنے کچھ نہیں ــــ واللہ دنیا کیلیئے یہی فخر کافی ہے کہ وہ آخرت کے ساتھ ذکر ہوتی ہے ؎

فی الجملہ نسبتے بتو کافی بود مراد
بلبل ہمیں کہ قافیۂ گل شود بس ست

کانسٹیبل کے لیئے یہی وقعت کافی ہے کہ وہ ملازمانِ سرکاری میں والسرائے کے ساتھ ذکر ہوتا ہے۔ کیا اہلِ دنیا یہ چاہتے ہیں کہ ہم دین کا نام ہی نہ لیں اور دنیا ہی کا ذکر رات دن کیا کریں۔ یہ تو ہم سے نہیں ہو سکتا۔ ہاں اُن کی خاطر سے کبھی کبھی دنیا کا ذکر بھی کر دیتے ہیں وہ بھی کون سی دنیا؟ دنیائے محمودہ جو معینِ آخرت ہو کیونکہ دنیائے مذمومہ تو نہ انفراداً قابلِ ذکر ہے نہ انضماماً نہ مدحاً نہ ذماً گو مذموم

ہے کیونکہ خدا تعالیٰ سے دور کرنے والی ہے مگر بلا ضرورت ذم کے ساتھ بھی قابل ذکر نہیں۔

اسی وجہ سے حضرت رابعہ بصریہ رضی اللہ عنہا نے چند زاہدوں کو تنبیہ فرمائی تھی جو اُن کے سامنے دنیا کی مذمت کر رہے تھے قُومُوا عَنِّیْ فَاِنَّکُمْ تُحِبُّوْنَ الدُّنْیَا میرے پاس سے اُٹھ جاؤ، تم دنیا سے محبت رکھتے ہو۔ حالانکہ وہ دنیا کے مذموم ہونے کا ذکر کر رہے تھے، مگر بلا ضرورت کر رہے تھے اور اس وقت کے مسلمانوں کو اس مردار سے ایسا تعلق ہے کہ اس کے ساتھ وہ معاملہ کر رہے ہیں جو خدا سے کرنا چاہیئے تھا۔ یعنی خدا تعالیٰ کی طلب کی یہ شان ہونا چاہیئے تھی ؎

اے برادر بے نہایت در گہیست
ہرچہ بروے می رسی بروے مایست

مگر آج کل طلب دنیا کے ساتھ بعینہ یہ معاملہ ہو رہا ہے کہ اس کی کسی حد پر بس نہیں کرتے لَا یَنْتَہِیْ اِرْبٌ اِلَّا اِلٰی اِرْبٍ۔ ایک کام کو ختم کرتے ہیں دوسرے میں لگ جاتے ہیں۔ ہزار روپیہ جمع ہو گئے تو دو ہزار کی فکر ہے۔ کسی کے پاس ایک لاکھ جمع ہیں تو وہ دو لاکھ کی تمنا کر رہا ہے۔ بس اس مردار کو یوں سمجھ لیا ہے کہ ؎

بحریست بحر عشق کہ ہیچش کنارہ نیست
آں جا جز اینکہ جاں بسپارند چارہ نیست

چنانچہ آج اس پر فخر ہوتا ہے کہ ہم تو دنیا میں کھپ گئے ہیں ہم کو سوائے کمانے کے اور کوئی دھندا نہیں۔ ایک کہتا ہے کہ مجھ کو اتنا نفع ہوا۔ دوسرا کہتا ہے کہ میرے پاس اتنا جمع ہے۔ تیسرا کہتا

ہے میرے پاس اتنی دکانیں ہیں اور ہر ایک کی اتنی آمدنی ہے ان باتوں کو فخر کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔

مولانا محمد یعقوب صاحبؒ فرماتے تھے کہ اس کی ایسی مثال ہے جیسے دو بھنگی آپس میں فخر کریں۔ ایک کہے کہ میں نے اتنے گندگی کے ٹوکرے کمائے دوسرا کہے میں نے تجھ سے زیادہ کمائے۔ یہ ہے دنیائے مذموم جس نے خداتعالیٰ سے غافل کر رکھا ہے۔ باقی دنیائے محمودہ کو منع نہیں کیا جاتا۔

جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جو کہ اعقل الناس ہیں اور صرف ہمارے ہی نزدیک نہیں ہم تو غلامانِ غلام ہیں ہم تو آپؐ کو اعقل الناس افضل الناس، اکمل الناس سب کچھ مانتے ہی ہیں لیکن آپؐ تو ایسے عاقل ہیں کہ کفار بھی آپؐ کا لوہا مان گئے بلکہ وہ حضورؐ کو ہم سے بھی زیادہ عاقل مانتے ہیں کیونکہ ہم تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو امداد الٰہی کی وجہ سے مقاصد میں کامیاب مانتے ہیں اور کفار یہ دیکھ کر کہ نورِ اسلام روز بروز بڑھتا جاتا ہے اس کو حضورؐ کی عقل و فہم کا ثمرہ سمجھتے ہیں۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے رسولؐ اس قدر عاقل تھے کہ ایسی تدبیریں کر گئے جس سے تمام عالم کو اسلام کا گرویدہ بنا دیا۔ تو جس چیز کو ہم قدرت نبویہ سے خارج اور تائید الٰہی کا ثمرہ سمجھتے ہیں، وہ اس کو حضورؐ کی عقل کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ تو اس طرح گویا کفار نے حضورؐ کو ہم سے بھی زیادہ عاقل سمجھا۔ تو وہ اعقل الناس فرماتے ہیں۔

کَسْبُ الْحَلَالِ فَرِیْضَۃٌ بَعْدَ الْفَرِیْضَۃِ

یعنی دنیا کی ضروری مقدار حاصل کرنے کو حضورؐ فرض فرمایا ہے

ہیں۔ آپ لوگ تو دنیا کے طلب کو محض واجب عقلی ہی کہہ رہے ہیں اور حضورؐ اس کو فرض شرعی فرماتے ہیں جس کے ترک پر عذاب آخرت ہوگا۔ غرض بقدر ضرورت کسب دنیا ممنوع نہیں البتہ اس کی محبت اور دل میں اس کی وقعت کرنا ممنوع ہے خواہ پیرایۂ مذمت ہی میں ہو

طلب جاہ

اسی لئے حضرت رابعہ نے فرمایا تھا قُوْمُوْا عَنِّیْ فَاِنَّكُمْ تُحِبُّوْنَ الدُّنْیَا۔ اس پر ان زاہدوں نے عرض کیا کہ حضرت ہم تو دنیا کی مذمت کر رہے ہیں۔ ہم محبّ دنیا کدھر سے ہو گئے۔ فرمایا مَنْ اَحَبَّ شَیْئًا اَکْثَرَ ذِکْرَہٗ جس کو جس چیز سے محبت ہوتی ہے وہ اس کا ذکر بہت کیا کرتا ہے تمہارے دل میں دنیا کی کچھ تو وقعت ہے جو اس کی مذمت کرنے بیٹھے کیونکہ قاعدہ یہ ہے کہ جس چیز کی دل میں کچھ بھی وقعت نہ ہو، اس کا ذکر مذمت سے بھی نہیں کیا جاتا۔

چنانچہ جب ہم لوگ مجلس میں بیٹھتے ہیں تو عہدہ داروں کی مذمت کرتے ہیں چمار کی مذمت نہیں کرتے کیونکہ چمار کی ہماری نظر میں کوئی وقعت نہیں اور عہدہ داروں کی وقعت ہے۔

یہاں ایک طالب علمانہ اشکال ہو سکتا ہے۔ شاید کسی طالب علم کے ذہن میں یہ اشکال آیا ہو۔ وہ یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی تو دنیا کی مذمت کی ہے تو کیا نعوذ باللہ حضورؐ کی نظر میں بھی اس کی وقعت تھی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ حضورؐ کی نظر میں تو اس کی وقعت نہ تھی مگر امت میں بعض لوگ اس کے رنگ و روپ پر فریفتہ ہونے والے

اور اس کی وقعت کرنے والے ضرور تھے۔ اس لئے آپ کو اس مذمت کی ضرورت ہوئی۔ اگر اُمت میں بھی کوئی اس کی وقعت کرنے والا نہ ہوتا تو حضورؐ کبھی بھی اس کی مذمت نہ فرماتے۔ چنانچہ پیشاب و پاخانہ کی مذمت آپؐ نے نہیں فرمائی کیونکہ اس سے سب کو نفرت ہے اور شراب کی مذمت فرمائی کیونکہ اس سے سب کو نفرت نہیں ہے بلکہ بعضے اس کے فریفتہ ہیں گو حضورؐ کی نظر میں یہ بھی پیشاب پاخانہ ہی کے مثل تھی مگر بعض افرادِ اُمت کی رغبت کی وجہ سے مذمتِ خمر کی ضرورت ہوئی۔

غرض دنیا کی آپؐ نے بضرورت مذمت فرمائی ہے اور جو لوگ حضرت رابعہ کے پاس حاضر تھے اُن کو کوئی ضرورت نہ تھی کیونکہ وہاں دنیا دار کون تھا سارے زاہد ہی جمع تھے۔ مگر زاہدین بعض دفعہ امراء سے اعراض کرنے اور اُن کے ہدایا واپس کرنے کا تذکرہ اس لئے کرتے ہیں تاکہ اپنا کمال ظاہر ہو۔ اس پر تفاخر مقصود ہوتا ہے۔ تو گو بظاہر اس تذکرہ میں دنیا کی مذمت ہی کی جاتی ہے مگر حقیقت میں یہ شخص طالبِ دنیا ہے کیونکہ طالب جاہ ہے اور طلب جاہ بھی طلب دنیا ہی ہے محقق اس مذمت سے بھی تاڑ لیتا ہے کہ اس کے دل میں دنیا کی وقعت ہے ؎

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
من اندازِ قدت را می شناسم

اعوذ باللہ کا اثر

غرض مذمتِ دنیا تین وجہ سے ہوتی ہے یا بغرض محمود یا بغرض

مذموم یا بلا فائدہ مذمت۔ بغرض محمود تو دین ہے جیسا کہ انبیاء علیہم السلام اور کاملین کے کلام میں دنیا کی مذمت ہے اور بغرض مذموم جیسے مذمت کر کے اپنا کمال ظاہر کرنا مقصود ہو یہ مذمت نہیں بلکہ حقیقت میں طلبِ دنیا ہے اور مذمت بلا فائدہ یہ گو طلبِ دنیا نہ ہو مگر محبت دنیا کی علامت ہے کیونکہ ؎

گر ایں مدعی دوست بشناختے
بہ پیکار دشمن نہ پرداختے

جس کو خدا تعالیٰ سے تعلق ہو جاتا ہے وہ محبوب کے ذکر میں مشغول ہوتا ہے بلا فائدہ دشمن کا ذکر نہیں کیا کرتا۔ غالباً حضرت رابعہ کے پاس والے بلا فائدہ مذمت کر رہے تھے۔ اس لیے اُن کو تنبیہ فرمائی۔ اسی اصل پر حضرت رابعہ کی یہ بھی عادت تھی کہ شیطان پر لعنت کبھی نہ کرتی تھیں اور یہ فرماتیں کہ میں دوست کا ذکر چھوڑ کر دشمن کا ذکر کیوں کروں۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ تلاوت قرآن کے وقت اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم بھی نہ پڑھا جائے جیسے بعض بزرگوں کی حکایت سے یہ شبہ ہو سکتا ہے۔

وہ حکایت یہ ہے کہ ایک بزرگ کسی دوسرے بزرگ کی زیارت کو گئے مگر دفعۃً سامنے حاضر نہیں ہوئے بلکہ حجرہ سے باہر ٹھہرے اور توقف کر کے یہ معلوم کرنا چاہا کہ کس شغل میں ہیں۔ اس وقت دوسرے بزرگ تلاوت قرآن کا قصد کر رہے تھے۔ حسب معمول اُنہوں نے اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم پڑھا اور فوراً ہی فرمایا کہ اے شیطان! میں تجھ سے پناہ اس واسطے نہیں چاہتا کہ میں تجھ سے کچھ ڈرتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ بدون حکم الٰہی کے تو کچھ نہیں کر سکتا مگر بوجہ امر الٰہی کے تجھ سے پناہ چاہتا ہوں کیونکہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے

فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ
إِنَّهُ لَيْسَ لَهُ سُلْطَانٌ عَلَى الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ
إِنَّمَا سُلْطَانُهُ عَلَى الَّذِيْنَ يَتَوَلَّوْنَهُ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِهِ مُشْرِكُوْنَ

اس میں حق تعالیٰ نے یہ بھی بتلا دیا کہ مومنین متوکلین پر شیطان کا قابو نہیں چل سکتا مگر پھر بھی سید المتوکلین صلی اللہ علیہ وسلم کو امر ہے کہ تلاوت قرآن کے وقت اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم کہہ لیا کیجئے کہ عبدیت اور عجز کا اظہار ہو کر ہم ایسے عاجز ہیں کہ بے حقیقت شے سے بھی پناہ چاہتے ہیں۔ یہ سن کر ان ذاکر بزرگ کو حیرت ہوگئی کہ اللہ اکبر ان کا کیسا عالی مقام ہے۔ سو اس حکایت کے اول جزو سے ترک تعوذ کا شبہ ہو سکتا تھا مگر اسی کے دوسرے جزو میں اس کا جواب بھی مذکور ہے۔

میں کہتا ہوں کہ ان بزرگ کو جو یہ حالت نصیب ہوئی کہ ایسے مقام پر پہنچ گئے جہاں شیطان سے بے خطر ہو گئے یہ بھی اعوذ باللہ پڑھنے ہی کا اثر تھا یعنی پہلے سے جو وہ اعوذ باللہ پڑھتے آتے ہیں اس کی برکت سے حق تعالیٰ نے یہ حالت عطا فرمائی کہ شیطان سے بے خوف ہو گئے اگر وہ ساری عمر سے اس کو نہ پڑھتے تو یہ حالت نصیب نہ ہوتی۔ تو اس کا بھی مقتضا یہی ہے کہ اس کی اور کثرت کریں۔

جیسے موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ ہے کہ ایک دفعہ ان کا گزر ایک پتھر پر ہوا جو بہت رو رہا تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے رونے کا سبب پوچھا تو کہنے لگا کہ جب سے میں نے یہ سنا ہے وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ کہ جہنم میں پتھر بھی جائیں گے اس وقت سے مارے خوف کے رو رہا ہوں۔ موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی کہ اے اللہ! اس کو جہنم میں نہ ڈالا

جائے۔ وحی نازل ہوئی کہ دعا قبول ہو گئی اُس کی تسلی کر دیجیے کہ اُس کو جہنم میں نہ ڈالا جائے گا۔ موسیٰ علیہ السلام نے اُس کو بشارت سنادی۔ بہت خوش ہوا اور رونا موقوف کر دیا۔ موسیٰ علیہ السلام آگے تشریف لے گئے۔ واپسی میں پھر اُس پر گزر ہوا تو دیکھا اب بھی رو رہا ہے۔ پوچھا اب کیوں روتا ہے۔ کہا اے موسیٰ اور ونے ہی کی بدولت تو یہ بشارت نصیب ہوئی تھی تو جس چیز سے مجھے یہ دولت ملی اُسے کیوں کر چھوڑ دوں!

اسی طرح حضرت جنیدؒ کو کسی نے دیکھا کہ تسبیح ہاتھ میں لئے ہوئے ہیں۔ کہا حضرت آپ کو تسبیح کی کیا ضرورت ہے؟ آپ تو کامل و منتہی ہیں آپ کے تو رگ و پے میں ذکر سرایت کر چکا ہے۔ فرمایا تسبیح ہی کی بدولت تو یہ حالت حاصل ہوئی ہے تو کیا ایسے رفیق کو چھوڑ دوں، جس سے یہ دولت ملی۔ سبحان اللہ! خوب فرمایا۔ اہلِ صحو اس کی حقیقت سمجھتے ہیں۔ وہ اس میں سہو نہ کریں گے گو اہلِ سکر یہی کہتے ہیں کہ ہم کو تسبیح کی کیا ضرورت ہے ــــــ!

خیر یہ جواب تھا درمیان میں ایک شبہ کا بطور جملہ معترضہ کے۔ اب پھر عود کرتا ہوں اصل مضمون کی طرف۔ وہ یہ کہ بزرگوں نے بے فائدہ باتوں سے یہاں تک احتراز کیا ہے کہ حضرت رابعہ بے ضرورت شیطان پر بھی لعنت نہ کرتی تھیں پھر دنیا کی مذمت بے فائدہ کو وہ کیسے گوارا کرتیں۔

تکرار کی ضرورت

اسی لئے میں نے کہا تھا کہ دین کے ساتھ ہم دنیائے مذموم کا ذکر بھی کرنا نہیں چاہتے البتہ کبھی کبھی دنیائے محمودہ کا ذکر کر دیتے ہیں۔ بس دنیا کے لئے اتنا ہی فخر کافی ہے۔ باقی وہ اس قابل تو ہے ہی نہیں کہ اس

کا انفراداً ذکر کیا جائے کیونکہ وہ ہیچ اور لاشے ہے۔ اور اس مضمون کو عجیب نہ سمجھو کیونکہ قوی کے سامنے ضعیف شے بے حقیقت ہی ہوتی ہے۔ اسی طرح آخرت کے سامنے دنیا بے حقیقت ہے جو انفراداً تو کسی طرح ہرگز قابل ذکر ہے ہی نہیں۔ اور گو یہ مضمون پرانا ہے مگر میں کہہ چکا ہوں کہ پرانا ہونے سے مضمون بے وقعت نہیں ہو سکتا۔

اس پر شاید یہ سوال ہو کہ مضمون تو بے وقعت نہیں مگر اس کے بیان کی ضرورت کیا ہے کیونکہ یہ تو بارہا کا سنا ہوا ہے پھر تکرار فضول ہے میں کہتا ہوں کہ ہر چیز کا تکرار فضول اور بے ضرورت نہیں ہوتا۔ اس کی مثال میں یہ دیا کرتا ہوں کہ جیسے کھانا کھایا کرتے ہیں جو ہر دن مکرر ہوتا ہے بلکہ دن میں چار دفعہ ہوتا ہے۔ چنانچہ اول تو صبح ہی یار دوست جمع ہو کر چائے نوشی کرتے ہیں جو بقول حضرت مولانا دیوبندی ثقہ لوگوں کی بھنگ ہے۔ تو صبح ہی یہ بھنگ یعنی چائے اڑائی جاتی ہے جس کے ساتھ بسکٹ اور انڈے وغیرہ بھی ہوتے ہیں جو خاصی غذا ہے۔ پھر دوپہر کو اور اس کے بعد شام کو کھانا کھایا جاتا ہے۔ پھر رات کو دودھ یا چائے پی کر سوتے ہیں۔ اور چائے کو میں نے کھانا اس لئے شمار کیا کہ اگر یہ نہ ہو تو ایسی بے چینی ہوتی ہے گویا کھانا ہی نہیں کھایا۔

جیسا مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی حکایت ہے کہ آپ کے یہاں ایک بنگالی مہمان ہوا تھا۔ مولانا گھر والوں کو کھانا کھلانے کی تاکید فرما کر مدرسہ وغیرہ میں چلے گئے۔ واپسی پر مہمان سے پوچھا کہ آپ نے کھانا کھا لیا۔ کہنے لگے نہیں۔ مولانا گھر میں آ کر ناخوش ہونے لگے۔ گھر والوں نے کہا ہم تو کھانا کھلا چکے۔ مولانا کو حیرت ہوئی۔ سوچنے سے

یہ بات سمجھے کہ یہ لوگ چاول کو کھانا کہتے ہیں۔ پوچھا تو معلوم ہوا کہ روٹی گئی تھی چاول نہ تھے۔ وہ لوگ چاول ہی کو کھانا کہتے ہیں۔

اسی طرح جب چائے کے بدون کھانے سے قناعت نہیں ہوتی تو اُن کا کھانا چائے ہی ہوئی۔ اس طرح سے چار بار کھانا کھاتے ہیں۔ غرض کھانے کی ضرورت ہمیشہ ہوتی ہے۔ تکرار کی وجہ سے کوئی اُس کو بے ضرورت نہیں کہتا۔ نیز نئی شادی والے سوچیں کہ وہ روز روز بیوی کے پاس کیوں لیٹتے ہیں۔ چاہئے کہ ہر دن نئی شادی کیا کریں۔ ایک دن کے بعد پھر پہلی بیوی کے پاس نہ جایا کریں کیونکہ اب تو وہ مکرر ہے مگر یہاں تو حالت یہ ہے کہ بیوی سے مل کر اُس کے پاس سے اُٹھنے کو جی نہیں چاہتا ——،

اللہ —— ایک ادنیٰ سے جمال سے تو سیری نہ ہو اور حضرتِ حق سے سیری ہو گئی کہ اُن کے احکام ایک دفعہ سُن کر پھر بے ضرورت ہو گئے۔ شاید تم یہ کہو کہ یہاں تو بار بار شوق بڑھتا ہے اور وہاں کیا بڑھتا ہے؟ ارے جن پر حضرت حق کی محبت کا غلبہ ہے اُن سے پوچھو کیا بڑھتا ہے۔ اسی کی تو شکایت ہے کہ ہم کو حضرتِ حق کے ساتھ تعلق نہیں۔ جن کو تعلق ہے اُن کی تو یہ حالت ہے ؎

دیدہ از دیدنش نگشتے سیر   ہمچناں کز فرات مستسقی

اور فرماتے ہیں ؎

دلآرامے دربر دلآرام جوئے
لب از تشنگی خشک دربر طرف جوئے

نہ گویم کہ بر آب قادر نیند
کہ بر ساحلِ نیل مستسقی اند

اور یہاں تو انکشاف جمال ایک حالت اور ایک حد پر ختم بھی ہو جاتا ہے مگر پھر بھی اس سے سیری نہیں ہوتی۔ تو جہاں انکشاف ہر دم بڑھتا رہتا ہے وہاں کیا حال ہوگا۔ جمالِ حق کے انکشاف کی تو یہ حالت ہے ؂

نہ گردد قطع ہرگز جادۂ عشق از دویدنہا
کہ می بالد بخود ایں راہ چوں تاک از بریدنہا

اور اُن کے جمال کی یہ شان ہے ؂

نہ حسنش غایتے دارد نہ سعدی را سخن پایاں
بمیرد تشنہ مستسقی و دریا ہمچناں باقی

اسی لئے ایک بزرگ فرماتے ہیں ؂

قلم بشکن سیاہی ریز کاغذ سوز و دم درکش
حسن ایں قصۂ عشق است در دفتر نمے گنجد!

بلکہ محققین کا قول ہے کہ ترقیٔ معرفت جنت میں بھی ختم نہ ہوگی، وہاں بھی ترقی ہوتی رہے گی۔ حتیٰ کہ بعض اہلِ حال کا قول ہے کہ جنت میں ایک جماعت ہوگی جو نہ قصور پر توجہ کریں گے نہ حوروں پہ بلکہ وہ ہر دم اُدنِیْ اُدنِیْ کہیں گے کیونکہ وہاں انکشاف متزائد ہے۔ اس لئے ہر تجلّی کے بعد دوسری تجلّی کا اشتیاق ہوگا اور اُس کی لذّت کے سامنے حور و قصور سب ہیچ معلوم ہوں گے۔

اسرارِ دقیقہ

ہم نے دنیا میں خود بھی ایسے لوگ دیکھے ہیں جو حوروں کے طالب

نہ تھے محض خدا تعالےٰ کے طالب تھے۔ مگر یہ باتیں اُن لوگوں سے معلوم ہوتی ہیں جو کسی قدر مجذوب بھی ہوں یعنی جن پر جذب کا غلبہ ہو۔ عارفین کاملین ایسی باتیں نہیں ظاہر کرتے۔ اسی لئے عارف فرماتے ہیں ؎

رازِ درونِ پردہ ز رندانِ مست پرس
کیں حال نیست صوفیٔ عالی مقام را

وجہ یہ کہ صوفیٔ عالی مقام اپنے حال پر غالب ہوتا ہے اس لئے وہ ضبط کئے ہوئے رہتا ہے اسرار کو ظاہر نہیں کرتا۔ یا تو بوجہ غیرت کے اسرار پر۔ اُس وقت تو وہ یوں کہتا ہے ؎

غیرت از چشم برم روئے تو دیدن ندہم
گوش را نیز حدیثِ تو شنیدن ندہم

اور یا بوجہ مخاطب کے معاند ہونے کے۔ اُس وقت یوں کہتا ہے ؎

با مدعی مگوئید اسرارِ عشق و مستی
بگزار تا بمیرد در رنج خود پرستی

اور یا اس لئے ظاہر نہیں کرتا کہ مخاطب میں اسرارِ دقیقہ کے سمجھنے کی اہلیت نہیں جیسے مولانا فرماتے ہیں ؎

نکتہا چوں تیغِ فولاد ست تیز   چوں نداری تو سپر واپس گریز

سپر سے مراد فہم ہے ؎

پیشِ ایں الماس بے اسپر میا   کز بریدن تیغ را نبود حیا

اس مقام پر مولانا نے اُن لوگوں کی بہت خبر لی ہے جو بے دھڑک ہر ایک کے سامنے اسرار کو ظاہر کرتے پھرتے ہیں، چاہے مخاطب میں فہم ہو یا نہ ہو۔ فرماتے ہیں ؎

ظالم آں قومے کہ چشماں دوختند
از سخنہا عالمے را سوختند

غرض مولانا نے سامع اور متکلم دونوں کا انتظام کیا ہے کہ اگر متکلم مغلوب الحال نہ ہو جب تو اُس کو تنبیہ کی ہے کہ ہر ایک کے سامنے اسرار کو ظاہر نہ کرو۔ اور اگر وہ مغلوب الحال ہو تو سامع کو تنبیہ ہے کہ اسرار دقیقہ کو نقل نہ کرو نہ خود اُن میں تامل کرو۔ اسی لیے ہمارے حضرات تو ان باتوں کی رسید ہی نہیں دیتے گو وہ خود رشید ہی ہوں۔ اور اگر بعضے کسی وقت ظاہر بھی کرتے ہیں تو ہر اک کے سامنے نہیں ظاہر کرتے بلکہ مجمع خاص میں کچھ کہہ دیتے ہیں۔

چنانچہ ایک بار مولانا فضل الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس میں حاضر تھا۔ تنہائی کا وقت تھا خاص مجمع تھا۔ ہر ایک کو آنے کی اجازت نہ تھی جب کوئی آتا تو اس پر ڈانٹ پڑتی۔ ضرورت ہے ایسے بزرگوں کی بھی جو کبھی کبھی مریدوں کو ڈانٹ دیا کریں۔ بعضے تو بہت ہی سختی کرتے ہیں ایسی سزائیں اور قاعدے مقرر کرتے ہیں جیسے سلاطین کے یہاں انتظام ہوتا ہے یہ تو اچھا نہیں کم خلافِ سنت ہے۔ اور بعضے بہت نرمی کرتے ہیں کہ مریدوں کو کسی بات پر تنبیہ ہی نہیں کرتے۔ یہ بھی زیبا نہیں۔ بس نرمی اور گرمی دونوں چاہئیں، اس سے اعتدال ہو جائے گا۔

جیسے ایک بزرگ سے کسی سانپ نے بیعت کر لی تھی۔ اُنہوں نے اُس سے یہ عہد لیا کہ کسی کو ڈسنا نہیں۔ جانوروں نے جو دیکھا کہ یہ کسی کو کچھ نہیں کہتا تو نڈر ہو کر سب نے اُس کو مارنا اور تنگ کرنا شروع کیا۔ چند روز کے بعد وہ بزرگ کے پاس آیا تو دیکھا بہت ہی بُری حالت میں ہے پوچھا

کیا حال ہے؟ کہا حضور نے کاٹنے سے منع کیا تھا۔ جانوروں کو جو یہ خبر لگی تو اب سب مجھے تنگ کرنے لگے۔ فرمایا میں نے کاٹنے ہی سے تو منع کیا ہے پھنکارنے سے تو نہیں منع کیا۔ بس اب سے جو جانور پاس آئے فوراً پھنکار دیا کرو، وہ بھاگ جائے گا۔ اُس روز سے غریب کو چین ملا۔ اسی طرح بزرگوں کو بھی چاہئے کہ کبھی کبھی پھنکار دیا کریں۔

غرض اس وقت ایسی تنہائی تھی کہ حضرت مولانا نے ایسی خاص باتیں فرمائیں جو لوگوں کے سامنے کہنے کی نہ تھیں۔ منجملہ اُن کے ایک یہ بات بھی فرمائی کہ جب ہم جنت میں جائیں گے (گویا اس کا تو اطمینان تھا) اور حوریں ہمارے پاس آئیں گی تو ہم کہہ دیں گے کہ بی اگر قرآن سناؤ تو ہمارے پاس بیٹھو ورنہ بس جاؤ۔

مگر مولانا نے یہ بات یہاں کی حالت کے اعتبار سے فرمائی جس کو میں غلبۂ حال پر محمول کرتا ہوں۔ اس وقت مولانا کی نظر اس پر نہ تھی کہ جنت میں معرفت ایسی کامل ہو گی کہ حور کی طرف التفات کرنے سے بھی توجہ الی الحق میں کمی نہ آئے گی۔

جنتیوں کی اقسام

عارفین کاملین حور سے بھی نظر خدا تعالیٰ ہی پر کریں گے۔ اسی کو عارف فرماتے ہیں ؎

حسنِ خویش از روئے خوباں آشکارا کردہٗ
پس بچشم عاشقاں خود را تماشا کردہٗ

اس کی ایسی مثال ہے کہ محبوب نے ایک وقت مقرر کر دیا ہو کہ اس وقت میں بلا واسطہ رویت ہو گی اور دوسرے وقت میں ایک آئینہ

دے دیا کہ ہم کو اس میں سے دیکھو۔ اسی طرح حوریں عارفین کاملین کے لئے مرآۃ جمالِ حق ہوں گی۔

تو جنت میں دو قسم کے لوگ ہوں گے۔ ایک کاملین وہ تو دونوں صورتوں میں جمالِ حق ہی کا مشاہدہ کریں گے۔ دوسرے ناقصین وہ ایک رُخے ہوں گے کہ صرف اَرِنِی اَرِنِی پکاریں گے۔ ان کو کسی چیز کی طرف توجہ نہ ہوگی۔ مگر یہ ناقصین کاملین کے سامنے ناقص ہیں ہم سے آپ سے تو بہت بڑھے ہوئے ہیں ؎

آسماں نسبت بعرش آمد فرود
لیک بس عالی ست پیشِ خاکِ تود

حُسنِ حق

غرض خدا تعالیٰ کے شوق میں مست ہونا جنت میں تو ہو ہی گا ہم نے تو یہاں بھی ایسے بزرگ دیکھے ہیں جو حُسن و جمالِ حق میں ایسے مست تھے کہ حوروں کی طرف بھی التفات نہ کرتے تھے مگر تم نے حُسنِ حق کو سمجھا کیا ہے حق تعالیٰ شانہٗ کا حُسن کوئی چراغ جیسی روشنی نہیں ہے۔ بہت لوگ یہی سمجھے ہوئے ہیں، یہ غلط ہے۔ انہوں نے حق تعالیٰ کے حُسن کی قدر ہی نہیں کی وہ حُسن تو ایسا ہے کہ اُس کی حقیقت یہاں سمجھ میں آ ہی نہیں سکتی اسی لئے بزرگوں کا ارشاد ہے۔

مَاخَطَرَ بِبَالِكَ فَهُوَ هَالِكٌ وَاللّٰهُ اَجَلُّ مِنْ ذٰلِكَ۔

کہ اُس وقت جو کچھ دل میں انوار و تجلیات نظر آتے ہیں، وہ سب ہالک و فانی ہیں۔ حق تعالیٰ ان سب سے بالا و برتر ہیں۔

یہاں سے ان لوگوں کی غلطی معلوم ہو گئی جو انوارِ قلب کو یا انوارِ ذکر

کو نورِ حق سمجھ لیتے ہیں۔ اس غلطی میں بہت لوگ مبتلا ہیں۔ ایک سالک تجلیٔ روح کو تیس برس تک تجلی ذاتِ حق سمجھتے رہے۔ بعد میں تنبیہ ہوئی تو اس سے توبہ کی۔ غرض یہاں حسن و جمالِ حق کی حقیقت اور کیفیت معلوم نہیں ہو سکتی اور حقیقت تو آخرت میں بھی معلوم نہ ہوگی مگر وہاں انکشاف صحیح ہوگا۔ اسی کو سعدی فرماتے ہیں ؎

اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم
وز ہرچہ گفتہ اند و شنیدیم و خواندہ ایم
دفتر تمام گشت و بپایاں رسید عمر
ما ہمچناں در اوّلِ وصفِ تو ماندہ ایم

مشاہدۂ حق

ہاں جب انکشاف کا وقت آئے گا اُس وقت یوں ترنّم کیجئے گا ؎

بے حجابانہ درآ از درِ کاشانۂ ما
کہ کسے نیست بجز دردِ تو در خانۂ ما

اس میں وجہ بھی بتلا دی کہ اس وقت بے حجابانہ رویت کی درخواست اس لئے کریں گے کہ اس وقت غیر دل میں نہ ہوگا اور اب غیر دل میں گھسا ہوا ہے اور حق تعالیٰ کی تجلی غیر کے ساتھ کسی دل پر نہیں ہو سکتی۔ اُس کی تو شان یہ ہے ؎

چوں سلطانِ عزّت علم برکشد
جہاں سر بجیبِ عدم در کشد

اور اس سے معلوم ہو گیا کہ مانع ادھر سے ہے اُدھر سے مانع کوئی نہیں اسی لئے حق تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے لَن تَرَانِی فرمایا تھا کہ تم مجھے نہیں دیکھ سکتے۔ لَن اُرٰی نہیں فرمایا کہ میں نظر نہیں آ سکتا۔ وہ تو ہر وقت نظر

اُسکتے ہیں مگر یہاں ہماری آنکھوں میں تحمل دیدار کی طاقت نہیں ۔

شد ہفت پردہ برچشم ایں ہفت پردۂ چشم

بے پردہ ورنہ ماہے چوں آفتاب دارم

بس یہاں پر تو اُن کے دیکھنے کی سب سے اکمل یہ صورت ہے کہ قرآن کے اندر اُن کے جمال و جلال کا مشاہدہ کر لیا جائے ۔ اس پر مجھے مخفی کا شعر یاد آتا ہے ۔

در سخنِ مخفی منم چوں بوئے گل در برگ گل

ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بیند مرا

اسی طرح گویا دنیا کے اعتبار سے حق تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ ع

ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بیند مرا

ابھی قرآن[1] پڑھا گیا تھا ۔ اُس وقت سامعین کی کیا حالت تھی ۔ اگر کوئی یہ کہے کہ یہ اثر لہجہ اور آواز کا تھا تو میں کہتا ہوں کہ ذرا انہی قاری صاحب کو کافیہ دے دیا جائے اور اُن سے کہیے کہ اس کو اسی لہجہ کے ساتھ پڑھیں یقیناً خاک بھی اثر نہ ہوگا ۔ یہ شہادت کافیہ ہے اس امر کی کہ دراصل قرآن کا اثر ہے البتہ لہجہ اور آواز سے بھی اُس میں کچھ خوبی آجاتی ہے دوسرے لہجہ اور آواز کا اثر ایک دو دفعہ کے بعد نہیں رہا کرتا اور قرآن میں ایسی حلاوت ہے کہ جتنا بھی سُنا جائے اُس سے سیری ہی نہیں ہوتی ۔ کسی حسین صورت حسین صورت سے ایک عمدہ سی غزل سنیئے پہلی بار تو اثر ہوگا مگر تکرار میں جی

---

[1] وعظ شروع ہونے سے پہلے بعض قراء نے کچھ قرآن جلسہ میں پڑھا تھا ۱۲

بھر جائے گا کیونکہ وہ کلام انسانی ہے۔ جب متکلم فانی ہے تو اُس کے کلام کی لذّت بھی فانی ہے اور قرآن کا جا ہے کتنا ہی تکرار کیا جائے اُس سے جی نہیں بھرتا بشرطیکہ پڑھنے والا بے تکلّف اور صحیح پڑھتا ہو کیونکہ یہ خدا تعالیٰ کا کلام ہے جیسے وہ خود باقی ہیں ایسے ہی اُن کے کلام کی لذّت بھی باقی ہے۔ لَا یَخْلُقُ مِنْ کَثْرَۃِ الرَّدِّ۔

گو قرآن یعنی کلامِ لفظی بدرجہٗ کلامِ نفسی بنا بر تحقیق متکلمین حق تعالے کی صفت ذاتیہ نہ ہو مگر ذاتِ حق سے اس کو ایسی نسبت ہے جیسے شعاع کو آفتاب سے۔ پس ایک قرص آفتاب ہے کہ وہ اُس کی ذات ہے، دوسرے اس کی صفتِ نور جو اُس کی ذات کے ساتھ قائم ہے۔ تیسری شعاع، چوتھی زمین منور، یہ شعاع نہ نور قائم بالشمس کی طرح ہے نہ شمس سے متصل ہے اور نہ زمین کی طرح شمس سے بالکل منفصل۔

اسی طرح کلامِ لفظی نہ صفات ذاتیہ کی طرح ذات کے ساتھ قائم اور نہ دوسرے حوادث کی طرح بعید التعلق۔ بلکہ باوجود حادث ہونے کے دوسرے حوادث سے زیادہ شدید التعلق۔ اور اسی شدّت تعلق کے سبب اس کو کلام اللہ کہا جاتا ہے۔ دوسرے کلامِ حادث کو کلام اللہ نہیں کہا جا سکتا۔ اور اسی جگہ سے بعض متکلمین نے اس کلامِ لفظی کو بھی قدیم کہہ دیا ہے گو ظہور اس کا حادث ہو۔ اور مسئلہ دقیق ہے بلا ضرورت اس میں خوض کرنا بھی جائز نہیں۔ باقی میرا مقصود دونوں قولوں پر حاصل ہے کہ ان الفاظ میں ایک خاص شان ہے جس سے اُس میں کہنگی نہیں آتی۔

پس جب قرآن کے الفاظ سے جی نہیں بھرتا تو اُس کے معانی سے کیونکر سیری ہو سکتی ہے ور اُس پر عمل کرنے کے انوار سے کیونکہ جی بھر

سکتا ہے۔ واللہ! جو لوگ انوار معانی قرآن سے اور انوار اعمال سے مشرف ہو چکے ہیں اُن کو کبھی سیری نہیں ہوتی اور نہ اُن کو کسی حد پر چین ہے۔ مگر مزہ یہ ہے کہ اس کے مقابلہ میں اُن کو بڑے چین کے ساتھ بھی چین نہیں یعنی اُن کو اس بے چینی میں ایسا چین ہے کہ ہفت اقلیم کی سلطنت اُس کے سامنے حقیر ہے۔ غرض جب قرآن شریف کی یہ حالت ہے تو اُس کے مضامین سے سیری کیونکر ہو سکتی ہے اور احکام الٰہی کے ذکر سے جی کس طرح بھر سکتا ہے۔ لہٰذا گو یہ مضمون پُرانا سنا ہوا ہے مگر اس کا تکرار بے فائدہ نہیں ہے بلکہ قند مکرر کا سا تکرار ہے

آیت کی تفسیر

دوسرے اگر پُرانی بات چھوڑنے کے قابل ہے تو یہ آپ کا شبہ بھی تو پُرانا ہے۔ آپ ہی اس شبہ کو جانے دیجئے۔ جب میں قنوج گیا تھا، تو وہاں ایک محلہ والوں نے اپنے محلہ کا نام اس لئے بدل دیا تھا کہ پہلے نام میں اُس کی قومیت ظاہر ہوتی تھی۔ اُس کو چھپانے کے لئے نام بدلا گیا۔ میں نے اس پر ایک وعظ کہا تھا۔ دوبارہ جب پھر گیا تو وعظ میں پھر اس کا ذکر ہوا۔ اُس محلہ کے لوگوں نے کہا کہ ہمارے پیچھے پڑ گئے۔ پہلے بھی وعظ میں ہم کو بُرا بھلا کہا تھا۔ اب پھر وہی کہا۔ ایک صاحب نے جواب دیا کہ تم نے خود ہی کہلوایا ہے اُس نے نہیں کہا۔ اگر تم اوّل ہی اصلاح کر لیتے تو دوبارہ کہنے کی کیوں نوبت آتی۔ اسی طرح آپ کہلوا رہے ہیں۔ اگر آپ پہلے مضامین کو سُن کر اپنی اصلاح کر لیتے تو مجھے وہی مضمون دوبارہ کہنا نہ پڑتا ——،

یہ تو تمہید تھی۔ اب میں اصل مقصود شروع کرتا ہوں۔ یہ آیت جو میں نے اس وقت تلاوت کی ہے اتفاق سے جب میں جلسہ میں آیا، تو قاری یہی آیت پڑھ رہا تھا۔ اسی وقت میرے خیال میں آیا کہ آج اسی آیت کا بیان کروں گا۔ گویا حق تعالیٰ نے فعلاً اس آیت کے بیان کو ترجیح دے دی اس آیت میں حق تعالیٰ نے دنیائے مذموم سے منع فرمایا ہے اور آخرت کی ترغیب دی ہے مگر عنوان دونوں جگہ ایسا عجیب ہے جس سے دنیا و آخرت دونوں کی اصل حقیقت تھوڑے سے لفظوں میں ظاہر فرما دی واقعی خدا تعالیٰ کے سوا ایسا کوئی نہیں کر سکتا۔ اس آیت سے پہلے دنیا کا بے حقیقت ہونا ایک مثال سے ظاہر فرمایا ہے۔

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ فَاَصْبَحَ هَشِيْمًا تَذْرُوْهُ الرِّيٰحُ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرًا

اس کے بعد یہ آیت ہے المال والبنون زینۃ الحیٰوۃ الدنیا کہ مال اور اولاد حیاتِ دنیا کی زینت و آرائش ہیں اور یہ بات سب کو معلوم ہے کہ زینت ہر چیز کی اس کے تابع ہوا کرتی ہے اور جب تابع ہے تو اس کا مرتبہ اصل سے کم ہوا۔ اور متبوع کا بے حقیقت ہونا پہلے یعنی اوپر کی آیت میں بیان ہو چکا ہے۔ اس سے خود ہی معلوم ہو گیا کہ اس کا تابع کیسا کچھ ہو گا۔ تو ایک لفظ زینت سے اس قدر ان کی بے وقعتی کو واضح فرمایا ہے عجیب فصاحت و بلاغت ہے۔

اس کے علاوہ اس میں ایک اور بھی نکتہ ہے۔ وہ یہ کہ آرائش اور زینت کی چیزیں اکثر فضول اور زائد اور بے ضرورت ہوا کرتی ہیں۔ تو حق

تعالیٰ نے مال و بنون کا بے حقیقت و بے ضرورت ہونا لفظ زینت سے ظاہر فرمادیا ہے کہ یہ سب زینت ہی زینت ہے اور کچھ نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جو مال و اولاد تم کو مطلوب ہے جس میں آخرت کو چھوڑ کر تم منہمک ہو رہے ہو، وہ بے ضرورت اور زائد چیزیں ہیں کیونکہ مال سے مقصود رفع ضرورت ہے اور رفع ضرورت سے مطلوب بقاء النفس ہے۔ تو اصل مقصود کے لئے یہ واسطہ در واسطہ ہے۔ پھر ایسے واسطہ کو مطلوب بنا لینا حماقت نہیں کہ رات دن اسی میں منہمک ہو۔ اور بقاء نفس جو مطلوب ہے وہ بھی بے حقیقت ہے کیونکہ اس کا بقاء چند روزہ ہے جو قابل اعتبار نہیں غرض مال تو مطلوب بنانے کے قابل ہرگز نہیں اور اولاد تو اس سے بھی گھٹیا ہے کیونکہ وہ تو بقاء نفس کے لئے بھی نہیں صرف بقاء نوع کے لئے مطلوب ہے اور بقاء نوع کے لئے اسی کی کیا ضرورت ہے کہ آپ ہی کے اولاد ہو۔ اگر میرے اولاد نہ ہوئی اور آپ کے دو ہو گئیں تو اس سے بھی بقاء نوع ہو سکتا ہے۔ دوسرے بقاء نوع کی آپ کو کیا فکر ہے۔ جب تک حق تعالیٰ کو انسان کی آبادی دنیا میں مطلوب ہے اس وقت تک وہ اس کی تدبیر کریں گے۔ آپ اس میں رائے دینے والے کون ہیں کہ خواہ مخواہ آپ کی نوع باقی ہی رہے اور وہ بھی اس صورت سے کہ آپ ہی کے اولاد ہو۔

پردہ اور تعلیم

یہاں ایک بات قابلِ تنبیہ ہے۔ وہ یہ کہ اس جگہ حق تعالیٰ نے بنون کو زینت حیٰوۃ الدنیا بتلایا ہے بنات کو بیان نہیں فرمایا۔ اس کی وجہ یا تو یہ ہے کہ بنات کو خود تم نے بھی بے حقیقت سمجھ رکھا ہے۔ کیونکہ لوگوں کو لڑکوں سے زیادہ خوشی ہوتی ہے اور لڑکیوں کو تو عموماً وبال سمجھتے ہیں،

تو تمہارے نزدیک وہ کیا خاک زینت دنیا ہوں گی۔

دوسرا نکتہ بنات کے ذکر نہ کرنے میں یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے یہ بتلا دیا کہ بنات زینت دنیا بھی نہیں ہیں بلکہ محض زینت خانہ ہیں۔ اگر وہ بھی زینت دنیا ہوتیں تو حق تعالیٰ اُن کو بھی یہاں ذکر فرماتے۔ پس صرف بیٹوں کو زینت دنیا فرمانا اور بنات کو ذکر نہ فرمانا اس کی دلیل ہے کہ لڑکیاں دنیا کی بھی زینت نہیں ہیں کیونکہ عرفاً زینت دنیا وہ سمجھی جاتی ہے جو منظر عام پر زینت بخش ہو اور وہ ایسی زینت نہیں کہ تم اُن کو ساتھ لئے لئے پھرو اور سب دیکھیں کہ ان کی اتنی لڑکیاں ہیں اور ایسی آراستہ پیراستہ ہیں بلکہ وہ محض گھر کی زینت ہیں۔

یہاں سے پردہ کی دلیل کی طرف اشارہ نکل آیا۔ دوسرے لغت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ عورتوں کا پردہ کرایا جائے۔ کیونکہ اردو میں عورت کو عورت کہتے ہیں جس کے معنی لغت میں ہیں چھپانے کی چیز تو اس کے ساتھ یہ کہنا کہ عورتوں کو پردہ نہ کراؤ ایسا ہے جیسا یوں کہا جائے کہ کھانے کی چیز کو نہ کھاؤ۔ پہننے کی چیز کو نہ پہنو اور اس کا لغو ہونا ظاہر ہے تو یہ قول بھی لغو ہے کہ عورتوں کا پردہ نہ کراؤ۔ اُن کو عورت کہنا خود اس کی دلیل ہے کہ وہ پردہ میں رہنے کی چیز ہیں۔

ایک ترقی یافتہ کہتے تھے کہ عورتیں پردے کی وجہ سے ترقی علمی سے رکی ہوئی ہیں۔ میں نے کہا، جی ہاں اسی واسطے تو ان چھوٹی قوموں کی عورتیں جو پردہ نہیں کرتیں بہت تعلیم یافتہ ہوگئی ہیں۔ یہ جواب سن کر وہ خاموش ہی تو رہ گئے۔ اصل بات یہ ہے کہ تعلیم یافتہ یا غیر تعلیم یافتہ ہونے میں پردہ یا بے پردگی کو کوئی دخل نہیں بلکہ اس میں بڑا دخل توجہ کو ہے۔ اگر کسی قوم کو عورتوں

کی تعلیم پر توجہ ہو تو وہ پردہ میں بھی تعلیم دے سکتے ہیں ورنہ بے پردگی میں بھی کچھ نہیں ہو سکتا بلکہ غور کیا جائے تو پردہ میں تعلیم زیادہ ہو سکتی ہے کیونکہ تعلیم کے لئے یکسوئی اور اجتماعِ خیال کی ضرورت ہے اور وہ گوشۂ تنہائی میں زیادہ حاصل ہوتی ہے۔ اسی واسطے مرد بھی مطالعہ کے لئے گوشۂ تنہائی تلاش کیا کرتے ہیں جیسا کہ طلباء کو اس کا اچھی طرح اندازہ ہے پس عورتوں کا پردہ میں رہنا تو علوم کے لئے معین ہے نہ کہ مانع۔ نہ معلوم لوگوں کی عقلیں کیا ہوئیں جو پردہ کو تعلیم کا منافی سمجھتے ہیں۔

ہاں علومِ تجارت اور علومِ تجارت کے لئے سیر و سیاحت کی البتہ ضرورت ہے مگر عورتیں ناقص العقل اور کم حوصلہ ہیں۔ اُن کے لئے سیر و سیاحت سے تجربہ میں حقیقی یعنی اخلاقی ترقی نہ ہوگی بلکہ آزادی اور شرارت بڑھے گی۔ اسی لئے شریعت نے عورتوں کے ہاتھ میں طلاق نہیں دی کیونکہ یہ ایسی کم حوصلہ ہیں کہ ذرا سی بات پر آپے سے باہر ہو جاتی ہیں۔ مرد تو برسوں میں کسی بہت ہی بڑی بات پر طلاق کا قصد کرتا ہے وہ بھی ہزاروں میں سے ایک ورنہ زیادہ تو ایسے ہی مرد ہیں جو عورت کی بدتمیزیوں پر صبر کرتے ہیں اور اگر عورتوں کے ہاتھ میں طلاق ہوتی تو یہ تو ہر مہینہ شوہر کو طلاق دے کر نئی شادی کیا کرتیں۔ پس عورتوں کے لئے یہی سیر و سیاحت کافی ہے کہ اپنے گھر میں چل پھر لیا کریں۔ جن تجربوں کی اُن کو ضرورت ہے وہ گھر میں رہ کر ہی اُن کو حاصل ہو سکتے ہیں۔

تعلق مع اللہ کا اثر

بلکہ میں کہتا ہوں نظرِ حقیقت بیں سے دیکھیے تو مردوں کو بھی اس کی ضرورت نہیں۔ اگر سیر و تماشا چاہتے ہو تو وہ بھی آپ کے اندر موجود ہے

دل کی آنکھوں سے دیکھ لو، تم کو اپنے ہی اندر ایسا تماشا نظر آئے گا کہ دنیا کے پھول پھلواریوں سے استغنا ہو جائے گا۔

ستم ست اگر ہوست کشد کہ بسیر سرو سمن در آ
تو زغنچہ کم ندمیدہ درِ دل کشا بچمن در آ

چوں کوئے دوست ہست بصحرا چہ حاجت است
خلوت گزیدہ را بہ تماشا چہ حاجت است

جس کو یہ دولت مل گئی ہے اُس کو تو اس کی بھی ضرورت نہیں رہی کہ آنکھوں سے کچھ نظر آتا ہو۔ وہ نابینائی کی حالت میں بھی خوش و خرم رہے گا بینا سے نابینا ہونے کے بعد مطمئن ہم نے کسی کو نہیں دیکھا مگر حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کو لوگوں نے ابھی دیکھا ہے۔ مولانا نابینائی کی حالت میں بھی ایسے مطمئن تھے جیسے بینائی کی حالت میں تھے۔ آخر مولانا میں کیا بات تھی۔ مولانا نبی تو نہ تھے، اُمتی ہی تھے۔ تو جو بات اُن کو حاصل تھی وہ آپ بھی حاصل کر سکتے ہیں یعنی تعلق مع اللہ۔ یہ وہ دولت ہے کہ اس کے بعد کسی سیر و تماشا کی ضرورت نہیں رہتی۔ یہ نہ سمجھا جائے کہ میں کشف و کرامت کو مولانا کی طرف منسوب کر رہا ہوں کہ مولانا کو نابینائی کی حالت میں بھی ویسا ہی نظر آتا تھا جیسا کہ بینائی کی حالت میں، اس لئے آپ مطمئن تھے ان حضرات کے سامنے کشف و کرامت کی حقیقت ہی کیا ہے۔ نہیں بلکہ مولانا کے اطمینان کا سبب محض تعلق مع اللہ تھا۔ اُن کو دنیا سے تعلق ہی نہ تھا اس لئے بینائی کے جاتے رہنے کا بھی کچھ غم نہ تھا بلکہ عجب نہیں کہ اس سے خوش ہوئے ہوں کہ پہلے اغیار پر نظر پڑتی تھی۔ اب محبوب کے سوا کسی پر نظر نہیں۔

افسوس! ان حضرات پر نادانوں کو یہ شبہ تھا کہ وہ شورش برپا کریں گے اس لئے ان کی سخت نگرانی چاہیئے۔ ہائے! شورش یہ کریں گے جن کو دنیا سے کچھ علاقہ ہی نہیں۔ شورش تو وہ کرے جس کو دنیا مطلوب ہو اور ان حضرات کی تو یہ حالت ہے کہ بے شورش کے بھی اگر ان کو کوئی ملک ملتا ہو تو اس سے بیزاری ظاہر کرتے ہیں، شورش کر کے تو ملک و حکومت یہی لیں گے۔

حضرت سیدنا عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ملک سنجر کے بادشاہ ملک نیمروز کا خط آیا تھا کہ میں ملک نیمروز کا ایک حصہ آپ کو خرچ خانقاہ کے لئے دینا چاہتا ہوں۔ اگر یہ حضرات طالبِ حکومت ہوتے، تو فوراً منظور کر لیتے۔ مگر آپ نے جواب میں تحریر فرمایا ؎

چوں چترِ سنجری رُخِ بختم سیاہ باد
در دل بود اگر ہوسِ ملکِ سنجرم

یعنی اگر میرے دل میں تیرے ملک کی ہوس تک بھی ہو تو خدا کرے میرا بخت سیاہ رو ہو جائے جیسا کہ تیرا چتر سیاہ ہے۔ اس زمانہ میں سلاطین کا چتر سیاہ ہوا کرتا تھا۔ آگے اس کے بے رغبتی کی وجہ بیان فرماتے ہیں ؎

زانگہ کہ یافتم خبر از ملکِ نیم شب
من ملکِ نیمروز بہ یک جو نمی خرم

کہ جب سے مجھے نیم شب یعنی آدھی رات کی بادشاہت ملی ہے اس وقت سے میں ملک نیمروز کو ایک جَو کے بدلے بھی نہیں خریدنا چاہتا (اس وقت ایک طرف سے آواز آئی کہ حضرت ادھر بھی رُخ کیجیے آواز

نہیں آتی۔ فرمایا کہ پھر ایک واعظ اور بلا لو جو اِدھر اُدھر والوں کو سنا دے گا۔ ہم کسی کے نوکر نہیں جو آپ کے گھمانے سے گھومتے رہیں۔ جب جی چاہے گا تو اُدھر بھی رُخ کر لیں گے اور اگر کسی کو آواز نہ پہنچتی ہو اور اس لئے بیٹھنا گراں ہو تو وہ اٹھ کر چلا جائے)

واللہ جس کو یہ دولت مل گئی ہو اس کو سلطنت کی ہوس نہیں رہ سکتی بلکہ وہ تو اس سے گھبراتا ہے کیونکہ اس سے تعلق مع اللہ میں تشویش اور تشتت پیدا ہوتا ہے۔ لوگ آج کل حضرات صحابہ کے قصوں کی بحث میں اوقات ضائع کرتے ہیں۔ مثلاً بعضے کہتے ہیں کہ حضرت علی کو اوّل خلیفہ کرنا چاہیے تھا۔ میں بقسم کہتا ہوں کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے دل سے پوچھا جائے وہ تو حضرات شیخین کے احسان مند ہوں گے کہ انہوں نے اُن کو مصیبت سے بچا لیا کیونکہ حضرات صحابہ کی خلافت شاہان اودھ کی سی بادشاہت نہ تھی کہ رات دن عیش اور مستیاں کرتے ہوں۔

وہاں تو ایسی بادشاہت تھی کہ ایک دن گرمی کی سخت دوپہر میں جب کہ لو چل رہی تھی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ تنہا جنگل کی طرف جا رہے تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے دُور سے دیکھا تو پہچان لیا کہ امیر المومنین ہیں۔ جب اُن کے گھر سے قریب ہوئے تو آواز دی کہ امیر المومنین اس وقت سخت

لہ اس وقت حضرت سیدنا عبد القادر رحمۃ اللہ علیہ کی حکایت کے اثر سے استغناء کا غلبہ زیادہ تھا نیز لہجہ بھی درخواست کا نامناسب تھا غالباً اس لئے ایسا جواب دیا ورنہ حضرت اکثر ایسی درخواست پر توجہ ضرور فرماتے ہیں ۱۲ منہ

گرمی اور لُو میں کہاں جا رہے ہیں - فرمایا، بیت المال کا ایک اونٹ ضائع ہو گیا ہے اُس کی تلاش میں جا رہا ہوں - اُنہوں نے عرض کیا کہ کسی خادم کو نہ بھیج دیا - فرمایا، قیامت میں تو سوال مجھ سے ہونا، خادم سے سوال نہ ہوتا عرض کیا پھر تھوڑی دیر توقف کر کے تشریف لے جائیے، ذرا گرمی کم ہو جائے فرمایا نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا - جہنم کی آگ اس سے بھی زیادہ گرم ہے - یہ کہہ کر اسی دھوپ اور لُو میں جنگل تشریف لے گئے - یہ سلطنت تھی -

ایک بار آپ منبر پر کھڑے ہوئے خطبہ پڑھ رہے تھے - خطبہ میں فرمایا اِسْمَعُوْا وَاَطِیْعُوْا - ایک شخص نے کھڑے ہو کر کہا لَا نَسْمَعُ وَلَا نُطِیْعُ - آپ نے پوچھا، کیوں؟ اُس نے کہا کہ آپ نے دو کپڑے پہن رکھے ہیں جو مالِ غنیمت سے تقسیم ہوئے ہیں مگر سب کے حصہ میں تو ایک کپڑا آیا تھا، آپ نے دو کپڑے کیسے لئے - حضرت عمرؓ نے فرمایا بے شک تم سچ کہتے ہو - اے عبداللہ تم اس کو جواب دے دو - اس پر حضرت عبداللہ بن عمرؓ کھڑے ہوئے اور کہا، امیر المومنین کے پاس آج کوئی کپڑا نہ تھا جس کو پہن کر نماز پڑھاتے، تو میں نے اپنے حصہ کا کپڑا ان کو عاریتاً دے دیا ہے - اس طرح ان کے پاس دو کپڑے ہو گئے جن میں سے ایک کی لنگی بنا لی اور ایک کی چادر - یہ جواب سن کر سائل رونے لگا اور کہا، جزاک اللہ! اب آپ خطبہ پڑھیں ہم سنیں گے اور اطاعت کریں گے -

خلافت کی حقیقت

یہ اُن حضرات کی حکومت تھی کہ رعایا کا ہر شخص اُن پر روک ٹوک کرنے کو موجود تھا، تو اس صورت میں خلافت کوئی راحت کی چیز تھی جس کی تمنا کی جائے ـــــ ہرگز نہیں - واللہ! اس سے زیادہ مصیبت کی چیز کوئی نہ

تھی۔ تو کیا حضرت علیؓ اس کے نہ ملنے سے رنجیدہ ہو سکتے تھے؟۔ کبھی نہیں ـــــ!

دوسرے اگر مان بھی لیا جائے کہ خلافت بڑی راحت کی چیز تھی تو اس کی تمنا وہ کرے جس کے دل میں دنیا کی ہوس اور وقعت ہو تو کیا نعوذ باللہ ان لوگوں نے حضرت علیؓ کو دنیادار اور طالب دنیا سمجھ رکھا ہے جو وہ اس کے نہ ملنے سے رنجیدہ ہوئے ہوں گے۔ اگر وہ ایسا سمجھیں تو اُن کو یہ خیال مبارک ہو۔ ہمارا خیال تو یہ ہے کہ حضرت علیؓ کی نظر میں دنیا کی کچھ بھی وقعت یا ہوس نہ تھی کیونکہ اُن کو تعلق مع اللہ کی سلطنت حاصل تھی جس کی یہ خاصیت ہے کہ ؎

آں کس کہ ترا شناخت جاں را چہ کند
فرزند و عیال و خانماں را چہ کند

پھر اُن کو خلافت دیر میں ملی تو کیا اور نہ ملتی تو کیا۔ اُن کو کبھی بھی اس کا رنج نہ ہو سکتا تھا بلکہ وہ تو اس سے خوش ہوتے۔ پھر جس بات سے اُن کو خوشی ہو: آپ اُس میں رنج کرنے والے کون ہیں؟ یہ تو وہی مثل ہوئی، مدعی سست گواہ چست۔

اسی دنیا کی بے وقعتی کو حق تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ مال و بنون زینت حیوٰۃ دنیا ہیں۔ اور ان کو زینت کہنے میں ایک نکتہ اور سمجھ میں آیا وہ یہ کہ زینت و آرائش اعراض میں سے ہے تو اس میں یہ بتلایا ہے کہ دنیا کے جواہر بھی اعراض ہی ہیں گو بظاہر جواہر نظر آتے ہیں مگر فانی ہونے کی وجہ سے وہ اپنے وجود میں غیر مستقل مثل اعراض کے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں آخرت کے اعراض بھی جواہر ہیں کیونکہ وہ باقیات صالحات ہیں۔ یہ نکات تو اس وقت

ذہن میں ہیں۔ اگر غور کیا جائے تو اور بھی نکات نکل آئیں گے۔ ان کی تو انتہا ہی نہیں۔

باقیات الصالحات

مجھے اس وقت زیادہ تر آیت کے اسی جزو کا بیان مقصود ہے۔ وَالْبٰقِیٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَیْرٌ عِنْدَ رَبِّکَ ثَوَابًا وَّخَیْرٌ اَمَلًا۔ کیونکہ یہ بیان مدرسہ کے جلسہ میں ہو رہا ہے اور مدرسہ باقیات صالحات سے ہے۔ سو سنئے، حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ باقی رہنے والی چیزوں سے (مراد اچھے اعمال ہیں) ثواب کے اعتبار سے اور امید کے اعتبار سے تمہارے پروردگار کے نزدیک زیادہ بہتر ہیں۔ یہاں حق تعالیٰ نے لفظ اعمال کو مقدر فرما دیا ہے کیونکہ مقصود بقاء کا مدار خیریت بتلانا ہے گو تحقق اس کا مادہ اعمال ہی میں ہو۔ پس اگر اعمال کا ذکر ہوتا تو باقیات کا مفہوم ان کی صفت واقع ہو کر تابع ہو جاتا تو مقصود مذکور میں صریح نہ ہوتا۔

یہاں چند نکات طالب علمانہ ذہن میں اور ہیں ان کو مختصراً ذکر کرتا ہوں ایک یہ کہ یہاں حق تعالیٰ نے اعمال شر کو ذکر نہیں فرمایا حالانکہ وہ بھی باقیات سے ہیں۔ کیونکہ جس طرح اعمال صالحہ کی جزا جنت ہے اور وہ باقی ہے ایسے ہی اعمال شر کی سزا جہنم ہے اور وہ بھی باقی ہے تو جب یہاں اعمال کی بقاء کا ثابت کرنا مقصود ہے تو ان کو بھی بیان کرنا چاہئے تھا۔

جواب یہ ہے کہ ان کو بقاء علی الاطلاق نہیں کیونکہ بعض اعمال شر کی جزا غیر باقی ہے اور بعض کی گو غیر باقی ہے جیسے کفر و شرک کی مگر چونکہ اس جزا والوں کی یہ حالت ہے کہ لا یموت فیہا ولا یحیٰی کہ نہ ان کو وہاں موت ہے نہ زندگی ہے۔ تو ایسی حیات جس کے متعلق لا یحیٰی بھی ارشاد

ہے اس قابل نہیں کہ اُس کو باقیات کے ساتھ موصوف کیا جاوے اور اُن کے لئے بقاء ثابت کیا جائے کیونکہ وہ بقاء مثل عدم بقاء کے ہے۔

دوسرے باقیات صالحات جو ہیں اُن کی بقاء محض لغوی نہیں بلکہ بناء بر ایصال الی الباقی کے ہے اور حق تعالیٰ کے ساتھ یہ تعلق خیر ہی کو ہے شر کو نہیں بلکہ وہ تو اُس سے تعلق کو قطع کرنے والی ہے۔ اس لئے اعمال صالحہ ہی باقیات کے ساتھ موصوف کرنے کے قابل ہیں پس صالحات کی قید محض توضیح کے لئے ہے ورنہ صرف لفظ باقیات ہی اعمال صالحہ پر دلالت کے لئے کافی ہے اور یہ جو میں نے کہا ہے کہ اعمال صالحہ کی بقاء بوجہ تعلق بحق کے ہے۔ یہ ایک تفسیر کی بناء پر نص سے بھی موید ہے کُلُّ شَیْءٍ ہَالِکٌ اِلَّا وَجْہَہٗ کی تفسیر ایک تو ذاتہ سے کی گئی ہے اور ایک تفسیر ما کان لاجلہ سے بھی کی گئی ہے۔ اس پر یہ شبہ نہ کیا جائے کہ اعمال صالحہ کیا فناء عالم کے وقت بھی باقی رہیں گے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ محققین کے نزدیک کچھ دیر کو فنا ہو جائیں گے مگر چونکہ وہ ساعت قلیلہ ہے اس لئے عرفاً وہ گویا باقی ہی ہیں۔ کیونکہ عرفاً انقطاع قلیل کا اعتبار نہیں کیا جاتا۔

مثلاً کہتے ہیں کہ فلاں شخص صبح سے شام تک چلتا رہا تو اگر وہ تھوڑی دیر کے لئے راستہ میں پیشاب کرنے بیٹھ گیا ہو تو کوئی اس پر یہ اعتراض نہیں کرتا کہ واہ صاحب وہ تو پانچ منٹ بیٹھا بھی تھا۔

اور مثال لیجئے شعلہ جوالہ سے حرکت کے وقت ایک پورا دائرہ روشن نظر آتا ہے حالانکہ زیادہ حصہ اس کا تاریک ہے مگر عرفاً اُس تاریکی کا اعتبار نہیں کیا جاتا بعدم الاحساس اور اگر اُس کو خطِ مستدیر پر نہ گھمایا جائے بلکہ

یمین سے یسار کو اور پھر رجعت قہقری سے حرکت دی جائے تو رجعت کے وقت تو یسار سے یمین کو ضرور ہی تاریکی ہوگی لتخلل السکون بین الحرکتین یعنی دو حرکتوں کے درمیان سکون کا ہونا ضروری ہے لیکن عرفاً یہی کہا جاتا ہے کہ یہ روشنی مستمر معلوم ہے کیونکہ سکون محض آنی ہے اُس کا اعتبار نہیں کیا جاتا —— پس ایسے ہی یہاں سمجھئے کہ ساعت قلیلہ میں فنا ہو جانا اعمال صالحہ کے بقاء کو عرفاً مضر نہیں کیونکہ زیادہ حصّہ تو بقاء ہی کا ہے اور گو غیر خیر میں بھی ایسا ہی بقاء ہے مگر اوپر ان دونوں میں فرق بیان ہو چکا ہے۔

اب ایک شبہ اور رہا۔ وہ یہ کہ حق تعالیٰ شانہٗ نے یہاں اعمال کو باقی فرمایا ہے حالانکہ وہ تو اعراض ہیں، وہ کیسے باقی رہ سکتے ہیں۔

لان العرض لا بقاء له بالذات بل تبعا للمعروض والمعروض لیس بباق نضائہٗ بالموت

مثلاً پھر بقاء تبعاً للمعروض بھی اعراض لازمہ کو ہے نہ کہ غیر لازمہ کو اور اعمال صالحہ ظاہر ہے کہ اعراض لازمہ نہیں بلکہ غیر لازمہ ہیں۔ اُن کا بقاء تو تبعاً للمعروض بھی نہیں رہ سکتا مثلاً نماز پڑھ کر جہاں فارغ ہوئے بس عمل ختم ہوا۔ اب اُس کا بقاء نہ اصالۃً ہے نہ تبعاً۔

اس جگہ سب معقولی تھک گئے مگر علامہ جلال الدین دوانی نے رسالہ زوراء میں لکھا ہے کہ آخرت میں یہ اعراض جواہر ہوں گے۔ یعنی جو عمل ہم کرتے ہیں وہ یہاں تو عرض ہے مگر عالم آخرت میں (جو کہ مکاناً اس وقت بھی موجود ہے) جواہر ہوں گے فقط اور اس کے لئے یہ صورت جوہریہ صادر ہی کے وقت سے حاصل ہو جاتی ہے اور وہ صورت جوہریہ باقی رہے گی

اب کوئی اشکال نہیں۔ عارفین تو کشفی طور پر اس کے قائل ہیں ہی مگر ایک معقولی عقلی طور پر بھی اس کا قائل ہے اور عقلاً اس کو جائز و ممکن سمجھتا ہے۔ تقریب الی الفہم کے لئے میں طلبا کے واسطے ایک معقولی مثال سے اس کو واضح کرتا ہوں۔

وہ یہ کہ حصول اشیاء بانفسہا فی الذہن بہت حکماء کے نزدیک حق ہے اور ظاہر ہے کہ حصول بانفسہا سے مراد یہ تو نہیں ہے کہ بعینہ یہی شے جو خارج میں ہے، ذہن میں حاصل ہوتی ہے۔ اگر بعینہ حصول ہو تو تصور جبال سے ذہن کا انشقاق اور تصور نار سے احراق لازم ہوگا وغیرہ وغیرہ۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ حقیقت شے کی ذہن میں حاصل ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ حقیقت جوہر کی جوہر ہے حالانکہ صورۃ حاصلہ فی الذہن عرض ہے تو جو نسبت ذہن کو خارج سے ہے ہم کہتے ہیں کہ وہی نسبت دنیا کو آخرت سے ہے جس طرح اعراض ذہنیہ خارج میں جواہر ہیں، اسی طرح اعراض دنیویہ آخرت میں جواہر ہوں تو اشکال کیا ہے۔

ایک نکتہ اس جگہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے الباقیات الصالحۃ نہیں بلکہ الباقیات الصالحات فرمایا ہے۔ اس عنوان میں یہ بتلایا گیا ہے کہ ان اعمال میں ہر ہر عمل میں مستقل صلاحیت ہے۔ اس لئے صالحہ کا مصداق بھی متعدد ہو کر صالحات صادق آوے گا۔ یہ نہیں کہ مجموعہ میں صلاحیت ہو تاکہ ان کو مجموعہ بنا کر صالحۃ صفت مفردہ سے تعبیر کیا جائے۔ یہاں سے ان لوگوں کی غلطی واضح ہو گئی جو بعض اعمال صالحہ کو حقیر سمجھتے ہیں۔

عمل کی وقعت

یہ سخت غلطی ہے بلکہ ہر عمل قابل وقعت ہے۔ حدیث میں آیا ہے

کہ ایک بدکار عورت نے ایک کتے کو پیاس کی حالت میں پانی پلایا تھا اُس کی اسی عمل پر مغفرت ہوگئی تو اب تبلایئے کیونکہ کسی عمل کو حقیر سمجھا جائے نہ معلوم اُن کو کون سی بات پسند آجائے ع

تا یار کرا خواہد و میلش بکہ باشد

یہاں سے سالکین کو سبق لینا چاہیئے کیونکہ اہل ظاہر تو اپنے اعمال کو حقیر نہیں سمجھتے بلکہ وہ تو اپنے ہر عمل کو اتنا بڑا سمجھتے ہیں کہ اُس کے گھٹانے کی ضرورت پڑتی ہے مگر اہل سلوک چونکہ مست ہوچکتے ہیں، اس لئے وہ اپنے کو بھی حقیر سمجھتے ہیں اور اپنے اعمال کو بھی ہیچ اور لاشئے سمجھتے ہیں مگر اس میں بعض اوقات تواضع کے ساتھ ناشکری ہو جاتی ہے پس دونوں کے جمع کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے عمل کو اس حیثیت سے تو کچھ نہ سمجھو کہ تم نے کیا ہے مگر اس حیثیت سے کہ حق تعالیٰ نے یہ نعمت عطا فرمائی ہے بڑی قدر کرنا چاہیئے خلاصہ یہ ہے کہ یوں سمجھو کہ ہم تو نالائق ہیں کسی قابل نہیں مگر حق تعالےٰ کا فضل و احسان ہے کہ انہوں نے اپنے کرم سے یہ دولتیں ہم کو عطا فرما دی ہیں۔ اس صورت میں تواضع بھی ہے اور شکر بھی۔ پس اپنے اعمال کو مطلقاً ایسا حقیر نہ سمجھا جائے کہ نعمتِ حق کی ناشکری ہونے لگے۔

الہ آباد میں ایک ولائتی بزرگ محمد شاہ صاحب تھے۔ حافظ عبدالرحمٰن صاحب بگھروی بیان کرتے تھے کہ میں ایک شخص کے ہمراہ ان کی زیارت کو گیا تو انہوں نے ساتھی سے پوچھا یہ کون ہیں۔ انہوں نے کہا کہ یہ حافظ بھی ہیں حاجی بھی ہیں۔ انہوں نے تواضعاً کہہ دیا کہ جی نہیں میں تو کچھ بھی نہیں۔ بس محمد شاہ اُن کے سر ہوگئے اور کہا اچھا تم یہ چاہتے ہو کہ حق تعالےٰ تم سے حفظ کی دولت چھین لیں اور تمہارا حج باطل کر دیں۔ یہ بڑے چپ ہوئے

پھر جب جاتے تو شاہ صاحب کہتے آؤ ناشکرا، آؤ ناشکرا!

صاحبو ــــ اگر یہی تواضع ہے تو نہ معلوم اپنے کو کیا بناؤ گے۔ کیونکہ ہر چیز میں کچھ نہ کچھ کمال ہے۔ اگر اپنے کو مسلمان کہو گے اس میں بھی کمال ہے آدمی کہو گے اس میں بھی کمال ہے۔ بھنگی چمار کہو گے اس میں بھی کمال ہے کیونکہ آخر تو وہ بھی آدمی ہیں، جانوروں سے تو اچھے ہیں۔ دوسرے بھنگی اور چماروں کے پاس ایسا کمال ہے کہ اگر وہ آج اپنا کام چھوڑ دیں تو سارا عالم پریشان ہو جائے اور بڑے بڑے امراء اُن کی خوشامد کرنے لگیں۔

ایک عالم تھانہ بھون میں اپنے ایک شاعر شاگرد کو چھیڑتے تھے اور کہتے تھے کہ ہر پیشہ والوں کی دنیا میں ایسی ضرورت ہے کہ اگر وہ نہ رہیں تو لوگ پریشان ہو جائیں حتیٰ کہ بھنگی بھی بجز شاعروں کے کہ یہ کسی کام کے نہیں اگر سب کے سب بھی مر جائیں دنیا میں کسی کا بھی کچھ حرج نہ ہو۔ لہ

غرض گھٹیا سے گھٹیا پیشہ کی طرف نسبت کرنے میں بھی کچھ نہ کچھ کمال ضرور ہو گا۔ اور کچھ نہ سہی آدمی ہونے کا ہی کمال ظاہر ہو گا۔ ہاں ایک صورت تواضع کی ہے کہ اپنے کو آدمی ہی نہ کہو، جانور کہنے لگو جیسے آج کل بعض لوگ آدمی سے جانور بنتے ہیں۔ کسی کا لقب طوطیٔ ہند ہے کسی کا بلبلِ ہند ہے اور مزا یہ کہ اس کو فخر سمجھتے ہیں۔ بھلا اس میں بھی کچھ فخر ہے کہ آدمی سے طوطی اور بلبل بن گئے۔ کیا یہ جانور آدمی سے افضل ہیں۔ خدا کا شکر کرو کہ اس نے تمہیں آدمی بنایا مسلمان بنایا، نمازی بنایا، ذکر کی توفیق دی۔ ان نعمتوں کی قدر کرو اور ایسی تواضع

لہ ہاں شاید رنڈیوں اور قوالوں اور ڈوموں کو کچھ نقصان پہنچے تو ممکن ہے کیونکہ اُن کی آمدنی اشعار گانے پر ہی ہے۔ جواب۔ ان کے لئے پرانے اشعار کافی ہیں، تو اُن کا بھی نقصان نہ ہوا۔ ۱۲

نہ کرو جس سے اُن کی ناشکری ہونے لگے۔

عجیب بات ہے کہ آج کل سالکین اعمال کی تو بے قدری کرتے ہیں ہاں احوال کی قدر کرتے ہیں۔ چوبیس ہزار دفعہ ذکر اللہ کر کے جی خوش نہیں ہوتا ہاں ذرا کچھ کشف ہو جائے یا گریہ طاری ہو جائے تو بس جامہ سے باہر ہیں یہ کیسی نادانی کی بات ہے۔ یاد رکھو اصل چیز اعمال ہی ہیں۔ یہی کام آنے والے ہیں، احوال کا کیا ہے ہوئے یا نہ ہوئے۔ ہاں اگر اعمال کے ساتھ احوال بھی نصیب ہو جائیں تو نور علیٰ نور ہے ورنہ صرف احوال کا اعتبار نہیں۔

ہمارے حضرت حاجی صاحبؒ سے جب کوئی شکایت کرتا کہ حضرت ذکر سے نفع نہیں ہوتا تو فرماتے یہ کیا تھوڑا نفع ہے کہ تم ذکر کر رہے ہو پھر یہ شعر پڑھتے ؎

یابم اورا یا نیابم جستجوئے می کنم
حاصل آید یا نیاید آرزوئے می کنم

دنیا کی حقیقت

غرض باقیات کے ساتھ صالحات کے جمع لانے میں ہر عمل کی وقعت کا اظہار ہے اور جب اعمالِ آخرت باقی رہنے والے ہیں اور اس کے مقابلہ میں مال و بنون کو زینت فرمایا گیا ہے تو اس لفظ سے اس پر تنبیہ ہے کہ دنیا کی چیزیں فنا ہونے والی ہیں۔ اور جب دنیا کے اموال و اولاد فانی ہیں تو اگر وہ آپ سے پہلے اور آپ کے سامنے ہی فنا ہو جائیں تو غم نہ کرو کیونکہ وہ تو فنا ہونے والے تھے ہی۔ پس ایسی فانی چیزوں کے متعلق تمہارا یہ حساب لگانا کہ یہ لڑکا اتنی عمر کا ہوگا تو اتنی تنخواہ کمائے گا۔ پھر اس کی شادی ہوگی۔ پھر اس کے بال بچے ہوں گے۔ یہ سارا حساب ایسا ہے جیسا

دریا کے متعلق ایک بنئے نے حساب کیا تھا۔

جس کا قصہ یہ ہے کہ ایک لالہ جی گاڑی کرایہ کر کے اپنے کنبہ کو لے کر چلے تھے۔ راستہ میں دریا آیا جو خوب چڑھا ہوا تھا۔ گاڑیبان نے کہا، معلوم نہیں کتنا پانی ہے، ڈوبنے کا خطرہ ہے۔ بنئے نے ایک بانس لے کر ناپا کہ پانی کنارہ پر کتنا ہے اور بیچ میں کتنا اور دوسرے کنارہ کو پہلے پر قیاس کر لیا۔ سلیٹ پر حساب نکالا اور بیچ کی گہرائی کو دونوں کناروں پر تقسیم کر کے اوسط نکالا، کمر تک ہے اور گاڑیبان سے کہا کہ تم بے فکر ہو کر گاڑی ڈال دو ہم نے اوسط نکال لیا ہے کمر تک ہے۔ چنانچہ گاڑی ڈلوادی۔ جب بیچ میں پہنچے تو لگے ڈوبنے۔ اب لالہ جی نے اپنے حساب کو پھر دیکھا تو اوسط پھر وہی نکلا۔ تو آپ کہتے ہیں لیکھا جوں کا توں پھر کنبہ ڈوبا کیوں؟

تو جیسے اس احمق نے حساب لگایا تھا کہ جیسے سلیٹ پر پانی کا اوسط نکل آیا ہے ایسے ہی دریا میں بھی اوسط برابر ہو گیا ہو گا۔ ایسا ہی اولاد کے متعلق یہ تمہارا حساب ہے جس کو تم اپنے ذہن میں لگا کر یوں سمجھتے ہو کہ بس ایسا ہی ہو گا حالانکہ وہاں ہوتا وہ ہے جو پہلے سے مقدّر ہے، تمہارے حساب سے کیا ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر مال اور روپے ہلاک ہو جائیں تو غم نہ کرو یوں سمجھ لو کہ یہ تو ہلاک ہونے والے ہی ہیں۔

بعضے مال کے ہلاک ہونے سے غم کرنے کی تاویل یہ کرتے ہیں کہ ہم اس کو اللہ کی راہ میں خرچ کرتے تو ہم کو ثواب ملتا۔ میں کہتا ہوں اوّل تو یہ خیال ہی خیال ہے۔ ہلاک ہونے کے بعد ہی یہ خیال آتا ہے اگر روپے گھر میں رہتے تو کبھی یہ خیال نہ آتا۔ اور اگر کسی کو واقعی یہ خیال ہو تو میں کہتا ہوں وہ شخص مطمئن رہے اس کو ثواب مل گیا کیونکہ ثواب کا مدار نیت پر ہے۔ جب تم نے یہ

نیت کر لی تھی کہ اس کو اللہ کی راہ میں خرچ کریں گے تو ثواب اسی وقت مل گیا، اب چاہے خرچ کی نوبت آئے یا نہ آئے تمہارا ثواب ضائع نہ ہوگا۔ پس اس وجہ سے بھی قلق نہ ہونا چاہئے۔

البتہ اعمالِ صالحہ اگر فوت ہوں اس کا قلق ہونا چاہئے مگر اس میں بھی ایک تفصیل ہے۔ وہ یہ کہ اعمال صالحہ کے فوت ہونے کا عوام تو جس قدر چاہیں قلق کریں ان کو تو مفید ہے اور سالکین زیادہ اس کا بھی قلق نہ کریں بلکہ تھوڑی دیر تک رنج کر لیں پھر جی بھر کے توبہ کر لیں اور اپنے کام میں لگیں اور ماضی کی فکر میں نہ پڑیں کہ ہائے یہ کام کیوں فوت ہوا، ہائے یہ خطا کیوں ہوئی۔ ہر وقت اسی کا شغل رکھنا سالک کو مضر ہے کیونکہ یہ فکر ترقی تعلق مع اللہ میں حجاب ہو جاتا ہے اور اس میں راز یہ ہے کہ تعلق مع اللہ بڑھتا ہے نشاطِ قلب سے اور یہ قلق نشاط کو کم کر دیتا ہے۔ لیکن تھوڑی دیر تک تو قلق کرنا چاہئے اور خوب رونا دھونا چاہئے تاکہ نفس کو کوتاہی کی سزا تو ملے۔ پھر توبہ کر کے اور اچھی طرح استغفار کر کے اس سے التفات کو قطع کرے اور کام میں لگے۔

آج کل زیادہ قلق کرنے میں ایک اور بھی نقصان ہے۔ وہ یہ کہ قلوب اس وقت بے حد ضعیف ہیں۔ زیادہ قلق سے ان کا ضعف بڑھ جاتا ہے جس سے بعض اوقات تعطل کی نوبت آجاتی ہے جو کھلا ضرر ہے ——— بہر حال جب بعض منافع باقیہ کا فوت بھی زیادہ محلِ قلق نہیں تو منافع فانیہ یعنی منافع دنیویہ تو بالکل ہی محلِ قلق نہ ہوں گے تو ان پر تحسر بالکل ہی بے معنی ہے خصوصاً جب کہ یہ بات ثابت ہے کہ مسلمان کی جو چیز بھی ضائع ہوتی ہے سب حق تعالیٰ کے یہاں جمع ہو جاتی ہے جس کا اسے ثواب ملتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک کانٹا بھی لگتا ہے تو اس سے بھی ثواب ملتا ہے۔ اس جگہ اسی اصل پر ایک آیت کی

تفسیر سمجھ لو۔ بڑے کام کی بات ہے۔ وہ یہ کہ ایک جگہ حق تعالیٰ نے دنیا کی مثال میں فرمایا ہے۔

مَثَلُ مَا يُنْفِقُونَ فِي هٰذِهِ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَثَلِ رِيْحٍ فِيْهَا صِرٌّ اَصَابَتْ حَرْثَ قَوْمٍ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَاَهْلَكَتْهُ ۭ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝

حاصل ارشاد یہ ہے کہ کفار حیوۃ الدنیا میں جو خرچ کرتے ہیں اس کی ایسی مثال ہے جیسے کسی کافر قوم کی کھیتی پر پالہ پڑ جائے اور اس کو تباہ کر دے، تو جیسے وہ کھیتی ہری بھری ہونے کے بعد بالکل ضائع ہو جاتی ہے یوں ہی کفار کا خرچ کیا ہوا مال بوجہ عدم ایمان کے ضائع محض ہوتا ہے۔ یہ تو آیت کا حاصل تھا مگر سوال یہ ہے کہ اس مثال میں حرث قوم ظلموا انفسھم کیوں فرمایا! حالانکہ پالہ تو کافر کی کھیتی کو بھی تباہ کرتا ہے اور مسلمان کی کھیتی کو بھی۔ تو بات یہ ہے کہ مسلمان کی کھیتی کا پالہ سے کامل طور پر نقصان نہیں ہوتا گو کھیتی برباد ہو جائے مگر اس مصیبت سے اجر صبر بڑھ جائے گا اور آخرت میں جو ثواب اس کے بدلہ میں ملے گا، وہ اس کھیتی سے لاکھ درجہ افضل ہو گا کیونکہ اجر آخرت کی تو شان یہ ہے ؎

نیم جاں بستاند و صد جاں دہد ۔۔۔ آنچہ در وہمت نیاید آں دہد
خود کہ یابد ایں چنیں بازار را ۔۔۔ کہ بیک گل می خری گلزار را

پس ضیاعِ اعمال کافر کے لئے کافر ہی کی کھیتی مثال ہو سکتی ہے کہ پالہ سے فنائے کامل اسی کو ہوتا ہے کیونکہ اس کا بدل بھی نہیں ملتا۔ مسلمان کو کامل اور حقیقی نقصان نہیں ہوتا۔ اس لئے ظلموا انفسھم کی قید بڑھا دی۔ واللہ! یہ بڑے مزے کی قید ہے اور مسلمانوں کے لئے بڑی خوشی کی بات ہے کہ دنیا

کے کسی نقصان سے بھی اُن کا حقیقی نقصان نہیں ہوتا۔ حقیقی نقصان صرف کافر کو ہوتا ہے مسلمان کے لیئے ہر وقت خوشی اور مسرت ہی ہے، راحت میں بھی اور مصیبت میں بھی۔ غیر قومیں بھی تو کہا کرتی ہیں کہ مسلمان بڑھے تو امیر گھٹے تو فقیر جن کی امیروں سے بھی زیادہ قدر ہے اور مر گئے تو پیر۔ اور دوسری قومیں بڑھیں تو سپوت اور گھٹیں تو کپوت اور مریں تو بھوت کہ زندوں کو پیٹتے پھرتے ہیں۔ مسلمان کی مراد حاصل ہو جائے تب تو خوشی ہی ہے اگر نامراد بھی رہے تب بھی خوشی ہے کیونکہ مولانا فرماتے ہیں ؎

گر مرادت را مذاق شکر ست ــــــ بے مرادی نے مراد دلبر ست

اگر مراد میں مزا ہے تو بے مرادی میں ثواب ہے کیونکہ وہ حضرت حق کی مراد کے موافق ہے۔ عشاق کے لیئے تو یہی بات خوش ہونے کو کافی ہے گو ثواب بھی نہ ہوتا مگر اب تو ثواب بھی ہے۔ عشاق کو تو اسی سے خوشی ہوتی ہے کہ محبوب کی رضا اسی میں ہے۔ بس یہ سوچ کر بڑی سے بڑی مصیبت بھی خوشگوار ہو جاتی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے زیادہ مسلمانوں کے لئے کیا مصیبت ہو گی مگر حضورؐ کے وصال پر بھی حضرت خضر علیہ السلام نے صحابہ کو اس طرح تسلی فرمائی تھی۔

إِنَّ فِي اللّٰهِ عَزَاءً مِنْ كُلِّ مُصِيبَةٍ وَخَلَفًا مِنْ كُلِّ فَائِتٍ فَبِاللّٰهِ فَثِقُوا وَإِيَّاهُ فَارْجُوا فَإِنَّمَا الْمَحْرُومُ مَنْ حُرِمَ الثَّوَابَ۔

یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات میں ہر مصیبت سے تسلی ہے اور ہر فوت ہونے والے کا عوض ہے۔ پس اللہ پر بھروسہ رکھو اور اسی سے امید رکھو کیونکہ پورا محروم تو وہی ہے جو ثواب سے بھی محروم رہے (اور مسلمان کسی مصیبت میں

ثواب سے محروم نہیں رہتا، جب اللہ تعالیٰ کے ہوتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی بدل ہے تو اور کیا رہ گیا۔ اب کوئی مصیبت ایسی نہیں جس سے خدا کے ہوتے ہوئے مسلمان پریشان ہو۔ ہاں دین میں کمی ہو تو قلق ہونا چاہیئے کیونکہ اس کا عوض کچھ نہیں مگر اس میں بھی اعتدال ہونا چاہیئے جیسا کہ اوپر بتلایا گیا کیونکہ نقصان دین کی تلافی بھی توبہ اور استغفار اور گریہ وزاری سے ہو سکتی ہے۔

رجاء کی اہمیت

اب میں آیت کا ترجمہ پھر کرتا ہوں اور چند باتیں اس کے متعلق بیان کر کے ختم کرنا چاہتا ہوں حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

والباقیات الصالحات خیر عند ربك ثوابا وخیرا املا۔

کہ باقیات صالحات خدا کے پاس ثواب اور امید کے اعتبار سے بہتر ہیں یعنی اعمال صالحہ سے ثواب کے ساتھ بندہ کو حق تعالیٰ کے ساتھ امید بھی قائم ہو جاتی ہے کہ انشاء اللہ وہ ہم سے راضی ہیں اور یہ امید بڑی چیز ہے۔ اس کی قدر عشاق سے پوچھنا چاہیئے۔ عشاق تو اسی امید کے بھروسہ جیتے ہیں کسی نے خوب کہا ہے ؎

اگرچہ دور افتادم بدیں امید خرسندم
کہ شاید دستِ من بارِ دگر جانانِ من گیرد

اور یہ امید ہوسنا کی کا نام نہیں ہے بلکہ یہ وہ رجاء ہے جس سے روح تازہ اور زندہ ہوتی ہے جیسے ایک عاشق کا قصہ ہے کہ نزع کے وقت اُسے محبوب کے آنے کی خبر ملی تو فرطِ شوق میں اٹھ بیٹھا۔ پھر معلوم ہوا کہ وہ دروازہ تک آکر لوٹ گیا۔ یہ سنتے ہی گر پڑا۔ تو یہ رجاء وہ چیز ہے جس سے

مرتے مرتے کو بھی ایک دفعہ حیاتِ جدیدہ حاصل ہو جاتی ہے مگر اس عاشق کا محبوب تو مجازی تھا، ظالم تھا، اس لئے اس کی رجاء ادھوری رہی اور جن کو حق تعالیٰ سے رجاء ہو جو لم یزل ولایزال ہیں اور رحیم و کریم و عاشق نواز ہیں ان کا کیا پوچھنا۔ واللہ! ان کے لئے تو اس رجاء کی بدولت ہر دم تازہ حیات ہے ——— !

یہاں سے معلوم ہوا کہ اعمال صالحہ میں نفع نقد بھی ہے صرف ادھار ہی نہیں۔ ہاں ایک چیز ادھار بھی ہے یعنی ثواب اور اس کے ساتھ ایک چیز نقد ہے، وہ یہی رجاء اور امید ہے جو بدون اعمال صالحہ کے حاصل نہیں ہوتی اگر کسی مجرم کو امیدوار دیکھا جائے تو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ امیدوار نہیں ہے بلکہ ہوس ناک اور مبتلائے غلطی ہے اور اگر صحیح امیدوار ہی ہو، تو یقیناً اس کے پاس کوئی عمل صالح ہے جس کی بنا پر اس کو یہ رجاء حاصل ہے چاہے اور کچھ نہ ہو ایمان اور اسلام ہی ہو کیونکہ ایمان افضل الاعمال الصالحہ ہے۔ باقی کسی کافر کو ہرگز خدا سے صحیح امید نہیں ہو سکتی، اس کو تو محض ہوس اور غرور ہی ہو گا۔ غرض اعمال صالحہ کا یہ ثمرہ نقد ہے۔

اعمال کا ثمرہ

اور اسی طرح اعمال سیئہ کا بھی ایک ثمرہ ادھار ہے اور ایک نقد ادھار تو عذاب جہنم ہے اور نقد وہ وحشت اور ظلمت اور بے چینی ہے جو گناہوں کے لئے لازم ہے۔ اسی واسطے بعض لوگوں نے تو کہہ دیا کہ جنت اور دوزخ ہر شخص کو اسی وقت محیط ہیں۔ جس کے پاس اعمال صالحہ ہیں اس کو اسی وقت جنت محیط ہے کیونکہ رجاء کی وجہ سے اس کو بہت بڑی راحت حاصل ہے اور جس کے پاس اعمال سیئہ ہیں اس کو اسی وقت دوزخ محیط ہے

کیونکہ گناہوں کی وحشت اور ظلمت سے دنیا میں بے چینی اور عذاب میں ہے ـــــ!

میں نے حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحبؒ سے خود سنا ہے فرمایا کہ بھائی جنت کا مزہ برحق، حوضِ کوثر کا مزا برحق، مگر نماز میں جو مزا ہے، وہ کسی چیز میں نہیں اور سجدہ میں جاتے ہوئے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے پیار کر لیا ـــــ سبحان اللہ! جس شخص کو اعمال کی یہ لذت نصیب ہوائس کے لیے دنیا ہی میں جنت کیوں نہ ہوگی۔

یہاں سے ان لوگوں کا جواب بھی ہو گیا جو کہا کرتے ہیں کہ آخرت دنیا سے افضل تو ہے مگر وہ ادھار ہے اور یہ نقد ہے اور طبعاً انسان نقد کا عاشق ہے، اس لیے اضطراراً دنیا کو ترجیح دیتا ہے۔ میں کہتا ہوں اوّل تو یہی غلط ہے کہ نقد کو ہر حال میں ترجیح دی جاتی ہے۔ بھلا اگر کوئی آپ سے یہ کہے کہ اگر اس وقت مکان لینا چاہو تو یہ کچا گھر ملے گا اور اگر سال بھر کے بعد لو تو بڑا عالیشان پختہ محل ملے گا۔ بتلایئے اس وقت آپ کس کو ترجیح دیں گے۔ یقیناً سال بھر کے انتظار کو گوارا کریں گے۔

دوسرے یہ بھی غلط ہے کہ آخرت ادھار ہے۔ واللہ! اعمالِ آخرت کا ثمرہ نقد بھی ملتا ہے اور جن کو اس ثمرہ کا پتہ چل گیا ہے، وہ ہفت اقلیم کی سلطنت پر بھی نگاہ نہیں اٹھاتے۔ وہ ثمرہ یہی ہے، خدا تعالیٰ کے ساتھ تعلق اور اُن سے امید کا وابستہ ہو جانا۔ اسی لیے ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ اگر سلاطینِ دنیا کو اس دولت کی خبر ہو جائے جو ہمارے پاس ہے، تو وہ تلواریں لے کر ہمارے اوپر چڑھ آئیں اور اس دولت کو چھیننے کا ارادہ کریں حق تعالیٰ نے ایک مقام پر اعمال صالحہ کے دو ثمرے بیان فرماتے ہیں

أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ

کہ یہ لوگ اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور یہی لوگ پوری فلاح پانے والے ہیں یعنی اعمال صالحہ کا ایک ثمرہ اخروی فلاح تو ہے ہی، دوسرا ثمرہ عاجلہ ہدایت بھی ہے۔ یہاں ظاہر میں شبہ ہوتا ہے کہ ہدایت کا ثمرہ ہونا کیسا، مزا تو وہ ہے جس میں حظ ہو اور ہدایت تو خود عملی حالت ہے اس میں کیا حظ ہوتا، مگر ایک حکایت سے آپ کو اس کا ثمرہ ہونا معلوم ہو جائے گا۔ اور وہ قصہ خود مجھے پیش آیا۔

میں ایک دفعہ سہارنپور سے کانپور جا رہا تھا تو سہارنپور سے لکھنؤ جانے والی ریل میں سوار ہوا۔ اسی گاڑی میں میرے ایک دوست اور ہم وطن مگر جنٹلمین بھی پہلے سے سوار تھے۔ میں یہ سمجھا کہ شاید یہ بھی لکھنؤ جا رہے ہوں گے کیونکہ ایک زمانہ میں اُن کے تعلقات لکھنؤ میں بہت رہ چکے تھے۔ سردی کا موسم تھا اور وہ حضرت بیک بینی و دوگوش تھے۔ نہ ساتھ میں کمبل نہ رضائی کیونکہ آج کل جنٹلمینوں کے سفر کا اصول یہی ہے کہ سفر میں اسباب ساتھ نہیں لیتے۔ جب ریل چھوٹ گئی تو میں نے اُن سے پوچھا کہ آپ لکھنؤ جائیں گے؟ کہنے لگے میں میرٹھ جا رہا ہوں۔ میں نے کہا کہ ممکن ہے کہ آپ میرٹھ جا رہے ہوں لیکن میں افسوس کرتا ہوں، یہ گاڑی لکھنؤ جا رہی ہے۔ میں نے انہیں کے محاورہ میں گفتگو کی، اب تو بڑے چونکے۔ کہنے لگے کیا یہ گاڑی لکھنؤ جا رہی ہے؟ میں نے کہا، ہاں! پھر تو اُن کی یہ حالت تھی کہ بار بار لاحول پڑھتے ہیں اور اِدھر اُدھر دیکھتے جاتے ہیں۔ میں نے کہا، میاں! اب تو رڑکی سے اس طرف یہ گاڑی ٹھہرتی نہیں، پریشان ہونے سے کیا حاصل، اطمینان سے بیٹھو اور باتیں کرو۔ تو وہ جھلا کر کہتے ہیں کہ تم کو باتوں کی سوجھی ہے اور مجھے پریشانی

ہو رہی ہے۔

اس وقت میں نے اپنی اور ان کی حالت میں غور کیا کہ حالانکہ میں ابھی تک منزل پر نہیں پہنچا اور یہ ابھی اپنے مقصود سے بہت دور نہیں ہوئے بلکہ لوٹتی گاڑی میں یہ اپنی منزل مقصود پر مجھ سے پہلے پہنچ جائیں گے مگر پھر بھی میں مطمئن ہوں اور یہ غیر مطمئن، تو آخر میرے اطمینان اور ان کی بے اطمینانی کا سبب کیا ہے۔ تو یہی معلوم ہوا کہ میرے اطمینان کا سبب یہ تھا کہ میں راہ پر تھا اور ان کی بے اطمینانی کا سبب یہ تھا کہ وہ راہ سے ہٹے ہوئے تھے اس وقت ریل جس قدر مسافت طے کرتی تھی مجھے مسرت و راحت بڑھتی تھی اور ان کو ہر ہر قدم خار تھا۔

تو اس واقعہ سے آیت کی تفسیر واضح ہوئی کہ اُولٰئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ بھی ایک بڑا ثمرہ ہے اور ہدایت پر ہونا بڑی نعمت اور بڑی دولت ہے۔ یہ ثمرہ دنیا میں ہر مسلمان کو حاصل ہے کافر کو یہ بات نصیب نہیں۔

صدقہ جاریہ

پھر مزید برآں یہ بات سونے پر سہاگہ ہے کہ اعمال صالحہ باقیاتِ صالحات بھی ہیں کہ آخرت میں ان کا اجر ہمیشہ کے لئے باقی رہنے والا ہے۔ پھر اس بقاء میں بھی تفصیل ہے کہ بعض اعمال تو مطلقاً باقیات ہیں اور بعض کو انقی کہنا چاہیے جیسے مدرسہ اور خانقاہ کہ یہ صدقاتِ جاریہ ہیں۔ یعنی بعض اعمال کی تو یہ حالت ہے کہ زندگی کے بعد ان کا ثواب نہیں بڑھتا۔ بس جتنا ثواب زندگی میں کما چکے ہو، وہی باقی رہے گا۔ اب اس میں ترقی نہ ہو گی اور صدقاتِ جاریہ کا ثواب مرنے کے بعد بھی برابر بڑھتا رہتا ہے۔ تم قبر میں پڑے سو رہے ہو گے اور اس وقت بھی فرشتے نامۂ اعمال میں ثواب لکھتے ہوں گے۔ تو مدرسہ اور

خانقاہ کی بنا ایسے ہی اعمال ہیں جن کا ثواب مرنے کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔ مگر آج کل خانقاہ بنانے والوں کو چاہیئے کہ خانقاہ کے نام سے نہ بنائیں بلکہ مدرسہ ہی کے نام سے بنائیں اور اُس میں کام کریں خانقاہ کا کیونکہ ایک تو خانقاہ کے نام سے شہرت زیادہ ہوتی ہے دوسرے بعد میں خانقاہ کے اندر بدعات ہونے لگتی ہیں۔ کوئی عرس کرتا ہے، کوئی قوالی کرتا ہے، پھر گدّی نشینی کا قصہ ہوتا ہے جس میں بہت جھگڑے اور فساد ہوتے ہیں۔ اس سے بہتر یہ ہے کہ خانقاہ کا نام نہ کیا جائے بلکہ مدرسہ بناؤ اور اُس میں ترتیب اخلاق اور تعلیم سلوک کا کام کرو کہ وہی حقیقی مدرسہ بھی ہوگا اور وہی خانقاہ بھی ہوگی۔ پس حقیقی مدرسہ وہ ہے جس میں علم کے ساتھ عمل کی بھی تعلیم اور نگہداشت ہو۔ پس اے مدرسہ والو تم اپنے مدرسوں کی سنبھال کرو اور اُن کو حقیقی مدرسہ بناؤ یعنی طلباء کے اعمال کی بھی نگہداشت کرو، ورنہ یاد رکھو۔

كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ

کے قاعدہ پر آپ سے اس کے متعلق سوال ہوگا کیونکہ آپ طلباء کے نگہبان ہیں اور وہ آپ کی رعایا ہیں۔ پس یہ جائز نہیں کہ آپ طلباء کو سبق پڑھا کر الگ ہو جائیں بلکہ یہ بھی دیکھتے رہو کہ ان میں سے کون علم پر عمل کرتا ہے اور کون عمل نہیں کرتا۔ جس کو عمل کا اہتمام ہو اُسے پڑھاؤ ورنہ مدرسہ سے نکال باہر کرو۔ جب تو آپ کا مدرسہ واقعی دار العلم ہوگا ورنہ وہ دارِ ظلم بلغت فارسی ہوگا کہ اس میں علم کو سولی دی گئی ہے۔ طلباء کے تمام افعال کی نگہداشت کرو۔ لباس کی بھی دیکھ بھال رکھو، جو لوگ کوٹ پتلون بوٹ وغیرہ پہنتے ہوں، اُن کو لباس اہلِ علم کی ہدایت کرو، ورنہ مدرسہ سے الگ کرو چاہے مشابہت تامہ ہو یا مشابہت ناقصہ، سب کا انتظام کرو اور اُن سے صاف

کہہ دو ہے

با مکن با پیلبانان دوستی! یا بنا کن خانہ بر انداز پیل

کہ اگر علم حاصل کرنا ہے تو طالب علموں کی سی صورت بناؤ، ورنہ رخصت یہ تو علماء سے خطاب تھا، اب عوام کو خطاب کرتا ہوں کہ آپ مدرسہ کی خدمت کریں۔ مدرسہ کے جس کام میں بھی آپ امداد کریں گے یہ تمام باقیات الصالحات ہوں گے۔ بعض لوگ صرف تعلیم کی امداد کو صدقہ جاریہ سمجھتے ہیں، یہ غلط ہے بلکہ مدرسہ کی تعمیر اور طلباء کے کھانے پینے اور کپڑے کی امداد سب صدقاتِ جاریہ ہیں کیونکہ سب سے تعلیم ہی کو امداد پہنچتی ہے۔ پھر جب یہ لوگ پڑھ کر فارغ ہوں گے اور مخلوق کو جا کر تعلیم دیں گے تو ہمیشہ آپ کو اس کا ثواب ملتا رہے گا جب تک اس مدرسہ کے طلبا سے علم کا فیض چلے گا برابر آپ کے نامۂ اعمال میں ثواب درج ہوتا رہے گا۔ تو یہ کتنی خوشی کی بات ہے کہ مدرسہ کی امداد تو آپ نے پچاس برس تک یا کسی کی بہت عمر ہوئی تو سو برس تک کی اور نامۂ اعمال میں ثواب لکھا گیا ہزار برس تک بلکہ قرب قیامت تک کیونکہ انشاء اللہ قرب قیامت تک علم کا چرچا دنیا میں رہے گا۔ اور اگر اپنی زندگی میں آپ نے ان کاموں میں امداد نہ کی تو روپیہ تو صرف ہو ہی جائے گا، وہ تو باقی نہ رہے گا مگر فضول یا ناجائز مواقع میں صرف ہوگا یا بعد میں ورثاء گلچھرے اڑائیں گے اور ان گناہوں کے آثار آپ کے نامۂ اعمال میں باقی رہیں گے۔

جیسے ایک شخص کی عادت تھی کہ وہ روز بستر پر پیشاب کر لیا کرتا تھا۔ اس کی بیوی نے ملامت کی کہ یہ کیا خرافات ہے کہ تم اتنے بڑے ہو کر

بستر پر پیشاب کرتے ہو۔ میں روز بستر کو دھوتی دھوتی تھک گئی۔ کہنے لگا کیا بتلاؤں، رات کو ہر روز شیطان خواب میں آتا ہے کہ آؤ تمہیں سیر کرا لاؤں پھر کہیں راستہ میں پیشاب کی ضرورت ہو جاتی ہے تو میں خواب کے اندر قدمچہ پر بیٹھ کر پیشاب کرتا ہوں وہ بستر پر نکل جاتا ہے۔ بیوی کہنے لگی کہ جب شیطان تمہارا اتنا بڑا دوست ہے تو آج اس سے یہ کہنا کہ تیری دوستی کس کام آئے گی۔ ہم غریب آدمی ہیں کہیں سے ہم کو بہت سے روپے دلوا دے۔ مرد نے کہا، بہت اچھا آج ضرور کہوں گا۔ چنانچہ رات ہوئی اور شیطان آیا تو آپ نے بیوی کا پیغام پہنچایا۔ شیطان نے کہا، تمہارے واسطے روپے بہت۔ ایک خزانہ میں اس کو لے گیا اور اس کی کمر پر اتنے روپے لاد دے کہ میاں کا پاخانہ نکل گیا۔ صبح کو جو آنکھ کھلی تو بستر سے پر پاخانہ تو موجود اور روپے غائب۔ بیوی نے کہا، یہ کیا؟ آپ نے سارا قصہ سنایا۔ وہ کہنے لگی، بس جی میں ایسے روپوں سے باز آئی، تم روز پیشاب ہی کر لیا کرو، پاخانہ مت کرو۔

تو اسی طرح گناہ کے کاموں میں روپیہ صرف کرنے کا یہ انجام ہو گا کہ روپیہ تو غائب ہو جائے گا اور نامۂ اعمال میں اس کے گناہ باقی رہیں گے پھر جہنم کا عذاب الگ رہا۔ اس لئے ضرورت ہے کہ اعمال صالحہ کا اہتمام کرو اور اپنی کمائی کو اچھے موقع میں صرف کرو اور گناہوں سے بچنے کا اہتمام کرو۔ اور حق تعالیٰ کی رضا اور اس کی اطاعت میں کوشش کرو۔

اب میں ختم کرتا ہوں اور آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ مدرسہ کی جو کچھ کارروائی اس وقت ہو گی اس کو دیکھ کر جائیں۔ بیان کے بعد منتشر نہ ہوں اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ توفیق عمل اور فہم سلیم عطا فرمائیں۔ منبر سے اترتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ اس بیان کا نام مظاہر الاموال رکھ دیا جائے

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہٖ سیدنا ومولانا محمد وعلیٰ آلہ
واصحابہٖ اجمعین وآخر دعوینا ان الحمد للہ رب العلمین۔

سبیل النجاح

حصولِ فلاح کے متعلق یہ وعظ ۱۶ صفر المظفر ۱۳۳۱ھ کو جامع مسجد قنوج میں منبر پر بیٹھ کر بیان فرمایا جو اڑھائی گھنٹوں میں ختم ہوا۔ جسے مولانا سعید احمد صاحب نے قلمبند فرمایا

اگر آپ کو فلاح کی تمنّا ہے ـــــ فلاحِ دنیا کی تبعاً اور فلاحِ آخرت کی قصداً ـــــ تو اس کی یہ صورت ہے کہ دین کو اختیار کرو اور اس کے احکام پر عمل کرو۔ کیوں کہ حق تعالیٰ نے فلاح کو انہی پر مترتب فرمایا ہے ـــــ !!!

خطبۂ ماثورہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الحمد للہ نحمدہٗ ونستعینہٗ ونستغفرہٗ ونؤمن
بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا و
من سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہٗ
ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا اللہ
وحدہٗ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا
محمدًا عبدہٗ ورسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ
آلہ واصحابہ وبارک وسلم امابعد فاعوذ باللہ من
الشیطان الرجیم ۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم ۔
یاایھا الذین اٰمنوا اصبروا وصابروا ورابطوا واتقوا اللہ
لعلکم تفلحون ۔

شفقتِ الٰہی

یہ آیت سورۂ آل عمران کے خاتمہ کی ہے۔ سورۂ آل عمران میں حق تعالیٰ نے مختلف ابواب کے احکام بیان فرمائے ہیں جیسا کہ اُن کی تفصیل مطالعہ سے معلوم ہوسکتی ہے۔ ان سب احکام کو بیان فرماکر خاتمہ پر انہی احکام کے متعلق چند ضروری امور بیان فرماتے ہیں جن پر اُن کی تکمیل موقوف ہے اور جس طرح یہ تکملہ ہیں اُن احکام کا اسی طرح ان کی تسہیل کرنے والے بھی ہیں۔ اور یہاں سے آپ کو قرآن کا حُسنِ ختام معلوم ہوگا کہ جس طرح قرآن کے مضامین بے نظیر ہیں، اسی طرح اس کا اختتام اور افتتاح بھی بے نظیر ہے۔ عموماً خاتمہ سورت پر جو مضمون ذکر کیا جاتا ہے وہ تمام سورت کا خلاصہ اور اُس کے احکام کا تکملہ اور اُن کو سہل کرنے والا ہوتا ہے اور اس میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ شانہٗ کو اپنے بندوں پر بہت ہی شفقت ہے کہ جن مضامین کو تسہیل میں کچھ بھی دخل ہے اُن کو چھوڑا نہیں بلکہ احکام بیان فرماکر

اُن کی تسہیل کا طریقہ بھی بیان فرما دیا ہے۔

یہی فرق ہے وحی اور غیر وحی میں۔ کلامِ غیر وحی میں اتنے دقائق کی رعایت نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ جب متکلم غیر صاحب وحی ہو گا تو اُس کی نظر جو کہ مدار ہے کلام کا ضرور قاصر ہو گی اور اُس کے کلام میں یہ بڑی کمی ہو گی کہ اس میں دقیق شقوں پر نظر نہیں اور صاحب وحی کی نظر محیط ہوتی ہے۔ اس لئے اگر خود اُس کا کلام بھی ہو تب بھی امداد وحی سے اُس کی نظر تمام شقوں پر گہری ہوتی ہے اور اگر اس کے کلام میں کوئی شق دشوار ہوتی ہے تو وہ دشواری کو معلوم کر کے اس کی تسہیل بھی ساتھ ساتھ کر دیتا ہے اور اگر وہ بعینہٖ وحی کا ناقل ہے تو یہ وصف اُس میں اعلیٰ اور بالاولیٰ ہو گا۔ غیر صاحب وحی کو اوّل تو بوجہ قصورِ نظر کے یہی معلوم نہیں ہوتا کہ میرے کلام میں کوئی شق دشوار بھی ہے اور اگر معلوم بھی ہو جائے تو وہ اس کی تسہیل پر قادر نہیں ہوتا۔ اور صاحب وحی کی نظر چونکہ محیط ہوتی ہے اس لئے وہ تمام شقوں کی رعایت کر لیتا ہے اوّل تو اس کے کلام میں کوئی شق فی نفسہٖ دشوار بھی نہیں ہوتی اور اگر کسی عارض سے مثلاً یہ کہ مخاطب اب تک آزادی کا عادی رہا ہے پابندی سے گھبراتا ہے کوئی شق ظاہر میں دشوار بھی ہو تو وہ اُس کے آسان اور سہل کرنے کا طریقہ بھی بتلا دیتا ہے۔ اور صاحب وحی کے جیسا کہ اوپر بھی اشارہ ہوا ہے دو معنی ہیں ایک تو وحی کا نازل کرنے والا یعنی خدا تعالیٰ، دوسرے وہ جس پر وحی نازل ہو یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم۔ سو اگر صاحب وحی سے مراد حق تعالیٰ ہیں تو اُن کی نظر کا محیط ہونا ظاہر ہے اور اگر صاحب وحی سے مراد دوسرے معنی کے اعتبار سے نبی منزل علیہ ہیں تو اُن کی نظر کا محیط ہونا بھی دلیل سے ثابت ہے کیونکہ آپ کو نبوت و رسالت ایک وہبی صفت بطور منصب کے عطا

ہوئی ہے اور مناصب موہوبہ میں نقص نہیں ہوتا۔ جب حق تعالیٰ کی طرف سے ایک وہبی منصب کسی کو عطا ہوتا ہے، تو اس کے خواص بھی علی وجہ الکمال عطا ہوتے ہیں۔

عصمتِ انبیاءؑ

دیکھیئے دنیا میں اگر کوئی حاکم کسی کو کوئی عہدہ دیتا ہے تو اپنے نزدیک وہ انتخاب میں کوتاہی نہیں کرتا۔ پھر اگر انتخاب کرنے والے خدا تعالیٰ ہوں تو اس انتخاب میں غلطی کا بھی احتمال نہیں۔ حکام دنیا اپنی طرف سے گو انتخاب میں کمی نہ کریں مگر ان کے انتخاب میں غلطی ممکن ہے لیکن حق تعالیٰ کے انتخاب میں غلطی نہیں ہو سکتی۔ اور یہی وجہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام علماً و عملاً ہر طرح کامل ہوتے ہیں۔ اسی لئے اہل حق نے انبیاء علیہم السلام کو معصوم کہا ہے۔ جس کا حاصل کمال عمل ہے۔ کیونکہ اگر عصمت نہ ہو اور نبی سے گناہ سرزد ہو سکیں، تو اس کے معنے یہ ہوئے کہ اس کا عمل ناقص ہے۔ کمالِ عمل یہی ہے کہ کوئی کام رضاء حق کے خلاف سرزد نہ ہو سکے اور نبی کے لئے یہ کمال لازم ہے کیونکہ ان کو حق تعالیٰ نے ایک منصب عطا فرمایا ہے اور منصب عطا کرنے میں چند امور کا لحاظ ضروری ہے۔

ایک یہ کہ جس کو وہ منصب دیا گیا ہے اس میں اس منصب کی اہلیت ہو تاکہ وہ اس کے فرائض کو بخوبی انجام دے سکے۔ دوسرے یہ کہ وہ منصب عطا کنندہ کا پورا مطیع و تابعدار ہو۔

مثلاً اگر بادشاہ کسی کو وائسرائے بنا کر بھیجے تو وہ دو باتوں پر نظر کرے گا۔ ایک یہ کہ اس کو انتظامِ ملکی کا سلیقہ اعلیٰ درجہ کا ہو۔ دوسرے یہ کہ اس میں گورنمنٹ کی اطاعت پوری پوری ہو۔ مخالفت اور بغاوت کا شائبہ بھی

نہ ہو۔ کوئی بادشاہ ایسے شخص کو عہدہ نہیں دیا کرتا جس میں ذرا بھی مخالفت و بغاوت کا احتمال و شائبہ ہو۔ پس اگر کوئی شخص والسرائے میں قابلیت انتظام کی کمی کا عیب نکالے یا اس کی وفاداری پر اعتراض کرے تو حقیقت میں یہ اعتراض بادشاہ پر ہوگا کیونکہ اسی نے اس کو یہ منصب دیا ہے۔ پس اعتراض کا حاصل یہ ہوگا کہ بادشاہ نے ایک ناقابل کو یا مخالف گورنمنٹ کو والسرائے بنایا ہے اور اس صورت میں معترض پر توہین شاہی کا جرم قائم کیا جائے گا لیکن والسرائے پر اعتراض کرنے میں ممکن ہے کہ کسی وقت معترض ہی حق بجانب ہو کیونکہ شاہان دنیا کا علم محیط نہیں اس لئے ان سے انتخاب میں غلطی ہوجانا بعید نہیں لیکن خدا تعالیٰ کے اوپر تو اس اعتراض کی کسی طرح بھی گنجائش نہیں۔ تو جس کو حق تعالیٰ اپنے انتخاب سے کوئی عہدہ دیں اس میں اس عہدہ کی پوری قابلیت اور خدا تعالیٰ کی کامل اطاعت کا ہونا لابدی ہے۔

تو معلوم ہوا کہ انبیاء علیہم السلام کو جو عہدہ دیا جاتا ہے اس میں وہ علماً کامل ہوتے ہیں اور چونکہ خدا تعالیٰ نے ان کو اپنے انتخاب سے ایک منصب دیا ہے تو ان میں مخالفت و نافرمانی حق کا شائبہ بھی نہیں ہوسکتا جس کا حاصل یہ ہے کہ وہ عملاً کامل ہوتے ہیں اور یہی معنی ہیں عصمت کے۔ پس اگر کوئی شخص انبیاء علیہم السلام کے علم و عمل پر کسی قسم کا اعتراض کرے تو وہ حقیقت وہ خدا تعالیٰ پر اعتراض ہے۔ پس نبوت کے ساتھ مخالفت حق ممکن ہی نہیں اور یہاں سے معلوم ہوگیا کہ عصمت انبیاء علیہم السلام کا مسئلہ محض نقلی نہیں بلکہ عقلی بھی ہے۔

نیز انبیاء علیہم السلام کے علوم میں بھی نقص ممکن نہیں بلکہ ان کے علوم کامل ہوتے ہیں یعنی وہ علوم جن کی اس منصب میں ضرورت ہے۔ کیونکہ حق

تعالیٰ ایسے شخص کو کسی عہدہ کے واسطے منتخب نہیں کر سکتے جس میں اس منصب کی قابلیت نہ ہو۔ اور قابلیت کے معنی ہی یہ ہیں کہ اس منصب کو جن علوم کی ضرورت ہو وہ اس شخص کو کامل طور پر حاصل ہوں۔

ہاں یہ ضرور نہیں کہ اس منصب کے علاوہ دیگر امور کا بھی اُسے علم ہو کیونکہ تحصیلدار کو اُنہی علوم کی ضرورت ہے جن کو تحصیلداری سے تعلق ہے یعنی قانون۔ اسی طرح اگر کسی کو طبیب اور معالج بنایا جاوے تو اس کو انہی علوم میں کامل ہونا چاہیئے جن کو طب سے تعلق ہے یعنے صحت و مرض وغیرہ۔ اسی طرح انبیاء علیہم السلام کا بھی انہی علوم میں کامل ہونا ضروری ہے جو نبوت کے متعلق ہیں۔ اور ان علوم میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اُن کی نظر مصالح عباد میں وسیع ہو۔ اس لئے اگر صاحب وحی سے مراد نبی ہے تو اُس کی نظر بھی مصالح عباد میں اس وجہ سے وسیع ہونا چاہیئے کہ خدا تعالیٰ نے وہی طور پر اُن کو نبوت کا منصب عطا فرمایا ہے۔ جس کا تعلق مصالح عباد سے ہے۔ بہر حال یہ دعویٰ ثابت ہو گیا کہ وحی میں تمام پہلوؤں کی اعلیٰ درجہ کی رعایت ہوئی اسی لئے قرآن میں ہر پہلو کی ایسی رعایت ہے کہ کسی کلام میں ویسی رعایت نہیں ہے۔

ربط کلام الہٰی

قرآن میں صرف ضابطہ کو پورا نہیں کیا گیا۔ اس مضمون کو آپ سہولت سے یوں سمجھیں گے کہ حکام دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جو محض ضابطہ کے پابند ہیں۔ ضابطہ کی رو سے جو کام اُن پر واجب ہے وہ کر دیا۔ اور قانون کے موافق رعایا پر احکام لازم کر دیئے۔ اُن کو اس کی ضرورت نہیں کہ دشوار احکام کو قانون سے خارج کریں یا اُن کے سہل و آسان کرنے کی تدبیر بتائیں

دوسرے وہ حکام ہیں جن کو رعایا سے محبت ہوتی ہے اور مخلوق کو راحت پہنچانا چاہتے ہیں۔ وہ حتی الامکان قانون میں کوئی دشوار حکم داخل نہیں کرتے اور اگر کسی مصلحت سے کوئی دشوار حکم رکھتے بھی ہیں تو رعایا کو اس کے سہل کرنے کی تدبیر بھی بتلاتے ہیں۔ اور اس تجویز میں اُن پر تعب ضرور ہوتا ہے مگر یہ شفقت پر مبنی ہے۔ اتنی رعائتیں وہی حاکم کر سکتا ہے جس کو رعایا پر شفقت ہو۔

اسی طرح ایک اور مثال سمجھئے کہ نصیحت کرنے والا ایک تو استاد ہوتا ہے اور ایک باپ ہوتا ہے۔ باپ کی نصیحت میں عام لوگوں کی نصیحت سے فرق ہوتا ہے۔ اُستاد تو ضابطہ پُری کر دیتا ہے مگر باپ ضابطہ پُری نہیں کر سکتا، وہ نصیحت کرتے ہوئے اس کا خیال رکھتا ہے کہ بیٹے کو ایسے عنوان اور ایسے طرز سے نصیحت کروں جو اُس کے دل میں گھر کر لے کیونکہ وہ دل سے یہ چاہتا ہے کہ بیٹے کی اصلاح ہو جائے اور اس میں کوئی کمی نہ رہ جائے اور اگر وہ کوئی مشکل کام بھی بتلاتا ہے تو اس کا طریقہ وہ اختیار کرتا ہے جس سے بیٹے کو عمل آسان ہو جائے اور ان سب رعائتوں کا منشا وہی شفقت ہے، شفقت ہی کے ساتھ تمام پہلوؤں کی رعایت کی جا سکتی ہے اور اسی لئے باپ کا کلام نصیحت کے وقت کبھی بے ربط اور بے ترتیب بھی ہو جاتا ہے۔

مثلاً باپ بیٹے کو کھانا کھاتے ہوئے نصیحت کرے کہ بُری صحبت میں نہیں بیٹھا کرتے اور اس مضمون پر وہ مفصل گفتگو کر رہا ہو۔ اسی درمیان میں اُس نے دیکھا کہ بیٹے نے ایک بڑا سا لقمہ کھانے کو لیا ہے تو وہ فوراً پہلی نصیحت کو قطع کر کے کہے گا کہ یہ کیا حرکت ہے، لقمہ بڑا نہیں لیا کرتے

اس کے بعد پھر پہلی بات پر گفتگو شروع کر دے گا۔ اب جس کو شفقت کی اطلاع نہ ہو وہ کہے گا کہ یہ کیسا بے ترتیب کلام ہے۔ بڑی صحبت سے منع کرنے میں لقمہ کا کیا ذکر! مگر جو شخص کبھی کسی کا باپ بنا ہے، وہ جانتا ہے کہ یہ بے ترتیب کلام مرتب و مرتبط کلام سے افضل ہے۔ شفقت کا مقتضا یہی ہے کہ ایک بات کرتے ہوئے اگر دوسری بات کی ضرورت ہو، تو ربط کا لحاظ نہ کرے۔ دوسری بات کو بیچ میں کہہ کر پھر پہلی بات کو پورا کرے۔

یہی راز ہے اس کا کہ خدا تعالیٰ کا کلام ظاہر میں کہیں بے ربط بھی معلوم ہوتا ہے۔ اس ظاہری بے ربطی کا منشا شفقت ہی ہے کہ حق تعالیٰ مصنفین کی طرح گفتگو نہیں کرتے کہ ایک مضمون پر کلام شروع ہو، تو دوسرے باب کا کوئی مضمون اس میں نہ آ سکے، بلکہ وہ ایک مضمون کو بیان فرماتے ہوئے اگر کسی دوسرے امر پر تنبیہ کی ضرورت دیکھتے ہیں تو شفقت کی وجہ سے درمیان میں فوراً اس پر بھی تنبیہ فرما دیتے ہیں۔ اس کے بعد پھر پہلا مضمون شروع ہو جاتا ہے۔

چنانچہ ایک آیت مجھے یاد آئی جس پر لوگوں نے غیر مرتبط ہونے کا اعتراض کیا ہے۔ سورۂ قیامہ میں حق تعالیٰ نے قیامت کا حال بیان فرمایا ہے کہ انسان اس وقت بڑا پریشان ہوگا اور بھاگنے کا موقعہ ڈھونڈے گا۔ اپنے اعمال پر اسے اطلاع ہو گی۔ اس روز اس کو سب "اگلے، پچھلے کئے ہوئے کام جتلا دیئے جائیں گے۔ پھر فرماتے ہیں۔

بَلِ الْإِنسَانُ عَلَىٰ نَفْسِهِ بَصِيرَةٌ ۝ وَلَوْ أَلْقَىٰ مَعَاذِيرَهُ ط

یعنے (انسان کا اپنے اعمال سے آگاہ ہونا کچھ اس جتلانے پر موقوف نہ ہوگا

بلکہ اُس دن) انسان اپنے نفس (کے احوال و اعمال) سے خوب واقف ہے (کیونکہ اس وقت حقائق کا انکشاف ضروری ہو جائے گا) اگرچہ وہ (بااقتضائے طبیعت) کتنے ہی بہانے بنائے۔ جیسے کفار کہیں گے، واللہ! ہم تو مشرک نہ تھے مگر دل میں خود بھی جانیں گے کہ ہم جھوٹے ہیں۔ غرض انسان اس روز اپنے سب احوال کو خوب جانتا ہو گا۔ اس لئے یہ جتلانا محض قطع جواب اور اتمامِ حجت اور دھمکی کے لئے ہو گا نہ کہ یاد دہانی کے لئے۔ یہاں تک تو قیامت ہی کے متعلق مضمون ہے، اس کے بعد فرماتے ہیں۔

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ط ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ط

اس کا مطلب یہ ہے کہ حضورؐ کو ارشاد فرماتے ہیں کہ قرآن نازل ہوتے ہوئے اس کے یاد کرنے کے خیال سے زبان نہ ہلایا کیجئے۔ ہمارے ذمہ ہے آپ کے دل میں قرآن کا جما دینا اور زبان سے پڑھوا دینا۔ تو جب ہم قرآن نازل کریں اس وقت فرشتے کی قرائت کا اتباع کیجئے۔ پھر یہ بھی ہمارے ذمہ ہے کہ آپ قرآن کا مطلب بھی بیان کر دیں گے۔ اس کے بعد پھر قیامت کا مضمون ہے۔

كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ۔

کہ تم لوگ دنیا کے طالب ہو اور آخرت کو چھوڑتے ہو۔ پھر فرماتے ہیں۔

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ۔

بعضوں کے چہرے اس دن تر و تازہ ہوں گے۔ اپنے پروردگار کی طرف دیکھتے ہوں گے ــــــ الخ

تو لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ سے اوپر بھی قیامت کا ذکر ہے اور بعد کو

بھی اسی کا ذکر ہے اور درمیان میں یہ مضمون ہے کہ قرآن پڑھتے ہوئے جلدی یاد کرنے کے لیئے زبان کو حرکت نہ دیا کیجئے۔ لوگ اس مقام کے ربط میں تھک تھک گئے ہیں اور بہت سی توجیہات بیان کی ہیں مگر سب میں تکلف ہے اور کسی نے خوب کہا ہے

"کلامیکہ محتاج معنی باشد لایعنی ست۔"

تو جس کو حق تعالیٰ کے اس تعلق کا علم ہے جو حق تعالیٰ کو حضورؐ کے ساتھ ہے، اس کو آفتاب کی طرح نظر آتا ہے کہ اس کلام کا درمیان میں کیا موقع ہے۔ صاحبو! اس کا وہی موقع ہے جیسے وہ باپ اپنے بیٹے کو نصیحت کر رہا تھا کہ بری صحبت میں نہیں بیٹھا کرتے اور اس کے مفاسد بیان کر رہا تھا کہ درمیان میں بیٹے کو بڑا سا لقمہ اٹھاتے ہوئے دیکھ کر کہنے لگا یہ کیا حرکت ہے لقمہ بڑا نہیں لیا کرتے۔ تو ظاہر میں لقمہ کا ذکر ترتیب کلام سے بالکل بے ربط ہے لیکن جو باپ ہوا ہو گا، وہ جانے گا کہ نصیحت کرتے کرتے درمیان میں لقمہ کا ذکر اس لیئے کیا گیا کہ لڑکے نے بڑا لقمہ لیا تھا باپ نے فرطِ شفقت سے درمیان کلام میں اس پر بھی تنبیہ کر دی۔ اسی طرح یہاں بھی حق تعالیٰ قیامت کا ذکر فرما رہے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس خیال سے کہ کہیں یہ آیتیں ذہن سے نہ نکل جائیں جلدی جلدی ساتھ ساتھ پڑھ رہے تھے تو درمیان میں خدا تعالیٰ نے فرطِ شفقت سے اس کا بھی ذکر فرما دیا کہ آپ یاد کرنے کی فکر نہ کریں۔ یہ کام ہم نے اپنے ذمہ لے لیا ہے۔ آپ بے فکر ہو کر سنتے رہا کریں۔ قرآن آپ کے دل میں خود بخود محفوظ ہو جائے گا۔ تو اس مضمون کو درمیان میں ذکر فرمانے کی وجہ فرطِ شفقت ہے اور اس کا مقتضا یہ تھا کہ اگر یہاں بالکل بھی ربط نہ ہو، تو یہ بے ربطی ہزار ربط سے

افضل تھی۔ مگر پھر بھی باوجود اس کے ایک مستقل ربط بھی ہے۔ اور یہ خدا ہی کے کلام کا اعجاز ہے کہ جہاں ربط کی ضرورت نہ ہو، وہاں بھی کلام میں ربط موجود ہے۔ چنانچہ جو رسالے ربط کے باب میں لکھے گئے ہیں اُن سے اس آیت کا مضمونِ قیامت سے ربط معلوم ہو سکتا ہے۔ میں نے بھی اپنے ایک رسالہ عربی میں اور اپنی تفسیر کے اندر اردو میں اس کا ماقبل سے ارتباط بیان کیا ہے جو کہ تبرع اور احسان کے درجہ میں ہے ورنہ یہاں ربط کی ضرورت ہی نہ تھی۔

شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ جب ربط کی ضرورت نہ تھی تو ممکن ہے کہ یہ روابط سب مخترع ہوں پھر اُن کی حاجت ہی کیا تھی؟ (کیونکہ تقریر سابق سے یہ معلوم ہو چکا ہے کہ فرطِ شفقت کا مقتضا یہ ہے کہ ترتیب و ربط کا لحاظ نہ کیا جائے بلکہ مخاطب کی ضرورت کے موافق کلام کیا جائے چاہے ربط ہو یا نہ ہو۔ اور قرآن کا طرزِ کلام یہی ہے۔ تو اس صورت میں جو کچھ ربط بیان کیا جائے گا وہ مخترع ہوگا کیونکہ متکلم نے ارتباط کا لحاظ کیا ہی نہیں)، اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن میں باوجود طرزِ تصنیف اختیار نہ کرنے اور

لہ چنانچہ رسالہ سبق الغایات میں اس آیت کا ربط ماقبل سے اوّل وہی تحریر فرمایا ہے جو اس جگہ بیان ہوا کہ درمیان میں فرطِ شفقت سے حضورؐ کو تحریکِ لسان سے اس لئے منع فرما دیا کہ آپؐ غالباً اُس وقت خود بھی پڑھنے لگے تھے۔ دوسرا ربط نقلاً عن القفال یہ تحریر فرمایا ہے کہ لاتحرک بہ لسانک سے حضورؐ کو خطاب نہیں بلکہ یہ خطاب قیامت میں انسان کو ہوگا کہ نامۂ اعمال کے پڑھنے میں جلدی نہ کر۔ ہم تیرے سب اعمال جتلاتے ہیں تو نامۂ اعمال کو دیکھنا رہ اور ہماری

شفقت کا طرز اختیار کرنے کے پھر بھی ربط کا لحاظ کیا گیا ہے۔ اس لئے مفسرین کے بیان کردہ روابط مخترع نہیں ہیں۔

اس ربط ملحوظ فرمانے کی دلیل یہ ہے کہ احادیث سے ثابت ہے کہ ترتیب نزول آیات اور ہے اور ترتیب تلاوت و مصحف اور ہے یعنے قرآن کا نزول تو واقعات کے موافق ہوا کہ ایک واقعہ پیش آیا اور اس کے متعلق ایک آیت نازل ہو گئی۔ پھر دوسرا واقعہ پیش آیا تو دوسری آیت نازل ہو گئی وعلیٰ ہذا۔ تو ترتیب نزول تو حسب واقعات ہے۔ اگر تلاوت میں بھی یہی ترتیب رہتی تو واقعی ربط کی کوئی ضرورت نہ تھی لیکن ترتیب تلاوت خود جناب باری تعالیٰ عزاسمہ نے بدل دی۔ یعنی حدیث میں آتا ہے کہ جب کوئی

(بقیہ حاشیہ از صفحہ ۵۷۷) تقریر ستارہ الخ۔ اور تفسیر میں لا تحرک بہ لسانک سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو خطاب مان کر ربط یہ بیان فرمایا ہے کہ اوپر یہ معلوم ہو چکا ہے کہ انسان کو قیامت میں اس کے تمام اعمال پر مطلع کیا جائے گا اور اس کا مطلع ہونا جتلانے پر موقوف نہ ہوگا بلکہ علم ضروری کے طور پر وہ خود بھی اپنے نفس کے سب احوال سے خوب واقف ہو گا۔ اس سے دو مضمون مستفاد ہوئے۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ تمام اشیاء کے عالم اور محیط ہیں۔ دوسرے یہ کہ حق تعالیٰ کی عادت ہے کہ وہ کسی حکمت سے بعض دفعہ مخلوق کے ذہن میں بہت سے غائب شدہ علوم کو دفعتہً حاضر کر دیتے ہیں گو ان علوم غائبہ کثیرہ کا دفعتہً حاضر ہو جانا عادت طبعی کے خلاف ہو جیسا کہ قیامت میں ایسا کیا جائے گا۔ جب یہ بات ہے تو آپ نزول وحی کے وقت

آیت کسی واقعہ کے متعلق نازل ہوتی تو جبریل علیہ السلام بحکمِ خداوندی حضور ﷺ سے یہ کہتے کہ اس آیت کو مثلاً سورۃ بقر کی فلاں آیت کے بعد رکھا جائے اور اس کو فلاں آیت کے بعد اور اس کو فلاں سورت کے ساتھ وعلیٰ ہذا۔ تو مصحف میں ترتیب آیات ترتیب نزول پر نہیں بلکہ اس کی ترتیب حق تعالیٰ نے دوسری رکھی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جس آیت کو بھی کسی آیت کے ساتھ ملایا گیا ہے، دونوں میں کوئی مستقل ربط اور مناسبت اور تعلق ضرور ہے کیونکہ اگر اب بھی دونوں میں کوئی ربط نہ ہوا تو ترتیب نزول کا بدلنا مفید نہ ہوگا ــــــ تو عجب بے نظیر کلام ہے کہ باوجود ضرورتِ ربط نہ ہونے کے پھر بھی اس میں ربط ہے۔ اور پورا ربط ہے ـــ پس

یاد کرنے کی فکر کیوں کرتے ہیں بلکہ مطمئن ہو کر سنتے رہا کیجیے۔ ہم قرآن کو آپ کے دل میں جما دیں گے اور جب کبھی آپ پڑھنا چاہیں گے آپ کی زبان سے اس کو ادا کرا دیں گے۔ قلت وہذا اولیٰ مما قالہ القفال رحمہ اللہ لان نزول الآیۃ فی تحریک النبی صلی اللہ علیہ وسلم لسانہ وقت التنزیل مذکور فی الصحیحین فتاویل الآیۃ لغیرہ لایحسن ویعجبنی ایضاً ما قالہ الاستاذ العلامۃ الفاضل مولانا محمد اسحٰق البردوانی ان ہذہ الآیۃ مرتبطۃ بقولہ تعالیٰ بلیٰ قادرین علی ان نسوی، بنانہ بانہ لما کان سبحانہ وتعالیٰ قادراً علی جمع العظام (بقیہ حاشیہ از صت) وہی رمیم وعلی تسویۃ البنان وہی رفات فہو قادر بالاولیٰ علی جمع القرآن الازلی الابدی الذی لایزول ولا یفنی فی قلب حی مثلک یا محمد فلا تعالج من نزولہ شدۃ ولا تحرک بہ لسانک لتعجل بہ فللہ درہ ما ابہی دررہ واللہ تعالیٰ اعلم وعلمہ اتم واحکم ۱۲ جامع

خدا تعالیٰ کے کلام میں اس مستقل دلیل سے ہم ربط کے قائل ہیں لیکن اگر ربط نہ بھی ہوتا تب بھی قرآن پر اعتراض کی گنجائش نہ تھی۔ ہم کہہ سکتے تھے کہ قرآن میں طرزِ تصنیف نہیں اختیار کیا گیا بلکہ طرزِ نصیحت مع لحاظِ شفقت اختیار کیا گیا ہے ——'

قرآن کا طرزِ کلام

اس میں ضرورت مخاطب کے لحاظ سے گفتگو کی جاتی ہے جس کی بے ربطی ہزار ربط سے افضل ہوتی ہے اور یہی شفقت منشا ہے اس امر کا کہ قرآن کی ہر تعلیم کامل ہے جس میں تمام پہلوؤں کی پوری پوری رعایت کی جاتی ہے اور اسی وجہ سے حق تعالیٰ ہر سورت میں بہت سے احکام بیان فرما کر اخیر میں ایسی بات بیان فرماتے ہیں جو سب کی جامع ہوتی ہے اور جس پر عمل کرنے سے تمام احکامِ مذکورہ میں سہولت ہو جاتی ہے۔ چنانچہ سورۃ آل عمران میں مختلف ابواب کے احکام بیان فرما کر کلام کو ختم نہیں کیا بلکہ اخیر کی آیت میں بطور میزان الکل کے ایک بات ایسی بتلا دی، جو سب کو جامع ہے ——'

یہ ایسا ہے جیسا تفصیلی حساب کے بعد میزان دی جایا کرتی ہے اگرچہ مفصّل حساب بیان کرنے کے بعد میزان کی ضرورت نہیں ہوتی۔ مگر ظاہر ہے کہ میزان بیان کر دینے سے ایک قسم کا ضبط و تکرار ہو جاتا ہے مفصّل حساب کا یاد رہنا دشوار ہے اور میزان کا یاد رہنا آسان ہے۔

اسی طرح یہ آیت اخیرہ تمام سورت کی میزان ہے جس میں بالاجمال جملہ احکام مذکورہ داخل ہیں اور دیکھنے میں دو تین باتیں ہیں جن پر عمل بہت سہل ہے۔ خدا تعالیٰ نے اس بات کی رعایت ہر جگہ رکھی ہے۔ یہ طرز سوائے

قرآن کے کسی کلام میں بھی نہیں ہے کہ تمام باتوں کو ختم کر کے ایک بات ایسی بتلا دی جو سب کو جامع ہے۔

یہ ایسا ہے جیسے شفیق باپ مفصل نصیحتیں کر کے اخیر میں ایک گر بتلا دیتا ہے اور منشا اس کا شفقت ہے کہ لڑکے کو ساری باتیں شاید یاد نہ رہیں یا اتنی باتوں کو سن کر گھبرا جاوے تو اخیر میں ایک گر بتلا دیتا ہے کہ بس اس کو یاد کر لو ـــــــــ تو جس نے دوسروں کو شفقت سکھلائی اس کے کلام میں شفقت کی پوری رعایت کیوں نہ ہو گی۔

غرض اس مقام پر اس آیت میں وہی بات مذکور ہے جو ساری سورت میں بیان کی گئی ہے۔ اور اس میں ابہام نہیں ہے کہ ایک گول بات کہہ دی ہو جس کا مطلب بھی سمجھ میں نہ آوے بلکہ ساری سورت کا مضمون اس آیت میں اجمال کے ساتھ مذکور ہے (جس کو بلاغت میں ایجاز کہتے ہیں) کہ تھوڑے سے مختصر لفظوں میں بڑا مضمون ادا کر دیا جو تفصیل پر دلالت میں کافی وافی ہے اور اجمال کہنے کی یہ وجہ ہے کہ اس آیت میں ایک گونہ کلیت ہے اور ہر چند کہ کلیات کے تحت میں جزئیات سب ہوتے ہیں مگر بالاجمال ہوتے ہیں نہ کہ تفصیلاً۔

یہ ایسی بات ہے جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نے عرض کیا یارسول اللہ!

اِنَّ شَرَائِعَ الْاِسْلَامِ قَدْ کَثُرَتْ عَلَیَّ فَقُلْ لِیْ قَوْلًا اَحْفَظُہٗ وَاٰخُذُ بِہٖ (او کما قال)

کہ یارسول اللہ! احکام اسلام مجھ پر بہت زیادہ ہو گئے ہیں، آپ مجھے ایک بات ایسی بتلا دیجئے جس کو میں یاد کر لوں اور اسی کے موافق عمل کرتا

رسول ۔ آپ نے ارشاد فرمایا قل اٰمنت باللہ ثم استقم کہ تم یوں کہو کہ میں اللہ پر ایمان لایا پھر استقامت کے ساتھ رہو۔ حضورؐ نے ساری شریعت ابتدائ سے انتہا تک اس ایک جملہ میں بھر دی حالانکہ سائل نے ابتداء سے سوال بھی نہ کیا تھا پس اٰمنت باللہ میں آپ نے بالاجمال تمام اعتقادیات کو بیان فرمادیا اور ثم استقم میں اعمال کے اندر استقامت کی تعلیم دی ہے جس میں نماز، روزہ، حج زکوٰۃ، معاملات و معاشرات سب آ گئے (کیونکہ استقامت و اعتدال اعمال شرعیہ کی خاص صفت ہے اُن سے تجاوز کرکے عمل میں اعتدال باقی نہیں رہ سکتا) استقامت کی ہر جگہ ہر عمل میں ضرورت ہے (تو حضورؐ نے اس سائل کو ایسی بات تبلادی جس سے وہ ہر عمل کا جواز و ناجواز دریافت کر سکے۔ پس جہاں استقامت و اعتدال موجود ہو وہ شرعی عمل ہے اور جہاں یہ صفت مفقود ہو وہ شریعت سے خارج ہے)

باقی یہ مطلب تو ہو ہی نہیں سکتا کہ سائل کی درخواست یہ تھی کہ مجھے ایسی بات تبلا دیجئے کہ تمام احکام کو بھلا کر میں اس ایک بات کو یاد کر لوں بلکہ اس کا مطلب یہ تھا کہ مجھے ایسی بات تبلادیجئے جس کی تمام شریعت میں رعایت کر وں اور جس سے ہر حکم کا شرعی و غیر شرعی ہونا معلوم کر لیا کروں حضورؐ نے اسی کے موافق ایسی بات تبلادی جو شریعت کا موضوع ہے یعنے اعتقاد عظمت الٰہی و استقامت افعال و احوال۔

اور ظاہر ہے کہ موضوع علم معلوم ہو جانے سے اُس کے تمام مسائل دوسرے علوم کے مسائل سے ممتاز ہو جاتے ہیں اور جس کو موضوع کا علم ہے گویا بالاجمال اُسے تمام مسائل کا علم ہے کیونکہ اب جو مسئلہ اُس کے سامنے آئے گا، وہ باآسانی معلوم کر لے گا کہ یہ مسئلہ اس علم کا ہے یا نہیں۔

چنانچہ اسی لئے ہر فن میں موضوع کی تعیین کی جاتی ہے۔ مثلاً طب میں چونکہ مسائل کثیرہ منتشر ہیں جن کا ضبط دشوار ہے اور حفظ مسائل کے ذریعہ سے تمام جزئیات میں یہ امتیاز مشکل ہے کہ کونسا مسئلہ طب کے متعلق ہے اور کون سا نہیں۔ مثلاً یہ بات کہ اتنے اونچے مکان کی بنیاد کتنی گہری اور چوڑی ہونا چاہیئے، یہ طب کا مسئلہ ہے یا نہیں محض مسائل کے پڑھ لینے سے معلوم نہیں ہو سکتی کیونکہ کتابوں میں تمام جزئیات کا احصا نہیں کیا گیا اور نہ ہو سکتا ہے تو اب جن جزئیات کا کتاب میں ذکر نہیں یا ہم کو یاد نہیں ان کی بابت یہ کیسے معلوم ہو کہ ان کو طب سے علاقہ ہے یا نہیں۔ اس کے لئے حکماء نے طب کا ایک موضوع قرار دیا وہ یہ کہ ــــــ بدن الانسان من حیث الصحۃ والمرض۔ یعنی طب کا موضوع بدن انسانی ہے بحیثیت تندرستی اور بیماری کے۔ یہ موضوع معلوم کر لینے کے بعد تمام مسائل کا امتیاز ہو گیا۔

اب اگر سُنا کہ بنفشہ زکام کو نافع ہے فوراً سمجھ میں آگیا کہ یہ مسئلہ طب کے متعلق ہے اور اگر یہ سُنا کہ اتنی گہری بنیاد ہو تو اتنا اونچا مکان بنایا جا سکتا ہے، تو سننے ہی سمجھ میں آجائے گا کہ یہ مسئلہ طب کے متعلق نہیں ہے۔ اسی طرح اگر یہ سُنا کہ بدن انسان حادث ہے جب بھی سمجھ لوگے کہ یہ طب کا مسئلہ نہیں ہے کیونکہ گو اس میں بدن انسان کی ایک حالت مذکور ہے مگر اس حالت کو صحت و مرض سے کوئی واسطہ نہیں۔ اور موضوع طب بدن انسان مطلقاً نہیں ہے بلکہ صحت و مرض کی حیثیت سے ہے۔ غرض جس کو موضوع معلوم ہو گا وہ ہر جگہ ہر مسئلہ میں اس کی رعایت کر لے گا۔

اسی طرح اس جگہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سائل کو شریعت کا موضوع بتلا دیا جس کے حفظ سے گویا تمام مسائل بالاجمال اُسے محفوظ ہو گئے

اور اب وہ ہر بات کے متعلق یہ معلوم کر سکے گا کہ اُس کو شریعت سے تعلق ہے یا نہیں کیونکہ وہ اس موضوع کی ہر جگہ رعایت کرے گا۔

ایسے ہی اس مقام پر حق تعالیٰ بھی تمام احکام کو ذکر کر کے اخیر میں ایک ایسا گُر بتلاتے ہیں جو گویا تمام سورت کا موضوع ہے جس کو اس کے سب احکام سے تعلق ہے۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں۔

یَا أَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا اصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝

اے ایمان والو! (تکالیف پر) صبر کرو اور (جب کفار سے مقابلہ ہو، تو) مقابلہ میں صبر کرو اور (احتمالِ مقابلہ کے وقت) مقابلہ کے لئے مستعد رہو اور (ہر حال میں) اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو (حدودِ شرعیہ سے باہر نہ نکلو) تاکہ تم پورے کامیاب ہو (آخرت میں تو ضرور ہی اور اکثر اوقات ان اعمال پر محافظت کی بدولت دنیا میں بھی پوری کامیابی ہوتی ہے)

جن باتوں کا اس آیت میں ذکر ہے یہ وہ چیزیں ہیں کہ ان کو اس سورت کے احکام سے تو تعلق ہے ہی میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ جس قدر بھی احکام شرعیہ ہیں سب سے ان کا تعلق ہے۔ اور اس سے آگے میں اور ترقی کرتا ہوں کہ اتفاق سے ہم کو یہ بات بھی ثابت ہو گئی ہے کہ جیسے ان کو احکامِ شرعیہ سے تعلق ہے اسی طرح تمام دنیوی مصالح معاشیہ سے بھی ان کو تعلق ہے مگر نہ اس وجہ سے کہ یہ شریعت کا موضوع و مقصود ہے بلکہ اس لئے کہ شریعت تکمیلِ آخرت کے ساتھ ہماری دنیا کی بھی تکمیل ساتھ کرتی ہے۔ اس لئے احکامِ شرعیہ اس طور سے مقرر کئے گئے ہیں جو تبعاً مصالح دنیویہ کو بھی متضمن ہیں۔

مصالح دنیویہ کا اثر

آج کل احکام شرعیہ میں مصالح دنیویہ بیان کرنے والوں کی تین جماعتیں ہیں۔ ایک تو وہ جو اصل چیز مصلحت دنیا ہی کو سمجھتے ہیں اور احکام شرعیہ کو انہی مصالح پر مبنی سمجھتے ہیں۔ چنانچہ یہ لوگ مصالح دنیا کی تحصیل کی طرف اوّل ترغیب دیتے ہیں۔ پھر ان کی تائید احکام شرعیہ سے کرتے ہیں اور اس طرزِ تقسیم سے اکثر لوگوں کو اُن کے حامیٔ دین ہونے کا دھوکا ہو جاتا ہے حالانکہ وہ اثر کے اعتبار سے ماحیٔ دین ہیں۔

چنانچہ اس وقت کثرت سے اس قسم کے مضامین اخباروں اور لکچروں میں دیکھنے میں آتے ہیں کہ اتفاق ایسی چیز ہے کہ شریعت میں اس کا اس قدر اہتمام ہے کہ پانچ وقت کی نماز میں خدا تعالیٰ نے جماعت کو اسی لیے واجب کیا تاکہ ہر محلہ کے سب مسلمان دن میں پانچ دفعہ کم از کم ملتے رہیں۔ ہر شخص کو ایک دوسرے کی حالت کا علم ہو اور میل جول میں اتفاق بڑھے۔ پھر ہفتہ میں ایک بار تمام بستی کے آدمیوں کے باہمی اجتماع کے لیے جمعہ کی نماز مقرر کی تاکہ تمام بستی کے مسلمانوں سے شناسائی ہو اور ایک دوسرے کی ہمدردی کا موقع ملے۔ پھر بعض مسلمان ایسے ہیں جو شہر سے بھی دور رہتے ہیں۔ اُن کے اجتماع کے لیے عیدین کی نماز مقرر کی تاکہ سال بھر میں دو دفعہ آس پاس کے دیہاتی مسلمانوں سے بھی ملاقات ہو جایا کرے۔ پھر ساری دنیا کے مسلمانوں کو یکجا کرنے کے لیے حج کی عبادت مشروع کی گئی کہ عمر بھر میں ایک دفعہ تو سب طرف کے مسلمان ایک جگہ جمع ہو کر تبادلۂ خیالات کر لیا کریں۔

اس مضمون کو آج بڑے افتخار کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے اور بہت سے بھولے بھالے ایسے مقرروں کو شریعت کا راز داں سمجھتے ہیں کہ بس یہ

شخص شریعت کے اسرار کو سمجھ گیا اور کہتے ہیں کہ دیکھئے علم اس کو کہتے ہیں کہ نقلی بات کو عقلی بنا دیا اور شریعت کے اسرار کو زمانہ کے موافق بیان کر دیا مگر واللہ! اس کی وہ مثال ہے۔ ع

چوں ندیدند حقیقت رہِ افسانہ زدند

نہ یہ کچھ راز ہے اور نہ اس میں سمجھنے والوں کا کچھ کمال ہے بلکہ اس طرز تقریر میں زہر بھرا ہوا ہے۔ جو اس کو جان لے گا وہ سمجھ جائے گا کہ یہ لوگ ایسے اسرار بیان کر کے اسلام کے ساتھ دوستی نہیں کرتے بلکہ دشمنی کرتے ہیں اور یہ لوگ حامیٔ اسلام بلکہ اسلام کے نادان دوست ہیں اور۔ ع

دوستیٔ بے خرد چوں دشمنی ست

اب میں آپ کو بتلاتا ہوں کہ اس تقریر میں زہر کیا ہے۔ اس مضمون کا حاصل یہ ہے کہ بس اصل چیز تو اتفاق ہے اور جماعت پنجگانہ اور جمعہ و عیدین و حج اسی اتفاق کے پیدا کرنے کے واسطے ذرائع و وسائل ہیں تو عجب نہیں کہ بعض لوگوں پر اس کا یہ اثر ہو کہ وہ ان احکام کو مقصود بالذات نہ سمجھیں اور اگر کبھی کسی دوسرے طریق سے اتفاق ممکن ہوا تو وہ بہت آسانی سے جماعت اور نماز دونوں کے چھوڑنے پر آمادہ ہو جائیں گے کیونکہ ان کے خیال میں تو یہ سب احکام حصول اتفاق کے لئے مقرر ہوئے ہیں اور ان کو کلب میں جانے اور تھیٹر میں مل کر شریک ہونے سے بھی یہ بات حاصل ہو سکتی ہے، جہاں راحت سے آرام کرسی اور گدی تکیوں پر جگہ ملتی ہے تو وہ خواہ مخواہ مسجد میں کیوں آنے لگے اور وضو اور نماز کی مشقت کیوں برداشت کرنے لگے۔ چنانچہ اس وقت ان تقریروں کا یہ ضرر نمایاں ہو رہا ہے۔

اخباروں میں ایک شخص کا قول شائع ہوا تھا کہ وضو کی ضرورت ابتداء اسلام

میں تھی آج کل نہیں ہے کیونکہ اس وقت بدوی لوگ پاک وصاف نہ رہتے تھے جنگل کے کاروبار سے غبار آلود آتے تھے۔ اس لئے ان کو وضو کا حکم کیا گیا اور ہم لوگ آج کل صفائی کا بہت اہتمام رکھتے ہیں۔ ہر وقت موزے اور دستانے چڑھائے رہتے ہیں جن کی وجہ سے ہاتھ پیر گرد سے محفوظ رہتے ہیں ہم کو وضو کی ضرورت نہیں۔

یہ نتیجہ ہے ایسے اسرار بیان کرنے کا کہ اب ہر شخص اس قسم کی مصلحتوں ہی کو مقصود سمجھنے لگا اور اس شخص سے کچھ تعجب نہیں کہ وہ نماز کو بھی چھوڑ دے .... اور یہ کہے کہ نماز کی ضرورت ابتدائے اسلام میں اس لئے تھی کہ اس زمانہ کے لوگ جاہلیت کی وجہ سے بڑے متکبر و سرکش ہوتے تھے اور ان کو مہذب بنانے کے لئے یہ افعال تواضع و خشوع کے تعلیم فرمائے گئے تھے اور ہم لوگ تعلیم یافتہ ہیں۔ ہمارے اندر تعلیم سے تہذیب پیدا ہو گئی ہے ہم کو نماز کی کیا ضرورت ہے۔

اسی طرح ایک شخص نے جو کہ مسلمان ہیں، انگلستان سے مجھ کو لکھا تھا کہ قربانی شریعت کو مقصود نہیں اور یہ بالکل عقل کے خلاف ہے کہ ایک دن میں اتنے جانوروں کو ذبح کیا جائے جن کا گوشت آدمیوں سے کھایا بھی نہ جائے۔ چنانچہ اسی لئے منیٰ میں قربانی کرتے ہی جانوروں کو کھیتوں میں ڈال

لہ ان حضرت نے منیٰ میں کھیتوں کے اندر جانوروں کے دبانے کی جو (بقیہ حاشیہ از ص۴۴۷) یہ وجہ بتلائی ہے کہ اتنا گوشت آدمیوں سے کھایا نہیں جاتا یہ بالکل غلط ہے کیونکہ موسم حج پر جتنے آدمی جمع ہوتے ہیں سب کے سب مالدار نہیں ہوتے اور نہ سب قربانی کرتے ہیں۔

دیا جاتا ہے۔ غضب یہ ہے کہ آج کل خدا پر بھی عقل کی حکومت ہونے لگی۔
افسوس! میں کہتا ہوں کہ اگر ایک جج کسی مجرم کو سزا دے اور مجرم یہ کہے کہ یہ
سزا تو عقل کے خلاف ہے تو کیا وہ اس بات کی سماعت کرے گا۔ ہرگز
نہیں! بلکہ وہ صاف یہ کہے گا کہ قانون پر تمہاری عقل کی حکومت نہیں بلکہ قانون
عقل پر حاکم ہے اور اس کے اس جواب کو سب عقلاء تسلیم کرتے ہیں۔۔۔
۔۔۔ مگر حیرت ہے کہ قانونِ الٰہی کو آج کل کے مسلمان اپنی عقل پر حاکم
نہیں مانتے بلکہ اس کو اپنی عقل کے تابع کرنا چاہتے ہیں۔ اور یہ جواب علی
سبیل التنزل ہے ورنہ قانون الٰہی تو بالکل عقل کے مطابق ہے بشرطیکہ عقلِ سلیم
ہو۔ یہ کیا ضرور ہے کہ ہر شخص کی عقل میں اس کی حکمتیں آ جایا کریں۔ آخر پارلیمنٹ
کے عقلاء جو قوانین تجویز کرتے ہیں کیا ہر عامی کی عقل اس کی مصالح تک پہنچ جاتی
ہے ہرگز نہیں بلکہ اس کے مصالح و حکم کو خاص خاص حکام ہی سمجھتے ہیں۔ پھر
قانون الٰہی کی حکمتوں اور مصالح کو ہر شخص اپنی عقل سے کیوں معلوم کرنا چاہتا
ہے اور یہاں یہ کیوں نہیں کہا جاتا کہ قانون الٰہی عقل کے مطابق ضرور ہے
مگر ہماری عقلیں اس کے سمجھنے سے قاصر ہیں۔ خاص خاص لوگ ہی اس کو
سمجھ سکتے ہیں اور بالفرض اگر کسی قانون کی حکمت خاص لوگوں کی عقل میں

بلکہ حجاج میں زیادہ تر غریب ہوتے ہیں۔ ہم دعوے سے کہتے ہیں
کہ اگر منیٰ کی قربانی کا سارا گوشت حجاج میں اور بدوؤں میں تقسیم کر دیا
جائے تو وہ ہرگز سب کو کافی نہ ہوگا بلکہ بہت لوگ پھر بھی محروم رہ
جائیں گے بلکہ منیٰ میں قربانی کے جانوروں کو محض ڈاکٹروں کی رائے
سے دبایا جاتا ہے۔ پس اس خلاف عقل حرکت کے جواب دہ وہ ڈاکٹر
ہیں جن کی رائے سے ایسا کیا جاتا ہے ۱۲ ظ

بھی نہ آسکے تو قانون کے بدلنے کا کسی کو اختیار نہیں کیونکہ قانون پر عقل حاکم نہیں بلکہ اس کے ماتحت اور تابع ہے۔

غرض ان حضرت نے مجھے لکھا کہ قربانی خود شریعت کو مقصود نہیں بلکہ اصل مقصود غرباء کی امداد ہے اور ابتداء میں لوگوں کے پاس نقد کم تھا، مویشی زیادہ تھے، اس لئے یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ جانور ذبح کر کے غرباء کو گوشت دے دو۔ اور اس زمانہ میں نقد بھی بہت موجود ہے پس آج کل بجائے قربانی کرنے کے نقد روپیہ سے غرباء کی امداد کرنا چاہیے۔

(تو) اس شخص نے قربانی کی حکمت امدادِ غرباء سمجھ کر جب یہ دیکھا کہ یہ حکمت دوسرے طریقہ سے بھی باآسانی حاصل ہو سکتی ہے قربانی چھوڑنے کا ارادہ کر لیا حالانکہ یہ حکمت مقصود ہی نہیں بلکہ مقصود تو تعمیلِ حکم ہے اگر یہ حکمت مقصود ہوتی تو اس کی کیا وجہ کہ غرباء کو زندہ جانور دینے سے واجب ادا نہ ہوتا۔ اگر اُس زمانہ میں نقد اور غلہ کم تھا اور مویشی زیادہ تھے، اس لئے جانوروں کے ذریعہ سے غرباء کی امداد کا طریقہ مقرر ہوا تھا تو اس کے کیا معنی کہ جانور کو ذبح کر کے غرباء کو گوشت ہی دیا جائے تو واجب ادا ہو۔ اور زندہ جانور کسی غریب کو دے دیں تو واجب ادا نہ ہو۔ پھر کیا پہلے زمانہ میں مسلمانوں پر نقد کی وسعت کبھی نہ ہوئی تھی ۔۔ بالکل غلط! تاریخ اٹھا کر دیکھ لو، تو معلوم ہو کہ صحابہ نے جس وقت کسریٰ و قیصر کے خزانے فتح کئے ہیں، تو مسلمانوں کے پاس نقد سونا اور چاندی اس قدر تھا کہ آج کل تو اُس کا عشر عشیر بھی نہ ہوگا۔ پھر اس وقت صحابہؓ کو یہ بات کیوں نہ سوجھی جو اس شخص کو انگلستان میں بیٹھ کر سوجھی؟ اور صحابہؓ نے بجائے قربانی کے نقد امداد کو کیوں نہ اختیار کیا؟

دوسرے اگر یہ حکمت قربانی سے مقصود بالذات ہوتی تو اُس کا مقتضاء یہ تھا کہ قربانی کے گوشت میں سے کسی حصّہ کا تصدّق ضرور واجب ہوتا حالانکہ شریعت میں یہ بھی حکم نہیں بلکہ اگر کوئی شخص سارا گوشت خود ہی کھالے اور غریبوں کو ذرہ برابر بھی نہ دے، تو قربانی میں کچھ قصور نہیں آتا۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ امداد غرباء قربانی سے مقصود بالذات نہیں بلکہ مقصود کچھ اور ہے۔ مگر آپ نے دیکھ لیا کہ اس قسم کے اسرار بیان کرنے کا نتیجہ کہاں تک پہنچا ہے کہ ہر شخص اپنی مخترع حکمتوں پر احکام کا مدار سمجھنے لگا (۱۲)

اور اس خیال کا اثر یہ ہوا کہ چندۂ بلقان میں یہ مادہ پھوٹ ہی پڑا۔ آخر اہلِ جرائت نے یہ فتویٰ دے ہی دیا، خدا اُن کو ہدایت کرے کہ اگر مسلمان اس سال قربانی نہ کریں اور بلقان کے چندہ میں جانور کی نقد قیمت دے دیں تو یہ زیادہ بہتر ہے اور اس طرح بھی قربانی ادا ہو جائے گی۔ کیونکہ قربانی سے مقصود غریب مسلمانوں کی امداد ہے اور اس وقت ترکوں کو نقد امداد سے زیادہ فائدہ ہو سکتا ہے۔

اس کا جواب ایک عامی آدمی نے خوب دیا۔ اُس نے کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی غزوات ہوتے تھے یا نہیں اور اس وقت بھی غازیوں کے لئے نقد امداد کی ضرورت ہوتی تھی یا نہیں، تو کبھی حضورؐ نے بھی یہ تجویز کیا کہ اس سال قربانی کو موقوف کر کے مسلمان نقد روپیہ سے غزوات میں امداد کریں۔ اس کا جواب کسی کے پاس کچھ نہ تھا۔

تو جب قربانی کے متعلق بعض لوگوں کو ایک خیال فاسد ہوا تھا، جو بالآخر پھوٹ کر رہا اسی طرح اور احکام کی حکمتوں میں بھی جو رنگین مضامین آج کل لکھے جاتے ہیں اُن کا بھی اثر یہی ہے کہ لوگ اُن مصالح اور حکمتوں کو

مقصود بالذات سمجھنے لگیں گے اور جب وہ حکمت کسی اور طریقہ سے حاصل ہوتی ہوئی دیکھیں گے، فوراً احکام کو چھوڑنے پر آمادہ ہو جائیں گے۔

اس کی ایک اور نظیر مجھے یاد آئی۔ اس وقت سب لوگ مانے ہوئے ہیں کہ اتفاق ضروری ہے اور کچھ ٹھوکریں کھا کر یہ بھی ان کو ثابت ہو گیا ہے کہ اتفاق بدون پابندی مذہب کے حاصل نہیں ہو سکتا، تو اب عموماً لکچروں میں پابندی مذہب پر بہت زیادہ زور دیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس کے بغیر مسلمانوں میں اتفاق و اتحاد نہیں ہو سکتا اور بدون اتفاق کے ترقی نہیں ہو سکتی۔ ظاہر میں یہ بہت ہی خوش کن جملہ ہے مگر اس میں بھی وہی زہر مخفی ہے کہ اصل میں تو مذہب مقصود نہیں بلکہ اتفاق مطلوب ہے مگر چونکہ مذہب اس کا ذریعہ ہے اس لئے مذہب کی بھی ضرورت ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جب تک ان لوگوں کو اسلام پر رہنے سے اتفاق کی امید ہے اس وقت تک تو یہ اسلام پر رہیں گے اور دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دیں گے اور جہاں یہ امید منقطع ہوئی اسی دن یہ اسلام کو ترک کر دیں گے۔

مثلاً فرض کر لو کہ کسی زمانہ میں مسلمانوں پر ایسی کشاکشی کا وقت آپڑے کہ وہ اسلام کو قائم رکھ کر اتفاق نہ پیدا کر سکیں اور ان لوگوں کو یہ ثابت ہو جائے کہ فلاں مذہب اختیار کر لینے سے اتفاق حاصل ہوگا تو یہ فوراً اسلام کو خیر باد کہہ کر دوسرا مذہب اختیار کر لیں گے کیونکہ ان کے نزدیک تو اسلام محض اتفاق کے لئے مطلوب تھا مقصود بالذات نہ تھا۔ تو یہ بڑا خطرناک مسلک ہے کہ مصالح دنیویہ پر احکام کی بنا قرار دی جاتی ہے اس کا کبھی نام بھی نہ لیجئے۔ سو ایک تو اس مشرب کے لوگ ہیں جو اس درجہ میں مصالح دنیویہ کا اثبات کرتے ہیں۔ ان کی غلطی تو واضح ہو گئی۔

طاعت اور فلاح

ایک دوسرا مشرب یہ ہے کہ بعض لوگوں کا گمان یہ ہے کہ مذہب سے فقط دین ہی کی فلاح حاصل ہوتی ہے دنیوی فلاح حاصل نہیں ہوتی۔ تو یہ مصالح دنیویہ کی بالکل ہی نفی کرتے ہیں۔ یہ اس درجہ کا تو غلط نہیں جیسا پہلا مشرب غلط تھا اور اگر نصوص اس کے خلاف نہ ہوتیں تو ہم اس کو مان لیتے مگر نصوص اس کے بھی خلاف موجود ہیں۔ اس لئے یہ بھی غلط ہے۔ کیونکہ نصوص سے ثابت ہے کہ اطاعت خداوندی سے دنیاوی مصالح اور راحتیں بھی حاصل ہوتی ہیں اور معصیت اور مخالفت خداوندی سے دنیوی خسارہ بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ؁

اور اگر ان بستیوں کے رہنے والے ایمان لے آتے اور پرہیز کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین کی برکتیں کھول دیتے لیکن انہوں نے تکذیب کی اور ہم نے ان کے اعمال کی وجہ سے ان کو پکڑ لیا۔

اور ایک جگہ اہل کتاب کے متعلق ارشاد ہے۔

وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ۔

یعنی اگر اہل کتاب توراۃ وانجیل پر اور جو (قرآن) آپ پر نازل ہوا ہے اُس پر پوری طرح عمل کرتے (اور جیسا کہ اُن میں رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کا امر ہے اُس کے موافق آپ کا اتباع اختیار کر لیتے) تو اوپر سے بھی روزی حاصل کرتے (یعنی آسمان سے) اور اپنے پیروں تلے سے بھی (یعنی زمین سے)

ایک جگہ ارشاد فرماتے ہیں۔

وَمَا اَصَابَكُمْ مِنْ مُّصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ

کہ تم کو جو کچھ مصائب پہنچتے ہیں یہ تمہارے اعمال کے سبب سے ہیں اور حق تعالیٰ بہت سی باتوں کو معاف ہی کر دیتے ہیں۔

ان کے علاوہ اور بہت سی نصوص ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ طاعت سے دنیوی فلاح بھی ہوتی ہے اور معصیت سے دنیوی خسارہ ہوتا ہے۔ تو ہم اس مشرب کے بھی نہیں ہو سکتے۔

اب سامعین کو شبہ پیدا ہوا ہوگا کہ جو لوگ احکام میں دنیوی مصالح بتلاتے ہیں اُن کے مشرب کو بھی غلط کر دیا اور جو نہیں بتلاتے اُن کے مشرب کو بھی غلط کر دیا۔ یہ دونوں غلط کیوں کر ہو سکتے ہیں۔ ان میں سے ایک بات تو صحیح ہونی چاہیے۔

تو ہاں صاحب میں نے دونوں کو غلط کر دیا اور ان میں سے ایک بھی صحیح نہیں بلکہ ان دونوں کے علاوہ ایک درمیانی درجہ ہے وہ صحیح ہے اور ہم اسی کے قائل ہیں۔ وہ یہ کہ احکامِ شرعیہ سے فلاح دنیوی حاصل تو ہوتی ہے مگر احکامِ شرعیہ سے فلاح دنیوی مقصود نہیں بلکہ اُن سے اصل مقصود تو رضائے خدا ہے۔ ہاں ساتھ میں تبعاً یہ دنیوی نعمت بھی حاصل ہو جاتی

ہے۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے حج کے رستہ میں بمبئی آتا ہے مگر بمبئی مقصود نہیں۔ تو اب یوں سمجھئے کہ تین مشرب ہو گئے۔ ایک تو یہ کہتا ہے کہ حج سے بمبئی کی سیر ہی مقصود ہے تاکہ مسلمانوں کو دنیا کے کاروبار اور تجارت وصنعت کی اطلاع ہو جائے اور ایک یہ کہتا ہے کہ حج سے مقصود زیارت کعبہ ہے اور بمبئی رستہ میں بھی نہیں آتا۔ یہ دونوں غلط ہیں۔ صحیح مشرب تیسرا ہے کہ حج سے مقصود زیارت بیت اور رضائے خدا ہے اور رستہ میں بمبئی بھی آتا ہے مگر وہ مقصود نہیں۔

اسی طرح احکامِ شرعیہ کو فلاحِ دنیا سے نہ تو اتنا تعلق ہے کہ وہی مقصود ہو اور نہ اتنی بے تعلقی ہے کہ وہ اُن پر مرتب بھی نہ ہو۔ صحیح مذہب یہ ہے کہ احکامِ شرعیہ پر فلاحِ دنیا کا ترتب تو ہوتا ہے مگر یہ مقصود نہیں اور اگر کوئی شخص اعمالِ صالحہ سے دنیا کو مقصود سمجھے گا اور مصالحِ دنیویہ کے لئے اُن کو اختیار کرے گا تو وہ اعمالِ صالحہ نہ رہیں گے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ وَاِنَّمَا لِکُلِّ امْرِئٍ مَّا نَوٰی فَمَنْ کَانَتْ ھِجْرَتُہٗ اِلَی اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ فَھِجْرَتُہٗ اِلَی اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَمَنْ کَانَتْ ھِجْرَتُہٗ اِلٰی دُنْیَا یُصِیْبُھَا اَوِامْرَاَۃٍ یَتَزَوَّجُھَا فَھِجْرَتُہٗ اِلٰی مَا ھَاجَرَ اِلَیْہِ۔

کہ اعمال کا اعتبار نیت سے ہے اور ہر شخص کو وہی ملے گا جو اُسے مقصود ہے۔ اگر کوئی اللہ و رسول ؐ کے واسطے ہجرت کرے تو اُس کی ہجرت تو واقعی اللہ و رسول ؐ کے واسطے ہے اور مقبول ہے اور جو کوئی

دنیا کے لئے یا کسی عورت سے نکاح کرنے کے لئے ہجرت کرے تو اس کی ہجرت خدا ورسولؐ کی طرف نہیں بلکہ اسی چیز کی طرف ہے جس کی اس نے نیت کی ہے۔ اس سے صاف فیصلہ ہو گیا کہ دنیا کو اعمال صالحہ میں مقصود سمجھنے سے اعمال صالحہ باقی نہیں رہتے بلکہ صرف اعمال کی نقل رہ جاتی ہے۔ پس اعمال شرعیہ سے دنیا کو غرض بنانا تو ناجائز ہے مگر تبعاً طاعات سے فلاح دینوی بھی حاصل ہو جاتی ہے۔ اب وہ جملہ آپ کی سمجھ میں آگیا ہوگا جو میں نے اوپر کہا تھا کہ اس مقام پر حق تعالیٰ نے جو احکام کلیہ بتلائے ہیں ان کا تعلق مصالح دنیویہ سے بھی ہے گو وہ دنیوی مصالح مقصود نہیں

آیت کے معنی و تفسیر

اب سمجھئے کہ وہ احکام کیا ہیں تو ارشاد فرماتے ہیں۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا۔ الآیۃ

یعنی اے ایمان والو! صبر کرو۔ اصْبِرُوْا کا تعلق تو اعمال لازمہ سے ہے جن میں دوسروں سے کچھ تعلق نہیں۔ ان میں حکم ہے صبر کا۔ اور ایک صبر ہے دوسرے مقام پر۔ وہ یہ کہ کسی عمل میں مخالفت کی مزاحمت ہو اس کے متعلق ارشاد ہے وَصَابِرُوْا کہ مقابلہ میں بھی صبر کرو یعنی استقلال کے ساتھ رہو۔ آگے ارشاد ہے وَرَابِطُوْا۔ اس کے دو معنی ہیں۔ ایک یہ کہ سرحد کی حفاظت کرو۔ دوسرے یہ کہ مستعد رہو۔ پہلے معنی خاص عمل کے متعلق ہیں اور دوسرے معنی سب اعمال کو عام ہو سکتے ہیں۔ آگے فرماتے ہیں وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ۔ اور اللہ سے ڈرو امید ہے کہ تم کو فلاح حاصل ہو جائے۔ اس ترجمہ سے معلوم ہوا ہوگا کہ اس مقام پر ایک تو صبر کا حکم ہے اور صبر کے دو درجے ہیں۔ اور ایک رباط کا حکم ہے اور ایک تقویٰ نے

کا تو چار حکم ہوئے۔ ایک پانچویں اور ایک چھٹی چیز اور ہے جن میں سے ایک کا اوّل میں ذکر ہے اور ایک کا آخر میں۔ اوّل میں ایمان ہے اور آخر میں فلاح ہے۔ ایک چیز بطور مبادی کے ہے اور ایک صورت نتیجہ میں ہے اور چار حکم درمیان میں ہیں کل چھ ہوئے اور ان کے مراتب میں فرق ایسا ہے جیسے سفر اور مسافت اور منزل میں فرق ہے کہ سفر کی ایک ابتداء ہوتی ہے اور ایک درمیانی مسافت ہوتی ہے جس کے قطع کے لئے کچھ مراتب ہوتے ہیں اور ایک نتیجہ ہوتا ہے یعنی منزلِ مقصود پر پہنچنا۔

پس یہ کلام ایسا ہے جیسے ہم کسی سے یوں کہیں کہ اے مسافر فلاں رستہ سے جانا اور فلاں مقامات پر ٹھہرنا اور چوروں سے اپنی حفاظت رکھنا تو دہلی پہنچ جائے گا۔ اس کلام سے تین باتیں معلوم ہوں گی۔ ایک یہ کہ دہلی پہنچنے کے لئے سفر کی بھی ضرورت ہے کیونکہ یہ وعدہ مسافر ہی سے کیا گیا ہے مگر اس کو بصورت امر اس لئے ظاہر نہیں کیا کہ مخاطب خود ہی سفر شروع کر چکا ہے۔ اب اس سے یہ کہنا کہ اے مسافر سفر کرنا تحصیل حاصل ہے اور بلا ضرورت کلام کو طول دینا ہے۔ بس سفر کی ضرورت اس کو مسافر کہہ کر خطاب کرنے ہی سے معلوم ہو گئی۔ یہ مختصر کلام ہے اور دلالت اس کی علی التمام ہے۔ غرض ایک تو سفر کرنا ضروری ہوا اور دوسری بات یہ معلوم ہوگی کہ منازل پر سے گزرنا اور اپنی حفاظت کرنا بھی ضروری ہے تیسرا وعدہ ہے کہ اس طرح تم دلی پہنچ جاؤ گے۔ تو سفر شرط وصول ہے اور درمیانی باتیں احکام وصول ہیں اور تیسری بات نتیجہ ہے۔ ہر مقصود کے لئے ان تین باتوں کا ہونا ضروری ہے۔

اس کی ایک مثال اور لیجئے۔ مثلاً کوئی کہے کہ اے طالب علم رات

کو جاگنا اور محنت کرنا تو علم آوے گا۔ اس کلام سے اوّل تو طلب علم کا ضروری ہونا معلوم ہوا۔ دوسرے رات کو جاگنے اور محنت کرنے کی ضرورت معلوم ہوئی۔ تیسرے نتیجہ کا وعدہ ہے کہ اس طرح کرنے سے علم حاصل ہو جائے گا مگر یہاں بھی طلب علم کو بصورت امر اس لئے ظاہر نہیں کیا گیا کہ مخاطب خود ہی طلب میں مشغول ہے۔

اسی طرح یہاں بھی یَا أَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا سے ایمان کی ضرورت معلوم ہوئی لیکن اس وقت بصورتِ امر آمِنُوْا کہہ کر اس لئے ظاہر نہیں کیا گیا کہ مخاطب اہل ایمان ہی ہیں اُن کو آمِنُوْا کہنے کی ضرورت نہیں کیونکہ احکام کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ احکام جو ان لوگوں کے متعلق ہیں جنہوں نے ایمان قبول نہیں کیا اور دوسرے وہ جو اُن کے متعلق ہیں جنہوں نے ایمان قبول کر لیا ہے۔ پہلی قسم میں اوّل ایمان کا حکم کیا جائے گا اور دوسری قسم میں ایمان کا حکم صیغۂ امر سے نہ کیا جائے گا۔ جیسے طالب علمی کے متعلق ایک تو غیر طالب کو خطاب کیا جائے اور ایک طالب علم کو۔ تو جس وقت غیر طالب کو خطاب کیا جائے اُس وقت یہ کہنے کی ضرورت ہے کہ علم طلب کرو۔ اور جس وقت طالب علم مخاطب ہو، اُس وقت اس شرط کے اظہار کی ضرورت نہیں۔ قرآن میں بھی اسی طرح دونوں قسم کے خطاب ہیں۔۔

یہ مثالیں میں نے اس لئے دے دیں تاکہ معلوم ہو جائے کہ قرآن کے مضامین کوئی نئے نہیں ہیں۔ اگر غور کیا جائے تو جس طرح ہم لوگ محاورات میں گفتگو کرتے ہیں اسی طرح قرآن میں بھی کلام کیا جاتا ہے۔۔ ہاں طرزِ تعلیم ایسا عجیب ہے کہ دوسرے سے ممکن نہیں کیونکہ قرآن میں تمام

پہلوؤں کی پوری رعایت ہوتی ہے۔ بہرحال چونکہ اس سورت میں زیادہ احکام اور اکثر خطابات مومنین کو ہیں اس لئے اٰمنُوْا بصیغۂ امر نہیں کہا گیا۔ مگر یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ہی سے ایمان کا شرط ہونا معلوم ہو گیا جیسا کہ اوپر چند مثالوں سے میں نے اس کو سمجھا دیا ہے۔ مجھ کو اس سے یہ بتلانا مقصود ہے کہ آج کل بہت سے لوگ اس غلطی میں مبتلا ہیں کہ وہ فلاح کے لئے ایمان کو بھی ضروری نہیں سمجھتے۔ اس وقت ہم کو دنیوی فلاح سے تو بحث نہیں اس کے متعلق تو ہماری حالت یہ ہے ؎

ما قصۂ سکندر و دارا نہ خواندہ ایم

از ما بجز حکایتِ مہر و وفا مپرس

سلامتی کی تعریف

ہم دنیوی ترقی سے منع بھی نہیں کرتے مگر اس کے ساتھ ہی ہم کو اس کے احکام بیان کرنے کی بھی ضرورت نہیں تو ہم اس سے بحث نہیں کرتے کہ دنیوی فلاح و ترقی کے لئے بھی ایمان شرط ہے یا نہیں۔ بلکہ اس وقت فلاح آخرت سے بحث ہے۔ تو افسوس یہ ہے کہ بعض مسلمان فلاح آخرت اور وصول الی اللہ کے لئے بھی اس کو ضروری نہیں سمجھتے۔ چنانچہ بہت لوگ ایسے بھنگڑوں کے پیچھے پھرتے ہیں جن کو نہ ایمان سے واسطہ ہے نہ نماز روزہ سے اور کہتے ہیں کہ درویشی کا رستہ ہی ایسا ہے۔ چنانچہ اگر کوئی ہندو جوگی آجاوے اور دو چار شعبدے ظاہر کر دے اور کسی پر اس کی توجہ سے کچھ اثر بھی ہونے لگے تو اس کو ولی سمجھنے لگتے ہیں اور بہت سے لوگ معتقد ہو جاتے ہیں۔

کانپور میں ایک عیسائی تھا بالکل سڑی اور مجنون مگر کانپور کے عوام الناس

اس کو ولی اور اہلِ خدمت سمجھتے تھے حالانکہ اُس کی صورت پر ایسی نحوست برستی تھی کہ الامان! مگر اس پر بھی لوگ معتقد تھے ـــــــ غرض عوام کے نزدیک ولایت کے لئے کوئی شرط نہیں۔ ہاں ترک شریعت کی البتہ شرط ہے تو یہ ایسا عجیب عہدہ ہے کہ اس کے لئے کسی کورس کے پڑھنے اور پاس کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ اس میں سارے کورس کے چھوڑ دینے کی ضرورت ہے ـــــــ۔

کانپور میں ایک وکیل کہتے تھے کہ ایک بھنگڑ یہاں آیا جو ہمہ اوست کہتا تھا۔ اُس نے آکر رنڈیوں میں قیام کیا اور بھنگ پی کر رنڈیوں سے بھی منہ کالا کیا۔ مگر عوام اُس کے بہت معتقد تھے کہ بڑا پہنچا ہوا ہے۔

اس کے لئے یہ بات یاد کر لی ہے کہ بزرگوں میں ایک فرقہ ملامتی ہوتا ہے جو ظاہر میں ایسے افعال کرتے ہیں جن سے لوگ اُن کو برا بھلا کہیں۔ اس بناء پر لوگوں نے اُن بھنگڑوں کو بھی ملامتی فرقہ میں داخل کر کے اُن کے افعال میں تاویل کر لی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ آخر ملامتی کی کوئی جامع مانع تعریف بھی ہے یا اس کا مفہوم اتنا وسیع ہے کہ ہر شخص اس میں داخل ہو سکتا ہے۔ اگر ایسا ہے تو پھر صحابہ نے بڑی غلطی کی کہ تلوار لے کر کفار کو قتل کیا۔ جب ملامتی کا مفہوم اتنا وسیع ہے کہ کفار بھی اس کے تحت میں داخل ہو سکتے ہیں تو صحابہ نے کفار کو ملامتی سمجھ کر اُن کے کفر میں کیوں تاویل نہ کر لی۔ اگر تاویل اتنی ہی سستی ہے تو یوں تو ہر امر کی تاویل ہو سکتی ہے پھر شریعت نے خواہ مخواہ اسلام و کفر کے احکام بیان کیے۔ صاحبو! تاویل تو وہاں کی جاتی ہے، جہاں آثار تقویٰ غالب ہوں اور ذرا سی کوئی بات خلافِ تقویٰ سرزد ہو جائے، تو اس میں تاویل کی جاتی ہے۔ یہ نہیں کہ تاویل اوڑھنا بچھونا ہو جائے کہ سر سے

پیر تک تمام افعال ہی میں تاویل کی جائے۔

یوں تو پھر یہ بھی ایک تاویل ہے جو میرے ایک عزیز نے ایک ہندو سے سنی تھی۔ وہ ریاست گوالیار میں ملازم تھے۔ گھر کے قریب ایک مندر تھا۔ وہاں ایک بُت پرست روزانہ صبح کو آ کر بُت کو پانی دیا کرتا تھا۔ ایک روز جو وہ پانی دے کر لوٹنے لگا تو ایک کتا آیا اور ٹانگ اٹھا کر بُت پر پیشاب کرنے لگا۔ تو میرے عزیز نے اُس ہندو کو آواز دی کہ پنڈت جی! ذرا یہاں تو آؤ۔ وہ لوٹ کر آیا تو کہا کہ دیکھئے، یہ کُتا آپ کے دیوتا کے ساتھ کیا کر رہا ہے؟ ہندو نے کہا، حضور کچھ نہیں، یہ بھی دیوتا کو پانی دے رہا ہے۔

اگر تاویل ایسی ہی سستی ہے تو پھر کُتے کے پیشاب کرنے کو پانی دینا کہنا یہ بھی ایک تاویل تھی۔ یہی حال آج کل عوام کی تاویلوں کا ہے کہ چاہے کوئی کافر ہو یا فاسق فاجر ہو اور کیسی ہی بیہودہ حرکتیں کرتا ہو سب میں یہ تاویل ہے کہ یہ ملامتی بزرگ ہیں۔ آپ کو خبر بھی ہے کہ ملامتی کی تعریف کیا ہے۔ یہ لفظ صوفیہ کی اصطلاحات میں سے ہے۔ اس کے معنی اُنہی سے دریافت کرنے چاہئیں۔ غضب تو یہ ہے کہ لوگ کسی فن کو حاصل تو کرتے نہیں محض چند الفاظ یاد کر کے اُن کو گاتے پھرتے ہیں۔

سنئے ملامتی اس کو کہتے ہیں جو اعمالِ صالحہ کو سوائے فرائض کے مخفی رکھے اور چھپ چھپ کر نوافل پڑھے کھلم کھلا نوافل کو ادا نہ کرے تاکہ لوگ اُن کو معمولی آدمی سمجھیں۔

اسی طرح ایک فرقہ قلندر کہلاتا ہے۔ قلندر کی تعریف یہ ہے کہ جو اعمالِ نافلہ کم کرے اور قلب سے ذکر و شغل زیادہ کرے۔ اس کو اعمال

ظاہرہ میں فرائض و واجبات کے سوا اور اعمال کا اہتمام نہیں ہوتا بلکہ باطن کا اہتمام زیادہ ہوتا ہے۔ اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ ملامتی گناہوں کا ارتکاب بھی کرتا ہے۔ یہ تو محض اختراع وافتراء ہے۔ جو شخص کھلم کھلا گناہ کرتا ہو اس کو ولایت سے کیا واسطہ ---- ! ہاں شیطانی ولایت سے اس کو البتہ واسطہ ہے۔ پس ان بھنگڑوں کو ملامتی کہنا بالکل غلط ہے۔

ہاں اس جگہ ایک سوال باقی رہا۔ وہ یہ کہ بعض بزرگوں سے منقول ہے کہ انہوں نے بعضی باتیں خلافِ شرع کی ہیں تاکہ لوگ ان کو برا بھلا کہیں۔ تو یہ لوگ بزرگ تھے یا نہیں؟ اگر وہ بزرگ تھے تو یہ بھنگڑ بھی ویسے ہی بزرگ ہیں۔ ہم ان کو بھی ویسا ہی سمجھتے ہیں۔

تو اس کا جواب بھی سنیئے۔ اوّل تو جن بزرگوں سے ایسی ویسی باتیں منقول ہیں وہ محض وضع کے خلاف تھیں شریعت کے خلاف نہ تھیں۔ یہ تو ایسا ہے جیسے میں صرف پاجامہ پہن کر بازار میں چلا جاؤں۔ اس میں گناہ کچھ نہیں البتہ وضع کے خلاف ہے کہ اس صورت سے نکلنے والے کو لوگ برا بھلا کہتے ہیں۔ اور اگر کسی نے کوئی کام خلافِ شریعت بھی کیا ہے تو وہ محض ظاہر بین ناواقفوں کو خلافِ شرع معلوم ہوتا تھا، واقع میں خلافِ شرع نہ تھا ---- ،

(جیسے ایک بزرگ چلے جارہے تھے۔ راستہ میں ایک عورت ملی انہوں نے دوڑ کر اس کا بوسہ لے لیا۔ یہ حرکت دیکھ کر بہت سے مرید برگشتہ ہو گئے مگر چند لوگ پھر بھی ساتھ رہے۔ آگے چل کر ایک دکان پر پہنچے اور بدون دکان دار کی اجازت کے حلوا اٹھا کر کھانے لگے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ عورت ان کی باندی تھی جس کا بوسہ لینا شرعاً جائز تھا اور وہ حلوائی ان

کا جان نثار مرید تھا جو شیخ کو آتا ہوا دیکھ کر خود ہدیہ پیش کرنے کی نیت کر رہا تھا اور شیخ کے اس طرح بے تکلف کھانے سے وہ باغ باغ ہوگیا۔)

دوسرے یہ بات دیکھنا چاہیئے کہ پہلے بزرگوں نے ایسے اعتراض کے کام کس غرض سے کئے تھے۔ اس کا اصلی منشا کبر کا علاج تھا کہ لوگ ہم کو بزرگ نہ سمجھیں۔ اس وقت یہ غرض رندانہ وضع سے حاصل ہوتی تھی اور ایسی وضع بنانے والوں کو سزائیں دی جاتی تھیں۔ اس لیئے وہ ایک دو حرکت رندانہ کر لیا کرتے تھے تاکہ عوام معتقد ہو کر پریشان نہ کریں اور اب تو ایسے لوگوں کو عوام قطب و ابدال سمجھتے ہیں۔ تو اب یہ غرض رندانہ وضع سے حاصل نہیں ہو سکتی بلکہ اب یہ بات حاصل ہوتی ہے ملانوں کی سی شکل بنانے اور شریعت کی پابندی کرنے سے۔ آج کل جو شخص ملانوں کی سی شکل بنالے تو ساری دنیا اُس کو کمالات سے خالی سمجھتی ہے اور یوں کہتے ہیں کہ اس کو سوائے مسئلے مسائل کے کچھ نہیں آتا۔ پس آج کل ملامتی بننے کا طریقہ بھی پابندی شریعت ہی ہے۔ غرض یہ بالکل غلط ہے کہ پہلے بزرگوں نے قصداً خلاف شرع کام کیئے ہیں۔ بلکہ اس کی حقیقت وہ ہے جو میں نے ابھی بیان کی۔

انتظامِ شریعت کے مجاز ہیں

خوب سمجھ لو کہ جو شخص شریعت کی مخالفت کرتا ہے، وہ کبھی بزرگ نہیں ہو سکتا۔ اور اگر تم کو کسی پر ایسا ہی رحم آتا ہے تو اُس کو بُرا بھلا مت کہو لیکن معتقد نہ بنو کیسی کو بُرا کہنے کا منصب عوام کا نہیں بلکہ یہ علماء کا منصب ہے۔ تم کسی کو کچھ نہ کہو بلکہ یہ کام جس جماعت کا ہے اسی پر چھوڑ دو۔ اور علماء کو فاسقوں کے بُرا کہنے کا تو منصب ہے ہی اُن کو تو یہ بھی حق حاصل ہے

کہ اچھوں کو بھی بُرا کہہ دیں اگر انتظامِ شریعت کیلئے اس کی ضرورت ہو۔

چنانچہ شیخ اکبر رحمۃ اللہ علیہ کو ایک بزرگ عالم ساری عمر زندیق کہتے رہے مگر جب شیخ اکبر کے انتقال کی خبر آئی تو رونے لگے اور فرمایا کہ افسوس آج بہت بڑے صدیق کا انتقال ہو گیا۔ لوگوں کو حیرت ہوئی کہ عمر بھر تو اُن کو زندیق کہتے رہے اور آج بہت بڑا صدیق بتلاتے ہیں آخر دریافت کیا کہ اگر وہ ایسا عالی مرتبہ شخص تھا تو آپ نے اب تک زندیق کہہ کر ہم کو اس کے برکات وفیوض سے کیوں محروم رکھا؟ فرمایا واقعی وہ بہت بڑا صدیق تھا مگر تم کو اُس سے کچھ نفع نہ ہوتا۔ اگر تم اس کی صحبت میں رہتے تو زندیق ہی بن جاتے۔ کیونکہ اس کے دقیق علوم عام عقول سے بالاتر تھے۔ تم اس کی باتوں کو سن کر اپنی سمجھ کے موافق مطلب نکالتے حقیقت تک نہ پہنچتے اور زندقہ میں مبتلا ہوتے۔ اس لئے میں تم کو اس سے بچاتا رہا اور ظاہر میں زندیق کہتا رہا۔

غرض علماء نے انتظامِ شریعت کے لئے بعض اچھے آدمیوں کو بھی جان کر بُرا کہا ہے۔ مگر یہ علماء ہی کا منصب ہے عوام کا منصب نہیں تو اگر آپ کو کسی بھنگڑ بسنگڑ پر ولایت کا شبہ ہو تو آپ اُس کو بُرا نہ کہئے کیونکہ بُرا کہنا آپ پر فرض نہیں ہے۔ حضرت رابعہ تو شیطان کو بھی بُرا نہ کہتی تھیں اور فرمایا کرتیں کہ مجھے دوست کی یاد سے اتنی فرصت کہاں جو دشمن کا ذکر لے کر بیٹھوں۔ تو اگر آپ کسی کو بُرا نہ کہیں تو اُس پر ملامت نہ کی جائے گی۔ یہ تو اچھی بات ہے بلکہ ملامت اس پر کی جاتی ہے کہ تم ان بھنگڑوں سے دینی نفع یا دنیوی فائدہ حاصل کرنے جاؤ۔

مجذوبوں کا معاملہ

اگر ان میں سے کوئی سچ مچ بھی مجذوب ہو تو تمہیں اس سے کیا نفع دین کا نفع نہ ہونا تو ظاہر ہی ہے دنیا کا بھی ان سے کچھ نفع نہیں۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ مجذوب سیف زبان ہوتے ہیں؛ جو کہہ دیتے ہیں وہی ہو جاتا ہے۔ تو سمجھو کہ اُن کی زبان سے نکلتا وہی ہے جو ہونے والا ہوتا ہے اُن کے کہنے کو وقوع میں کچھ دخل نہیں۔ اس میں بھی لوگوں کی نادانی ہے کہ اُن کی باتوں کو وقوع کا سبب سمجھتے ہیں حالانکہ وہ اپنے اختیار سے کوئی بات بھی نہیں کہہ سکتے اُن کے منہ سے وہی نکلتا ہے جو ہونے والا ہے۔ اگر وہ نہ کہتے جب بھی اُس کا وقوع ضرور ہوتا۔ تو جب مجذوبوں سے نہ دین کا نفع ہے نہ دنیا کا، پھر تم مفت میں وہاں جا کر گالیاں کیوں کھاتے ہو؟ عجیب بات ہے کہ جو بزرگ خوش اخلاقی سے ملیں، اُن سے تو عوام بھاگتے ہیں اور جو بات بات میں گالیاں دیں اُن کو لپٹتے ہیں ــــــ!

وہی قصہ ہو گیا جیسے ایک شخص کی حکایت ہے کہ اُس کی بیوی نہایت حسین تھی مگر وہ اُسے منہ نہ لگاتا تھا۔ بلکہ ایک رنڈی سے پھنسا ہوا تھا۔ بیوی کو فکر ہوئی کہ دیکھنا چاہئے وہ رنڈی کیسی ہے۔ دیکھا تو صورت میں ناک بھی نہ تھی مگر حالت یہ تھی کہ میاں جب اُس کے پاس پہنچے تو اُس نے دو چار جوتے لگائے کہ بھڑوے کہاں تھا، اتنی دیر کہاں لگائی۔ وہ جوتے مارتی اور یہ خوشامدیں کرتا۔ بیوی نے سمجھ لیا کہ اس مرد کے لئے اس انداز کی ضرورت ہے۔ چنانچہ اس کے بعد جو مرد گھر میں آیا تو بیوی نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا کہ دو چار جوتے لگائے اور گالیاں برسانے لگی۔ تو وہ مرد ہنس

کر کہنے لگا کہ بی تیرے اندر بس اسی کی کسر تھی، اب سے میں کہیں نہ جاؤں گا (تو واقعی لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانا کرتے) بعض آدمی اسی کے مشتاق ہوتے ہیں کہ گالیاں کھائیں برا بھلا سنیں۔ سو یہ طریقہ تو سب کو آتا ہے مگر تہذیب مانع ہوتی ہے۔

بعض لوگ مجذوبوں سے دعا کے واسطے کہتے ہیں۔ تو یاد رکھو وہ کسی کے واسطے دعا نہیں کرتے۔ وہاں دعا کا محکمہ ہی نہیں بلکہ وہ تو یہ دیکھتے ہیں کہ حکم کیا ہو رہا ہے۔ مولانا اس کی بابت فرماتے ہیں ؎

کفر باشد نزد شاں کردن دعا
کاے خدا از ما بگرداں ایں قضا

خوب سمجھ لیجئے کہ ایک تو کوتوال ہوتا ہے اور ایک ہوتا ہے مصاحب تو کوتوال کی یہ مجال نہیں کہ وہ کسی مجرم کی سفارش کرے وہ تو حکم کا تابع ہے جس کے لئے سزا کا حکم ہوا سزا کر دیتا ہے اور جس کے لیے رہائی کا حکم ہو گیا اُسے رہا کر دیتا ہے اور مصاحب کو سفارش کا اختیار ہوتا ہے وہ بڑے سے بڑے مجرم کی سفارش کر سکتا ہے۔

تو مجذوبوں کا درجہ کوتوال کا سا ہے وہ سفارش اور دعا نہیں کر سکتے اور سالک کی حالت دوسری ہے یعنی اُن میں مصاحبت کی شان ہوتی ہے۔ وہ دعا اور سفارش کر سکتے ہیں۔ گو ان کے اختیارات زیادہ نہیں ہوتے مگر مقبول بھی زیادہ ہیں۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے سلطان محمود کے سامنے ایک تو ایاز تھا اور ایک حسن میمندی۔ حسن میمندی کے اختیارات بہت کچھ تھے کیونکہ وزیر اعظم تھا اور ایاز کے اختیارات باضابطہ کچھ نہ تھے کیونکہ وہ کسی عہدہ پر معین نہ تھا

مگر مقبولیت اور قرب کی یہ حالت تھی کہ جب محمود کو کسی بات پر غصہ آ جاتا تو کسی کو دم مارنے کی مجال نہ تھی اور حسن میمندی کے سب اختیارات رکھے رہ جاتے۔ اُس وقت سب لوگ ایاز ہی کی خوشامدیں کرتے تھے۔ کہ اس وقت سلطان سے تمہارے سوا کوئی بات نہیں کر سکتا۔

پس سالکین کی وہ شان ہے جو ایاز کی شان تھی۔ یہ ہر وقت دعا اور سفارش کر سکتے ہیں۔ تو دنیا بھی انہی کے پاس سے ملتی ہے اور ملنے کے یہ معنی نہیں کہ وہ خود تم کو خزانے دے دیں گے بلکہ مطلب یہ ہے کہ حاکم سے عرض کر دیں گے اور دین تو انہی میں منحصر ہے۔ مگر لوگوں نے عجیب خلط ملط کر رکھا ہے کہ مجذوبوں ہی سے دنیا بھی طلب کرتے ہیں اور دین بھی حالانکہ اُن کے اختیار میں کچھ بھی نہیں۔ گو وہ صاحب ولایت ہوتے ہیں مگر کسی کو کچھ دے نہیں سکتے۔ اور یہ بھی جب ہے کہ وہ مجذوب ہوں اور صاحب حال ہوں۔ اور اگر صاحب حال نہ ہوں جیسے آج کل عموماً جھنگڑ مسنگڑ پھرتے ہیں۔ تو وہ صاحب ولایت بھی نہیں بلکہ ان میں بعض تو پاگل سڑی ہوتے ہیں اور بعضے بنے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ تو پورے شیطان ہیں اور صاحب حال کی پہچان اہل علم کے لئے یہ ہے کہ اس کے پاس بیٹھ کر خدا کی محبت زیادہ ہو اور دنیا کی محبت کم ہو۔ اب دیکھئے! ان جھنگڑوں کے پاس جا کر بھی کبھی ایسا ہوتا ہے ــــ ہرگز نہیں!

پس خوب سمجھ لو کہ ہر مجنون مجذوب نہیں اور اگر کوئی ہو بھی تو وہاں نہ دنیا ہے نہ دین۔ دنیا تو اس لئے نہیں کہ وہ دعا نہیں کر سکتا اور دین اس لئے نہیں کہ اُن کے پاس تعلیم نہیں پس اُن کی زیارت تو کرو، وہ بھی جب کہ اُن میں صاحب حال ہونے کی علامت موجود ہو جس کو اہل علم ہی سمجھ سکتے ہیں

ورنہ جاہل کو تو مجذوب اور مجنون میں فرق نہیں معلوم ہو سکتا۔ مگر زیارت کے سوا اور کوئی تعلق نہ رکھو۔ حتیٰ کہ میں تو اہلِ علم کو بھی خاص طور پر یہی کہتا ہوں

دین اور ترقی

غرض یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سے یہ مسئلہ مستنبط ہو گیا کہ فلاحِ آخرت کے لئے ایمان یقیناً شرط ہے اور اس سے قرآن کی جامعیت معلوم ہوتی ہے کہ ذرا سے لفظ سے کتنا بڑا مسئلہ ثابت ہو گیا۔ گو یہاں اس پر کوئی زور نہیں دیا گیا نہ صیغہ امر سے اس کو تعبیر کیا گیا ہے۔ مگر طرزِ خطاب ہی سے یہ لفظ اس مفہوم پر دلالت کر رہا ہے کہ فلاح کے لئے سب سے اوّل ایمان شرط ہے۔ پس اوّل درجہ تو ایمان کا ہے۔ دوسرا درجہ اس کے بعد مراتب متوسطہ کا ہے جن کو اِصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا وَاتَّقُوا اللّٰہَ میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ چار چیزیں ہیں اور تیسرا درجہ نتیجہ کا ہے جس کا بیان لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ میں ہے جو شمار میں چھٹی چیز ہے۔

گو ترتیب کا مقتضا یہ تھا کہ میں اوّل مراتب متوسطہ کو بیان کرتا لیکن میں ضرورت کی وجہ سے نتیجہ کو مقدم کرتا ہوں کیونکہ آج کل ترقی و فلاح پر بہت گفتگو ہو رہی ہے اور ہر شخص اس کا طالب ہے۔ تو سنئے! حق تعالیٰ ایمان اور چند احکام کا بیان فرما کر بطور نتیجہ کے فرماتے ہیں لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ کہ امید ہے تم کو فلاح حاصل ہو۔ اس سے ایک تو یہ معلوم ہوا کہ اخیر چیز اور مقصود فلاح ہے۔ دوسرے یہ معلوم ہوا کہ اس کا وعدہ ان اعمالِ مذکورہ پر کیا گیا ہے۔ اور یہاں فلاح مطلق ہے جس کو فلاحِ دین وغیرہ کے ساتھ مقید نہیں کیا گیا۔ تو اس درجہ میں عمومِ الفاظ کی بنا پر میں کہتا ہوں کہ اس آیت سے یہ مسئلہ مستنبط ہوا کہ فلاح خواہ دین کی ہو یا دنیا کی، ان احکام پر ہی عمل

کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ اور یہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ اعمالِ شرعیہ سے مقصود تو محض فلاحِ دین ہے مگر ترتب فلاحِ دنیا کا بھی ہوتا ہے۔ پس فلاحِ دین تو اس لفظ کا مدلول مطابقی ہے اور فلاحِ دنیا مدلول التزامی ہے یعنی اعمالِ شرعیہ کے لئے فلاحِ دنیا لازم ہے گو مقصود نہ ہو۔

اب سنئے کہ اس زمانہ میں ہر شخص فلاح کا طالب ہے۔ فلاحِ دنیوی کے طالب تو بہت کثرت سے ہیں حتیٰ کہ اس کے لئے دین کو بھی برباد کر دیا جاتا ہے اور اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جب تک دین کو برباد نہ کریں اس وقت تک فلاحِ دنیوی حاصل نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ بعض لوگوں کو جب گناہوں سے بچنے کے لئے کہا جاتا ہے تو وہ جواب دیتے ہیں کہ صاحب ہم تو دنیا دار آدمی ہیں ہم سے تقویٰ طہارت کہاں ہو سکتا ہے اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ دنیا دار ہونا تقویٰ طہارت کے منافی ہے۔ گویا یوں کہئے کہ دین کی ترقی دنیا کے لئے مضر اور مانع سمجھتے ہیں۔ اسی لئے کوئی تجارت کرتا ہے تو اس میں احکامِ شرعیہ کی رعایت نہیں کرتا۔ کوئی زراعت کرتا ہے تو اس میں ناجائز امور سے اجتناب نہیں کرتا اور عام طور پر یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ دین دار ہونے کے معنی یہ ہیں کہ تجارت و زراعت وغیرہ سب کو بالائے طاق رکھ دے اور ان کاموں میں مشغول ہو کر دین دار بننا مشکل ہے کیونکہ دین ان کاموں میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے۔

سو خوب سمجھ لو کہ یہ خیال بالکل غلط ہے، دین ہرگز فلاحِ دنیا اور ترقی دنیا کے لئے مانع نہیں ہے اور دین دار بن کر بھی تجارت و زراعت ہو سکتی ہے مگر اس کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ وہ ذریعۂ معاش دین کے خلاف نہ ہو تب تو وہ دنیا نہیں ہے بلکہ عین دین ہے کیونکہ حدیث میں ہے۔

كَسْبُ الْحَلَالِ فَرِيْضَةٌ مِنْ بَعْدِ الْفَرِيْضَةِ

اس صورت میں تجارت و زراعت بھی باعثِ ثواب ہے بلکہ ان کاموں میں مشغول ہو کر دین کی پابندی کرنا یہ نرے ذکر و شغل سے افضل ہے۔

چنانچہ ایک بزرگ کا انتقال ہوا جو بہت بڑے تارک اور زاہد اور صوفی تھے۔ انتقال کے بعد کسی نے ان کو خواب میں دیکھا، پوچھا کہ حضرت آپ کے ساتھ کیا معاملہ ہوا؟ فرمایا مجھے بخش دیا گیا۔ مگر بھائی ہمارے پڑوس میں جو ایک مزدور صاحبِ عیال رہتا تھا، وہ ہم سے افضل رہا۔ کیونکہ وہ رات دن اپنے بال بچوں کے لئے محنت مزدوری کرتا اور ذکر و شغل کم کرتا تھا مگر ہر وقت اس کی تمنا یہ تھی کہ فرصت ملے تو میری طرح ذکر میں مشغول ہو۔ حق تعالیٰ نے اس نیت کی برکت سے اس کو وہ درجہ عطا کیا جو مجھے بھی نصیب نہیں ہوا ــــــ،

اس سے معلوم ہوا کہ کسبِ حلال کے ساتھ احکامِ الٰہیہ کی پابندی کرنا نرے ذکر و شغل ہونے سے بعض دفعہ افضل ہو جاتا ہے۔ مگر اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ سب کے لئے یہی طریقہ افضل ہے اور بس ہر شخص اسی طریق کو اختیار کر لے۔ بات یہ ہے کہ مصالح باہم متعارض ہیں۔ کسی کے لئے ایک طریق مصلحت ہے اور کسی کے لئے مفسدہ ہے۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے طب میں ایک ایک مرض کے لئے متعدد دوائیں نافع ہوتی ہیں مگر ہر دوا ہر شخص کے لئے مفید نہیں ہوتی بلکہ اس میں اس کی بھی ضرورت ہے کہ ہر شخص کے مزاج کا لحاظ کر کے چند دواؤں میں سے ایک کو منتخب کیا جائے اور اس کے ساتھ کچھ اور دوائیں بھی ملائی جائیں جو اس کی مضرتوں کی اصلاح کر دیں اور نفع کو قوی کر دیں۔ چنانچہ طبیب

ان سب باتوں کا لحاظ کر کے نسخہ مرتب کرتا ہے۔ اب اگر کوئی مریض حکیم کے نسخہ کو چھوڑ دے اور اس میں سے صرف ایک دوا کو چھانٹ لے، تو یہ اس کی غلطی ہے۔ اس طرح وہ کبھی شفایاب نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ گو وہ خود دوا جو اس نے منتخب کی ہے، اس مرض کو مفید ہے۔ مگر اس مریض کے مزاج کے لحاظ سے اس کے ساتھ بدرقہ اور مصلح کی ضرورت تھی جس کے بغیر یہ دوا مرض کو زائل نہیں کر سکتی۔

اسی طرح باطن میں بھی ہر مریض کو شیخ کی تجویز کا اتباع ضروری ہے اپنی رائے سے کسی طریق کے تجویز کر لینے کا اُسے حق نہیں۔ ہم نے مانا کہ اشتغال بالکسب بھی بعض دفعہ وصول کے لئے کافی ہو جاتا ہے مگر ہر ایک کو نہیں بلکہ خاص استعداد والوں کو کافی ہوتا ہے اور بدون اس خاص استعداد کے اس سے نفع نہیں ہوتا۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے طلباء میں مشہور ہے کہ شرح ملّا جامی کسی کو اچھی طرح آجائے تو استعداد علوم کے لئے کافی ہے۔ تو ایک طالب علم نے یہ بات سُن کر اوّل ہی سے شرح جامی شروع کر دی اور دس بارہ برس تک اسی میں مشغول رہا۔ تو یہ اس کی حماقت ہے کیونکہ شرح جامی گو استعداد علوم کے لئے کافی ہے مگر خود اس کے لئے بھی تو خاص استعداد کی ضرورت ہے، جو میزان منشعب اور نحو میر و ہدایۃ النحو وغیرہ کے بغیر حاصل نہ ہو گی۔

اسی طرح اشتغال بالکسب ضرور کافی ہے مگر اس کے لئے بھی خاص استعداد کی ضرورت ہے اور وہ استعداد حاصل کرنے کے لئے طبیب کامل سے مشورہ کی ضرورت ہے۔ پھر جس کے لئے وہ اشتغال بالکسب تجویز کرے، اس کو یہی طریق مناسب ہے اور جس کے لئے ترک اسباب تجویز

کرے، اُس کے مناسب یہی طریق ہے کیونکہ جس طریق کو شیخ تجویز کرتا ہے حق تعالیٰ اُس کو طالب کے مناسب ہی کر دیتے ہیں۔ کسی طریق کا مناسب ہونا یا غیر مناسب ہونا تو دراصل حق تعالیٰ کے قبضہ میں ہے اور وہیں سے سب کچھ ملتا ہے مگر وہ اکثر مشائخ کاملین کے دل میں ہر ایک کے مناسب ایک بات ڈال دیتے ہیں کہ اس مریض کے لئے فلاں طریق تجویز کرنا مناسب ہے ؎

کارِ زلفِ تست مشک افشانی اما عاشقاں
مصلحت را تہمتے بر آہوئے چیں بستہ اند

غرض حق تعالیٰ نے ہر ایک کے لئے ایک خاص طریق مقرر کیا ہے۔ کہ اس کو اسی سے وصول ہوتا ہے۔ کسی کو اشتغال بالکسب سے دولت ملتی ہے اور کسی کو ترک اسباب سے۔ پس جس کے لئے جو طریقہ تجویز کر دے، وہ اُسی کو اختیار کرے۔ اور اُسی پر راضی رہے۔ کسی کے لئے خندہ مناسب ہے، اور کسی کے لئے گریہ مناسب ہے۔ اس میں اپنی رائے کو دخل نہ دینا چاہئے اسی کو کہتے ہیں ؎

بگوشِ گل چہ سخن گفتہ کہ خنداں ست
بعندلیب چہ فرمودہ کہ نالاں ست

مولانا فرماتے ہیں ؎

چونکہ بر میخت بہ بندد بستہ باش
چوں کشاید چابک و برجستہ باش

یعنی جب وہ باندھ دیں بندھے رہو اور جب کھول دیں کودتے پھرو۔ اگر وہ بے فکری دیں بے فکر رہو اور اگر افکار میں مبتلا رکھیں تو اسی میں خوش

رہو کیونکہ افکار و تشویشات سے بھی ترقی ہوتی ہے اور ثواب بڑھتا ہے طلب اسی کا نام ہے اور بدون اس کے کام نہیں چل سکتا۔ اس طریق میں اپنی تجویز کو فنا کر دینا چاہیئے۔ بعض لوگ ان تجویزوں ہی کی وجہ سے پریشان ہوتے ہیں کیونکہ وہ اپنے لیئے ایک خاص حالت تجویز کر لیتے ہیں کہ ہم اس حال میں رہیں تو اچھا ہے۔ پھر جب اس کے خلاف دوسری حالت طاری ہوتی ہے تو گھبرا جاتے ہیں۔

میں نے ایک صاحب کو دیکھا جو عالم آدمی معمر ڈپٹی کلکٹر تھے جب اُن کی پنشن ہو گئی تو اُن کا جی چاہتا تھا کہ الگ بیٹھ کر اللہ اللہ کروں۔ خدا کی قدرت کہ ذکر و شغل شروع کرنے کے بعد اُن کے دو بیٹے ایک دم سے مجنون ہو گئے۔ ایک تو اُن کا لڑکا ہے اور ایک لڑکے کا لڑکا ہے۔ تو وہ سخت پریشان ہو گئے کیونکہ اب اُن کے علاج معالجہ میں مشغول ہونا پڑا۔ وہ خلوت و یکسوئی فوت ہو گئی اور بعض دفعہ اللہ اللہ کرنا بھی نصیب نہ ہوتا تھا لیکن عارف کے لیئے کچھ پریشانی نہیں کیونکہ عارف اپنے لیئے کوئی حالت تجویز نہیں کیا کرتا۔ جب تک حق تعالیٰ خلوت میں رکھیں خلوت میں رہتا ہے اور جب وہ خلوت سے نکالنا چاہیں نکل جاتا ہے اور اسی میں راضی رہتا ہے اسی کو فرماتے ہیں ؎

چونکہ بر میخت بہ بندد بستہ باش چوں کشاید چابک و برجستہ باش

میں کہتا ہوں کہ اصل مقصود تو رضائے حق ہے اور وہ جس طرح خلوت میں ہوتی ہے بعض دفعہ خدمتِ خلق میں ہوتی ہے تو کیا اُن کو مجنون کی خدمت میں ثواب نہ ملتا؟ ضرور ملتا۔ اس صورت میں یہ فکر ہی ترقی کا موجب ہے اس وقت بے فکری اور خلوت مفید نہیں بلکہ خلوت میں اللہ اللہ کرنے سے جو

ثواب ملتا خدمتِ مجنون میں اس سے زیادہ ملتا۔ پھر پریشانی کس لیے؟

ایک شخص حضرت حاجی صاحب قدس اللہ سرہٗ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میں بیمار ہو گیا تھا۔ کئی وقت سے حرم میں جا کر نماز بھی نہ پڑھ سکا۔ اس کا بہت رنج ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ قرب کے طریقے مختلف ہیں۔ یہ بھی ایک طریقہ ہے کہ گھر پر نماز پڑھو اور حرم کی حاضری کو ترسو۔ جس حال میں وہ رکھیں اسی میں راضی رہنا چاہیے۔

پھر فرمایا کہ اس کی ایسی مثال ہے جیسے حج کو بمبئی سے بھی جاتے ہیں اور کراچی سے بھی۔ اگر وہ بمبئی سے بلاویں بمبئی سے چلے جاؤ اور کراچی سے بلاویں تو کراچی سے چلے جاؤ۔ مقصود دونوں حالتوں میں حاصل ہے۔ اسی کو فرماتے ہیں ؎

چوں کہ بر میخت بہ بندد بستہ باش
چوں کشاید چابک و برجستہ باش

اسی طرح اگر حق تعالیٰ کسی کو اسباب میں رکھیں اسباب میں رہو اور ترکِ اسباب میں رکھیں تو اسی میں رہو۔ چنانچہ اگر کوئی شخص زراعت و تجارت اس طرح کرے کہ وہ دین کے موافق ہو کوئی بات خلافِ شرع نہ ہو تو یہ عین ثواب ہے اور اس حالت میں یہ دنیا نہیں بلکہ عین دین ہے۔ ہاں اگر کوئی بات دین کے خلاف ہے تو البتہ یہ دنیا ہے جو دین کو مضر ہے۔ پس یہ خیال غلط ہے جو عام طور پر لوگوں کے دل میں جما ہوا ہے کہ دین کے ساتھ دنیا کے کام نہیں ہو سکتے اور دنیا دی فلاح بدون ترکِ دین کے حاصل نہیں ہو سکتی۔ خدا تعالیٰ کا کلام اس خیال کو غلط بتلا رہا ہے کیونکہ یہاں حق تعالیٰ نے چند احکام بیان فرما کر لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ فرمایا ہے جو اپنے عموم سے فلاح دنیوی کو بھی شامل کر

فلاح کی حقیقت

اس میں غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ یہ اعمال شرعیہ فلاح اخروی کا طریق تو ہیں ہی مگر فلاح دنیوی بھی ان کو لازم ہے لیکن سب سے پہلے فلاح کی حقیقت سمجھنا چاہیئے۔ تو سمجھو کہ فلاح کہتے ہیں کامیابی کو نہ کہ مال یابی کو۔ آج کل لوگوں نے کثرتِ مال کو فلاح سمجھ لیا ہے یہ غلط ہے۔ دیکھئے قارون کو بہت لوگ صاحبِ نصیب اور صاحبِ فلاح سمجھتے تھے یہ بھی اسی خیال کے لوگ تھے جیسے آج کل بعض لوگوں کا خیال ہے۔ چنانچہ جب وہ اپنے حشم خدم لے کر ساز و سامان کے ساتھ نکلا ہے تو ان لوگوں کی رال ٹپک پڑی اور کہنے لگے۔

یٰلَیْتَ لَنَا مِثْلَ مَا اُوْتِیَ قَارُوْنُ اِنَّهٗ لَذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ۔

کیا خوب ہوتا کہ ہم کو بھی وہ ساز و سامان ملا ہوتا جیسا قارون کو ملا ہے واقعی وہ بڑا صاحبِ نصیب ہے تو اس وقت جو عقلاء تھے انہوں نے ان لوگوں کو ان کی غلطی پر متنبہ کیا اور بتلایا کہ فلاح اور خوش نصیبی کثرتِ مال سے نہیں ہے بلکہ یہ تو اطاعتِ خداوندی سے حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

وَقَالَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَیْلَکُمْ ثَوَابُ اللّٰهِ خَیْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ۚ وَلَا یُلَقّٰهَآ اِلَّا الصّٰبِرُوْنَ۔

اور جن لوگوں کو فہم عطا ہوا تھا وہ کہنے لگے کہ ارے تمہارا ناس ہو (تم اس مال اور سامان پر کیا للچاتے ہو) اللہ تعالیٰ کا ثواب ہزار درجہ (اس سے) بہتر ہے جو ایسے شخص کو ملتا ہے کہ ایمان لائے اور نیک عمل کرے اور وہ (کامل طور پر) انہی لوگوں کو دیا جاتا ہے جو (دنیوی حرص و طمع سے) صبر کرنے والے ہیں ——— اس جواب سے معلوم ہو گیا کہ کثرتِ مال سے خوش نصیبی

اور فلاح نہیں ہوتی بلکہ دنیا کی فلاح اور خوش نصیبی بھی اطاعت الٰہیہ ہی سے حاصل ہوتی ہے۔ اس زمانہ کے عوام عقلاً تو اس جواب سے خاموش ہو گئے ہوں گے مگر شاید کسی کو دلیل حسّی کا انتظار رہا ہو۔ تو وہ زمانہ عجیب تھا کہ بات بات کے لیے دلائل و آیات ظاہر ہوتی تھیں۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے ایسی نشانی ظاہر کر دی جس سے دنیا داروں کو بھی اقرار کرنا پڑا کہ واقعی خدا تعالیٰ کی نافرمانی کرنے والوں کو دنیوی فلاح بھی حاصل نہیں ہو سکتی، گو وہ کیسے ہی مالدار ہوں بلکہ دنیا میں بھی خوش نصیب اور صاحبِ فلاح دیندار ہی ہیں حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

فَخَسَفْنَا بِهٖ وَبِدَارِهِ الْاَرْضَ فَمَا كَانَ لَهٗ مِنْ فِئَةٍ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُنْتَصِرِيْنَ ۝ وَاَصْبَحَ الَّذِيْنَ تَمَنَّوْا مَكَانَهٗ بِالْاَمْسِ يَقُوْلُوْنَ وَيْكَاَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ لَوْلَآ اَنْ مَّنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا لَخَسَفَ بِنَا وَيْكَاَنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ۝

پھر ہم نے قارون کو اور اس کے محل سرائے کو زمین میں دھنسا دیا سو کوئی ایسی جماعت نہ ہوئی جو اس کو اللہ کے عذاب سے بچا لیتی اور نہ وہ خود ہی اپنے آپ کو بچا سکا اور کل جو لوگ اس جیسا ہونے کی تمنا کر رہے تھے، وہ (آج اس کو دھنستا ہوا دیکھ کر) کہنے لگے کہ بس جی یوں معلوم ہوتا ہے کہ اللہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے زیادہ روزی دے دیتا ہے (اور جس کو چاہے) تنگی سے دیتا ہے (یہ ہماری غلطی تھی کہ ہم کثرتِ مال کو خوش نصیبی سمجھتے تھے۔ بس جی خوش نصیبی اور بدنصیبی کا مدار اس پر نہیں بلکہ یہ تو محض کسی حکمت کی وجہ سے ہے)، اگر ہم پر اللہ تعالیٰ کی مہربانی نہ ہوتی تو ہم کو بھی دھنسا

دنیا (کیونکہ حُبِ دنیا کے گناہ میں ہم بھی مبتلا ہو گئے تھے) بس جی معلوم ہوا کہ کافروں کو فلاح نہیں ہوتی (گو چند روز مزے لوٹ لیں مگر انجام پھر ناکامی اور خسران ہی ہے) اس میں حق تعالیٰ نے دنیاداروں کا قول نقل فرمایا ہے کہ آخر کو انہوں نے بھی اقرار کر لیا کہ کافروں کو فلاح اور کامیابی نہیں ہوتی اور یقیناً قارون کی جو حالت اخیر میں ہوئی اُس کو دیکھ کر کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ قارون کامیاب تھا — ہرگز نہیں۔ ہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ مال یاب تھا۔ پس معلوم ہو گیا کہ فلاح کامیابی کا نام ہے نہ مال یابی کا۔

تموّل اور کامیابی

یہ ضرور نہیں کہ جو شخص مال یاب ہو، وہ کامیاب بھی ہو۔ مگر عجیب اندھیر ہے کہ آج کل لوگ تموّل ہی کو کامیابی سمجھتے ہیں حالانکہ مال خود مقصود نہیں بلکہ یہ تو مقصود کا وسیلہ ہے۔ مال تو ایسا ہے جیسے بادام کا خول اور مقصود ایسا ہے جیسے بادام کا مغز۔ تو بڑا نادان ہے وہ شخص جو چھلکے کو مقصود سمجھے اور اسی کو جمع کرنے میں ساری عمر گنوا دے اُس کے دماغ کو بادام سے خاک بھی قوت حاصل نہ ہو گی اور یقیناً وہ مقصود سے ناکام رہے گا۔ اور جو شخص مغز کو مقصود سمجھے اور اُسی کو جمع کرے گو اُس کے پاس چھلکا ایک بھی نہ ہو، وہ کامیاب ہے۔ اس کے دماغ میں بے شک قوت پہنچے گی اب سمجھو کہ اصل مقصود کیا ہے۔ تو سب جانتے ہیں کہ مال آرام وراحت کے لئے جمع کیا جاتا ہے پس راحت و آرام اصل چیز ہے اور یہی مغز ہے اب میں پوچھتا ہوں کہ اگر کسی کو بدون مال کے آرام و چین حاصل ہو تو وہ کامیاب ہو گا یا نہیں؟ یقیناً وہ کامیاب ہے۔

اس کی ایسی مثال ہو گی جیسے کسی کے پاس بادام کی گریاں موجود ہوں

گو چھلکے نہ ہوں۔ اور اگر کسی کو باوجود کثرتِ مال کے آرام وچین نصیب نہ ہو تو بتلایئے وہ ناکام ہے یا نہیں؟ یقیناً وہ ناکام ہے۔ اور بے چینی کے ساتھ اس کے پاس مال کا جمع ہونا ایسا ہے جیسے کسی کے پاس خالی بادام کے چھلکے جمع ہوں جن میں مغز کا نام نہ ہو۔

تو میں دعویٰ کے ساتھ کہتا ہوں کہ مطیعِ خدا کے برابر دنیا کا آرام وچین بھی کسی کو حاصل نہیں ہوتا۔ اُس کو وہ راحت ہے جو کسی بادشاہ کو بھی نصیب نہیں۔ مجھے آپ کوئی دین دار دنیوی آسائش سے محروم دکھا دیجئے اور میں دنیا دار ہزاروں آرام سے محروم بتلاتا ہوں جو ہر وقت سینکڑوں تشویشات اور ہزاروں افکار میں مبتلا ہیں۔

میں بقسم کہتا ہوں کہ مجھ کو امیروں پر غریبوں سے زیادہ رحم آتا ہے کیونکہ غریبوں کو اتنے افکار نہیں ہیں جتنے امراء کو ہیں۔ ہمارے اکثر بھائی چندوں میں امیروں کی گردنیں دباتے ہیں اور اُن سے زیادہ وصول کرنا چاہتے ہیں کیونکہ ظاہر میں وہ غریبوں سے زیادہ مالدار ہیں مگر مجھے اُن پر رحم آتا ہے۔ کیونکہ جیسا مال اُن کے پاس زیادہ ہے ویسے ہی اُن کے افکار بھی زیادہ ہیں اور خرچ بھی بہت ہیں۔ مثلاً کسی کی آمدنی پانچ سو روپیہ ماہوار کی ہے تو اس کے اخراجات سات سو روپے ماہوار کے ہیں۔ اور خرچ کا آمدنی سے زیادہ ہونا جڑ ہے کلفت اور پریشانی کی۔ اور جو لوگ غریب ہیں اُن کی آمدنی اور خرچ عموماً برابر ہے جتنا کما لیا وہی کھا لیا پہن لیا بلکہ اس میں سے بھی بعض دفعہ کچھ بچا لیتے ہیں۔ اس لئے غریب آدمی دس پیسوں میں سے ایک پیسہ بآسانی دے سکتا ہے اور امیر آدمی ایک ہزار میں سے بھی ایک روپیہ نہیں دے سکتا۔ کیونکہ وہ ہزار سے زیادہ کا مقروض ہے۔ وہ اگر ایک روپیہ

دے گا تو اس سے بھی قرض میں ہی کچھ اضافہ ہو گا۔ تو جو اس راز کو سمجھے گا، وہ امیروں پر غرباء سے زیادہ رحم کرے گا۔ مگر لوگ اُن کے ظاہری سامان کو دیکھ کر اُنہی کی گردن دباتے ہیں۔ تو ان بے چاروں کو زیادہ نہ ستانا چاہیئے۔

دوسری بات یہ ہے کہ غریب آدمی کے اگر اخراجات بڑھتے ہیں، تو وہ آمدنی بھی بڑھا دیتے ہیں۔ مثلاً پہلے دو آنے یومیہ پر مزدوری کرتے تھے، کسی سال گرانی ہوگئی تو اُنہوں نے مزدوری بڑھا دی۔ اب چار آنے یومیہ پر کام کرنے لگے۔ اور کام لینے والے مجبور ہو کر وہی دیتے ہیں جو مزدور مانگتا ہے۔ تو غریبوں کی آمدنی اُن کے اختیار میں ہے اور امراء کی آمدنی اُن کے قبضہ میں نہیں۔ نیز امراء کے تعلقات بھی وسیع ہوتے ہیں، غرباء کے تعلقات اس درجہ وسیع نہیں ہوتے۔ غریب کو بہت سے بہت اپنے گھر کا فکر ہے اور بال بچوں کا یا دو چار جانوروں کا۔ اور امیروں کو گھر کا الگ فکر، احباب اور حکام کی خاطر مدارات کا جُدا فکر، پھر جائداد اور زمین کا بھی خیال ہے کوئی بیمار ہو جائے تو طبیب کے بلانے کا بھی اہتمام کرنا پڑتا ہے۔ غرباء اوّل تو بیمار کم ہوتے ہیں اور جو ہوئے بھی تو ویسے ہی دو چار دن پھر پھرا کر اچھے ہو جاتے ہیں۔ غرض امراء کے ساتھ تعلقات بہت لگے ہوئے ہیں اور جتنے یہ تعلقات زیادہ ہوتے ہیں اتنا ہی سوہانِ روح زیادہ ہوتا ہے۔

اولاد کا عذاب

حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

وَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّعَذِّبَهُمْ بِهَا فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا۔

حق تعالیٰ نے اموال و اولاد کو اس جگہ آلۂ عذاب فرمایا ہے۔ اور واقعی غور کر کے دیکھا جائے تو کثرتِ مال و اولاد کے ساتھ افکار و تشویشات بھی زیادہ ہو جاتی ہیں اور یہی کلفت و پریشانی کی حقیقت ہے جس میں امراء اکثر مبتلا ہیں۔ چنانچہ کسی مالدار کے اولاد نہ ہو تو اُس کو اپنے مال کی فکر ہوتی ہے کہ میرے بعد یہ تیرے میرے پاس پہنچے گا اس لئے وہ کسی نہ کسی کو متبنیٰ بناتا ہے اور بعد میں اپنے بھی اولاد ہو جائے تو پریشان ہوتا ہے اور اگر کسی کو مال کے ساتھ اولاد بھی نصیب ہو جائے تو خیر ایک غم تو ڈھلا اب یہ فکر ہے کہ بچہ بڑا ہوا ہے اُس کی تعلیم و تربیت کرنا چاہیئے اور یہ ایسی چیز ہے کہ کسی کے قبضہ و اختیار میں نہیں۔ بعض دفعہ لاکھ کوشش کرو، مگر اولاد نالائق اٹھتی ہے اور جو لائق بھی ہوئی تو پھر اس کے نکاح کی فکر ہے سو پریشانیوں کے بعد نکاح بھی ہوا تو اب یہ فکر ہے کہ بیٹے کے اولاد نہیں ہوتی۔ اگر لڑکا بے اولاد رہ گیا تو پھر جائداد کے غیروں کے پاس جانے کا اندیشہ ہے۔ غرض عمر بھر یہی پریشانی رہتی ہے۔

میں نے ایک بڑی بی کو دیکھا جو اپنے بچوں کو بہت چاہتی تھیں۔ رات کو سب بچوں کو اپنے ہی پلنگ پر لے کر سوتی تھیں۔ جب اولاد زیادہ ہوئی تو پلنگ کی بجائے فرش پر سب کو لے کر سوتی تھیں۔ اور رات کو یہ حالت تھی کہ بار بار اٹھ کر سب کو ہاتھ سے ٹٹولتی تھیں کہ سب زندہ بھی ہیں یا نہیں۔ اور اگر ذرا کبھی کسی کو تکلیف ہو گئی تو بس ساری رات کی نیند اڑ گئی تو بھلا اس صورت میں یہ اولاد آلۂ عذاب نہیں تو کیا ہے۔ خدا کی قسم راحت میں وہ ہے جس کے دل میں صرف ایک کی محبت ہو۔ وہ ایک کون؟ خدا تعالیٰ اور یہ حالت ہو ؎

یکے بین ویکے دان ویکے گوے   یکے خواہ ویکے خوان ویکے جوے
خلیل آسا در ملک یقین زن   نوائے لا احب الآفلین زن

اسی کو ایک عارف فرماتے ہیں ؎

مصلحت دید من آنست کہ یاراں ہمہ کار
بگذارند و خم طرۂ یارے گیرند

اور فرماتے ہیں ؎

دلا رامیکہ داری دل درو بند   دگر چشم از ہمہ عالم فرو بند

پریشانیٔ افکار کی وجہ

شاید کسی کو یہاں پر یہ شبہ ہو کہ پہلے تو تم یہ کہہ رہے تھے کہ پریشانی میں بھی ثواب ہوتا ہے اور اب پریشانی کی مذمت کرنے لگے۔ تو سمجھو کہ پریشانی دو قسم کی ہے۔

۱۔ ایک اضطراری   ۲۔ ایک اختیاری

پہلی قسم کی میں نے فضیلت بیان کی تھی کہ اگر من جانب اللہ کسی کو افکار میں مبتلا کر دیا جائے تو وہ اسی پر راضی رہے۔ اس وقت فکر ہی سے ترقی ہوگی اور ثواب بڑھے گا۔ اور دوسری قسم کی مذمت کر رہا ہوں کہ اپنے اختیار سے پریشانی کو مول لینا سراسر موجب کلفت ہے۔ غرض تعلقات ماسوا اللہ یہ ہیں حقیقت میں تکلیف دہ۔ اسی لئے بعض بزرگوں نے فرمایا ہے کہ سلاسل واغلال جہنم کی حقیقت تعلقات ماسوی اللہ ہیں۔ یعنی سلاسل و اغلال جہنم ان تعلقات کی صورت ہیں جو دنیا میں انسان غیر اللہ سے پیدا کرتا ہے جن سے یہاں بھی پریشان ہوتا ہے اور آخرت میں بھی وہ سلاسل واغلال کی صورت میں ظاہر ہوں گے۔ تو کیا ایسے مالدار کو کامیاب کہیں گے، جو باوجود

کثرتِ مال کے راحتِ قلب سے محروم ہو۔ ہرگز نہیں۔ البتہ اگر مال سے قلب کو تعلق نہ ہو تو پھر وہ آلۂ عذاب نہ ہوگا۔ اور نہ اس صورت میں کثرتِ مال کا کچھ حرج ہے۔

غرض اصل مقصود راحت و آسائش ہے اور وہ دنیا میں بھی دین داروں ہی کو حاصل ہے پس آخرت کی فلاح تو ان کے لئے ہے ہی، دنیا کی فلاح بھی انہی کے لئے ہے۔ کیونکہ روحانی راحت دنیا میں اُن کے سوا کسی کو نہیں بلکہ میں اس سے بھی ترقی کر کے کہتا ہوں کہ دین داروں کو روحانی راحت تو حاصل ہے ہی، جسمانی راحت بھی اُنہی کو حاصل ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ بیمار نہیں ہوتے بلکہ مطلب یہ ہے کہ بیماری اور حوادث میں اُن کو روحانی اطمینان کے ساتھ جسمانی اطمینان بھی حاصل ہوتا ہے۔ وہ مصائب میں نہایت استقلال اور سکون کے ساتھ رہتے ہیں اور دنیا داروں کو ایسے وقت میں روحانی اطمینان تو ہوتا ہی نہیں، جسمانی راحت بھی نہیں ہوتی۔ اُن کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگتی اور باتوں سے گھبراہٹ و بے صبری نمایاں ہوتی ہے۔

مثلاً جب طاعون آتا ہے تو جتنے لوگ دین دار ہیں اُن کو پریشانی نہیں ہوتی نہ وہ گھبراہٹ کی باتیں کرتے ہیں نہ مردوں کا شمار کرتے پھرتے ہیں کہ آج کتنے مرے اور کل کتنے۔ نہ اپنی مجلسوں میں ہر وقت اس کا تذکرہ کرتے ہیں بلکہ اپنے کام میں لگے رہتے ہیں۔ اور نہ وہ اپنے مرنے سے گھبراتے ہیں۔ اُن کو طاعون کی پروا بھی نہیں ہوتی۔ کیونکہ اُن کا تو مذاق یہ ہے اِنَّآ اِلٰی رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ۔ کہ مر کر ہم اپنے خدا کے پاس پہنچ جائیں گے۔ تو جو شخص موت کو معراج سمجھتا ہے، وہ طاعون سے کیا ڈرے گا بلکہ اہل اللہ تو اس کے مشتاق رہتے ہیں۔ چنانچہ حافظ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

خرم آں روز کزیں منزلِ ویراں بروم
راحتِ جاں طلبم و زپئے جاناں بروم
نذر کردم کہ گر آید بسر ایں غمِ روزے
تا درِ میکدہ شاداں و غزل خواں بروم

وہ تو موت کو ایسا شیریں سمجھتے ہیں کہ اس کے لئے نذریں مانتے ہیں خیر یہ تو بڑے دین داروں کی حالت ہوتی ہے مگر معمولی دین داروں کو بھی آپ دیکھیں گے کہ وہ طاعون سے اس قدر پریشان نہیں ہوتے، جتنے دنیا دار پریشان ہوتے ہیں۔

میں نے طاعون میں ایک ہندو کو مرتے دیکھا۔ چونکہ وہ سب سے میل جول رکھنے والا تھا اس لئے بیماری میں اس کے دیکھنے کو ہندو مسلمان سبھی جاتے تھے۔ تو میں نے دیکھا کہ وہ ہائے ہائے کرتا تھا اور سخت پریشان تھا حالانکہ بڑا مالدار تھا مگر اس وقت مال نے اس کی پریشانی کو کچھ کم نہ کیا۔

اور ہم نے مسلمانوں کو بھی طاعون میں مرتے ہوئے دیکھا ہے کہ بڑے خوش و خرم جان دیتے تھے۔ ہمارے یہاں ایک دفعہ طاعون بہت زور کا ہوا تو مولانا فتح محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مکتب سے پردیسی طلباء اپنے اپنے وطن جانے لگے کیونکہ مولانا کا اسی طاعون میں وصال ہو چکا تھا تو ان میں ایک طالب علم نور احمد نامی بھی جس کی عمر ۱۸ برس کی تھی گھر جانے کے لئے تیار تھا۔ اسباب بندھا رکھا تھا کہ رات ہی کو اسے بخار ہوا اور گلٹی نمودار ہوئی۔ سب کو بڑا رنج ہوا کہ اس بے چارہ کو اپنے وطن کی کیسی حسرت ہوگی، گھر جانے کو تیار بیٹھا تھا اور اب موت کا سامان ہونے لگا

تو بعض لوگوں نے تسلی کے طور پر اُس سے کہا کہ نور احمد گھبراؤ نہیں انشاءاللہ تم اچھے ہو جاؤ گے اور تندرست ہو کر اپنے گھر جاؤ گے۔ تو وہ کہنے لگا کہ بس اب میرے واسطے ایسی دُعا نہ کرو، اب تو خدا تعالیٰ سے ملنے کو جی چاہتا ہے۔ یہ دُعا کرو کہ ایمان پر خاتمہ ہو جائے۔ اس وقت لوگوں کو معلوم ہوا کہ اُسے گھر کی ذرا بھی حسرت نہیں۔ چنانچہ ایک دو روز میں اس کا انتقال ہو گیا تو میں نے دیکھا کہ اُس کے جنازہ پر ایک نور تھا۔

صاحبو ـــ بھلا ایسے لوگ کیا پریشان ہوں گے جو خدا تعالیٰ کے ہر حکم پر راضی ہیں۔ کھانے کو کم ملے تو اس پر راضی، پہننے کو پھٹا پرانا ملے اس پر راضی، بیماری آوے تو اس پر راضی، پھر اُنہیں کا ہے کا غم۔ ان کی طرف سے دنیا میں جو چاہے ہوتا رہے وہ کبھی پریشان نہ ہوں گے۔ کیونکہ وہ سب کو خدا کی طرف سے سمجھتے ہیں اور ع

ہر چہ از دوست میرسد نیکوست

اور ع

ہر چہ آں خسرو کند شیریں بود

حضرت بہلول دانا نے ایک بزرگ سے دریافت کیا کہ فرمائیے کہ آج کل کیوں کر گزرتی ہے؟ فرمایا، اُس شخص کی خوشی کا کیا حال پوچھتے ہو، جس کی خواہش کے خلاف عالم میں کچھ نہیں ہوتا جو کچھ ہوتا ہے اُس کی خواہش کے موافق ہوتا ہے۔ بہلول نے کہا کہ یہ کیوں کر؟ فرمایا کہ عالم میں جو کچھ ہوتا ہے یقیناً خدا کے ارادہ کے موافق ہوتا ہے اور میں نے اپنے ارادہ کو اُن کے ارادہ میں فنا کر دیا ہے۔ تو اب جو کچھ ہوتا ہے وہ میری خواہش کے بھی موافق ہوتا ہے۔

سو بتلائیے! جس نے اپنی خواہش کو خدا کی خواہش میں فنا کر دیا ہو اس کو پھر غم کا ہے کا۔ اس سے بڑھ کر کسے آسائش ہو گی۔ صاحب آپ کسی اہل اللہ کے پاس بیماری کی حالت میں جا کر دیکھئے جو نادار بھی ہوں، واللہ آپ اُن کو پریشان نہ پا دیں گے۔

امرائے سے ہمدردی کا فقدان

اس کے بعد کسی والیٔ ریاست کے پاس جا کر دیکھئے تو وہ بیماری میں سخت پریشان ہو گا۔ گو ظاہر میں اُن کے خدمت گار اور تیمار دار بہت ہوں گے مگر وہ راحت میں نہ ہو گا، نہایت بے چین ہو گا اور ایسا بھی کم ہوتا ہے کہ امراء و رؤسا کو بیماری میں تیمار دار اور خدمت گار خیر خواہ نصیب ہو جائیں۔ زیادہ تو یہی دیکھا ہے کہ بیماری میں راحتِ جسمانی بھی دینداروں کو امراء سے زیادہ نصیب ہوتی ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ بزرگ بیمار ہوتے ہیں تو اُن کو دل سے خدمت کرنے والے جان نثار خادم بہت میسّر ہوتے ہیں اور امیروں کو ایک بھی میسّر نہیں ہوتا۔ اُن کے خدمت گار محض اوپر کے دل سے خدمت کرتے ہیں۔ پھر کوئی بزرگ بیمار ہوتا ہے تو ہر مرید اور ہر عالم اُن کے لئے دل سے دعائے صحت کرتا ہے اور امیروں کے لئے ایک بھی دل سے دعا نہیں کرتا۔

چنانچہ ایک رئیس بیمار ہوئے اور حکیموں نے نسخے لکھے تو اُن کے ورثاء نسخوں کو چھپاتے پھرتے تھے کہ دوائیں استعمال کر کے اگر یہ بچ گیا تو سارا مال اور ریاست کا کام پھر اسی کے قبضہ میں رہے گا۔ یہ تو مالداروں کی حالت ہے ______ اور چرتھاول میں ایک مزدور کو ہم نے دیکھا کہ وہ بیمار ہوا تو اُن کے سب بچے اور گھر والے وظیفے پڑھ پڑھ کر

دُعا کرتے اور یہ چاہتے تھے کہ خدا کرے یہ نہ مرے اور کسی طرح اچھا ہی ہو جائے۔

تو بتلایئے! کیا اس پر بھی کوئی کہہ سکتا ہے کہ فلاح و کامیابی کثرتِ مال سے ہے۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ دنیوی فلاح بھی دین ہی سے حاصل ہوتی ہے۔ اور ایک کھلی دلیل اس کی یہ ہے کہ اہل دنیا دینداروں کے دروازوں پر دنیا کی حاجتیں لے کر جاتے ہیں۔ چنانچہ اہل اللہ کے دروازوں پر آپ ہزاروں دنیا داروں کو جاتا دیکھیں گے۔ معلوم ہوا کہ دنیا دار بھی سمجھتے ہیں کہ دنیا بھی ان دینداروں ہی کے پاس ہے جب تو اُن کے پاس دنیا کی حاجتیں لے جاتے ہیں اور آپ نے کسی دین دار بزرگ کو اہل دنیا کے پاس کوئی حاجت لے کر جاتے ہوئے نہ دیکھا ہوگا۔ پس معلوم ہوا کہ اہلِ دنیا محتاج ہیں اور اہل دین غنی ہیں گو وہ کیسے ہی خستہ حال ہوں۔ یہ تو واقعات ہیں، ان کھلے ہوئے مشاہدوں سے کون انکار کر سکتا ہے اور کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمیشہ یوں ہی ہوا ہے کہ اہل دنیا اہل دین کے محتاج رہے اور دین دار اُن کے محتاج نہیں ہوئے۔ ع

گدا بادشاہست و نامش گداست

ہاں اگر کوئی دنیا دار ایسا ہو کہ اس کو خدا تعالیٰ نے دین و دنیا کی دونوں دولتیں دی ہوں جیسے بعض اہل اللہ سلطانِ وقت ہوئے ہیں، تو وہ اپنے وقت کا سلیمانؑ ہے۔ اس کو دین داروں سے استغنا ہو سکتا ہے مگر اس کو بھی یہ استغنا دین کی بدولت حاصل ہوا نہ کہ دنیا کے ساتھ اس کو کبھی اہلِ دین سے استغناء نہیں ہو سکتا تھا اور گفتگو اسی میں ہے کہ اگر کسی کے پاس صرف ایک ہی دولت ہو تو دونوں میں کون سی حالت اچھی ہے

تو میں اس کو بتلا رہا ہوں کہ اہل دین تو بدون مال کے کامیاب ہیں اور اہل دنیا بغیر دین کے کامیاب نہیں ہو سکتے بلکہ پریشان رہیں گے۔ تو اب ثابت ہو گیا کہ بدون دین کے اختیار کیئے دنیا کی راحت بھی حاصل نہیں ہو سکتی۔

مطیع اور باغی کا فرق

اگر کسی کو اس پر یہ شبہ ہو کہ اہل یورپ تو بغیر دین کے آرام میں ہیں، تو اس کا اصل جواب تو یہ ہے کہ وہ آرام میں نہیں ہیں۔ آپ محض اُن کے ساز و سامان کو دیکھ کر سمجھتے ہیں کہ وہ آرام میں ہیں۔ حالانکہ راحت اصل میں اطمینانِ قلب کا نام ہے اور واللہ! وہ بے دین کو کبھی حاصل نہیں ہو سکتی۔ مگر یہ جواب ایسا ہے کہ اُس کی حقیقت کو ہر شخص نہیں سمجھ سکتا بلکہ جس کو قلوب کفار کی حالت منکشف ہو گئی ہو وہی اس کو سمجھ سکتا ہے۔ اس لئے میں دوسرا جواب دیتا ہوں۔

وہ یہ کہ اچھا میں فرض کرتا ہوں کہ وہ آرام میں ہیں مگر آپ اپنے کو اُن پر قیاس نہیں کر سکتے۔ اُن کو بدون دین کے راحت دنیا حاصل ہو سکتی ہے مگر آپ کو بدون دین کے دنیا کی راحت ہرگز نصیب نہیں ہو سکتی کیونکہ آپ مدعی اطاعت کے ہیں اور وہ اطاعت کے مدعی نہیں بلکہ کفر اختیار کر کے وہ خدا سے باغی ہو چکے ہیں۔ پس آپ کے ساتھ وہ برتاؤ کیا جائے گا جو مدعی اطاعت کے ساتھ کیا جاتا ہے کہ بات بات پر گرفت ہو گی اور جہاں ذرا قانون شریعت سے باہر قدم رکھا فوراً سزا ہو گی۔ اور اُن سے وہ برتاؤ کیا جا رہا ہے جو باغیوں کے ساتھ کیا جاتا ہے کہ باغی اگر دن میں سو دفعہ قانون کی مخالفت کرے تو اس سے جزوی تعرض نہیں کیا جاتا اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک تو بلقانی ریاستیں سلطان سے باغی ہو کر

اُن کے احکام کی مخالفت کرتی ہیں اور ایک کوئی ترک سلطان کے کسی حکم کی مخالفت کرے تو بلقانی ریاستوں کی جزوی مخالفتوں پر نظر نہیں کی جاتی بلکہ اُن کو بغاوت کی سزا اکٹھی دی جاوے گی۔ اور اس کا کچھ تذکرہ بھی نہ ہو گا کہ بغاوت کے بعد اُنہوں نے اور کون کون سے کام خلافِ قانون کئے تھے کیونکہ بغاوت اتنا بڑا جرم ہے جس نے دوسرے جرائم کو نظرانداز کر دیا۔ اور ترک ذراسی مخالفت کرے تو فوراً سزا کا مستحق ہوتا ہے کیونکہ وہ اپنے کو مطیع سلطنت کہتا ہے اس لئے اس کی ہر بات پر مواخذہ ہوتا ہے۔

اسی طرح یہاں سمجھئے کہ مسلمان کو تو ذرا ذراسی مخالفت پر سزا ملتی ہے اور جہاں اُس نے کوئی گناہ کیا فوراً اس کی دنیوی راحت سلب کر لی جاتی ہے گو ظاہری ساز و سامان جلدی سلب نہ کیا جاوے مگر راحتِ قلب تو فوراً سلب ہو جاتی ہے جو کہ فلاح و کامیابی کی اصل حقیقت ہے کیونکہ وہ اطاعت کا مدعی ہے اور کفار کے جزوی افعال پر نظر نہیں کی جاتی بس اُن کو تو بغاوت کی سزا اکٹھی دی جاوے گی جس کے لئے ایک میعاد معین ہے۔

شاید اس پر کوئی یہ کہے کہ اس دعوئ اطاعت سے تو بغاوت ہی اچھی کہ روز روز کی گرفت سے تو بچے رہیں گے۔ تو سمجھ لیجئے کہ مطیع کو تو ابھی سزا ہو گئی مگر یہ سزا بھگتنے کے بعد پھر وہ ہمیشہ کے لئے راحت میں ہے۔ جیسے کوئی ترک چوری یا زنا کرے تو اُس کو اُس وقت کچھ دنوں کے واسطے قید کر دیا جاتا ہے مگر قید کاٹنے کے بعد پھر سلطنت میں وہ کوئی عہدہ لے سکتا ہے اور اپنی زندگی آرام سے گزار سکتا ہے مگر باغی کو

چند روز یا چند سال کے لئے گو کچھ نہ کہا جاوے لیکن جب پکڑا جاوے گا تو اُس کی سزا سُولی سے اِدھر نہ ہو گی۔ اسی طرح جو خدا تعالیٰ سے بغاوت کرے گا، وہ چند روز دنیا میں گو راحت سے گزار لے مگر جب اس کو پکڑا جائے گا تو ابدالاباد کے عذاب جہنم سے اِدھر اُس کی سزا کچھ نہ ہو گی۔ اب اختیار ہے جس کو چاہو اختیار کر لو۔

غرض آسائش کی دو ہی صورتیں ہیں۔ یا تو کوئی بالکل باغی ہو کر رہے تو سزائے بغاوت کے وقت سے پہلے اس کو چین ہے اور یا بالکل مطیع ہو کر رہے تو اس کو ہمیشہ کے لئے چین ہے، یہاں بھی اور آخرت میں بھی۔ باقی مطیع و نافرمان دونوں بن کر دنیا کی راحت تو حاصل نہیں ہو سکتی، ہاں آخرت میں کچھ سزا بھگتنے کے بعد پھر راحت ہو جائے گی۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ آسائش کا طریقہ جو کہ اصل ہے فلاح کی، بدون دین کی پابندی کے ممکن نہیں۔

اس مضمون کو میں نے اس لئے بیان کیا کہ آج کل سب لوگ فلاح کے طالب ہیں جن میں زیادہ تر فلاح دنیا کے طالب ہیں۔ تو میں نے بتلا دیا کہ فلاح دنیا بھی دین ہی کے اتباع سے مل سکتی ہے۔ اس کے بغیر مسلمانوں کو تو مل نہیں سکتی اور اس وقت مسلمانوں ہی سے خطاب ہے۔ یہ مسئلہ لعلکم تفلحون سے مستنبط ہوا اور یہاں لعلّ شک کے لئے نہیں ہے بلکہ ترجی یعنی امید دلانے کے لئے ہے اور مطلب یہ ہے کہ یہ اعمال بجا لا کر فلاح کے امیدوار رہو۔ لیکن اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ اس میں کوئی وعدہ تو ہے ہی نہیں۔ تو شاید ایسا نہ بھی ہو کیونکہ یہ شاہانہ کلام ہے اور بادشاہ کسی کو امید دلا کر نا امید نہیں کیا کرتے۔ شاہانہ کلام میں امیدوار ہونا ہزار پختہ وعدوں

سے زیادہ ہوتا ہے۔ پھر رفع شک کے لئے بعض مقامات پر حق تعالیٰ نے پختہ وعدہ بھی فرما دیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے

حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ۔

رہا یہ کہ پھر سب جگہ حَقًّا عَلَيْنَا ہی کیوں نہ فرمایا کہیں کہیں لَعَلَّکُمْ کس لئے فرمایا؟ تو اس میں ایک راز ہے جو اہلِ سنت نے سمجھا ہے وہ یہ کہ پختہ وعدہ کے بعد بعض جگہ لَعَلَّ فرما کر اس پر تنبیہ کی گئی ہے کہ ہم وعدہ کر کے مجبور نہیں ہو گئے بلکہ اب بھی جزا کا دینا اور نہ دینا ہمارے اختیار میں ہے۔ تمہاری مجال نہیں کہ ہم پر تقاضا کرنے لگو اور ہم کو ایفائے وعدہ پر مجبور سمجھ کر ہم سے کچھ مانگنے اور بکنے لگو۔ ہماری شان یہ ہے۔

لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُوْنَ

یہ اور بات ہے کہ ہم وعدہ کر کے ایفا ضرور کریں گے مگر اس پر مجبور بھی نہیں ہیں بلکہ وعدہ کے بعد بھی ویسے ہی مختار ہیں جیسے قبل وعدہ تھے اس لئے تم تو لَعَلَّکُمْ ہی کے مفہوم پر نظر رکھو اِنَّ پر ناز نہ کرو گو ہمارے یہاں لَعَلَّ بھی اِنَّ ہی کے حکم میں ہے۔ اس نکتہ کو اہلِ سنت ہی نے سمجھا ہے۔ معتزلہ نے یہاں بہت ٹھوکریں کھائی ہیں۔ وہ خدا پر بھی بعض امور کو واجب سمجھتے ہیں ——— یہاں تک تو جزوِ اوّل اور جزوِ اخیر کا بیان تھا۔

فلاح کا انحصار

اب میں ان احکام کو بیان کرتا ہوں جو درمیان میں مذکور ہیں جن پر فلاح کو موقوف کیا گیا ہے۔ ارادہ تو تھا ان کے مفصل بیان کا مگر وقت نہیں ہے اس لئے مختصراً بیان کر دوں گا اور گو مفصل بھی پورا پورا تو نہ ہوتا

مگر خیر کسی قدر تفصیل ہو جاتی۔ تو سمجھئے کہ وہ چار چیزیں ہیں۔

۱۔ اِصْبِرُوْا	۲۔ وَصَابِرُوْا
۳۔ وَرَابِطُوْا	۴۔ وَاتَّقُوْا اللّٰہَ

میں نے تمہید میں کہا تھا کہ احکام کو تمام سورت سے بلکہ تمام شریعت سے بلکہ تمام مصالح دنیویہ سے تعلق ہے۔ اب میں اس کو بتلانا چاہتا ہوں۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ اعمال دو قسم کے ہیں۔

۱۔ ایک تو وہ جن کا وقت آگیا ہے۔

۲۔ ایک وہ جن کا وقت نہیں آیا۔

سو یہاں ایک حکم قسمِ اوّل کے متعلق ہے اور ایک حکم قسم دوم کے متعلق ہے۔ قسم اوّل کے متعلق تو اصبروا ہے یعنی جس عمل کا وقت آجاوے اُس وقت صبر سے کام لو یعنے پابندی اور استقلال سے رہو۔ تو حق تعالےٰ نے اس میں اعمال حاضرہ میں مستقل رہنے کا حکم فرمایا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ دین داری کے یہی معنے ہیں کہ ہر کام کو پابندی اور استقلال سے کیا جاوے۔ آج کل لوگ ولولے اور جوش میں بہت سا کام شروع کر دیتے ہیں۔ پھر نباہ نہیں ہوتا تو یہ دینداری کامل نہیں ہے۔ اسی لئے خدا تعالیٰ نے اتنا ہی کام بتلایا ہے جس پر نباہ ہو سکے۔ واجبات و فرائض و سنن موکدہ پر نباہ کچھ دشوار نہیں۔ اس سے زیادہ کام کرنے میں البتہ بعض سے نباہ نہیں ہوتا۔ تو اُن کو اپنے ذمہ اتنا ہی کام بڑھانا چاہیئے جس پر نباہ اور دوام ہو سکے۔ تو اِصْبِرُوْا کا حکم اُن اعمال کے متعلق ہے جن کا وقت آ گیا ہے۔

پھر ان کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جن کا تعلق صرف اپنی ذات سے

ہے۔ دوسرے وہ جن کا تعلق دوسروں سے بھی ہے۔ اُن کے متعلق صَابِرُوْا فرمایا ہے کہ دوسروں کے ساتھ صبر و استقلال سے کام لو۔ بعض لوگ اپنے ذاتی کام تو کر لیتے ہیں مثلاً نماز وغیرہ مگر دوسروں کے متعلق باہمت نہیں ہوتے۔ اور اگر کچھ ہمت بھی کی تو وہ اسی وقت تک رہتی ہے جب تک کوئی دوسرا مزاحم نہ ہو اور اگر کوئی مزاحم ہوا تو پھر مستقل نہیں رہتے۔ جیسے نکاح وغیرہ کی رسموں میں اکثر لوگوں کی یہی حالت ہے کہ بیٹے والا بیٹی والوں کی مزاحمت کو برداشت نہیں کرتا بلکہ وہ جس طرح چاہتا ہے اُن کو نچاتا ہے۔ پھر یہ دین پر مستقل نہیں رہ سکتے۔ اس کے متعلق صَابِرُوْا میں یہ حکم ہے کہ دوسروں کے مقابلہ میں بھی ثابت قدم رہو۔ اسی طرح اگر کبھی اعداء اللہ دین میں مزاحمت کرنے لگیں تو اُن کے مقابلہ میں بھی مستقل رہنے کا صَابِرُوْا میں حکم ہے۔

غرض ایک تو وہ افعال ہیں جن میں کسی سے مقابلہ نہیں کرنا پڑتا۔ ان پر مداومت و استقلال کرنے کا حکم تو اِصْبِرُوْا میں ہے اور جن میں دوسروں سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے ان میں ثابت قدم رہنے کا حکم صَابِرُوْا میں ہے یہ تو وہ افعال تھے جن کا وقت آگیا اور ایک وہ افعال ہیں جن کا ابھی وقت نہیں آیا۔

رَابِطُوْا کی تفسیر

ان کے متعلق حکم رَابِطُوْا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ ان کاموں کے لئے تیار و مستعد رہنا چاہیئے اور یہیں لئے اس سے سمجھا کہ لغت میں رباط کے معنی اعداء کے مقابلہ میں سرحد پر گھوڑے باندھنا ہے یعنی مورچہ بندی اور ظاہر ہے کہ مورچہ بندی حفظِ ماتقدم کے لئے اور پہلے سے

مقابلہ کو تیار و مستعد رہنے کے واسطے کی جاتی ہے۔ عام لغت کے موافق ایک تفسیر تو رباط کی یہ ہے۔

دوسری ایک تفسیر حدیث میں آئی ہے اِنْتِظَارُ الصَّلٰوۃِ بَعْدَ الصَّلٰوۃِ یعنی ایک نماز پڑھ کر دوسری نماز کے لئے منتظر رہنا۔ حضورؐ نے اس کے متعلق بھی فرمایا ہے فَذٰلِکُمُ الرِّبَاطُ فَذٰلِکُمُ الرِّبَاطُ یہی رباط ہے یہی رباط ہے۔ اور اس تفسیر میں اور پہلی تفسیر میں کچھ منافات نہیں بلکہ اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو اس پر متنبہ فرمایا ہے کہ رباط اعداء ظاہری کے ساتھ ہی مختص نہیں بلکہ جیسے اعداء ظاہری کے مقابلہ میں رباط ہوتا ہے اسی طرح کبھی اعداء باطنی یعنی نفس و شیطان کے مقابلہ میں بھی رباط ہوتا ہے۔ وہ مجاہدہ ظاہری کا رباط ہے اور یہ مجاہدہ باطنی کا رباط ہے۔ اسی کو ایک حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح ارشاد فرمایا ہے۔

اَلْمُجَاهِدُ مَنْ جَاهَدَ نَفْسَهٗ وَالْمُهَاجِرُ مَنْ هَجَرَ الْخَطَايَا وَالذُّنُوْبَ۔

یعنی مجاہد وہ ہے جو اپنے نفس کے مقابلہ میں مجاہدہ کرے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مجاہدہ کی ایک قسم مجاہدہ نفس بھی ہے اور اس کے لئے بھی ایک رباط ہے جیسے اعداء ظاہر کے مقابلہ کی پہلے سے تیاری کی جاتی ہے اسی طرح نفس و شیطان کے مقابلہ میں بھی مورچہ بندی کی ضرورت ہے کیونکہ یہ بھی بڑے سخت دشمن ہیں جو بدون مورچہ بندی کے قابو میں نہیں آتے۔ اسی کو فرماتے ہیں ؂

اے شہاں کشتیم ما خصمے بروں　　ماند خصمے زو تبر در اندروں

اور فرماتے ہیں ؎

کشتن ایں کارِ عقل و ہوش نیست
شیر باطن سخرۂ خرگوش نیست

یعنی اس کا زیر کرنا عقل و ہوش کا کام نہیں کیونکہ شیر خرگوش کے پھندے میں نہیں آیا کرتا بلکہ ان کو زیر کرنے کے لئے شارع علیہ السلام کی تعلیم کا اتباع ضروری ہے۔ چنانچہ اسی کا ایک شعبہ یہ رباط ہے یعنی نماز کا انتظار کرنا بعد ایک نماز کے۔ یہ نفس پر سب سے زیادہ گراں ہے کیونکہ اس میں کوئی حظ نہیں ہے۔ بس نماز پڑھ کر خالی بیٹھتے ہیں اور دوسری نماز کا انتظار کر رہے ہیں۔

آج کل بعض لوگ سوال کرتے ہیں کہ اس خالی بیٹھے رہنے سے کیا فائدہ؟ میں کہتا ہوں اس میں دو فائدے ہیں۔ ایک تو نفس کو طاعات پر جمانا دوسرے وہ فائدہ ہے جس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں بیان فرمایا ہے۔ اِنَّ الْعَبْدَ فِی الصَّلٰوۃِ مَا انْتَظَرَ الصَّلٰوۃَ کہ بندہ جب تک نماز کے انتظار میں رہے اس وقت تک وہ نماز میں ہی رہتا ہے یعنی اس انتظار میں بالکل وہ ثواب ملتا ہے جو نماز پڑھنے میں ملتا ہے مگر چونکہ ثواب نظر نہیں آتا اس لئے نفس پر یہ انتظار گراں ہوتا ہے۔ اسی واسطے حضور نے اس کو رباط فرمایا ہے۔ تو ایک تفسیر رباط کی یہ ہے جو پہلی تفسیر کی بھی مؤید ہے اور ان دونوں میں ایک امر مشترک ہے یعنی مستعد اور تیار رہنا اگلی عبادت اور آئندہ کام کے لئے۔ تو رباط کی روح اصل میں تیاری اور استعداد ہے۔ اس لئے میں نے رابطوا کی تفسیر یہ کی کہ جن کاموں کا وقت نہیں آیا ان کے لئے تیار و مستعد رہنا چاہیئے۔

پس صبر کی ضرورت تو ان افعال میں ہے جن کا وقت آگیا اور رباط کی ضرورت ان کاموں میں ہے جن کا وقت نہیں آیا۔ دین کا خلاصہ یہی ہے کہ جن کاموں کا وقت آگیا ہو اُن کو استقلال و پابندی سے ادا کیا جائے اور جن کا وقت نہیں آیا اُن کے لیئے تیار و مستعد رہے۔ کسی وقت بے فکر ہو کر نہ بیٹھے بلکہ یہ حال ہونا چاہیئے ؎

اندریں رہ می تراش و می خراش
تا دمِ آخر دمے فارغ مباش

تا دمِ آخر دمے آخر بود
کہ عنایت باتو صاحب سِر بود

بس دین یہ ہے کہ آدمی کو ہر دم ایک دھن لگی رہے یا تو کسی کام میں لگا ہوا ہو یا کسی کام کی تیاری میں مشغول ہو۔

تعلق باللہ کی صورت

اے مسلمانو! خدا کے ساتھ وہ حالت تو ہونی چاہیئے جو ایک محبوب مجازی کے ساتھ ہوتی ہے کہ ہر دم عاشق اسی کی دھن میں رہتا ہے، گو دنیا کے سارے دھندے بھی کرتا ہے مگر اس کا خیال کبھی دل سے نہیں اترتا بس یہ حال ہوتا ہے۔ ع

بہ چو میرد مبتلا میرد و چو خیزد مبتلا خیزد

تو کم از کم طالب خدا کا یہ حال تو ہونا چاہیئے جو ایک مردار کسبی کے عاشق کا ہوتا ہے کہ وہ کسی وقت دل سے نہیں اترتی ؎

عشق مولیٰ کے کم از لیلےٰ بود
گوی گشتن بہر او اولےٰ بود

صاحبو ــــ کیا خدا کی محبت ایک مخلوق کی محبت سے بھی کم ہو گئی اگر نہیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ خدا کی ایسی دھن نہ ہو۔ واللہ! جو سچا طالب ہوگا

اُن کے دل کو ہر وقت خدا تعالیٰ کی دھن لگی ہو گی۔ چنانچہ ایسے ہی لوگوں کی بابت ارشاد ہے۔

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ۔

کہ وہ ایسے لوگ ہیں جن کو تجارت اور خرید و فروخت خدا کی یاد سے غافل نہیں کرتی۔

ایک شخص نے مجھ سے سوال کیا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم دنیا کا بھی کام کریں اور اُس کے ساتھ خدا کی بھی یاد رہے۔ میں نے کہا یہ ایسے ہو سکتا ہے، جیسے آپ کو خدا کے کام کے ساتھ دنیا یاد رہتی ہے اگر ایک کام کے ساتھ دوسرے کی یاد نہیں ہو سکتی تو پھر نماز اور تلاوتِ قرآن اور ذکر میں دنیا کیوں کر یاد رہتی ہے۔ اگر دنیا کے ساتھ خدا کا یاد رہنا تعجب کی بات ہے تو اس پر بھی تعجب ہونا چاہیے۔ اور اگر اس پر تعجب نہیں تو اس کے عکس پر کیوں تعجب ہے۔

بات یہ ہے کہ جو چیز دل میں بس جاتی ہے وہ ہر کام کے ساتھ یاد رہا کرتی ہے۔ چونکہ ہمارے دلوں میں دنیا بسی ہوئی ہے اس لیے خدا کے کام میں بھی یاد رہتی ہے اور اگر کبھی خدا دل میں بس جائے گا تو پھر وہ بھی دنیا کے کاموں میں یاد رہے گا۔ اور اس کی ایک بڑی نظیر طاعون کی بدولت مل گئی ہے۔ اس سے ایک حدیث پر سے اشکال رفع ہو گیا۔ حدیث میں آتا ہے۔

إِذَا أَصْبَحْتَ فَلَا تُحَدِّثْ نَفْسَكَ بِالْمَسَاءِ وَإِذَا أَمْسَيْتَ فَلَا تُحَدِّثْ نَفْسَكَ بِالصَّبَاحِ وَعُدَّ نَفْسَكَ مِنْ أَصْحَابِ الْقُبُورِ۔

یعنی جب صبح کرو تو اپنے دل میں شام کا خیال نہ لاؤ اور جب شام ہو تو دل میں صبح کا خیال نہ لاؤ اور اپنے آپ کو مُردوں میں شمار کرو۔ یہ حضورؐ کا ارشاد ہے۔ بعض لوگوں کی سمجھ میں یہ بات نہ آتی تھی اور کہتے تھے کہ ایسا سمجھ بیٹھیں تو پھر دنیا کے کاروبار سب چھوٹ جائیں گے کسی سے کوئی کام دنیا کا نہ ہو سکے گا مگر طاعون نے اس کو حل کر دیا کہ اس زمانہ میں دنیا کا کوئی کام نہیں چھوٹا۔ دکاندار تجارت کرتے رہے، کاشت کار کھیتی کرتے رہے، ملازمت پیشہ اپنی ملازمت کے کام میں لگے رہے۔ ریل اور تار اور ڈاک اور کارخانے سب بدستور رہے مگر لوگوں کی حالت یہ تھی کہ صبح کو شام کی امید نہ ہوتی تھی اور شام کو صبح کی امید نہ ہوتی تھی۔ ہر شخص کو موت کا خطرہ لگا ہوا تھا۔ تو سارے کام بھی ہوتے رہے اور مراقبۂ موت بھی حاصل ہو گیا۔

بس اسی کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جیسا تم طاعون وہیضہ کے زمانہ میں ہو جاتے ہو بارہ مہینے ایسے ہی رہو۔ مگر آج تو یہ حالت ہے کہ جہاں طاعون گیا اور بے فکر ہو گئے گویا اب خدا تعالیٰ ان کو مار ہی نہیں سکتے۔ تو جیسے طاعون کے زمانہ میں ہر کام کے ساتھ موت کا دھیان لگا رہتا ہے اور اس سے کسی کام میں رکاوٹ پیدا نہیں ہوتی یوں ہی اہل اللہ کو دنیا کے ہر کام میں خدا تعالیٰ کی یاد بھی رہتی ہے جیسا کہ ارشاد ہے۔

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ

اور اس سے کسی کام میں رکاوٹ نہیں ہوتی اور یہی حاصل ہے اِصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا کا کہ ہر وقت کے متعلق جو کام ہے اس کو بجا لاؤ اور جس کا وقت نہیں آیا اس کے دھیان میں رہو اور اس کے لئے پہلے سے

تیار و مستعد رہو (اور احکامِ الٰہیہ کے دھیان میں رہنا اور ان کے لئے تیاری کرنا یہی ذکر اللہ بھی ہے اور اسی سے خدا کی یاد دل میں پیوستہ ہو جاتی ہے۔)

لذّت مقصود نہیں

اِصْبِرُوْا فرمانے سے ایک اور مسئلہ ثابت ہوا وہ یہ کہ اصل مقصود احکام کی پابندی ہے لذّت مقصود نہیں۔ پس اگر کوئی شخص احکام کو پابندی سے بجا لاتا ہو گو لذّت اور مزہ نہ آتا ہو تو وہ مقصود سے کامیاب ہے۔ اگر ناگواری مطلوب نہ ہوتی تو حق تعالیٰ اِصْبِرُوْا نہ فرماتے۔ پس جا بجا اہتمام کے ساتھ اِصْبِرُوْا فرمانا بتلا رہا ہے کہ لذّت مقصود نہیں بلکہ صبر و استقلال مطلوب ہے۔ مگر آج کل اکثر سالکین اس کے شاکی نظر آتے ہیں کہ ہمارے ہم کو طاعات میں مزا نہیں آتا اور اس کو طاعات کے لئے نقص سمجھتے ہیں حالانکہ یہ نفس کا ایک کید ہے کہ اس کو دنیا میں بھی حظ مطلوب ہے حالانکہ طاعات سے دنیا میں حظ مطلوب نہیں بلکہ آخرت میں اس سے حظ حاصل ہو گا لیکن اگر کسی کو بدون طلب کے حظ نصیب ہو جائے تو یہ لذّت بیکار بھی نہیں، نعمتِ الٰہیہ ہے۔ اس کی ناقدری نہ کرے کیونکہ بعض کے لئے یہ بہت مفید ہوتی ہے۔ پس جس کو یہ دولت حاصل ہو وہ کلفت کا ثواب سن کر زوالِ لذّت کا بھی طالب نہ ہو اور جس کو حاصل نہ ہو وہ اس کے درپے نہ ہو۔ غرض جس حالت میں وہ رکھیں اسی میں خوش رہنا چاہیئے۔ وہ تمہارے لئے جس کیفیت کو مصلحت جانیں وہی بہتر ہے ؎

بگوشِ گل چہ سخن گفتہ کہ خنداں ست
بعندلیب چہ فرمودہ کہ نالاں ست

اس کی ایسی مثال ہے جیسے طبیب ایک مریض کو تو حب ایارج دے اور ایک کو خمیرہ گاؤزبان دے۔ وہاں کوئی مزاحمت نہیں کرتا کہ اس کو میٹھی دوا اور مجھے کڑوی کیوں دی۔ اس جگہ سب عاقل بن جاتے ہیں کہ بھائی اس کے لئے یہی مصلحت ہے اور اس کے لئے یہی مناسب ہے مگر یہاں طب باطنی میں لوگ طبیب سے مزاحمت کرتے ہیں کہ فلاں کو تو خدا تعالیٰ نے لذت و بسط میں رکھا ہے اور ہم کو کلفت و قبض دے دیا ہے، نہ معلوم وہ کیا اُن کو عزیز ہے !!

صاحبو ـــ عزیز کوئی نہیں سب غلام ہیں اور غلام کو تجویز کا کوئی حق نہیں۔ غلام کی تو وہ حالت ہونی چاہیئے جیسے ایک غلام کی حکایت ہے کہ اس کو کسی نے خریدا اور گھر لاکر پوچھا کہ تیرا نام کیا ہے؟ کہا، اب تک تو جو کچھ نام تھا وہ تھا، آج سے میرا نام وہ ہے جس سے آپ پکاریں۔ پوچھا تم کھاتے کیا ہو؟ کہا، اب تک تو جو کچھ بھی کھاتا تھا، آج سے وہ کھاؤں گا جو آپ کھلائیں۔ اے صاحبو! غلام کا تو یہ مذاق ہونا چاہیئے ؎

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو
دل شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

اور یہ مذہب ہونا چاہیئے ؎

خوشا وقت شوریدگانِ غمش ... اگر ریش بینند و گر مرہمش!
گدایانِ از بادشاہی نفور ... بامیدش اندر گدائی صبور
دمادم شرابِ الم درکشند ... وگر تلخ بینند دم درکشند

بات یہ ہے کہ راہِ محبت ایسی ہی چیز ہے کہ اس میں طالب کو کسی تجویز کا حق نہیں۔ محبت تو نام ہی فنا کا ہے پھر یہ آواز کیوں نکلتی ہے، کہ

ہائے یوں ہوتا، ہائے ووں ہوتا۔ اور صاحبو! اس وقت تو طاعات میں ناگواری اور بدمزگی ہی ہے، آپ ایسے گھبرا گئے۔ یہ کیا چیز ہے اگر کبھی آپ پر وہ امور پیش آتے جو بزرگوں کو پیش آئے ہیں تو حقیقت نظر آجاتی۔

بزرگوں کی آزمائش

بزرگوں کو تو اس راہ میں وہ وہ سختیاں پیش آئی ہیں کہ ان کے سامنے یہ ذراسی ناگواری کچھ بھی نہیں۔ ایک بزرگ کو تہجد کے وقت غیب سے آواز آئی کہ کچھ بھی کرو یہاں کچھ بھی قبول نہیں اور اس زور سے آواز آئی کہ ان کے ایک خادم نے بھی سن لی۔ مگر وہ ایسے عاشق تھے کہ وضو کر کے پھر بھی نماز میں لگ گئے۔ اگلے دن پھر لوٹا بدھنا لے کر تہجد کو اٹھے۔ مرید نے کہا، حضرت جب وہ منہ بھی نہیں لگاتے اور کچھ قبول نہیں کرتے، تو آپ ناحق کیوں مصیبت جھیلتے ہیں، لیٹ کر سو بھی رہیے۔ بس ان بزرگ پر حال طاری ہو گیا اور رو کر فرمایا کہ بیٹا میں ان کو چھوڑ تو دوں مگر یہ تو بتلاؤ کہ ان کے در کے سوا کوئی اور در بھی اس قابل ہے جہاں چلا جاؤں۔ ظاہر ہے کہ اور کوئی در اس قابل نہیں۔ تو پھر میں تو اسی در پر جان دے دوں گا۔ چاہے وہ قبول کریں یا رد کریں۔ اس جواب پر رحمتِ حق کو جوش آیا اور پھر آواز آئی ؎

قبول ست گرچہ ہنر نیستت　　　که جز ما پناہے دگر نیستت

اگر آج کسی کو ایسی آواز آجائے تو بس سارا کام چھوڑ چھاڑ کر الگ ہو جائے کیونکہ محبت پوری نہیں ہے۔

اسی طرح ایک بزرگ کو ذکر کے وقت یہ آواز آتی تھی کہ چاہے کتنا ہی کر تیرا خاتمہ کفر پر ہو گا، کافر ہو کر مرے گا۔ جب بہت دن اسی قصہ میں

ہو گئے! اور یہ آواز موقوف ہی نہ ہوئی، تو آخر گھبرا گئے مگر کام نہیں چھوڑا گھبراہٹ کا اثر یہ ہوا کہ اپنے شیخ کے پاس حاضر ہوئے اور اُن سے یہ قصہ عرض کیا۔ واقعی شیخ کا زندہ ہونا بھی بڑی نعمت ہے۔ شیخ نے فرمایا کہ یہ دشنامِ محبت ہے۔ محبوبوں کی عادت ہے کہ عاشقوں کو چھیڑ چھاڑ سے تنگ کیا کرتے ہیں۔ اس سے دل گیر نہ ہو۔

اسی طرح ایک بار حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ مسجد کی طرف چلے جا رہے تھے کہ غیب سے آواز آئی، اے شبلی! کیا یہ ناپاک قدم اس قابل ہیں کہ ہمارا راستہ ان سے قطع کیا جاوے۔ یہ کھڑے رہ گئے۔ پھر آواز آئی کہ اے شبلی! تم کو ہماری طرف چلنے سے کیسے صبر آگیا۔ حضرت شبلی ایک چیخ مار کر بے ہوش ہو گئے کہ نہ چلنے دیتے ہیں نہ ٹھہرنے دیتے ہیں۔

صاحبو۔۔۔ اگر آپ ایسے ایسے شکنجوں میں کسے جاتے تو پھر آپ کا کیا حال ہوتا۔ اب تو اتنا ہی ہے کہ ذکر میں مزا نہیں آتا، آپ اس سے ہی گھبرا گئے۔ اوّل تو اگر اس کلفت پر اجر بھی نہ ملتا، تب بھی آپ کیا کر لیتے۔ محبت کا مقتضا یہ تھا کہ بدون اجر کے بھی اس پر راضی رہتے، مگر اب تو اجر بھی ملتا ہے پھر ناگواری اور شکایت کیوں ہے اور اگر مزا مطلوب ہوتا تو آپ دنیا ہی میں کیوں آتے، مزا تو جنت میں تھا۔ وہاں سے جو آپ دنیا میں آئے ہیں تو مزے کے لئے تھوڑا ہی آئے ہیں بلکہ بدمزگی اور کلفت کے لئے آئے ہیں۔ خوب کہا ہے ؎

کیا ہی چین خوابِ عدم میں تھا نہ تھا زلفِ یار کا کچھ خیال
سو جگا کے شورِ ظہور نے مجھے کس بلا میں پھنسا دیا

حق تعالیٰ خود فرماتے ہیں لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِیۡ کَبَدٍ کہ ہم نے

انسان کو مشقت میں مبتلا کر کے پیدا کیا ہے اور جناب آپ تو کیا چیز ہیں، اس کلفت سے تو بڑے بڑے بھی نہیں بچے۔

چنانچہ جب سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اوّل وحی نازل ہوئی ہے تو پھر اس کے بعد تین برس تک منقطع رہی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تین سال تک وحی کو ترستے رہے اور شدّتِ حزن کی یہ حالت تھی کہ بعض دفعہ پہاڑ پر سے گر کر اپنے کو ہلاک کرنا چاہتے تھے مگر فوراً حضرت جبرئیل علیہ السلام نمودار ہو کر آپ کو سنبھالتے تھے۔ تو جب تین برس تک حضورؐ کو کلفت میں رکھا گیا تو ہم کیا چیز ہیں۔ ہمیں تو اگر تین سو برس تک بدمزگی میں رکھا جائے تو حق ہے۔

دیکھو اگر کوئی حاکم با اختیار اپنے بیٹے کو کسی ملازمت کے لئے تین برس امیدوار رکھے اور ہم تین روز میں جا کر ملازم ہو جانا چاہیں۔ تو یہ حماقت ہے یا نہیں۔

پس جو لوگ ذکر و شغل شروع کرتے ہی بدمزگی اور قبض کی شکایت کرنے لگیں وہ کم از کم تین برس تو صبر کریں۔ گو حق تو یہ تھا کہ زیادہ مدت تک صبر کریں مگر افسوس! آج کل تو لوگ اتنے عرصہ تک بھی صبر نہیں کرتے جتنے عرصہ تک حضورؐ کو فترۃ وحی میں قبض رہا۔

غرض اوّل تو مزا مطلوب نہیں۔ دوسرے محبت کا مقتضا یہ ہے کہ مزے کا طالب نہ ہو۔ تیسرے اگر مزا مطلوب بھی ہو تو کم از کم کچھ دنوں تک تو بدمزگی کا تحمل کیا جائے۔ چوتھے اس میں ثواب بھی ملتا ہے۔ اور اس کے علاوہ یہ کہ اس میں باطنی مصلحت بھی ہوتی ہے۔ بعض اقسام تربیت کے اسی پر موقوف ہیں کہ طالب کو ظاہراً ناکام رکھا جائے جیسے آپ

نے دیکھا ہوگا کہ بعض عورتوں کو اسقاط میں سات آٹھ دن تک طبیب بھوکا رکھتا ہے اور اُن کو بھوک زیادہ لگتی ہے۔ وہ روٹی کے لئے ضد بھی کرتی ہیں مگر اس وقت اُن کو ناکام رکھنا ہی تربیت ہے۔ آپ خود سمجھ لیجئے کہ اس وقت اُن کو روٹی دینا محبت ہے یا نہ دینا؟ یقیناً نہ دینا ہی محبت ہے اور اسی میں مصلحت ہے۔ پس اسی طرح باطن میں سمجھ لو کہ بعض دفعہ لذت سے محروم کر دینا ہی محبت ہے ؎

آں کس کہ توانگرت نمی گرداند　　　او مصلحت تو از تو بہتر داند

افسوس! کیا اللہ میاں طبیب کے برابر بھی نہیں کہ طبیب بھوکا مارے، تو اس کو شفقت سمجھتے ہو اور اللہ میاں لذت سے ترسا دیں، تو شکایتیں کرتے ہو۔

اعمال کی اقسام

بہرحال اِصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا کا تعلق تو اُن اعمال سے ہے جن کا وقت آگیا اور رَابِطُوْا کا تعلق اُن اعمال سے ہے جن کا وقت نہیں آیا اب سمجھو کہ اعمال کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ظاہر، ایک باطن۔ اور اعمال ظاہرہ کی یہ تقسیم تھی جو میں نے اب تک بیان کی کہ اُن میں ایک قسم تو وہ ہے جس کا وقت آگیا اور پھر اس کی دو قسمیں ہیں ایک اپنے متعلق، ایک دوسروں کے متعلق۔ اور دوسری قسم وہ ہے جس کا وقت نہیں آیا۔ ان سب اقسام کے احکام تو اِصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا میں مذکور ہوئے اور اس سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ ان احکام کا تعلق تمام تر شریعت سے ہے کیونکہ کوئی عمل اس تقسیم سے باہر نہیں ہے۔ نیز یہ بھی معلوم ہو گیا کہ مصالح دنیویہ سے بھی ان احکام کو پورا تعلق ہے کیونکہ دنیا کے کام بھی دو ہی قسم کے

ہیں۔ ایک وہ جن کا وقت آ گیا ان میں استقلال وثباتِ قدم کی ضرورت ہے۔ دوسرے وہ جن کا وقت نہیں آیا۔ اُن کے لئے تیاری و مستعدی کی ضرورت ہے۔

اب ایک قسم رہ گئی یعنی اعمالِ باطنہ۔ اس کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں وَاتَّقُوا اللّٰہَ کہ خدا سے ڈرتے رہو۔ یہ تمام اعمال باطنہ کی جڑ ہے مگر اس میں بہت بسط کی ضرورت ہے جس کے لئے وقت نہیں۔ کتب تصوف سے اس کی تفصیل معلوم ہو سکتی ہے۔ مگر میرا مقصود حاصل ہو گیا۔ وہ یہ کہ اگر آپ کو فلاح کی تمنا ہے۔ فلاح دنیا کی طبعاً اور فلاح آخرت کی قصداً تو اس کی صورت یہ ہے کہ دین کو اختیار کرو اور ان احکام پر عمل کرو کیونکہ حق تعالیٰ نے فلاح کو انہی پر مرتب فرمایا ہے سو اس مقصود کے لئے اتنی تقریر کافی ہے۔ اور یہاں اِتَّقُوا اللّٰہَ کو مؤخر فرمانے میں یہ نکتہ ہے کہ یہ اعمال ظاہرہ اسی وقت مقبول ہیں جب کہ تقویٰ بھی ساتھ ساتھ ہو اور اسی وقت ان پر فلاح کا ترتب ہو سکتا ہے ——— !

اب میں ختم کرتا ہوں اور اس بیان سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ لوگ اس وقت طلب فلاح میں کدھر کدھر اُلٹے جا رہے ہیں اور جو اصلی طریقہ فلاح کا ہے اس پر کسی کو توجہ نہیں۔ بس ان لوگوں کی حالت پر یہ شعر صادق آتا ہے ؎

ترسم نرسی بکعبہ اے اعرابی
کیں رہ کہ تو میروی بہ کفرستان ست

شعر میں تو ترکستان ست ہے مگر میں نے کفرستان ست اس

لئے کہا کہ آج کل لوگ کفار کے طریقے اختیار کر کے ہی فلاح حاصل کرنا چاہتے ہیں مگر اس کا انجام فلاح نہیں بلکہ کفر سے نزدیک ہونا ہے۔ بس فلاح کا طریقہ اگر کوئی ہے تو وہ یہ ہے جو سچے فلسفہ سے معلوم ہوا کہ دین ہی فلاح کا طریقہ ہے اور اگر دین ہی نہیں، تو خدا کی قسم اگر ساری دنیا کی سلطنت بھی حاصل ہو جائے تو فلاح حاصل نہ ہوگی۔ یعنے راحت واطمینان جو اصل فلاح ہے۔

اب دُعا کیجئے کہ حق سبحانہٗ عمل کی توفیق عطا فرماویں وصلی اللہ علیٰ سیدنا ومولانا محمد وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین والحمد للہ رب العلمین ـــــــــ!

طریق النجاۃ

نجات کے طریقوں کے متعلق یہ وعظ ۲۲۔ جمادی الثانی سنہ ۱۳۳۰ھ کو جامع مسجد کیرانہ ضلع مظفر نگر میں قریباً تین ہزار کے مجمع میں ہوا جو سوا تین گھنٹے میں ختم ہوا۔ مولوی سعید احمد صاحب تھانوی نے قلمبند کیا۔ خطبہ بیٹھ کر فرمایا۔

تاریخ اس امر کی شہادت دے رہی ہے کہ مسلمانوں
کی دنیا دین کے ساتھ درست ہوتی ہے۔ یعنی جب
ان کے دین میں ترقی ہوتی ہے، تو دنیا میں بھی ترقی
ہوتی ہے اور جب دین میں کوتاہی ہوتی ہے، تو
دنیا بھی خراب ہو جاتی ہے ——————!

خطبۂ ماثورہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ نحمدہٗ ونستعینہٗ ونستغفرہٗ ونؤمن
بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا و
من سیئات اعمالنا من یہدہ اللہ فلا مضل لہٗ
ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشہد ان لا الہ الا اللہ
وحدہٗ لاشریک لہ ونشہد ان سیدنا ومولانا
محمدًا عبدہٗ ورسولہ صلی اللہ تعالی علیہ وعلی
آلہ واصحابہ وبارک وسلم اما بعد فاعوذ باللہ من
الشیطان الرجیم - بسم اللہ الرحمن الرحیم --
وقالوا لو کنا نسمع او نعقل ما کنا فی اصحٰب السعیر

مقصود حکایات

یہ ایک آیت ہے سورہ ملک کی۔ اس میں حق سبحانہ وتعالیٰ نے کفار کی ایک حکایت نقل فرمائی ہے یعنی ان کا ایک قول ہے جو کہ وہ قیامت میں کہیں گے مگر مقصود حکایات سے خود وہ حکایات نہیں ہوتیں خواہ وہ حکایات ماضیہ ہوں یا حکایات مستقبلہ بلکہ ان سے مقصود کوئی عبرت یا کسی بات کا جتنا نا ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ اس کے متعلق ایک آیت میں ارشاد بھی ہے۔

لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ۔

کہ ہم نے جو قرآن شریف میں اگلی قوموں کے قصے بیان کیے ہیں ان سے عقلمند لوگوں کو عبرت حاصل ہوتی ہے۔ اس کا حاصل یہی ہے کہ قصوں کے نقل کرنے سے غرض عبرت دلانا ہوتا ہے۔ عبرت کا حاصل قیاس ہوتا ہے یعنی پہلی قوموں کے حالات پر اپنے حالات کو کسی امر

مشترک کی وجہ سے قیاس کرنا اور اپنے لئے بھی ان کی حالت کے مشابہ اپنی کسی حالت کی تقدیر پر اسی امر کو ثابت کرنا جو کہ اُن کے لئے ثابت ہو چکا ہے۔

اس مقام پر بھی حکایت کو نقل کرنے سے یہی مقصود ہے کہ وہ حکایت ہم کو سنائیں تاکہ ہم غور کریں اور جانچیں کہ جس امر پر اُن کو وعید ہو رہی ہے ہمارے اندر بھی وہ پایا جاتا ہے یا نہیں اور ہماری حالت اس پر منطبق ہے یا نہیں اور اس سے نجات کا کیا ذریعہ ہے کہ ہم اس کو اپنا دستور العمل قرار دیں۔ یہ حاصل ہے مجملاً اس آیت کا جیسا کہ ترجمے سے آپ کو معلوم ہو گا اور تفصیل اس کی بیان سے معلوم ہو جائے گی۔

ترجمہ اس آیت کا یہ ہے کہ قیامت کے دن کفار یوں کہیں گے کہ اگر ہم سنتے یا سمجھتے تو آج ہم اصحاب جہنم میں نہ ہوتے۔ اس ترجمے سے معلوم ہوا کہ کفار اپنی بدحالی کو دیکھ کر یہ کہیں گے کہ ہم بہت چوکے کہ ہم نے دنیا میں کرنے کا کام نہ کیا اور اس کرنے کو خدا نے اس حکایت میں دو باتوں میں منحصر کیا ہے۔ ایک تو سننے میں اور ایک تعقل اور سمجھنے میں۔ اور وجہ اس کی یہ ہے کہ عمل علی الحق کے دو طریقے ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ کسی سے سُنا ہو۔ دوسرے یہ کہ خود سمجھا ہو۔ کفار نے چونکہ نہ سنا تھا نہ خود سمجھا تھا اس لئے اُن کو افسوس اور حسرت کی نوبت آئی۔ اس سے آپ کو آیت کا ماحصل مجملاً معلوم ہو گیا ہو گا۔

کفار کی حسرت

خدا تعالیٰ نے اس حکایت کو نقل کر کے اس پر انکار نہیں فرمایا اور اس کو غلط نہیں کہا بلکہ اگلی آیت میں اس کی تصدیق فرمائی فَاعْتَرَفُوا بِذَنْبِهِمْ

جس سے معلوم ہوتا ہے ان کا ذنب یہی تھا تو معلوم ہوا کہ یہ امر حق ہے اور ان ہی دو کا نہ ہونا باعثِ دخولِ جہنم ہوا بلکہ اگر اس کو نقل فرما کر سکوت بھی کیا جاتا تب بھی یہ حق سمجھا جاتا کیونکہ عقلی قاعدہ ہے کہ جس بات کو بیان کرکے اس پر سکوت کیا جائے اور ردّ و انکار نہ کیا جائے تو وہ حاکی کے نزدیک امر مرضی ہوا کرتا ہے نیز اصولیین نے بھی یہ قاعدہ مقرر کر دیا ہے۔

نیز قطع نظر اس مقدمہ کے اس کے حق ہونے کی ایک دلیل یہ ہے کہ یہ مقولہ قیامت کا ہے اور قیامت میں چونکہ سب امور منکشف ہو جائیں گے۔ اس لئے کوئی جھوٹ نہ بولے گا۔ اور اگر بعض آیات سے مثلاً وَاللّٰہِ رَبِّنَا مَا کُنَّا مُشْرِکِیْنَ۔ یہ شبہ ہو کہ ان لوگوں نے جھوٹ بولا۔ چنانچہ ارشاد ہے اُنْظُرْ کَیْفَ کَذَبُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِھِمْ۔ تو جواب اس کا یہ ہے کہ جھوٹ ایک عارض کی وجہ سے بولا اور وہ عارض یہ ہے کہ بولنے میں اُن کو نفع کی توقع تھی اور یہاں یہ بات نہیں ہے بلکہ اس قول میں خود اُن ہی کا ضرر ہے کہ اعتراف ذنب لازم آتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ قیامت میں کشف حقیقت کا اصل مقتضا یہ ہے کہ وہاں جو بات کہی جائے بالکل صحیح کہی جائے لیکن بعض لوگ عارض نفع کی وجہ سے اس مقتضا کے خلاف کریں گے۔ تو جس جگہ وہ عارض پایا جائے گا اس موقعہ پر تو اُن کے قول میں کذب کا احتمال ہوگا اور جس موقع پر وہ عارض نہ ہو، وہاں اصل مقتضا کی وجہ سے قول کو صادق ہی سمجھا جائے گا۔ لہٰذا کفار کا یہ قول بالکل سچّا ہے اور پھر جب کہ اس کے ساتھ خدا تعالیٰ کی طرف سے تائید بھی موجود ہے تو اس کے صدق میں کوئی شبہ ہی نہیں

رہا۔ چنانچہ ارشاد ہے۔ فَاعْتَرَفُوْا بِذَنْبِهِمْ فَسُحْقًا لِّاَصْحٰبِ السَّعِيْرِ۔ جس کی اوپر تقریر ہو چکی ہے۔

اب میں اصل مقصود کو بیان کرتا ہوں اور اس آیت سے انشاءاللہ اس کو ثابت کر دوں گا کیونکہ وہ مضمون اس آیت کا مدلول ہے اور اس کی ضرورت نہایت عام ہے۔ ہر وقت ہر جگہ ہر مسلمان کو اس کی ضرورت ہے۔ ایسے مضامین بتلانا نہایت ضروری ہیں۔ اور جیسے اس کی ضرورت عام ہے ایسا ہی اس کا فائدہ بھی نہایت عام ہے یعنی اس کے استعمال کے بعد حتمی فائدہ اس میں ہے۔ نیز یہ مضمون نہایت سہل ہے تو ان تینوں باتوں پر نظر کر کے اس کی ضرورت میں ذرا بھی کلام نہیں رہتا۔

مرض اور علاج

دیکھئے عقلی قاعدہ یہ ہے کہ مرض جس قدر صعب ہوتا ہے اس کا علاج بھی اسی قدر صعب ہوتا ہے۔ مثلاً اگر کسی شخص کو یا کسی جماعت کو یا کسی ایک شہر میں کوئی سخت مرض پھیل جائے تو عقلاء اس کے لئے نہایت سخت تدابیر تجویز کرتے ہیں۔ اور جب یہ قاعدہ مسلم ہے اور عقلاء میں اس کو برداشت کیا جاتا ہے اور اگر برداشت کی تاب نہیں ہوتی، تو علاج سے مایوس ہونا پڑتا ہے۔ چنانچہ بعض مرتبہ اطباء کہتے ہیں کہ تمہارا مرض امیرانہ ہے۔ مثلاً کسی غریب آدمی کو جنون ہو جائے اور کوئی طبیب اس کا علاج شروع کرے اور کسی طرح اس کو فائدہ نہ ہو تو پریشان ہو کر طبیب کو یہ کہنا پڑے گا کہ بھائی تمہارا مرض تو امیرانہ ہے اور تم دو چار پیسے کی دوا میں اس کا علاج چاہتے ہو۔ یہ کیوں کر ہو سکتا ہے۔ اس کے لئے تو بہت سخت تدابیر کی ضرورت ہے جن کی وسعت تم میں نہیں ہے

لہذا تم اچھے نہیں ہو سکتے۔ تو از روئے عقل ہر مرض صعب کی تدابیر بھی صعب ہوتی ہیں اور بعض اوقات مایوسی کی نوبت آتی ہے۔

لیکن اس طب میں جس کا نام طب ایمانی ہے کوئی درجہ بھی ایسا نہیں ہے کہ وہاں پہنچ کر مایوس کر دیا جائے اور یہ کہہ دیا جائے کہ اب تمہارا مرض لاعلاج ہو گیا بلکہ ہر مرض کے لئے علاج موجود ہے ——— ——— اور نہایت سہل علاج موجود ہے۔ میں اس کو انشاء اللہ بدلیل بیان کر دوں گا کہ صعب سے صعب مرض میں بھی نہایت سہل نسخہ تجویز کیا ہے اور یہ دلیل ہے خدا تعالیٰ کی رحمت عامہ کی کہ اتنا بڑا مرض اور اس کا علاج اس قدر سہل ——— !

دین کی آسانی

اس سے اس آیت کے معنی بھی منکشف ہو جائیں گے کہ یُرِیْدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ اور مَا جَعَلَ عَلَیْکُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ۔ یعنی خدا تعالیٰ نے دین میں تم پر کچھ تنگی نہیں کی۔

یہاں سے ایک جملہ معترضہ عرض کرتا ہوں۔ شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ دین میں کچھ تنگی نہیں ہے حالانکہ مشاہدہ اس کے بالکل خلاف ہے یعنی اکثر دینداروں کو عمل بالشرع میں بہت تنگی آتی ہے اور جو لوگ آزاد ہیں وہ نہایت مزے میں ہیں کہ جو جی میں آیا کر لیا۔ ان کو کارروائی میں تنگی نہیں ہوتی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دین پر عمل کرنے میں تنگی ہے اور آزاد رہنے میں آسانی۔ کیونکہ دیندار آدمی کو تو قدم بقدم حرام کی فکر لگی رہتی ہے بلکہ جس بات کو ان سے پوچھئے اس کو حرام ہی کہتے ہیں اور اس کی وجہ سے ان کو نہایت پریشانی اور تنگی

ہوتی ہے۔

مثلاً اب آموں کی بہار آ رہی ہے۔ جو لوگ آزاد ہیں وہ تو نہایت چین میں رہیں گے کہ فصل شروع ہوتے ہی فروخت کر دیں گے اگرچہ ابھی تک مزا پھول ہی ہو اور ان کو نہایت اچھے دام اٹھیں گے اور جو لوگ دیندار ہیں وہ اس فکر میں لگے رہیں گے کہ پھول فروخت کرنا حرام ہے لہٰذا اس وقت فروخت کرنا چاہیے کہ جب پھل آ جائیں اور پھل بھی بڑھ جائیں۔ نتیجہ یہ ہو گا کہ ان کی حفاظت کے لئے کم سے کم ۵ روپے ماہوار کا ایک ملازم رکھیں گے یا خود حفاظت کریں گے۔ پھر آندھیوں میں جو کچھ آم گریں گے سب ان کے گریں گے۔ ان کی وجہ سے قیمت کم لگے گی۔ علیٰ ہٰذا اگر تجارت کریں تو شریعت پر عمل کرنے میں کوئی صورت قمار میں داخل ہونے کی وجہ سے حرام ہے، کسی داد و ستد میں سود لازم آ گیا وہ اس لئے حرام ہے۔ غرض شریعت پر عمل کرنے میں ہر طرح تنگی و مصیبت ہے اور جب کوئی چیز بھی تنگی سے خالی نہیں تو یہ تو قرآن ہی میں شبہ پیدا ہو جاتا ہے! (نعوذ باللہ من ذالک)

تو یہ شبہ بعض لوگوں کو پیدا ہونا ممکن ہے۔ میں نے متعدد مقامات پر اس کا جواب عرض کیا ہے اس وقت بھی وہی جواب دیتا ہوں مگر توضیح کے لئے اوّل ایک مثال بیان کرتا ہوں۔

فرض کرو کہ ایک شخص مریض ہوا اور وہ کسی طبیب کے پاس گیا۔ اور نسخہ دریافت کیا اور حکیم صاحب نے نسخہ لکھا لیکن اتفاق سے مریض ایسی جگہ رہتا ہے کہ اس جگہ کوئی دوا دستیاب نہیں ہوتی۔ اس کے بعد حکیم صاحب نے پرہیز تبلایا اور اتفاق سے اس گاؤں میں صرف وہی

چیزیں ملتی ہیں جن کی ممانعت کی گئی ہے اور جن چیزوں کی اجازت ہے ان میں سے ایک چیز بھی نہیں ملتی۔ پس اگر یہ مریض حکیم صاحب کے نسخہ کو دیکھ کر اور پرہیز کو سن کر یہ کہنے لگے کہ طب میں نہایت ہی تنگی ہے، کیونکہ دوائیں وہ بتلائیں جن میں سے ایک بھی میسر نہیں۔ غذائیں وہ تجویز کیں جو کبھی گاؤں بھر میں بھی نہیں آئیں۔ اور جتنی چیزیں کھانے کی ہیں وہ سب ممنوع کہ نہ بینگن کھانا نہ آلو کھانا نہ بھینس کا گوشت کھانا۔ اور اس کے ساتھ ہی حکیم صاحب کو بھی اپنے جہل کی وجہ سے برا بھلا کہنے لگے، تو عقلاء اس کو کیا جواب دیں گے؟ یہی جواب دیں گے کہ طب میں تو ذرا بھی تنگی نہیں۔ اس شخص کے گاؤں ہی میں تنگی ہے۔ کیونکہ طب میں تنگی تو اس وقت سمجھی جاتی جب کہ دو چار چیزوں کی اجازت ہوتی اور باقی سب چیزیں ممنوع ہوتیں اور جب کہ بیسیوں کی اجازت ہے اور صرف چار کی ممانعت تو طب میں تنگی ہرگز نہیں بلکہ اس شخص کے گاؤں میں تنگی ہے کہ اس میں صرف وہی چیزیں منتخب ہو کر آتی ہیں جو کہ سراسر مضر ہیں۔ تو علاج اس کا یہ نہیں ہے کہ حکیم صاحب کا نسخہ رد کر دیا جائے اور اس پر عمل نہ کیا جائے بلکہ علاج یہ ہے کہ اپنے گاؤں کی اصلاح کی جائے۔ وہاں کی تجارت کو وسعت دی جائے۔ لوگوں کو مفید چیزیں فروخت کرنے پر مجبور کیا جائے۔

جب یہ مثال ذہن نشین ہو گئی تو اب غور و انصاف سے دیکھئے کہ تنگی شریعت میں ہے یا یہ کہ آپ کے معاملات میں۔ شریعت کو تنگ اس وقت کہا جا سکتا تھا جب تجارت اور داد و ستد کی صرف دو چار صورتیں شریعت نے جائز بتلائی ہوں اور ان کے ماسوا ساری صورتیں حرام کر

دیں اور جب کہ شریعت نے دو چار صورتوں کو حرام کر کے باقی سب کو جائز قرار دیا ہے تو شریعت کو تنگ نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن شریعت اس کا کیا علاج کرے کہ آپ کے معاملہ کرنے والوں نے بدقسمتی سے ان ہی صورتوں کو اختیار کر رکھا ہے جو حرام کر دی گئی ہیں۔ اس کا علاج یہ ہے کہ آپ متفق ہو کر اصلاح کریں۔ اپنی تجارت کو درست کریں جو شریعت نے کہی ہے نہ یہ کہ شریعت کو تنگ کہہ کر اس پر عمل کرنا ترک کر دیں اور شتر بے

مہار کی طرح آزاد ہو جائیں۔ تو آپ لوگوں کا شریعت پر اعتراض کرنا واقع میں اپنے اوپر اعتراض کرنا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

حملہ بر خود مے کنی اے سادہ مرد
ہمچو آں شیرے کہ بر خود حملہ کرد

مشہور ہے کہ ایک حبشی چلا جا رہا تھا۔ راستہ میں ایک آئینہ پڑا ملا۔ کبھی آئینہ دیکھنے کا اتفاق ہوا نہیں تھا۔ اس کو اٹھا کر دیکھا تو اپنی کالی بھجنگ صورت نظر پڑی۔ کہنے لگا کہ ایسا بدصورت تھا جب تو کسی نے یہاں پھینک دیا تھا ـــــــ یہی بعینہٖ حالت ہم لوگوں کی ہے کہ اپنے عیوب کو شریعت میں ثابت کرتے ہیں۔

صاحبو ـــــــ اگر کسی معاملہ کی دس صورتوں میں سے نو صورتوں کو حرام اور ایک کو حلال کہا گیا ہوتا تو بے شک شریعت کو تنگ کہہ سکتے تھے اور جب کہ دس صورتوں میں سے آٹھ حلال اور صرف دو حرام ہیں تو شریعت کو تنگ کیسے کہیں گے البتہ اپنے کو ملزم کہیں گے۔ ہم نے حلال صورتوں کو ترک کر کے صرف ان دو کو اختیار کر لیا جو حرام تھیں۔ اگر آپ شریعت سے دریافت کر کے تمام معاملات کو کرتے اور پھر بھی کوئی صورت

جوانہ کی نہ نکلتی تو شریعت پر تنگی کا الزام تھا۔ غضب ہے کہ ہم اپنی ہوا و ہوس سے معاملات کو مقرر کریں اور پھر شریعت کو مجبور کریں کہ ان معاملات کو جائز کہے۔ گویا شریعت ہماری محتاج یا نوکر ہے کہ جو کچھ ہم کریں وہ اس کو جائز کر دیا کرے۔

یہ تو بالکل ایسی بات ہے جیسے کہ مشہور ہے کہ ایک رئیس کو لغو بولنے کی عادت تھی۔ بہت اور اکثر بے تکی باتیں ہانکتے تھے۔ لوگ اُن پر ہنسا کرتے۔ آخر انہوں نے ایک شخص کو اس لئے نوکر رکھا کہ ہم جو کچھ کہا کریں اس کی کوئی معقول توجیہہ کیا کرو۔ چنانچہ ایک مرتبہ یہ کسی مجلس میں تھا کہنے لگا کہ ہم شکار میں گئے۔ ہرن کو جو گولی ماری تو وہ سُم توڑ کر ماتھا پھوڑ کر نکل گئی۔ یہ سُن کر تمام لوگ ہنسنے لگے کہ سُم اور ماتھے کو کیا تعلق؟ فوراً اس نوکر نے کہا، حضور بجا ارشاد ہے وہ اس وقت کھُر سے ماتھے کو کھُجلا رہا تھا۔

تو ہمارے ہوا پرست اور دنیا پرست بھائی چاہتے ہیں کہ جو کچھ ہمارے منہ سے نکل جائے اس نوکر کی طرح شریعت اس کو جائز ہی کر دے تو گویا شریعت آپ کی لونڈی ہوئی۔ صاحبو! آپ خود شریعت کے غلام بن جایئے اور پھر دیکھئے کہ کس قدر آسانیاں شریعت میں ہیں۔ حالت موجودہ میں دینداروں کو جو دقت پیش آتی ہے اس کا سبب زیادہ تر یہ بد دین لوگ ہیں۔ اس واسطے کہ دیندار آدمی معاملہ تو دوسروں ہی سے کرے گا۔ اور وہ دوسرے وہی ہیں جو دین سے بالکل آزاد ہیں اور جنہوں نے اپنے سب معاملات بگاڑ رکھے ہیں۔ تو اگر ایک آدمی تقویٰ اختیار بھی کر لے تو اس کو بے شک تنگی پیش آنی چاہیئے مگر یہ تنگی قوم کے معاملات میں تنگی ہونے کی

وجہ سے ہوئی نہ کہ شریعت میں تنگی ہونے کی وجہ سے۔

اصلاح کی صورت

پس آپ لوگ دو طرح اپنی اصلاح کیجئے ایک تو اس طرح کہ شریعت مطہرہ کو کبھی الزام نہ دیجئے۔ دوسرے علماء سے طمع نہ رکھئے کہ وہ ناجائز صورت کو جائز کہہ دیں یا جائز کر دیں۔ صاحبو! مسائل شریعت ایک قانون ہے اور قانون میں کسی شخص کی رائے سے تغیر نہیں ہو سکتا۔ البتہ اگر مقنن خود ہی بدل دے تو وہ دوسری بات ہے۔ اسی طرح اگر سب لوگ قانون پر عمل کرنا چھوڑ دیں تو ان کے چھوڑ دینے سے قانون نہیں بدل سکتا بالخصوص خدا تعالیٰ کا قانون کہ ان کی حکومت کا مدار بندوں کی اطاعت پر نہیں۔

اگر کوئی کہے کہ نزول وحی کے وقت ہماری آئندہ حالت پر نظر کر کے قانون دوسرا مقرر ہوتا کیونکہ شریعت میں ہر زمانے کی مصالح کی رعایت ہونا چاہئے۔ تو جواب اس کا یہ ہے کہ قانون میں مصلحت عامہ پر نظر ہوتی ہے۔ مصالح خاصہ کی رعایت اس میں نہیں ہو سکتی۔

مثلاً گورنمنٹ کا قانون ہے کہ کوئی شخص بغیر لائسنس کے بارود اور چھرے نہیں بیچ سکتا۔ اس قانون کو سن کر اگر کوئی احمق یہ کہنے لگے کہ گورنمنٹ کے قانون میں بڑی تنگی ہے کہ ہمارا جی چاہتا ہے کہ ہم بارود اور چھرے خوب فروخت کیا کریں۔ لیکن قانون لائسنس کی شرط لگاتا ہے۔ تو عقلاء اس کو یہی جواب دیں گے کہ قانون مصلحت عامہ کی بناء پر مقرر ہوا کرتا ہے، نہ کہ مصلحت خاصہ کی بناء پر۔ کیونکہ اگر مصلحت خاصہ کی رعایت کی جائے اور ہر شخص کو بندوق و بارود رکھنے کی اجازت دے دی جائے، تو امن عامہ میں خلل پڑ جائے اور جس شخص کا جو جی چاہے سو کر دے بیسیوں خون ہو جائیں

ہوا کرے۔ تو امن عامہ کا مقتضا یہ تھا کہ ایسا جھگڑا بند کیا جائے کہ عام طور پر اجازت نہ ہو اگرچہ کسی خاص شخص کا نقصان ہی کیوں نہ ہو البتہ اگر کسی شخص کا چال چلن اچھا ہو اور اس سے کسی قسم کا اندیشہ نہ ہو اور وہ لائسنس بھی حاصل کرلے تو اس کی اجازت ہو جائے گی۔ تو معلوم ہوا کہ قانون مصلحت عامہ کی بناء پر مقرر کئے جاتے ہیں۔

اب جو لوگ شریعت پر اعتراض کرتے ہیں وہ غور کر کے دیکھیں کہ شریعت کے کسی قانون میں بھی مصلحت عامہ فوت ہوئی ہے ہاں مصالح خاصہ بعض جگہ فوت ہو جاتی ہیں جہاں ان کی رعایت کرنے سے مصالح عامہ میں خلل ہونے والا ہوتا ہے اور اسی پر نظر کر کے لوگ اعتراض کرتے ہیں۔

مثلاً اب آموں کی فصل آرہی ہے اس میں باغ والوں کو یہ وہم ہوتا ہے کہ شریعت نے بہت تنگی کی ہے اور وجہ اس وہم کی یہی ہے کہ شریعت کے قانون پر عمل کرنے میں اپنی ذاتی منفعت فوت ہو جاتی ہے حالانکہ شریعت نے مصلحت عامہ کی بنا پر یہ قانون مقرر کیا تھا۔ اور وہ مصلحت عامہ یہ ہے کہ بیع المعدوم میں آئندہ احتمال ہے مشتری کے خسارہ کا کہ اگر پھل نہ آیا تو اس کا روپیہ مفت ہی ضائع گیا۔ اور پھل آنے کے بعد فروخت کرنے میں عام لوگ اس مصیبت سے محفوظ رہتے ہیں اگرچہ کسی ایک کے تھوڑے سے داموں کا نقصان ہو۔

پھر غضب یہ ہے کہ تنگی کا وہم کر کے بعض تو اس حکم کے حکم شرعی ہونے ہی سے انکار کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ سب مولویوں کی اختراع ہے حالانکہ یہ محض الزام اور افتراء ہے اور اس کا سبب قلتِ

علم اور کثرتِ جہل ہے جس شخص نے حضور پُرنور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث یا اس کے ترجمے کو پڑھا ہے وہ جانتا ہے کہ یہ سب احکام جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احکام ہیں۔ اور بعض لوگ حکمِ شرعی ہونے سے تو انکار نہیں کرتے لیکن یہ کہہ دیتے ہیں کہ ہم تو دنیا دار لوگ ہیں ہم سے شریعت پر کیسے عمل ہو سکتا ہے۔ میں ان لوگوں کو مخاطب کر کے کہتا ہوں کہ اگر خدا تعالیٰ کے احکام پر عمل کرنا نہیں چاہتے تو خدا تعالیٰ کا دیا ہوا رزق بھی چھوڑ دو۔ یہ کیا کہ شریعت پر عمل تو کریں مولوی اور خدا کا دیا ہوا کھاؤ ہڑپ تم لوگ بھی۔

غرض شریعت میں تنگی محسوس ہونے کا راز یہ ہے کہ لوگ اپنی مصالح خاصہ پر نظر کرتے ہیں اور جب ان کو فوت ہوتا ہوا دیکھتے ہیں تو شریعت کو تنگ سمجھتے ہیں حالانکہ شریعت یا کوئی قانون مصالح خاصہ کی حفاظت کا ذمہ دار نہیں ہوتا نہ ہو سکتا ہے کیونکہ مصالح خاصہ باہم متناقض ہوتے ہیں جن کا جمع ہو سکنا بھی محال ہے بلکہ قانون مصالح عامہ کی حفاظت کرتا ہے۔ سو بحمد اللہ! قانونِ شریعت مصلحتِ عامہ کے خلاف نہیں ہے۔

مثلاً اسی آموں کی صورت میں آپ کہتے ہیں کہ پھل آنے کے قبل فروخت کی اجازت نہ دینا مصلحت کے خلاف ہے کیونکہ بسا اوقات آندھی وغیرہ سے سارا پھول یا چھوٹے آم گر جاتے ہیں اور اس میں نقصان ہو جاتا ہے لیکن میں پوچھتا ہوں کہ یہ نقصان عام ہے یا خاص۔ ظاہر ہے کہ یہ نقصان خاص ہے کیونکہ اگر کسی جگہ دس ہزار کی مردم شماری ہو، تو بمشکل سو آدمی ایسے نکلیں گے جو کہ باغ رکھتے ہوں گے۔ باقی نو ہزار نو

سو وہ ہوں گے جو بارغ نہیں رکھتے۔ پس یہ قانون مقرر کرکے شریعت نے ان سو کی خاص خاص مصالح کے مقابلہ میں نو ہزار نو سو کی مصالح کو ترجیح دی ہے اور ان کی حفاظت کی ہے کیونکہ بیع معدوم میں ان بقیہ کا نقصان محتمل ہے۔

اگر کوئی کہے کہ ان بقیہ کی اگرچہ وہ عدد میں زیادہ ہوں رعایت ضروری نہ تھی کیونکہ یہ جب اپنے اختیار سے خریدتے ہیں تو نقصان خود گوارا کرتے ہیں پھر ان کی رعایت کیا ضرور؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ وہی شخص کہہ سکتا ہے کہ جس کو اپنے پیٹ اور اپنی ہوس کا جہنم بھرنے کے سوائے اور کوئی امر ہی پیش نظر نہ ہو اور دنیا میں کسی سے بھی اس کو محبت نہ ہو۔

دیکھو! اگر کوئی بچہ آگ میں گرنے لگے اور مشفق باپ دوڑ کر اس کو پکڑ لے اور باپ کی یہ حرکت دیکھ کر کوئی شخص کہے کہ آپ نے ناحق تکلیف اٹھائی، آپ کو دوڑنے کی کیا ضرورت تھی، وہ اپنے اختیار سے گرتا تھا سو گرنے دیا ہوتا، تو عقلاء اس شخص کی بابت کیا فتوے دیں گے۔ ظاہر ہے کہ اس کو نہایت درجہ سنگ دل اور بے رحم کہا جائے گا ——— تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور خداوند عالم جو شفیق باپ سے بھی بدرجہا زیادہ شفیق ہیں کیوں کر یہ گوارا فرماتے کہ ہم کو ضرر برداشت کرنے کی اجازت دے دیتے؟

غرض یہ شبہ علی وجہ الاحسن زائل ہو گیا! اور یہ بات ثابت رہی کہ دین میں نہایت سہولت اور آسانی ہے البتہ عقل کی تجاویز بعض سخت ہیں۔ مثلاً ایک یہی بات ہے جس کا اوپر ذکر تھا کہ مرض صعب کے لئے عقل

علاج بھی صعب تجویز کرتی ہے اور شریعت مرض صعب کے لئے علاج سہل تجویز کرتی ہے۔ پس کتنا بڑا فرق ہے اسلام کی تعلیم اور عقل کے فتوے ہیں کہ عقل تو مرض صعب کے لئے تدابیر بھی صعب تجویز کرتی ہے اور اسلام سخت سے سخت مرض کے لئے بھی نہایت سہل نسخہ تجویز کرتا ہے۔

مسلمانوں کے امراض

اب دیکھنا یہ ہے کہ مسلمانوں میں کیا مرض ہے جس کے لئے اس آیت میں علاج تجویز کیا گیا ہے اور مسلمانوں کی تخصیص اس وجہ سے نہیں کہ دوسروں میں امراض نہیں ہیں۔ دوسروں میں وہ امراض ہیں کہ بحمد اللہ مسلمان ان سے بچے ہوئے ہیں بلکہ تخصیص اس واسطے کی گئی ہے کہ دوسروں سے ہمیں کیا غرض اور مرض دریافت کرنے کے بعد ان کا سبب دریافت کیجئے تو مرض کی نسبت تو یہ کہا جاتا ہے۔ ع

تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

ہماری قوم کی یہ حالت ہے کہ اس کا کوئی عضو بھی صحیح نہیں کیونکہ ہماری دو حالتیں ہیں ایک دنیا دوسرے دین اور پھر ہر ایک کے اجزاء ہیں۔ اور اس کا مقتضا یہ تھا کہ دین کے ساتھ دنیا کی بھی ایک بڑی فہرست بتلائی جاتی بالخصوص اس وقت کہ رفارمروں کی رائے یہ ہے کہ اگر دنیا کی اصلاح نہ کی جائے گی تو دین کی کیا اصلاح ہو سکتی ہے۔ افسوس ان مصلحین نے جتنی اصلاح کی کوشش کی اسی قدر مرض بڑھتا گیا۔ وہ حالت ہو گئی کہ ؎

ہر چہ کردند از علاج و از دوا ۔۔۔ رنج افزوں گشت و حاجت ناروا

یہ ایک کنیزک کا قصہ ہے مولانا نے مثنوی میں اس کو نقل کیا ہے

یعنی طبیبانِ ظاہری جوں جوں علاج کرتے گئے، مرض میں افزونی ہوتی گئی آخر جب طبیب روحانی آئے اور انہوں نے حالت دیکھی تو یہ کہا ؎

گفت ہر دارو کہ ایشاں کردہ اند　　　آں عمارت نیست ویراں کردہ اند
بے خبر بودند از حالِ درول　　　استعیذ اللہ مما یفترون

یعنی جس قدر دوائیں کیں ہیں سب نے تباہ کیا ہے اور حقیقت حال سے ان کو کچھ خبر بھی نہیں ملی اور یہ ہوا کہ ؎

دید از زاریش کو زارِ دلست　　　تن خوش است او گرفتارِ دلست
عاشقی پیداست از زاریِ دل　　　نیست بیماری چو بیماری دل

کہ مرض دل کا تھا اور علاج بدن کا ہو رہا تھا جس میں مرض کا بڑھنا لازمی تھا یہی حالت اس وقت کے لیڈروں کی ہے کہ انہوں نے سب سے بڑا مرض روپیہ کے نہ ہونے کو سمجھا کہ روپیہ ہوتا تو یہ ہوتا اور وہ ہو جاتا۔ صاحبو! جہاں روپیہ بہت سا ہے وہاں کیا نور برس رہا ہے۔ ذرا امراء کی حالت کو ملاحظہ کر لیجئے اگر روپیہ کا نہ ہونا دین کے ضعف کا سبب ہے تو امراء میں دین زیادہ ہونا چاہیئے تھا اس لئے کہ ان کے پاس روپیہ زیادہ ہے آج کل تو مشاہدہ کی بڑی پرستش ہوتی ہے۔ سو آپ مشاہدہ کر لیجئے کہ روپیہ والوں میں دین زیادہ ہے یا غریبوں میں۔ اور صورت اس کی یہ ہے کہ کیف ما اتفق چند غریبوں اور چند امیروں کو لے لیجئے اور دیکھ لیجئے کہ زیادہ دیندار کون ہے۔ خود خدا تعالیٰ اس کے متعلق فرما رہے ہیں کہ

كَلَّا إِنَّ الْإِنسَانَ لَيَطْغَىٰ أَن رَّآهُ اسْتَغْنَىٰ۔

بس ہم کو تو یہ کہنے کا حق ہے کہ دنیا کی ترقی دین کی ترقی کو مانع ہے جیسا کہ مشاہدہ و مضمون آیت دونوں اس کی شہادت دے رہے ہیں

لیکن ہم اپنے بھائیوں کی خاطر سے یہ کہتے ہیں کہ روپیہ فی نفسہٖ نہ مضر ہے نہ مفید ہے۔ اگر ہمارے بھائیوں کے پاس اس قسم کی کوئی دلیل ہوتی تو وہ ہرگز بھی رعایت نہ کرتے تو ہم اپنے اس دعویٰ سے کہ روپیہ مانع ترقی دین ہے دست بردار ہوتے ہیں لیکن کوئی یہ بھی ثابت نہیں کر سکتا کہ روپیہ نافع ہے دین میں۔ پس معلوم ہوا کہ نافع فی الدین واقع میں کوئی دوسری چیز ہے۔

قلبِ سلیم کی خاصیت

اور وہ قلب سلیم ہے یعنی اگر قلب سلیم ہے تو روپیہ کا ہونا نہ ہونا دونوں مضر نہیں اور اگر قلب سلیم نہیں ہے تو روپیہ کا نہ ہونا تو کم مضر ہوتا ہے اور روپیہ کا ہونا زیادہ مضر ہو جاتا ہے

روپیہ اور قلب سلیم کی مثال بالکل تلوار اور ہاتھ کی سی ہے کہ تلوار کاٹتی ہے لیکن اسی وقت جب کہ ہاتھ بھی ہو اور اس میں قوت بھی ہو اور اگر ہاتھ نہیں یا ہاتھ تو ہے لیکن اس میں قوت نہیں تو نری تلوار کیا کام دے سکتی ہے بلکہ بعض اوقات خود اپنے ہی زخم لگ جاتا ہے۔ اسی طرح اگر قلب سلیم نہ ہو تو نرا روپیہ کیا کام دے سکتا ہے۔ اصل چیز قلب سلیم ہے۔ اگر ایسے شخص کے پاس مال ہے تو وہ بے شک حدیث نِعْمَ الْمَالُ الصَّالِحُ عِنْدَ الرَّجُلِ الصَّالِحِ کا مصداق ہے۔ مولانا علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں ؎

مال اگر بہر دیں باشی حمول | نعم مال صالح گفت آں رسولؐ

اور فرماتے ہیں ؎

آب در کشتی ہلاکِ کشتی است | آب اندر زیر کشتی پشتی ست

یعنی اگر کشتی کے اندر پانی بھر جائے تو اس کے ہلاک کا سبب ہوتا ہے اور اگر کشتی کے نیچے رہے تو اس کے لئے معین ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر مال قلب کے اندر گھس گیا تو وہ قلب کے لئے مہلک ہے اور اگر قلب سے باہر رہے تو وہ معین ہوتا ہے اور یہ اس وقت ہوتا ہے کہ جب صاحب قلبِ سلیم کے پاس روپیہ ہو۔ غرض روپیہ کا ہونا نہ ہونا دونوں برابر ہی ہوئے۔ لہذا یہ دعویٰ غلط ہے کہ ترقی دین دنیا کی ترقی پر موقوف ہے

مولانا علیہ الرحمۃ ایک دوسرے مقام پر فرماتے ہیں ؎

زر و نقرہ چیست تا مفتوں شوی

چیست صورت تا چنیں مجنوں شوی

کہ یہ صورت ہی کیا چیز ہے جس پر اس قدر مفتوں ہوتے ہو۔

صاحبو——اپنے بزرگوں ہی کو دیکھ لیجئے کہ ان کے پاس اس قدر روپیہ کہاں تھا اور پھر دینداری میں ان کی حالت کیا تھی۔ غرض ایک ضرورت کی چیز تو دنیا تھی تو اس کے تو جاننے والے مجھ سے زیادہ ہیں دوسرے دنیا کے متعلق کچھ بتلانا ان کے دہمیات میں اُن کی مدد کرنا ہے تیسرے ہم لوگ طالب علم ہیں۔ ہمارا یہ کام بھی نہیں ہے۔ اس کو آپ خود ہی کریں البتہ مولویوں سے پوچھ کر اور حلال و حرام کو دریافت کر کے کریں۔ آج کل بہت سی صورتیں آپ نے ایسی اختراع کر لی ہیں کہ وہ بالکل ناجائز ہیں۔ مثلاً شادی فنڈ، موت فنڈ کہ یہ سب قمار میں داخل ہے

دریافت احکامِ شرعیہ

افسوس ہے کہ لوگ ترقی کی صورت تجویز کر کے ان پر خود ہی عمل کر لیتے ہیں۔ یہ احتمال ہی نہیں ہوتا کہ ممکن ہے یہ جائز نہ ہو۔ صاحبو! جو جاہو

وہ کرو لیکن خدا کے لئے مولویوں سے حلت و حرمت کو دریافت کر لیا کرو۔ اور یہ کوئی عار کی بات نہیں۔ دیکھو تم بہت سی ضرورتوں میں مختلف جماعتوں سے پوچھتے اور مدد لیتے ہو۔ مثلاً اگر تجارت کرنا چاہو تو قانون داں لوگوں سے پوچھتے ہو اس کی اجازت کے پہلو دریافت کرتے ہو۔

علی ہذا۔ تو اگر شریعت کے احکام پوچھنا بکھیڑا اور دردسر ہے تو گورنمنٹ کے قانون پوچھنا کیوں دردسر نہیں۔ جو آزادی قانون شریعت پر عمل کرنے میں فوت ہوتی ہے، وہ تو گورنمنٹ کے قانون پر عمل کرنے میں بھی فوت ہوتی ہے۔ تو سب سے بڑی آزادی تو اس میں ہے کہ کسی قانون پر بھی عمل نہ کیا جائے اور ڈکیتی ڈالنی شروع کر دی جائے۔ پھر کیا کوئی عاقل اس کو آزادی کہے گا اور اگر چند احمق مل کر ڈکیتی ڈالنی تجویز کریں اور کوئی عقلمند آدمی اُن سے کہے کہ یہ قانون میں ناجائز ہے تو کیا ان کو محض اس بنا پر کہ یہ قانون آزادی کے خلاف ہے اس قانون پر عمل کرنا ضروری نہ ہوگا۔ معلوم ہوا کہ جس گورنمنٹ کے ملک میں رہو اُس کے قانون پر عمل کرنا نہایت ضروری ہوتا ہے۔ پس بموجب اس قاعدہ کے یا تو خدا تعالیٰ کے ملک سے نکل جاؤ اور کوئی دوسرا ملک تلاش کر لو اور اگر خدا کے ملک میں رہو تو حیرت کی بات ہے کہ ساری گورنمنٹوں کے قانون پر تو عمل کرو مگر خدا کے قانون پر عمل نہ کرو۔

غرض دنیا کے کام آپ لوگ خود ہی کریں۔ اور علماء سے پوچھ کر کریں۔ باقی علماء سے اس کی امید نہ رکھیں کہ وہ دنیا کے کاموں میں آپ کی اعانت کریں اور ان کی تدابیر آپ کو بتلائیں۔ دنیا کا کام آپ کا کام ہے علماء کا نہیں۔ علماء سے اس کی امید رکھنا ایسا ہے جیسے کوئی چمار حکیم عبدالمجید

سے جوتے گنٹھوانے کے کام میں مدد چاہنے لگے۔
مثلاً اگر حکیم عبدالمجید کے پاس کوئی دق کا مریض جائے اور وہ نسخہ لکھ دیں۔ نسخہ لے کر مطب سے باہر آئے تو ایک چمار ملے اور مریض سے پوچھے کہ تم کہاں گئے تھے اور وہ بتلائے۔ اس پر وہ چمار کہنے لگے کہ حکیم عبدالمجید بھی عجب بے خبر آدمی ہیں کہ ان سے اتنا نہ ہوا کہ اس نسخے میں جوتی گنٹھوانے کو بھی لکھ دیتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ قوم کی حالت سے بالکل بے خبر ہیں۔ تو ساری دنیا اس چمار کو احمق بتائے گی اور کہے گی کہ حکیم عبدالمجید کا یہ کام نہیں کہ وہ جوتی گانٹھنے کی ترکیب بتلائیں یا اس کام کے چلنے میں مدد دیا کریں۔ حکیم عبدالمجید کا کام امراض کے لئے ادویہ تجویز کرنے کا ہے۔

تو علماء کو بھی حکیم عبدالمجید ہی سمجھنا چاہئے کہ ان کا کام امراض باطن کے لئے نسخے تجویز کرنے کا ہے نہ کہ دنیا کے کاموں میں تجاویز بتلانے کا۔ اگر حکیم صاحب پر جوتی سلوانے کو نہ بتلانے کا الزام صحیح ہے تو علماء پر بھی صحیح ہے۔ البتہ حکیم صاحب کے ذمہ یہ ضروری ہے کہ اگر جوتی سینے سے پہننے والے کے پیر میں زخم نہ پڑے اور پیر کے سڑنے کا اندیشہ نہ ہو تو جوتی سینے سے منع نہ کریں ورنہ منع کرنا ضرور ہوگا۔ مثلاً ایک شخص نے پہنے پہنے اس طرح جوتا سلوایا کہ سُوا پیر کی کھال کے اندر سے ہو کر نکلا تو حکیم صاحب کو اطلاع ہونے پر منع کرنا ضرور ہے! اسی طرح علماء کے ذمہ بھی یہ ہے کہ اگر دنیا کے کام کرنے سے لوگوں کے قلب میں بد دینی کا زخم نہ پڑے تو ان کاموں سے نہ روکیں اور اگر قلب زخمی ہونے لگے تو پھر ان کو روکنا ضرور ہے۔ اور اگر زخم کے ڈر سے

روکنے میں حکیم صاحب بڑے شفیق ہیں تو زخم قلب سے بچانے کے لئے روکنے میں علماء بھی بڑے شفیق ہیں۔ اور اگر ان دونوں میں کوئی فرق ہے تو میں دس برس کی مہلت دیتا ہوں۔

الحاصل جب کسی حکیم پر یہ ضروری نہیں کہ وہ جوتی سینے کی ترکیب بتلایا کرے یا اس میں مدد کرے تو علماء کو بھی جو کہ طبیب روحانی ہیں کامل حق ہے کہ وہ اس باب میں یہ کہہ دیں کہ ؎

نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم
چو غلام آفتابم ہمہ ز آفتاب گویم

دنیا کی مثال بالکل خواب کی ہے اس کو وہ بتلائے جو شب پرست ہو۔ ہم آفتاب دین کے غلام ہیں ہم سے اس کی بات پوچھئے۔ ہم اس کے سوا کچھ نہ بتلائیں گے اور نہایت فخر سے یہ کہیں گے ؎

ما ہر چہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم
الّا حدیث یار کہ تکرار می کنیم

ہاں یہ علماء کا احسان ہوگا کہ وہ منع نہ کریں۔ یہ تو آپ کے شبہات اور اعتراضات کے جواب کی بناء پر گفتگو تھی۔ اب میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ دقتِ نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ علماء دنیا بھی سکھلاتے ہیں ——— !

دین و دنیا کا تعلق

وجہ یہ ہے کہ تاریخ اس امر کی شہادت دے رہی ہے کہ مسلمانوں کی دنیا دین کے ساتھ درست ہوتی ہے یعنی جب ان کے دین میں ترقی ہوتی ہے تو دنیا میں بھی ترقی ہوتی ہے اور جب دین میں کوتاہی ہوتی

ہے تو دنیا بھی خراب ہو جاتی ہے۔ تو جب ہم دین سکھلاتے ہیں معاملات معاشرت اخلاق کو درست کرتے ہیں تو گویا ہم دنیا کی ترقی کی تدابیر بھی بتلاتے ہیں البتہ ہماری تدابیر اور دوسروں کی تدابیر میں تھوڑا سا فرق ہے اور وہ یہ کہ دوسروں کی تدبیر میں پریشانی زیادہ ہوتی ہے ان کی یہ حالت ہوتی ہے کہ ع

چو میرد مبتلا میرد چو خیزد مبتلا خیزد

واللہ العظیم! جو لوگ بظاہر نہایت آسائش میں معلوم ہوتے ہیں اُن کی اندرونی حالت اگر دیکھی جائے تو معلوم ہوگا کہ ساری پریشانیوں کا نشانہ یہی ہیں۔

ان لوگوں کی حالت پر مجھے ایک لطیفہ یاد آیا۔ میرے استاد علیہ الرحمۃ فرماتے تھے کہ ایک شخص نے یہ دُعا کی مجھے خواجہ خضرؑ مل جائیں۔ چنانچہ خواجہ خضر اس کو مل گئے۔ اُس نے کہا کہ حضرت یہ دُعا کر دیجئے کہ خدا تعالیٰ مجھ کو اس قدر دنیا دے دیں کہ میں بالکل بے فکر ہو جاؤں۔ خواجہ خضرؑ نے کہا کہ بے فکری اور راحت دنیا دار میں نہیں ہو سکتی۔ اُس نے پھر اصرار کیا اُنہوں نے فرمایا کہ اچھا تو کسی ایسے شخص کو انتخاب کرلے جو تیرے نزدیک بالکل بے فکر اور نہایت آرام میں ہو میں یہ دُعا کروں گا کہ تو بھی اُسی جیسا ہو جائے اور تین دن کی اس کو مہلت دی۔ آخر اُس نے لوگوں کی حالت کو دیکھنا شروع کیا۔ جس کو دیکھا کسی نہ کسی تکلیف یا شکایت و پریشانی میں مبتلا پایا بہت سی تلاش کے بعد اس کو ایک جوہری نظر پڑا۔ جس کے پاس حشم و خدم بھی بہت کچھ تھے، صاحب اولاد بھی تھا اور اس کو بظاہر کوئی فکر نہ معلوم ہوتی تھی۔ اس کو خیال ہوا کہ اس جیسا ہونے کی دعا کراؤں گا لیکن ساتھ ہی یہ خیال

بھی ہوا کہ ایسا نہ ہو کہ یہ بھی کسی بلا میں مبتلا ہو اور میں بھی دعا کی وجہ سے اسی میں مبتلا ہو جاؤں۔ لہذا بہتر یہ ہے کہ اوّل اس سے اس کی اندرونی حالت دریافت کر لوں۔ چنانچہ اس جوہری کے پاس گیا اور اپنا پورا ماجرائی کو کہہ سنایا۔

جوہری نے ایک آہ سرد کھینچی اور کہا کہ خدا کے لئے مجھ جیسا ہونے کی دُعا ہرگز نہ کرانا۔ میں تو ایک مصیبت میں گرفتار ہوں کہ خدا نہ کرے کوئی اس میں گرفتار ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ میری بیوی بیمار ہوئی اور بالکل مرنے کے قریب ہو گئی۔ میں اُس کو مرتے دیکھ کر رونے لگا۔ اُس نے کہا کہ تم کیوں روتے ہو۔ میں مر جاؤں گی تم دوسری کر لو گے۔ میں نے کہا کہ نہیں، میں اب ہرگز نکاح نہ کروں گا۔ کہنے لگی کہ سب کہا ہی کرتے ہیں ایفاء کوئی بھی نہیں کرتا۔ میں چونکہ اس کی محبت میں مغلوب تھا اور اس وقت اُس کے مرنے کا نہایت سخت رنج دل پر تھا میں نے اُس کے کہنے پر اُس سے کہ اپنا اندام نہانی فوراً کاٹ ڈالا اور اُس سے کہا کہ اب تو تجھ کو بالکل اطمینان ہو گیا۔ اتفاق سے وہ اپنے مرض سے جانبر ہو گئی۔ اب چونکہ میں بالکل بیکار ہو چکا تھا اس لئے اُس نے میرے نوکروں سے

سازباز کر لیا۔ یہ جس قدر اولاد تم دیکھتے ہو سب میرے نوکروں کی عنایت ہے۔ میں اپنی آنکھوں سے اس حرکت کو دیکھتا ہوں لیکن اپنی بدنامی کے خیال سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اس واسطے تم مجھ جیسے ہونے کی دعا ہرگز نہ کرانا۔

آخر اُس شخص کو یقین ہو گیا کہ دنیا میں کوئی آرام سے نہیں۔ جب تیسرے دن حضرت خضرؑ سے ملاقات ہوئی تو اُنہوں نے کہا کہ کہو کیا

لائے ہے؟ اُس نے کہا حضرت یہ دُعا کر دیجئے کہ خدا تعالیٰ مجھے اپنی محبت کاملہ اور دین کامل عطا فرمائے۔ چنانچہ آپ نے دُعا فرما دی اور وہ نہایت کامل دیندار ہو گیا۔

تو حقیقت میں دنیاداروں میں کوئی بھی آرام سے نہیں ہے اندرونی حالت سب کی پریشان ہے۔ اس واسطے کہ دنیا کی حالت یہ ہے کہ لَا یَنْتَهِیْ اِرْبٌ اِلَّا اِلٰی اِرْبٍ۔ ایک آرزو ختم نہیں ہوتی کہ دوسری شروع ہو جاتی ہے اور تفویض و رضا بالقضا ہے نہیں۔ ہر کام میں یوں چاہتا ہے کہ یہ بھی ہو جائے اور وہ بھی ہو جائے اور سب امیدوں کا پورا ہونا دشوار۔ اس لیے نتیجہ اس کا پریشانی ہی پریشانی۔ گو ظاہر میں اموال و اولاد سب کچھ ہے مگر اس حالت میں وہ خود آلۂ تعذیب ہیں۔ اسی کو فرماتے ہیں ——— فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَاَوْلَادُهُمْ کہ بظاہر اگرچہ ان کے پاس مال و دولت بہت کچھ ہے لیکن وہ اُن کے لیئے عذاب ہے میں نے کانپور میں ایک رئیسہ کو دیکھا ہے کہ اُن کو اپنی اولاد سے اس قدر محبت تھی کہ اولاد کی بدولت کبھی چارپائی پر سونا نصیب نہیں ہوا کیونکہ بیٹے کئی تھے۔ ایک چارپائی پر کیسے سمائیں اور سب اپنے پاس لے کر سوتی تھیں۔ کسی پر ایک ہاتھ رکھ لیا کسی پر دوسرا ہاتھ رکھ لیا کسی پر پیر رکھ لیا۔ پھر غضب یہ کہ رات کو اٹھ کر ٹٹولتی تھیں کہ سب ہیں بھی یا نہیں۔ تمام رات ان کو اس مصیبت میں گزرتی تھی۔ اتفاق سے ان کا ایک بچہ مر گیا تو وہ اس قدر پریشان ہوئیں کہ اس کے کفن دفن میں بھی شریک نہیں ہوئیں اور کانپور چھوڑ کر لکھنو یا اور کہیں چل دیں۔

علیٰ ہذا مال بھی اکثر لوگوں کو عذابِ جان ہو جاتا ہے اور ورنہ اس کا

جی یہی ہے کہ واقعات تو اختیار میں ہوتے نہیں اور ہوس زیادہ ہوتی ہے۔ اس واسطے ہمیشہ مصیبت میں گزرتی ہے۔ برخلاف اس شخص کے کہ جس کے پاس دین ہو کیونکہ اس کو خدا تعالیٰ سے محبت ہوتی ہے اور محبت میں یہ حالت ہوتی ہے کہ ؎

ہر چہ آں خسرو کند شیریں بود

حضرت غوث اعظمؒ کا واقعہ ہے کہ ان کو کسی نے ایک آئینہ چینی نہایت بیش قیمت لا کر دیا۔ آپ نے خادم کے سپرد کر دیا کہ جب ہم مانگا کریں تو ہم کو دے دیا کرو۔ ایک روز اتفاق سے خادم کے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گیا۔ خادم ڈرا اور حاضر ہو کر عرض کیا کہ ؎

از قضا آئینۂ چینی شکست

آپ نے بیساختہ نہایت خوش ہو کر فرمایا کہ ؎

خوب شد اسباب خود بینی شکست

اور مال تو کیا چیز ہے اولاد کے مر جانے پر بھی یہ حضرات پریشان نہیں ہوتے۔ یہ دوسری بات ہے کہ طبعی رنج ہو۔ سو یہ کوئی مذموم نہیں۔ انبیاء علیہم السلام کو بھی ہوا ہے۔ غرض دین کے ساتھ اگر دنیا ہو گی، تو وہ دنیا بھی مزیدار ہو گی بلکہ اگر نرا دین ہو اور دنیا نہ ہو تب بھی ان کی زندگی نہایت مزیدار ہے۔ اس لئے کہ وعدہ ہے۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ

ان حضرات کو ہیچ مدان میں بھی لطف آتا ہے۔

حضرت شاہ ابو المعالیؒ کی حکایت ہے کہ ایک مرتبہ آپ گھر

پر موجود نہ تھے کہ آپ کے مرشد تشریف لائے۔ اتفاق سے اس روز گھر میں فاقہ تھا۔ اہل خانہ نے دیکھا کہ حضرت تشریف لائے ہیں آپ کے لئے کوئی انتظام ہونا چاہیے۔ آخر خادمہ کو محلے میں بھیجا کہ اگر قرض مل جائے تو کچھ لے آئے۔ خادمہ دو تین جگہ جا کر واپس چلی آئی اور کچھ نہ ملا۔ متعدد مرتبہ کی آمد و رفت سے حضرت کو شبہ ہوا اور آپ نے حالت دریافت فرمائی۔ معلوم ہوا کہ آج فاقہ ہے۔ آپ کو بہت صدمہ ہوا اور آپ نے ایک روپیہ نکال کر دیا کہ اس کا اناج لاؤ۔ چنانچہ اناج آیا آپ نے ایک تعویذ لکھ کر اس میں رکھ دیا اور فرمایا کہ اس اناج کو مع تعویذ کے کسی برتن میں رکھ دو اور اسی میں سے نکال کر خرچ کرتے رہو۔ چنانچہ

ایسا ہی کیا گیا اور اس اناج میں خوب برکت ہوئی۔ چند روز کے بعد جو شاہ ابو المعالیؒ صاحب آئے تو کئی وقت تک کھانے کو برابر ملا۔ آپ نے ایک روز تعجب سے پوچھا کہ کئی روز سے فاقہ نہیں ہوا۔ معلوم ہوا کہ اس طرح سے حضرت ایک تعویذ دے گئے تھے ———— اب اس موقع پر ملاحظہ فرمائیے حضرت شاہ ابو المعالی کے ادب کا اور آپ کی خداداد سمجھ کا کہ ادب توکل کو بھی ہاتھ سے نہ جانے دیا اور ادب پیر کو بھی ملحوظ رکھا ———— فرمانے لگے کہ اس اناج کو ہمارے پاس لاؤ چنانچہ لایا گیا۔ آپ نے اس میں سے تعویذ کو نکال کر تو اپنے سر پر باندھا اور فرمایا کہ حضرت کا تعویذ تو میرے سر پر رہنا چاہیے اور اناج کی بابت حکم دیا کہ سب فقراء میں تقسیم کر دیا جائے۔ چنانچہ سب تقسیم کر دیا گیا۔ اور اسی وقت سے پھر فاقہ شروع ہو گیا۔ ان حضرات کا فاقہ اختیاری فاقہ تھا کیونکہ اس کو سنت سمجھتے تھے۔

حضرت شیخ عبدالقدوس رحمۃ اللہ علیہ پر تین تین دن فاقہ کے گزر جاتے تھے اور جب بیوی بہت پریشان ہو کر عرض کرتیں کہ حضرت! اب تو تاب نہیں رہی۔ فرماتے کہ تھوڑا صبر اور کرو جنت میں ہمارے لئے عمدہ عمدہ کھانے تیار ہو رہے ہیں۔ لیکن بیوی بھی ایسی نیک ملی تھیں کہ وہ نہایت خوشی سے اس پر صبر کرتیں۔

صاحبو ــــ ان حالات پر آپ کو تعجب نہ کرنا چاہیے۔ اور اگر تعجب ہے تو یہ ایسا ہی تعجب ہے جیسے کوئی عنین تعجب کرنے لگے کہ صحبت میں بھی لطف ہوتا ہے کیونکہ اگر ذرا سا بھی ادراک ہوتا تو ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی محبت کا کیا عالم ہوتا ہے۔ محبت میں تو مطلقاً یہ عالم ہوتا ہے کہ ؎

چو در چشم شاہد نیاید زرت　　　زر و خاک یکساں نماید برت

دیکھو اگر محبوب کو ایک ہزار روپیہ دو اور وہ لات مار دے تو تمہارے دل میں بھی اس روپیہ کی قدر نہیں رہتی اور محبت مجازی میں جب یہ حالت ہے تو حقیقی کا کیا پوچھنا۔ اسی کو فرماتے ہیں ؎

ترا عشق ہمچو خودے ز آب و گل　　　رباید ہمہ صبر و آرام دل

عجب داری از سالکان طریق　　　کہ باشند در بحر معنی غریق

دیکھئے اگر کوئی محبوب اپنے پاس بیٹھنے کی اجازت دے دے اور اس درمیان میں کھانے کا وقت آجائے اور محبوب کہے کہ اگر بھوک لگی ہو تو جا کر کھانا کھا لو۔ تو کیا کوئی سمجھ سکتا ہے ــــــــ کہ عاشق اس وقت اٹھنے اور کھانے کو گوارا کرے گا۔ ہرگز نہیں۔ تو جب محبت کی یہ حالت ہوتی ہے تو شیخ کے فاقہ پر کیا تعجب ہے۔ وہ حضرت عاشق محبوب حقیقی سے

معیّت رکھتے ہیں۔ مولانا رحؒ کہتے ہیں ؎

گفت معشوقے بعاشق کای فتا | تو بہ غربت دیدۂ بس شہر ہا
پس کدامی شہر ازانہا خوشتر است | گفت آں شہرے کہ دروے دلبر است

آگے مولانا فرماتے ہیں ؎

ہر کجا دلبر بود خرم نشیں | فوقِ گردوں است نے قعر زمین
ہر کجا یوسف رخے باشد چو ماہ | جنت است آں گرچہ باشد قعر چاہ

تو اگر محبوب کنوئیں کے اندر ہو وہ بھی جنّت ہے۔ تو جب محبوب مجازی کی معیّت کی یہ حالت ہوتی ہے تو محبوب حقیقی کی معیّت اگر میسّر ہو جائے تو کیا حالت ہوگی۔

غرض دنیا دار آپ کو بے مزہ دنیا سکھلاتے ہیں اور ہم مزے دار دنیا سکھلاتے ہیں اور وہ وہی دنیا ہے جو کہ دین کے ساتھ ہو کر وہ نہایت لطیف اور مزیدار ہوتی ہے اور اگر یہ سمجھ میں نہیں آتا تو ضابطہ کا جواب وہی ہے کہ دنیا کا بتلانا ہی میرے ذمہ نہیں ہے۔

اجزائے دین

یہ تو دنیا کے متعلق تھا اب رہ گیا دین۔ سو اس کی یہ حالت ہے کہ اس کے پانچ جز ہیں۔

۱۔ عقائد ۲۔ دیانات ۳۔ معاملات

۴۔ معاشرت ۵۔ اخلاق

ان میں سے ہر جز کے اعتبار سے ہماری حالت ناگفتہ بہ ہے۔ عقائد میں توحید و رسالت کے متعلق جو گڑبڑ کر رکھی ہے سبھی جانتے ہیں کہیں تحقیقی فلسفہ کی وجہ سے اس پر اعتراض کئے جاتے ہیں۔ کہیں باطل تصوف کی وجہ سے

شکوک گزرتے ہیں۔ اولیاء اللہ کو انبیاء کے درجے سے متجاوز کر دیا ہے انبیاءً کو خدا کے درجہ سے متجاوز بنا دیا ہے اور وہ حالت ہے کہ جس شخص کو شریعت سے جتنا بُعد ہے اُس کو خدا تعالیٰ سے اُسی قدر زیادہ مقرّب کہا جاتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ فساق اولیاء اللہ میں شمار ہونے لگے ہیں۔

دوسرا جزو دیانات ہیں۔ اُن کے متعلق معلوم ہے کہ روزہ کتنے لوگ رکھتے ہیں۔ زکوٰۃ کتنے ادا کرتے ہیں۔ حج کتنوں نے ادا کیا۔

تیسرا جزو معاملات کا ہے۔ ان کو لوگوں نے شریعت سے بالکل ہی خارج سمجھ رکھا ہے۔ ان کے یہاں نہ بیع المعدوم حرام ہے نہ معاملات سود حرام ہیں۔ ان کا مطمح نظر یہ ہے کہ جس طرح ہو سکے بہت سا روپیہ سمیٹ لیا جائے۔ کھانے میں گھی خوب زیادہ ہو۔ کسی کی زمین دبی ہے تو کچھ پرواہ نہیں۔ ڈگریاں سود سمیت کرائی جاتی ہیں تو کچھ غم نہیں۔

چوتھا جزو معاشرت ہے اس کی جو گت ہے سبھی واقف ہیں۔ شادی غمی میں جس طرح جی چاہتا ہے کرتے ہیں۔ نہ اُن کو کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہ فتویٰ لینے کی حاجت۔ جو کچھ بیوی صاحبہ نے کہہ دیا وہ کر لیا گویا وہی شریعت کی مفتی ہیں۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ وہ قوم ہرگز فلاح نہ پائے گی جن کی سردار عورت ہوگی۔ علیٰ ہذا ــــ!

قومی شعار

وضع کو دیکھئے تو اس کی یہ حالت ہے کہ صورت سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ مسلمان ہیں یا کافر۔ داڑھی بالکل صاف، سر پر وحشیوں کے سے بال بڑھے ہوئے۔ صاحبو! آج قوم قوم پکارا جاتا ہے۔ لفظ قوم کی بڑی پرستش کی جاتی ہے لیکن افسوس ہے کہ آپ کو امتیاز قومی کی بھی پرواہ نہیں۔ اگر آپ پر

داڑھی کا رکھنا فرض بھی نہ ہو تب بھی قومی شعار ہی سمجھ کر اس کو رکھنا چاہیئے تھا۔ آخر قومی شعار بھی تو کوئی چیز ہے۔ کتنا افسوس ہے کہ مسلمان ہندوؤں کا شعار اختیار کریں اور ہندو مسلمانوں کا۔

میرے بھائی کے پاس دو شخص عہدہ دار آئے۔ ایک ان میں سے ہندو بہ شکل مسلمان تھا۔ ایک مسلمان بہ شکل ہندو تھے۔ مسلمان صاحب کے لئے گھر سے پان آیا۔ خادم چونکہ دونوں سے ناواقف تھا اس لئے اس نے ہندو کے سامنے پان پیش کیا۔ اس پر وہ دونوں ہنسے۔ اس سے وہ خدمت گار سمجھا کہ مسلمان یہ ہیں جن کی ڈاڑھی منڈی ہوئی ہے۔

صاحبو! اگرچہ گناہ بہ حیثیت گناہ ہونے کے تو سب ہی برے ہیں لیکن تاہم بعض گناہ ایسے ہیں کہ گو وہم ہی کے درجے میں ہو لیکن انسان اس میں اپنی مجبوری اور عذر بیان کر سکتا ہے مثلاً رشوت کا لینا کہ اس کی جس قدر مجبوریاں بیان کی جاتی ہیں گو وہ سب وہمی ہیں لیکن تاہم ہیں تو۔ بھلا داڑھی منڈانے کی ناشائستہ حرکت میں کیا مجبوری ہے اس پر کون کام اٹکا ہے اگر کوئی صاحب کہیں کہ اس سے حسن بڑھتا ہے تو میں کہوں گا کہ بالکل غلط ہے۔ ایک عمر کے دو آدمیوں کو پیش کیا جائے جن میں ایک کی داڑھی منڈی ہو اور دوسرے کے چہرے پر داڑھی ہو۔ اس کے بعد موازنہ کر کے دیکھ لیا جائے کہ کس چہرے پر حسن برستا ہے اور کس پر پھٹکار برستی ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ ایک جماعت فرشتوں کی ایسی ہے کہ وہ ہر وقت یہی تسبیح پڑھتے ہیں۔

سُبْحَانَ مَنْ زَیَّنَ الرِّجَالَ بِاللُّحٰی وَالنِّسَاءَ بِالذَّوَائِبِ۔

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مرد کے لئے داڑھی کا ہونا زینت ہے لہٰذا

اگر اس زینت کے رکھنے کی ضرورت نہیں تو عورتوں کا سر بھی منڈانا چاہیے غرض داڑھی منڈانے کی وجہ حسن وجمال تو نہیں ہو سکتی۔

کلکتہ میں ایک ملحد نے مولانا شہید دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے کہا تھا کہ غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ داڑھی رکھنا خلاف فطرت ہے کیوں کہ اگر فطرت کے موافق ہوتی تو ماں کے پیٹ سے پیدا ہونے کے وقت بھی ہوتی۔ مولانا شہید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اگر خلافِ فطرت ہونے کی یہی وجہ ہے تو دانت بھی خلافِ فطرت ہیں ان کو بھی توڑ ڈالو کیونکہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہونے کے وقت دانت بھی نہیں تھے۔

غرض داڑھی کا منڈانا نہایت لغو حرکت ہے اور میں نے اس وقت بالقصد داڑھی کا تذکرہ نہیں کیا۔ لیکن میں چونکہ اپنے عیوب وامراض کو بتلا رہا ہوں۔ اسی ذیل میں اس کا تذکرہ بھی آگیا۔ صاحبو! واللہ بعض دفعہ داڑھی کے تذکرہ سے شرم آتی ہے کہ شاید کسی کو ناگوار گزرے مگر منڈانے والوں کو اتنا حجاب بھی نہیں ہوتا۔ اور اب تو غضب یہ ہے کہ بعض لوگ داڑھی منڈانا حلال بھی سمجھنے لگے ہیں اور جب اس کی بابت ان سے گفتگو کی جاتی ہے تو کہتے ہیں کہ قرآن میں اس کی حرمت دکھلایئے۔

شرعی دلائل کی بنیاد

یہ سوال آج کل ایسا عام ہوا ہے کہ ہر شخص ہر بات کو قرآن سے مانگنے لگا ہے۔ میں اس سوال کا ایک فیصلہ کن جواب دیتا ہوں۔ یہ کوئی لطیفہ نہ ہوگا بلکہ قابلِ غور جواب ہوگا۔ لیکن اوّل ایک شرعی اور ایک تمدّنی قاعدہ بیان کرتا ہوں۔

تمدّنی قاعدہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص عدالت میں ایک ہزار روپے کا

دعوئے پیش کرے اور اس کی شہادت میں دو شاہد ایسے پیش کر دے جن میں مدعا علیہ کوئی نقص یا عیب نہ نکال سکے تو مدعا علیہ پر ڈگری ہو جاتی ہے اور اس کے بعد مدعا علیہ کو یہ حق نہیں رہتا کہ وہ ان گواہوں کو تسلیم نہ کرے۔ اور یہ کہے کہ میں تو دعوے کو اس وقت تک تسلیم نہیں کرتا جب تک کہ خود صاحب جج اور مجسٹریٹ ضلع آکر گواہی نہ دیں۔ اور اگر مدعا علیہ ایسا کرے تو عدالت اُس کو کہے گی کہ دعوے کے اثبات کے لئے مطلق شاہد کی ضرورت ہے، شاہد خاص کی ضرورت نہیں ہے۔ پس یا تو ان گواہوں میں کلام کرو یا دعوے کو تسلیم کرو۔ یہ قاعدہ تمدنی بھی ہے اور شرعی بھی۔

اور شرعی قاعدہ یہ ہے کہ شریعت کے چار دلائل ہیں۔ قرآن، حدیث، اجماع، قیاس۔ تو گویا یہ شاہد ہیں احکام کے۔ پس جو شخص یہ دعویٰ کرے کہ ہذا حکمٌ شرعیٌ۔ تو مطلب اس کا یہ ہوتا ہے کہ یہ مسئلہ ان چاروں دلیلوں میں سے کسی ایک دلیل سے ثابت ہے اور یہ دعویٰ ایسا ہی ہوتا ہے جیسا کہ کوئی ایک ہزار روپیہ کا دعویٰ کرے۔ پس اسی شخص کی طرح اس کو بھی اختیار ہے کہ جس دلیل سے چاہے ثابت کر دے خواہ حدیث پڑھ دے خواہ امام ابو حنیفہ رح کا قول نقل کر دے۔

اُن دونوں قاعدوں کے معلوم کرنے کے بعد اب اُس سوال کا جواب سنئے۔ وہ یہ ہے کہ داڑھی کٹانے یا منڈانے کی حرمت حدیث شریف سے ثابت ہے اور حدیث بھی دلائل شرعیہ میں سے ایک دلیل ہے اگرچہ قرآن اس سے بڑا ہے، تو قرآن سے دلیل کا طلب کرنا ایسا ہے جیسا کہ کوئی شخص خاص مجسٹریٹ کی گواہی پر ثبوت مدعا کا مدار رکھے۔ البتہ یہ حق ہر

شخص کو حاصل ہے کہ اگر ممکن ہو حدیث میں کلام کرے۔ لیکن اگر حدیث میں کلام نہ کر سکے تو آگے گنجائش باقی نہیں رہتی۔

میں مجیبوں کو بھی کہتا ہوں کہ آپ بھی اتنی خوش اخلاقی نہ کیا کیجئے کہ جس کسی نے جس قید کے ساتھ کوئی بات پوچھی آپ اسی طرح جواب دینے کی فکر میں پڑ گئے۔ لوگ کہتے ہیں کہ مولوی بداخلاق ہوتے ہیں حالانکہ مولوی اس قدر خوش اخلاق ہوتے ہیں کہ اُن کی خوش اخلاقی کی بدولت آپ خراب ہو گئے۔ غرض قرآن شریف سے داڑھی منڈانے کی حرمت کو تلاش کرنا اور حدیث وغیرہ کو حجّت نہ سمجھنا بڑی غلطی ہے۔ اسی طرح مجیب صاحبوں سے عرض ہے کہ آپ جو اس کی حرمت کو قرآن سے ثابت کرنا چاہتے ہیں، تو اگر فرض بھی کر لیا جائے کہ داڑھی منڈانے کی حرمت کو قرآن سے ثابت کر بھی دیا تو ہر ہر مسئلہ کو کہاں تک قرآن سے ثابت کیجئے گا۔ مثلاً مغرب کی تین رکعتیں، وتر کا وجوب اور اس کی تین رکعتیں قرآن کی کس آیت سے ثابت کرو گے۔

ہماری اخلاقی حالت

رہے اخلاق اور یہ پانچواں جزو ہے سو اس کی بابت سبھی جانتے ہیں کہ اخلاق کی خرابی سے ہمارے علماء اور طلباء بھی بہت ہی کم بچتے ہیں۔ اکثر دیندار لوگوں کو اس کی تو فکر ہوتی ہے کہ داڑھی بھی ہو، ٹخنے سے اوپر پاجامہ بھی ہو، لباس سارا شریعت کے موافق ہو لیکن اخلاق کو دیکھئے تو اس قدر خراب کہ گویا کبھی شریعت کی ہوا بھی نہیں لگی جس سے وہ حالت ہوتی ہے کہ ؎

از برون چوں گورِ کافر پُر حلل   واندروں قہرِ خدائے عزّ وجل

از بروں طعنہ زنی بر بایزید   وز درونت ننگ میدارد یزید

بہت لوگ ہماری پارسایانہ صورت کو دیکھ کر دھوکا میں آجاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ خدا تعالیٰ کے خاص مقبولین میں ہیں حالانکہ ہم میں یہ جزاخلاق کا جو کہ شعب دین سے ایک عظیم الشان شعبہ ہے ہم میں نشان تک نہیں ہوتا۔ ہماری ساری حرکتیں تکلف پر مبنی اور سارے افعال بناوٹ سے ناشی ہوتے ہیں۔ تو یہ امراض ہم میں ہیں جن کا علاج نہایت ضروری ہے اور جن کی وجہ سے ہماری حالت نہایت ناگفتہ بہ ہے۔ سو میں ان کا علاج بتلاتا ہوں۔

علاج کی قسمیں

علاج ہر مرض کا دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک علاج کلّی اور ایک علاج جزئی۔ علاج جزئی تو اس کو کہتے ہیں کہ ہر ہر شکایت اور ہر ہر مرض کا فرداً فرداً علاج کیا جائے اور علاج کلّی اس کو کہتے ہیں کہ تمام امراض کی جڑ یعنی ایک امر مشترک کا ازالہ کر دیا جائے کہ اس سے ہر شکایت خود بخود جاتی رہے۔ شریعت میں پہلی قسم کے علاج بھی ہیں اور دوسری قسم کے بھی لیکن پہلی قسم کے علاج کی آج کل لوگوں میں ہمت نہیں رہی البتہ پہلے لوگ اسی طرح کرتے تھے کہ ریا، عجب، حسد، کبر، بغض وغیرہ سب کا علاج علیحدہ علیحدہ کرتے تھے اور معالج کے لئے یہی سہل بھی ہے گو مریض کے لئے اس میں دشواری ہے۔

مثلاً اگر ایک شخص سر سے پیر تک بیماریوں میں مبتلا ہو اس کے لئے بہت اچھا یہ ہے کہ کوئی ایسا نسخہ تجویز کیا جائے کہ اسی ایک نسخہ سے سب مرض جاتے رہیں مگر یہ معالج کو نہایت دشوار ہے۔ شریعت اسلامیہ کے

قربان جائیے کہ اس نے ایسا علاج بتلا دیا کہ ایک ہی علاج میں ہر مرض سے رہائی ہو جاتی ہے اور راز اس کا یہ ہے کہ بعض شکایتوں میں اصل مرض ایک ہوتا ہے اور باقی سب اعراض ہوتے ہیں جو کہ اس مرض سے پیدا ہو جاتے ہیں۔

جیسا ایک شخص کا قصہ ہے کہ اس نے ایک طبیب سے شکایت کی کہ مجھے نیند نہیں آتی۔ اس نے کہا بڑھاپے کے سبب۔ پھر اس نے کہا کہ میرے سر میں درد بھی رہتا ہے۔ طبیب بولا کہ یہ بھی بڑھاپے کے سبب۔ اسی طرح اس نے بہت سی شکایتیں بتلائیں اور طبیب نے سب کا یہی جواب دیا کہ یہ سب بڑھاپے کی بدولت ہے۔ تو اصل مرض اس شکایت میں بڑھاپا تھا اور باقی سب اس کے اعراض تھے۔

ایک اور نظیر لیجئے۔ رات کے وقت آپ نے چراغ گل کر دیا اور چوہے، چھچھوندر، چھپکلی وغیرہ نکلنے شروع ہوئے تو بظاہر یہ بہت سے موذیوں کا ہجوم ہے کہ فرداً فرداً ہر ایک کا دفع کرنا دشوار ہے لیکن سبب ان سب کا صرف ایک چیز ہے یعنی ظلمت۔ جب اس کو دور کر دیا جائے گا تو یہ سارے موذی خود بخود دور ہو جائیں گے۔ اسی طرح شریعت مطہرہ کی یہ خوبی ہے کہ اس نے تمام شکایتوں میں سے اصل مرض کو منتخب کر کے بتلا دیا۔

بنیادی امراض

اس کی تدبیر بتلا دی کہ اصل مرض ہم میں دو ہیں علی سبیل منع الخلو یعنی کبھی تو وہ دونوں ہوتے ہیں اور کبھی ایک ہوتا ہے دوسرا نہیں ہوتا لیکن یہ کبھی نہیں ہوتا کہ اس میں سے ایک بھی نہ ہو۔ میں اس کو مفصل ذرا اس لئے

بیان کرتا ہوں کہ ہماری حالت بہت کچھ محتاجِ اصلاح ہو رہی ہے اور اس کے ساتھ ہم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہماری اصلاح ممکن ہی نہیں حالانکہ یہ سمجھنا بالکل غلط ہے۔ صاحبو! اگر دین ایسا تنگ ہوتا تو قرآن شریف میں یہ ارشاد نہ ہوتا۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّذُرِّيَّةً

نیز مسلمانوں کے لئے خلافت اور سلطنت عطا نہ ہوتی۔ پس یہ سمجھنا کہ اصلاح حالت کے لیے بالکلیہ ترک تعلق کر دینا ضروری ہے محض غلطی ہے وہ اصلی مرض ایک تو یہ ہے کہ لوگوں میں تعلیم نہیں اور علم دین سے بالکل ناواقف ہیں۔ دوسرے یہ کہ بزرگوں کی صحبت نصیب نہیں اور میرے اس جملہ سے عقلاء کو اس بیان کی اصلی غرض کا پتہ چل گیا ہوگا اور ایک بڑا شبہ بھی حل ہو گیا ہوگا۔ کیونکہ بعض لوگ علی العموم یہ سمجھتے ہیں کہ علماء کا مقصود تعلیم دین کی ترغیب سے پورا مولوی بنانا ہے اور بدون اس کے ان کے نزدیک مقصود حاصل نہیں ہوتا تو میرے اس عطف سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ ان کے نزدیک پورا مولوی بنانا ضروری نہیں۔ بلکہ یا تو پورا مولوی بنایا جائے اور یا بزرگوں کی صحبت ہو۔

اس کو ذرا تفصیل سے یوں سمجھئے کہ ایک تو علم دین کی تعلیم بقدر ضرورت ہے اس تعلیم کا عام ہونا تو نہایت ضروری ہے اور ایک تعلیم ہے اصطلاحی عالم بننا، یہ سب کے لئے ضروری نہیں۔ اور اس کی مثال ایسی ہے جیسے گورنمنٹ کا قانون کہ بقدر ضرورت قانون کا جاننا رعایا میں سے ہر واحد کے لئے ضروری ہے اور قانون میں پاس کرنا ساری رعایا کے لئے ضروری نہیں اور اگر کوئی گورنمنٹ اس پر مجبور کرے تو بے شک یہ تنگی ہے۔ تو اصطلاحی علماء سب

نہیں بن سکتے بلکہ میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ ہم تو سب کا اصطلاحی عالم بنانا مناسب بھی نہیں سمجھتے۔ اب تو آپ کے شبہ کی ذرا بھی گنجائش نہیں رہی اور وجہ اس کی یہ ہے کہ اگر سب مولوی ہو جائیں اور مولویت میں مشغول ہو جائیں تو معاش کے اسباب بالکل گم ہو جائیں اور ان اسباب کا محفوظ رکھنا خود شریعت کو مقصود ہے۔

مقصود علماء

اب میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ سب کا مولوی بنانا جائز بھی نہیں ہے اس پر شاید لوگوں کو تعجب ہو لیکن بات یہ ہے کہ مولوی ہونے سے مراد مقتدا ہونا ہے اور مقتدا ہونے کے لئے کچھ شرطیں ہیں جن میں سے بڑی شرط یہ ہے کہ اس شخص میں حق پرستی ہو نفس پرستی نہ ہو۔ طمع اور لالچ اس میں نہ ہو کہ اپنی طمع کی وجہ سے مسئلہ کو بدل دے۔ علماء بنی اسرائیل میں یہی بات تھی کہ جس کی وجہ سے وہ گمراہ ہوتے۔ اسی کی نسبت کہتے ہیں۔

بے ادب را علم و فن آموختن

دادن تیغ ست دستِ راہزن

اور یہ مشاہدہ ہے کہ طمع میں بہت طبائع مبتلا ہیں۔ جب یہ ہے تو فرض کیجئے کہ ایک شخص میں طمع اور نفس پرستی ہے اور اس کو مقتدا بنا دیا گیا تو وہ کیا کرے گا۔ ظاہر ہے کہ بجائے اصلاح قوم کے قوم کو تباہ کرے گا۔ اور اپنی طرف سے تراش کر مسئلے لکھے گا۔ میں نے ایک شخص کا فتوےٰ دیکھا ہے کہ اس نے ایک ہزار روپیہ لے کر ساس سے نکاح کو حلال کر دیا تھا۔

دہلی کے ایک بادشاہ کے متعلق مشہور ہے کہ اس کو ایک مرتبہ جریہ

پہننے کی طرف میلان ہوا۔ بعض تنخواہ دار مولویوں نے اس کی حلت کا فتویٰ دے دیا اور بہت سے وجوہ حلت کے لکھ دیئے۔ بادشاہ نے کہا کہ اگر ملا جیون بھی دستخط کر دیں تو میں پہن لوں گا۔ ملا جی کے پاس استفتاء گیا آپ نے کہلا بھیجا کہ میں دہلی آکر جواب دے دوں گا اور جامع مسجد میں جواب دوں گا۔ چنانچہ آپ دہلی تشریف لائے اور جامع مسجد میں ممبر پر جاکر بعد نقل سوال و جواب کے استحلال معصیت کی بناء پر بطور زجر کے فرمایا کہ "مفتی و مستفتی ہر دو کافر اند"۔ بادشاہ یہ سن کر نہایت غضب ناک ہوا اور ان کے قتل کا حکم دیا۔ بادشاہ کے ایک فرزند کو جو خبر ہوئی تو دوڑے ہوئے ملا جی کے پاس آئے اور کہا کہ آپ کے قتل کی تدابیر ہو رہی ہیں۔ ملا جی نے جو سنا تو بہت برہم ہوئے اور فرمایا کہ میں نے ایسا قصور کیا کیا ہے اور فرمایا کہ وضو کے لئے پانی لاؤ کہ میں بھی ہتھیار باندھ لوں کیونکہ الوضوء سلاح المومن۔ حقیقت میں ان حضرات کو تنہا نہ سمجھنا چاہیئے۔ حافظ علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں ؎

بس تجربہ کردیم دریں دیرِ مکافات
با دُرد کشاں ہر کہ در افتاد بر افتاد

حدیث شریف میں ہے۔

مَنْ عَادٰی لِیْ وَلِیًّا فَقَدْ اٰذَنْتُہٗ بِالْحَرْبِ

شہزادہ نے جو آپ کے جلال کی حالت دیکھی تو دوڑا ہوا باپ کے پاس گیا اور کہا کہ آپ کیا غضب کرتے ہیں۔ ملا جی آپ کے مقابلہ کے لئے وضو کر رہے ہیں اور سلاح وضو درست کر رہے ہیں سچ رہے ہیں بادشاہ یہ سن کر تھرا گیا اور کہا کہ اب کیا کروں؟ میں تو حکم دے چکا ہوں شہزادے نے کہا کہ سب کے سامنے میرے ہاتھ ایک خلعت بھیج

دیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ تب ملا جی کا غصہ فرو ہوا۔۔

اس قسم کے لوگ البتہ مقتدا ہونے کے قابل ہیں اور ایسے بہت لوگ گزرے ہیں برخلاف ان طماع لوگوں کے کہ یہ بجز فساد کے اور کیا کریں گے۔

چنانچہ ایک ایسے ہی بزرگوار کا قصہ ہے اور میں نے اُن کو دیکھا بھی ہے کہ اُن سے ایک عورت نے جس کا دوسرے شخص سے تعلق تھا کہا کہ میں اپنے شوہر کے پاس رہنا نہیں چاہتی اور وہ مجھے طلاق نہیں دیتا! اُنہوں نے کہا کہ تو کافر ہو جا (نعوذ باللہ) اس سے نکاح ٹوٹ جائے گا۔

فرمائیے! جب ایسے لوگ مقتدا ہوں گے تو قوم کی کیا حالت ہو گی اور عجب نہیں کہ ایسے لوگوں کی وجہ سے ان کے پڑھانے والوں سے بھی باز پرس ہو جب کہ ان کو قرائن سے معلوم ہو کہ یہ ایسے ہوں گے۔ یہی وجہ تھی کہ سلف صالحین انتخاب کر کے پڑھاتے تھے۔ ہر کس و ناکس کو علمِ دین مقتدائیت کے درجے تک نہ سکھلاتے تھے۔

اس مقام پر شاید متکبرین خوش ہوں کہ ہم کہا کرتے تھے کہ جلاہے نیلیوں کو نہ پڑھایا جائے۔ وہی بات ثابت ہو گئی۔ سو اُن کو سمجھ لینا چاہیئے کہ حضرات سلف صالحین کا انتخاب انساب سے نہیں ہوتا تھا بلکہ ملکات سے ہوتا تھا یعنی جس شخص میں ملکاتِ فاضلہ دیکھتے تھے اُن کو علمِ دین کی تعلیم کامل دیتے تھے اور جس شخص میں ملکاتِ رذیلہ دیکھتے تھے اس کو بقدر ضرورت سکھلا کر کسی دوسرے کام میں مشغول ہونے کی رائے دیتے تھے

اگرچہ پہلا کسی ادنیٰ اور معمولی گھرانے کا ہو اور دوسرا کسی عالی خاندان کا۔ اور اگر آپ کو ان جلاہے نیلیوں سے اس قدر عار آتی ہے تو ان کی جنت میں

بھی نہ جائیے گا بلکہ فرعون و ہامان کے ساتھ چلے جائیے گا کیونکہ وہ بہت بڑے لوگوں میں تھے۔

صاحبو۔۔۔ نسب کا علو اور تسفل غیر اختیاری ہے اور ملکات کے مقتضا پر چلنا اختیاری ہے اور غیر اختیاری امور میں عزت یا ذلت نہیں ہوا کرتی۔ عزت و ذلت کا مدار اختیاری افعال ہوا کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے قیامت میں ان انساب کا اعتداد نہ ہوگا۔ ارشاد خداوندی ہے۔

فَلَآ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَّلَا يَتَسَآءَلُوْنَ o

پھر یہ کہ شریف تو پڑھیں نہیں اور اسافل کو پڑھنے نہ دیں۔ کیسا ظلم ہے۔ خدائی مذہب کا نشر اور اس کا شیوع تو ضرور ہونے والا ہے اور اس کے لیے ہر زمانے میں غیب سے سامان ہوتا رہا ہے۔ جس وقت تک شرفاء علم کی طرف متوجہ رہے خدا تعالیٰ ان میں بڑے بڑے لوگ پیدا کرتا رہا جن سے دین کی اشاعت ہوئی۔ جب انہوں نے تقاعد کیا اور علم دین کی طرف سے روگردانی کی خدا تعالیٰ نے یہ دولت دوسری قوموں کو دے دی۔ غرض انساب کو نہ دیکھیے اخلاق کو دیکھنا چاہیے۔

میں اہل مدارس کو یہ رائے دیتا ہوں کہ وہ اپنی ضابطہ پری اور کارروائی دکھلانے کی غرض سے بدطینت لوگوں کو داخل نہ کریں۔ کثرت و قلت تعداد طلباء کی قطعاً پروا نہ کیا کریں بلکہ جس شخص کی حالت مقتدائیت کے مناسب نہ دیکھیں اس کو فوراً مدرسے سے خارج کر دیں۔

میں جب کانپور میں تھا تو ایک مرتبہ تقریباً آٹھ طالب علموں کو جو کہ قریب بفراغ تھے، مدرسہ سے خارج کر دیا تھا۔ اہل مدرسہ نے بہت کچھ کہا سنا کہ ان کے نکلنے سے مدرسہ کی کارگزاری میں بڑی کمی واقع ہوگی

اور اس سال کارروائی بالکل نہ دکھلائی جا سکے گی۔ میں نے کہا کہ آپ لوگوں کو کارروائی دکھلانے کا تو اس قدر خیال ہے اور اس کا خیال نہیں کہ یہ لوگ مقتدائے دین ہوں گے۔ لوگ ان کی پیروی کریں گے اور حالت ان کی یہ ہے تو بجز گمراہ کرنے کے اور کیا ان سے ہو سکے گا۔ تب ان لوگوں کی سمجھ میں آیا۔

غرض آپ لوگ اس کا ہرگز اندیشہ نہ کریں کہ ہم سب کو مولوی بنانے کی فکر میں ہیں کیونکہ ہم بہت سوں کو مولوی بنانا جائز بھی نہیں سمجھتے اور وہ ایسے لوگ ہیں جن کی نسبت کہا گیا ہے ؎

زیاں میکند مرد تفسیر داں　　　　کہ علم و ادب می فروشد بناں

آج کل جو علماء کا گروہ بدنام ہے یہ انہی طماعوں کی بدولت۔ واللہ اگر علماء آج دست کش ہو جائیں جیسا کہ اہل حق بحمد اللہ ہیں تو یہ بڑے بڑے متکبرین ان کے سامنے سر تسلیم خم کریں۔ بلکہ علماء کے لئے تو یہ مناسب ہے کہ اگر کوئی دنیا دار ان کے سامنے کوئی چیز پیش بھی کرے تو لینے سے انکار کر دیں صاحبو! علماء کا وجود فی نفسہٖ ایسا محبوب تھا کہ اگر یہ کسی کے گھر چلے جاتے تو اس دن عید ہونی چاہئے تھی۔ حالانکہ آج وہ دن یوم الوعید ہو جاتا ہے اور وجہ اس کی یہی ہے کہ ان طماعوں کی بدولت ہر عالم کی صورت دیکھ کر یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کچھ مانگنے آئے ہوں گے۔ صاحبو! استغناء و آزادی میں علماء کا تو یہ مذہب ہونا چاہئے کہ ؎

اے دل آں بہ کہ خراب از مے گلگوں باشی
بے زر و گنج بہ صد حشمتِ قاروں باشی

در رہِ منزلِ لیلیٰ کہ خطرہاست بجاں
شرطِ اوّل قدم آنست کہ مجنوں باشی

یعنی وہ حالت ہونی چاہیئے کہ مال اور جاہ دونوں کو آگ لگا دو اگر تم ان امراء کے دروازے پر جانا چھوڑ دو تو یہ خود تمہارے دروازہ پر آئیں گے۔

نیک صحبت کی ضرورت

تو ایسے لوگوں کے ہوتے ہوئے ہم تعلیم کامل کو عام نہیں کرنا چاہتے البتہ تعلیم بقدر ضرورت عام ہونی ضروری ہے اور تعلیم کامل کا بدل ایک دوسری چیز ہے یعنی اہل اللہ کی صحبت کہ اس سے بھی وہی فائدہ ہوتا ہے بلکہ یہ ایسی چیز ہے کہ تعلیم کامل کے بعد بھی اس کی ضرورت ہے۔ دیکھئے بہت سے صحابہ کرام ایسے تھے کہ وہ بالکل بھی پڑھے نہ تھے اور اسی حالت پر حضور فخر فرماتے ہیں۔

نَحْنُ اُمَّۃٌ اُمِّیَّۃٌ لَا نَکْتُبُ وَلَا نَحْسُبُ ۔

لیکن چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحبت اور معیت حاصل تھی وہی بالکل کافی ہو گئی — یہ تو دینی پہلو سے گفتگو تھی۔

اب میں تمدنی پہلو سے صحبت کی ضرورت اور بدون صحبت کے تعلیم کامل کے مفاسد بتلاتا ہوں۔ یہ تو سب کو معلوم ہے کہ اجتماع اور تمدن کے تمام مصالح علیٰ وجہ الکمال امن وامان سے اس وقت پورے ہو سکتے ہیں کہ جب تمام لوگوں کی زندگی میں نہایت سادگی اور معاشرت میں بالکل بے تکلفی ہو۔ بناوٹ اور چالاکی کے ساتھ تمام مصالح کا پورا ہونا ممکن نہیں نیز یہ بھی مشاہدہ ہے کہ اگر علم کامل ہو اور تربیت نہ ہو تو چالاکی اور دھوکا

دہی کا مادہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اگر جاہل ہو اور تربیت نہ ہو تب بھی یہی حالت ہوتی ہے اور مصالح تمدّن کا پورا ہونا ضروری ہے۔

پس خلاصہ یہ نکلا کہ مصالح تمدّن کا پورا ہونا ضروری اور وہ علیٰ وجہ الکمال بدون سادگی اور امن و امان کے پورے ہو نہیں سکتے۔ اور سادگی بدون تربیت کے حاصل نہیں ہو سکتی۔ اور تربیت بغیر علم بقدر ضرورت کے ممکن نہیں۔ تو تربیت کے لئے علم بقدر ضرورت حاصل ہونا ضروری اور سادگی کے لیے تربیت ضروری اور مصالح تمدّن کے پورا ہونے کے لئے سادہ زندگی ضروری۔ لہٰذا مصالح تمدّن کے لئے علم بقدر ضرورت اور تربیت ضروری ہے۔ اور چونکہ علم بدون تربیت مورث عیّاری ہے اور عیّاری مصالح تمدّن کے لئے مضر ہے لہٰذا علم کامل بدون تربیت کے مضر ہے اور چونکہ ہر شخص سامان تربیت کا حاصل نہیں کرتا۔ لہٰذا ہر شخص کو علم کامل پڑھانا مفید نہیں بلکہ مضر ہے۔

لیکن اس پر ناخواندہ لوگ خوش نہ ہوں کہ ہماری اُمیّۃ ایک درجے میں مطلوب ہو گئی۔ پس اچھا ہوا کہ ہم نے علم حاصل نہ کیا۔ بات یہ ہے کہ آپ کی اُمیّۃ تو حد سے بہت زیادہ گزری ہوئی ہے کہ صحبت سے بھی محروم ہو۔ لہٰذا یہ مطلوب نہیں ہو سکتی۔ تو یا تعلیم کامل مع صحبت ہو یا نری صحبت ہو کیونکہ نری تعلیم کافی نہیں اور نری صحبت کافی ہے مگر ایک شرط کے ساتھ۔ وہ یہ کہ جس کے پاس جائے اس کو اپنے دنیاوی قصوں میں مشغول نہ کرے اور اپنے تمام امراض باطن کو بلا کم و کاست اس کے سامنے پیش کر دے۔ اور وہ جو کچھ کہے اس پر کاربند رہے۔ ہم نے ایسا ایک آدمی بھی نہیں دیکھا کہ پورا عالم ہو اور صحبت یافتہ نہ ہو اور پھر اس سے

ہدایت ہوئی ہو۔ اور ایسے بہت سے دیکھے ہیں کہ شین اور قاف بھی ان کا درست نہیں لیکن دین کی خدمت کرتے ہیں۔ پس برا علم شیطان اور بلعم باعور کا سا علم ہے۔

طریق تعلیم و تربیت

لیکن پھر بھی ایک ایسی جماعت کی ضرورت ہے کہ وہ ان سب کے لئے مرکز ہو۔ یعنی سب تو پورے عالم نہ ہوں مگر چند لوگ ایسے ہوں کہ ضرورت کے وقت یہ لوگ ان کی طرف رجوع کر سکیں۔ حاصل یہ ہوا کہ مسلمانوں کو ایک تو ایسی جماعت کی ضرورت ہے جو کہ علماء کہلائیں۔

دوسرے یہ ضرورت ہے کہ ہر شخص بقدر ضرورت عمل عالم ہو۔

تیسرے اس کی ضرورت ہے کہ ہر شخص کو اہل اللہ کی صحبت حاصل ہو۔

اب میں ہر ایک کی تدبیر بتلاتا ہوں۔ سو اول کی تدبیر یہ ہے کہ مسلمانوں میں سے کچھ بچے ایسے انتخاب کئے جائیں جو کہ ذکی اور ذہین ہوں طبیعت میں سلامتی ہو اور ان کو باقاعدہ تعلیم دی جائے اور ان کے لیے ہر شہر میں ایک ابتدائی مدرسہ ہو۔ مثلاً اس بستی میں ایک ابتدائی مدرسہ قائم کیا جائے کہ اس میں شرح وقایہ نور الانوار تک تعلیم دی جائے اور یہاں تک پڑھ لینے کے بعد ان کو کسی بڑے مدرسہ میں بھیج دیا جائے کہ وہاں ان کی درسیات پوری ہو جائیں۔ اس کی فکر ہر شخص کے ذمہ ضروری ہے بالخصوص امراء پر اس کا حق زیادہ ہے کیونکہ ان کو خدا تعالیٰ نے فراغ دیا ہے اور ان چھوٹے مدرسوں کو کسی بڑے مدرسے سے وابستہ کیا جائے کہ وہاں کی سند ان لوگوں کے لئے حجت ہو اور وہ مدرسہ ان سب مدارس کے لئے دار العلوم کے طور پر ہو۔ پھر ایسے لوگوں کے فتوے اور تعلیمات پوری طرح

قابلِ اطمینان ہوں گے بلکہ بہتر یہ ہے کہ جو لوگ وعظ کہنے کے لئے آئے ہوں اُن کی نسبت بھی تحقیق کر لیں کہ وہ کسی مدرسے کے سند یافتہ بھی ہیں کیونکہ آج کل کے واعظوں سے نفع کی بجائے بہت زیادہ نقصان ہوا ہے۔

میں نے دیوبند میں ایک واعظ صاحب کو وعظ کہتے سُنا۔ اوّل اُس نے یہ آیت پڑھی ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ۔ اس کے بعد ترجمہ اس آیت کا کیا کہ تمہارے لئے یہ بہتر ہے کہ تم تالا لگا کر نمازِ جمعہ کو جایا کرو۔ یہ خرابی کی تعلمون کی یعنی تالا موند۔ اس زمانے میں جناب مولانا رفیع الدین صاحب دیوبندی مہتمم مدرسہ زندہ تھے۔ اس واعظ کو بہت ڈانٹا۔

ایک اور واعظ کانپور میں آئے تھے۔ جامع العلوم میں اُنہوں نے وعظ کہا۔ یہ آیت پڑھی وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ جَنَّتَانِ۔ اور ترجمہ کیا کہ جنت میں ایک تخت ہو گا جس کا ایک ایک پایہ ایک ایک ہزار کوس کا ہو گا اور طرہ یہ کہ کوس کی تفسیر بھی کی کہ بڑے کوس کو کہتے ہیں۔ اسی طرح ہم نے ایسے واعظ بھی دیکھے ہیں کہ وہ وعظ کہتے ہیں اور لوگوں سے معلوم ہوا کہ شراب پیتے ہیں۔

آج کل مقتدا بننا بھی ایسا سستا ہو گیا ہے کہ جس کا جی چاہے وہی مقتدا بن جاتا ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ لوگ کسی ایک بڑی جگہ اور مرکزی جماعت سے وابستہ نہیں۔ اس لئے سب خود مختار ہیں۔ لہٰذا بہت ضروری ہے کہ سب کے سب کسی ایسی جگہ اور ایسی جماعت سے وابستہ ہوں کہ ان کا ہر فعل وہاں کی اجازت اور سند کے بعد ہو۔ بدون

خاص اہتمام کے یہ جماعت علماء کی قائم نہیں ہو سکتی۔ اس لئے اس کا اہتمام نہایت ضروری ہے۔ مگر اس کا تمام تر اہتمام مولویوں پر نہ رکھو کیونکہ اس میں بعض کام ایسے بھی ہوں گے کہ اس کو مولوی نہیں کر سکتے ہیں، نہ ان کے لئے مناسب ہے۔

مثلاً مدارس قائم کرنے کے لئے چندہ کرنے کی ضرورت ہو گی۔ سو علماء کو مناسب نہیں کہ وہ چندہ کی تحریک میں حصہ لیں۔ اس سے بڑی خرابی یہ ہے کہ عام لوگ ان کو دیکھ کر یہ سمجھتے ہیں کہ اگر ہم نے اپنی اولاد کو پڑھایا تو وہ بھی یہی مانگنے کا کام کریں گے۔ پس مولوی پڑھانے کا کام کریں اور رئیس چندہ وصول کریں کیونکہ ان پر یہ احتمال نہیں ہو سکتا کہ خود کھا جائیں گے۔ دوسرے جب مولوی پڑھانے کا کام کرتے ہیں تو کھانے کمانے کے کام بھی ان ہی کے سر کیوں ڈالے جائیں۔ آج کل عوام مولویوں کو بھانڈ کا ہاتھی سمجھتے ہیں۔

مشہور ہے کہ اکبر نے کسی بھانڈ کو خوش ہو کر ایک ہاتھی دے دیا تھا۔ بھانڈ نے ہاتھی تو لے لیا لیکن اس کو خیال ہوا کہ میں غریب آدمی، اس ہاتھی کو کھلاؤں گا کہاں سے۔ اس کی تو چارہ خوراکوں میں میرا سارا گھر بھی ختم ہو جائے گا۔ آخر اس کو معلوم ہوا کہ آج اکبر کی سواری فلاں طرف سے فلاں وقت گزرے گی۔ جب وہ وقت آیا تو آپ نے ہاتھی کے گلے میں ایک ڈھول ڈال کر اسی طرف اس کو چھوڑ دیا۔ اکبر کی سواری جب گزری تو انہوں نے دیکھا کہ سامنے سے ایک ہاتھی چلا آ رہا ہے اور گلے میں ڈھول پڑا ہوا ہے۔ غور کیا تو معلوم ہوا کہ خاصہ کا ہاتھی ہے۔ لوگوں سے پوچھا کہ یہ ہاتھی اس حالت میں کیوں پھرتا ہے۔ لوگوں نے کہا، حضور نے اپنے بھانڈ کو

یہ ہاتھی دے دیا تھا۔ اکبر نے بھانڈ کو طلب کیا اور پوچھا کہ تم نے ہاتھی کو اس حالت میں کیوں چھوڑا ہے؟ کہنے لگا کہ حضور نے مجھے ہاتھی تو عنایت فرمایا مگر میرے پاس کھلانے پلانے کو کیا دھرا تھا۔ آخر یہ سمجھ میں آیا کہ جو میرا پیشہ ہے وہی اس کو بھی سکھلاؤں۔ اس لیئے میں نے گلے میں ڈھول ڈال کر چھوڑ دیا کہ مانگو اور کھاؤ۔ اکبر کو یہ لطیفہ پسند آیا اور اس نے ایک گاؤں بھی انعام میں دیا۔

تو لوگوں نے مولویوں کے لیئے بھی یہی تجویز کر رکھا ہے کہ کام بھی کرو اور مانگو اور کھاؤ بھی۔ صاحبو! ان کو کیا غرض پڑی ہے۔ خدا تعالیٰ نے ان کو دولت علم کی دی ہے۔ ان کو کیا مصیبت پڑی کہ وہ تم سے بھیک مانگیں اور میں مولویوں کو بھی کہتا ہوں کہ آپ کو کامل توکل کرنا چاہیئے۔ نیز مولویوں کے مانگنے میں ایک بڑی خرابی یہ ہے کہ لوگ ان پر یہ اعتراض کریں گے کہ یہ لوگ دوسروں سے تو مانگتے ہیں لیکن خود کبھی نہیں دیتے اور جو محرک نہ دے اس کی تحریک میں شبہات پیدا ہوتے ہیں۔ اور دوسرا اگر دوسرا

لہ اگرچہ لوگوں کا یہ اعتراض نظر بر واقع صحیح نہیں ہے کیونکہ اوّل تو مولویوں کے پاس اس قدر سرمایہ کہاں ہوتا ہے کہ وہ چندے دیں۔ دوسرے وہ باوجود سرمایہ نہ ہونے کے بہت زیادہ دیتے ہیں۔ میں چند مثالیں بطور مشتے نمونہ از خروارے پیش کرتا ہوں۔ اوّل حضرت مولانا اشرف علی صاحب دامت برکاتہم نے زمانہ قیام کانپور میں مدرسہ کی آمدنی میں قلت دیکھ کر اپنی تنخواہ یک قلم چھوڑ دی تھی، جو کہ ۵۰ روپیے ماہوار تھے۔ دوم حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سلمہٗ مدرس اوّل مدرسہ مظاہر العلوم ۴۰ روپے ماہوار پاتے ہیں۔

سے پچاس مانگیں گے تو کم سے کم بیس تو خود بھی دیں گے۔ اس لئے ان پر اعتراض کرنے کا کسی کو موقع نہیں ہے۔ تو یہ طریقہ ہے کام کرنے کا اس طور پر مدرسے کا قائم ہونا نہایت ضروری ہے بالخصوص اس شہر میں کہ یہاں کے لوگوں کو دین کی طرف بہت ہی کم رغبت ہے۔ سراسر دنیا ہی میں پھنسے ہوئے ہیں اور زیادہ تر وجہ اس کی یہ بھی ہے کہ ان لوگوں کو علماء کی صحبت بہت ہی کم ہے۔ جس کے حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ خود علمائ کو یہاں بلاؤ اور ان سے فیض حاصل کرو۔ عالم کی مثال آفتاب کی سی ہے کہ اس کے طلوع ہوتے ہی نصف کرۂ زمین منوّر ہو جاتا ہے اور ظلمت بالکل جاتی رہتی ہے لیکن شرط یہ ہے کہ وہ دیندار عالم ہو ایسا نہ ہو کہ تمہارے

(بقیہ حاشیہ از صہ ۶۹۳) اہل مدرسہ نے بہت کوشش کی کہ مولانا کی تنخواہ میں اضافہ کر دیا جائے لیکن مولانا نے صاف انکار کر دیا اور فرمایا کہ میرے لئے یہی بہت کافی ہے۔ سوم حضرت مولانا مولوی محمود حسن صاحب سلمہ مدرس اوّل مدرسہ دیوبند دارالعلوم ۵۰ روپے ماہوار پاتے ہیں اہل مدرسہ نے مولانا سلمہ کی ترقی کرنی چاہی لیکن آپ نے منظور نہیں فرمایا۔ چہارم مولانا مولوی عنایت الٰہی صاحب سلمہ، مہتمم مدرسہ سہارنپور ۱۵ روپے ماہوار پاتے ہیں۔ ارکین مدرسہ کے کہنے پر آپ نے اس تنخواہ سے زیادہ لینے سے انکار فرمایا۔ میرے خیال میں آج کوئی شخص دنیا داروں میں اس کی ایک نظیر بھی پیش نہیں کر سکتا کہ کسی نے اپنے باب ترقی کو بالکل مسدود کر دیا ہو یا اپنی پوری تنخواہ محکمے کے حوالہ کر دی ہو اور یہ امداد بعض

تابع بن جائے۔ اس کی صفت یہ ہو کہ

لَا یَخَافُوْنَ فِی اللّٰہِ لَوْمَۃَ لَآئِمٍ۔

اور اس کے لئے کم سے کم ۲۰ یا ۲۵ روپے ماہوار کا انتظام کردو۔ آج کل لوگ یہ چاہتے ہیں کہ عالم تو بہت بڑا ہو لیکن دس بارہ روپیہ ماہوار سے زیادہ نہ دینے پڑیں۔

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کے پاس ایک عالم کی طلب میں ایک خط آیا تھا جس میں ان عالم کے لئے بہت سی شرطیں لکھی تھیں کہ وہ ایسے ہوں اور ایسے ہوں اور کل دس روپے تنخواہ لکھی تھی۔ مولانا فرمانے لگے کہ بھلے مانسو! فی وصف ایک روپیہ تو رکھا ہوتا۔

صاحبو! خدا کا شکر ہے کہ اللہ نے آپ کو وسعت دی ہے۔ کچھ مشکل نہیں کہ دس پندرہ روپیہ ماہوار کا ایک مولوی کے لئے انتظام کردیں عمائد شہر اگر اس پر متوجہ ہو جائیں تو بہت آسانی سے سب کچھ ہو سکتا ہے۔ یہ تو بقاء علماء کی صورت تھی۔

دوسرے کام یعنی عمل کرنے کی تدبیر یہ ہے کہ مدرسے میں جو عالم ہوں ان سے مسائل دریافت کرکرکے اور علت و حرمت کو معلوم کرکے ان کے فتوے کے موافق عمل کیا جائے اور جس وقت تک مدرسے کا انتظام نہ ہو اس وقت تک یہ کیجئے کہ کسی ذی علم کو وعظ کے لئے نوکر رکھ لیجئے۔ اس کا کام یہ ہو کہ محلوں میں جا کر وعظ کہے اور ترغیب و ترہیب اور احکام شرع کو اس میں بیان کرے۔ آپ اس طریق پر عمل کرکے دیکھئے۔ انشاءاللہ

وجوہ سے متعارف چندہ دینے سے بہت زیادہ بڑھی ہوئی ہے اور اس قسم کی بہت مثالیں ہیں۔ سعید

تعالیٰ ایک سال میں کتنی حالت درست ہو جائے گی۔

دوسرے یہ کیجئے کہ ہر محلے کے لوگوں کو ہفتے بھر میں ایک دفعہ کسی جگہ جمع کر کے ایک آدمی مسائل کی کتاب لے کر ان کو مسائل سنا دیا کریں اور جو لوگ خود پڑھے لکھے ہیں وہ مسائل کی کتابیں خرید کر اپنے پاس رکھ لیں اور روزانہ اُن کو دیکھا کریں اور جہاں شبہ رہے کسی عالم سے حل کر لیں۔ غرض اس کو عمر بھر کا شغل رکھیں اور عورتوں کے لئے یہ کریں کہ جو پڑھی لکھی ہیں وہ تو یہ کریں کہ کتابیں خرید کر ان کو سبقاً سبقاً پڑھ لیں اور جو بے پڑھی ہیں وہ پڑھی لکھی عورتوں سے سُن لیا کریں۔

صحبتِ نیک کے فوائد

تیسری چیز یعنی صحبت کہ بدون اس کے نہ اعلیٰ درجے کی تعلیم کافی ہے اور نہ ادنیٰ درجے کی اور اسی لئے علماء طلباء سب کے ذمہ اس کا اہتمام ضروری ہے۔ پہلے زمانہ میں جو سب لوگ اچھے ہوتے تھے اس کی بڑی وجہ یہی تھی کہ وہ سب اس صحبت کا اہتمام رکھتے تھے۔ اس وقت یہ حالت ہے کہ تعلیم کا اہتمام تو کسی قدر ہے بھی کہ اس پر ہزاروں روپیہ صرف کیا جاتا ہے اور بہت سا وقت اس کو دیا جاتا ہے مگر صحبت کے لئے فی سال ایک ماہ بھی کسی نے نہیں دیا۔ واللہ اگر صحبت کی طرف ذرا بھی توجہ کرتے تو مسلمان ساری تباہیوں سے بچ جاتے اور اگر کسی کو اس میں شبہ ہو تو وہ اب امتحان کر دیکھے اور خود کو بھی اور اپنی اولاد کو بھی بزرگوں کی صحبت سے فیض یاب کرے۔ میں انشاء اللہ پانچ برس کے بعد دکھلاؤں گا کہ سب کے اقوال، افعال، اعمال کس قدر درست ہوئے۔ اس وقت شائستگی کے عام ہونے سے یہ حالت ہو گی کہ ے

بہشت آنجا کہ آزارے نباشد
کسے را با کسے کارے نباشد

کارے نہ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ کار موذی نہ ہوگا اور اس لئے دنیا جنت کی مثل ہو جائے گی۔ اور راز اس کا یہ ہے کہ علم سے نیک باتیں معلوم ہوں گی اور صحبت سے اخلاق رذیلہ دور ہوں گے اور یہی دو چیزیں جہل اور بدخلقی ساری خرابیوں کی جڑ ہیں۔ کیونکہ مثلاً اگر کسی شخص میں تکبر ہو اور اس سے کوئی غلطی ہو جائے تو اس کا تکبر کبھی اعتراف اور قبول حق کی اجازت نہ دے گا بلکہ وہ اپنی غلطی پر مصر ہوگا اور ہزاروں آدمی اس غلطی سے گمراہ ہوں گے اور جب تکبر کی اصلاح ہو جائے گی تو یہ بات نہ رہے گی اور اثر اس کا یہ ہوگا کہ ہر غلطی کو تسلیم کرے گا۔

سنا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ میرٹھ میں تشریف فرما تھے کہ ایک شخص نے عشاء کے وقت پوچھا۔ آپ نے اس کا جواب دے دیا۔ مستفتی کے جانے کے بعد ایک شاگرد نے عرض کیا کہ مجھے یہ مسئلہ یوں یاد ہے۔ آپ نے فرمایا کہ تم ٹھیک کہتے ہو اور مستفتی کو تلاش کرنا شروع کیا۔ لوگوں نے عرض کیا کہ اس وقت رات زیادہ ہو گئی ہے آپ آرام فرمائیے ہم صبح ہونے پر اس کو بتلا دیں گے لیکن آپ نے قبول نہیں فرمایا اور اس کے مکان پر تشریف لے گئے۔ گھر میں سے اس کو بلایا اور فرمایا کہ ہم نے اس وقت مسئلہ غلط بتلایا تھا۔ تمہارے آنے کے بعد ایک شخص نے صحیح مسئلہ ہم کو بتلایا اور وہ اس طرح ہے جب یہ فرما چکے تب چین آیا اور واپس آکر آرام فرمایا

تو اس بے چینی کا سبب کیا نرا علم تھا۔ ہرگز نہیں۔ یہ صرف حال کا

اثر تھا جو صحبت سے عطا ہوا تھا۔ اسی کو کہتے ہیں ؎

قال را بگذار مرد حال شو
پیش مرد کاملے پامال شو

بعض لوگ جن کی تربیت نہیں ہوتی اور مقتدا ہو جاتے ہیں ان کے اخلاق نہایت خراب ہوتے ہیں اور وجہ اس کی یہی ہے کہ وہ چھوٹا ہونے کے قبل بڑے ہو جاتے ہیں۔ کسی نے خوب کہا ہے ؎

اے بے خبر بکوش کہ صاحب خبر شوی
تا راہ بیں نباشی کے راہبر شوی

در مکتب حقائق پیش ادیب عشق
ہاں اے پسر بکوش کہ روزے پدر شوی

تو پسر بننے سے پہلے پدر بن جانا بہت سی خرابیوں کا باعث ہے اس لئے سخت ضرورت ہے کہ اول چھوٹا بن کر اخلاق کی درستی کی جائے کہ اس سے ایمان کی درستی ہو جائے گی اور تدبیر اس کی یہ ہے کہ جن لوگوں کو خدا تعالیٰ نے فراغ دیا ہے وہ تو کم از کم چھ ماہ تک کسی بزرگ کی خدمت میں رہیں لیکن اس طرح کہ اپنا تمام کچا چٹھا ان کے سامنے پیش کر دے اور پھر جس طرح یہ کہیں اس طرح عمل کریں۔ اور اگر وہ ذکر و شغل تجویز کریں تو ذکر و شغل میں مصروف ہو جائے اگر وہ اس سے منع کر کے کسی دوسرے کام میں لگا دیں اس میں لگ جائے اور ان کے ساتھ محبت بڑھائے اور ان کی حالت کو دیکھتا رہے کہ کسی چیز کے لینے کے وقت یہ کیا برتاؤ کرتے ہیں اور دینے کے وقت کس طرح پیش آتے ہیں۔ اس کا اثر یہ ہوگا کہ تخلق اخلاق اللہ ہو جائے گا۔ اور پھر اس کی ذات سے سراسر نفع ہی پہنچے گا اور جن لوگوں کو فراغ نہیں ہے وہ یہ کریں کہ وقتاً فوقتاً

جب ان کو دو چار یوم کی مہلت ہوا کرے اس وقت کسی بزرگ کے پاس رہ آیا کریں۔

اولاد کی ذمہ داری

اور اپنی اولاد کے لئے یہ کرو کہ روزمرہ جیسا ہر کام کے لئے نظام الاوقات ہے۔ ایسا ہی اس کے لئے بھی ایک وقت مقرر کرو کہ فلاں مسجد میں فلاں بزرگ کے پاس جاکر کچھ دیر بیٹھا کریں۔ صاحبو! کس قدر افسوس کی بات ہے کہ فٹ بال کے لئے وقت ہو اور درستی اخلاق کے لئے وقت نہ نکل سکے۔ اور اگر شہر میں کوئی ایسا شخص نہ ہو، تو چھٹی کے زمانہ میں کسی بزرگ کی خدمت میں بھیج دیا کرو۔ اس زمانے میں تو ان کو کوئی کام بھی نہیں ہوتا۔ کم بخت دن رات مارے مارے پھرتے ہیں نہ نماز کے نہ روزے کے۔ ماں باپ خوش ہیں کہ ہم نماز کے بہت پابند ہیں حالانکہ ان کو یہ خبر نہیں کہ قیامت میں وہ اولاد کے سبب ان کے ساتھ جہنم میں جائیں گے۔ حدیث شریف میں ہے۔

کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ

آج کل لوگ اپنی اولاد کی تربیت ایسی کرتے ہیں جیسا کہ قصائی گائے کی تربیت کیا کرتا ہے کہ اس کو کھلاتا پلاتا ہے حتی کہ وہ خوب موٹی تازی ہو جاتی ہے لیکن غرض اور مال اس کا یہ ہوتا ہے کہ اس کے گلے پر چھری پھیری جاتی ہے۔ اسی طرح یہ لوگ اپنی اولاد کو خوب زیب وزینت اور تعیش میں پرورش کرتے ہیں اور انجام اس کا یہ ہوتا ہے کہ وہ لقمہ جہنم ہوتے ہیں اور ان کی بدولت مربی کی بھی گردن ناپی جاتی ہے کیونکہ اس تعیش کی بدولت اولاد کو نہ نماز کی خبر ہوتی ہے اور نہ روزے کی۔ بعض نامعقول تو حد سے اس قدر آگے بڑھ گئے ہیں کہ ان کو اسلام کی کسی بات کی بھی خبر نہیں ہوتی

ایک نوجوان کی نسبت میں نے سنا ہے کہ وہ بیرسٹری پاس کر کے آ رہے تھے ان کے باپ نے اپنے ایک دوست کو لکھا کہ میرا لڑکا لندن سے آ رہا ہے تمہارے شہر سے اس کا گزر ہو گا۔ اگر تم اسٹیشن پر اس کو مل لو تو بہتر ہو۔ تاکہ اس کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔ اُن کے لکھنے کے موافق یہ مکتوب الیہ اسٹیشن پر گئے۔ اور جا کر ان بیرسٹر صاحب سے ملے۔ اس وقت بیرسٹر صاحب کھانا کھا رہے تھے۔ چونکہ رمضان شریف تھا اس لیے اُن کو تعجب ہوا اور انہوں نے دریافت کیا کہ رمضان شریف ہے آپ نے روزہ نہیں رکھا۔ صاحبزادے پوچھتے ہیں کہ رمضان کیا چیز ہوتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ رمضان ایک مہینہ کا نام ہے۔ کہنے لگا جنوری فروری الخ ان میں تو رمضان کہیں نہیں آیا۔ آخر اُس کی یہ حالت دیکھ کر اُن کو سخت صدمہ ہوا اور سمجھے کہ منبع الکفر کا مسخ شدہ ہے اس کی حالت میں تغیر آنا معلوم اور انا للہ پڑھ کر چلے آئے۔

اب آپ غور کیجیے کہ یہ مسلمانوں کے بچے ہیں۔ مسلمان خواتین کی گودوں کے پرورش کیے ہوئے ہیں اور آغوش جہنم میں دیئے جا رہے ہیں۔ صاحبو! اگر یہی رنگ رہا تو عجب نہیں کہ پچاس برس کے بعد یہ لوگ اپنے کو مسلمان کہنا بھی ننگ و عار سمجھیں۔ اتنا اثر تو اب بھی آ گیا ہے کہ اسلامی نام پسند نہیں ہے۔ آپ خوش ہیں کہ ہم نے بی اے کرا دیا۔ ایم اے کرا دیا حالانکہ آپ نے جہنم کی پگڈنڈی پر چھوڑ دیا ہے اور آنکھوں پر ایسے چشمے بند چڑھ جاتے ہیں کہ شاہراہِ جنت نظر ہی نہ آ سکے۔

صاحبو! آپ کہتے ہیں کہ مولوی انگریزی پڑھنے سے منع کرتے ہیں واللہ ہم منع نہیں کرتے۔ خدا کے لئے ان کا دین تو خراب نہ ہونے دو۔ اور اس

کا طریقہ یہی ہے کہ ان کو اہل اللہ کی صحبت حاصل ہو۔ خیر اگر چھ مہینے دوزخ میں جانے کے کام کریں گے تو چھ مہینے جنت میں جانے کے کام بھی تو کر لیں گے۔ یاد رکھو کہ اہل اللہ کی صحبت وہ اکسیر ہے کہ ؎

گر تو سنگِ خارہ مرمر شوی　　چوں بصاحب دل رسی گوہر شوی

اور کہتے ہیں ؎

یک زمانہ صحبتِ با اولیاء　　بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

صحبتِ نیکاں اگر یک ساعت است
بہتر از صد سالہ زہد و طاعت است

مذہب کی رُوح

صاحبو! صحبت سے وہ بات حاصل ہو گی کہ اس کی بدولت اسلام دل میں رچ جائے گا اور یہی مذہب کی روح ہے کہ دین کی عظمت دل میں رچ جائے اگرچہ کسی وقت نماز روزے میں کوتاہی ہو جائے۔ اگرچہ یہ بات میرے کہنے کی نہیں ہے کیونکہ اندیشہ ہے کہ کوئی شخص نماز روزے کو خفیف سمجھ جائے مگر مقصود میرا جو کچھ ہے ظاہر ہے۔ غرض ضرورت اس کی ہے کہ مذہب دل میں رچا ہو اور اگر دل میں یہ حالت نہیں ہے تو ظاہری نماز کام کی اور نہ روزہ۔ وہ حالت ہے جیسے طوطے کو سورتیں رٹا دیں کہ وہ محض اس کی زبان پر ہیں۔ ایک شاعر نے طوطے کی وفات کی تاریخ لکھی ہے کہتا ہے ؎

میاں مٹھو جو ذاکرِ حق تھے　　!　　رات دن ذکرِ حق رٹا کرتے
گربہ موت نے جو آدابا　　کچھ نہ بولے سوائے ٹے ٹے

اس میں سے ۱۲۳۰ھ تاریخ موت نکلتی ہے۔ یہ تاریخ اگرچہ ہے تو مسخرہ

پن لیکن غور کیا جائے تو اس نے ایک بڑی حکمت کی بات کہی ہے یعنی یہ بتلا دیا کہ جس تعلیم کا اثر دل پر نہیں ہوتا مصیبت کے وقت وہ کچھ کام نہیں دیتی۔ تو اگر دین کی محبت دل میں رچی ہوئی نہ ہو تو حافظ قرآن بھی ہوگا تب بھی آ لٹے دال کا بھاؤ ہی دل میں لے کر مرے گا۔ جیسا اس وقت غالب حالت رہتی ہے کہ دل میں سے اسلام کا اثر کم ہوتا جاتا ہے اور صاحبو! اسی کو دیکھ کر میں کہتا ہوں کہ مسلمانوں سے اسلام نکل جاتا ہے۔ خدا کے لئے اپنی اولاد پر رحم کرو اور ان کو اسلام کے سیدھے ڈگر پر چلاؤ۔

صاحبِ کمال کی علامتیں

اب میں اپنے بیان کو ایک ضروری بات پر ختم کرتا ہوں۔ وہ یہ کہ صحبت کے لئے جس شخص کو تجویز کیا جائے وہ کیسا ہو اور اس کے صاحبِ کمال ہونے کی علامتیں کیا ہیں۔ سو علامتیں اس کی یہ ہیں کہ:-

ایک تو بقدرِ ضرورت علمِ دین جانتا ہو۔

دوسرے شریعت پر پوری طرح کاربند ہو۔

تیسرے اس میں یہ بات ہو کہ جس امر کو خود نہ جانتا ہو علماء سے رجوع کرتا ہو۔

چوتھے علماء سے اس کو وحشت نہ ہو۔

پانچویں یہ کہ اس میں روک ٹوک کی عادت ہو۔ مریدین اور متعلقین کو ان کی حالت پر نہ چھوڑ دیتا ہو۔

چھٹے یہ کہ اس کی صحبت میں برکت ہو کہ اس کے پاس بیٹھنے سے دنیا کی محبت کم ہوتی جائے۔

ساتویں یہ کہ اس کی طرف صلحاء اور دین کے سمجھنے والے لوگ زیادہ

متوجہ ہوں ــــ اور یہ بڑی علامت ہے کمال کی۔

جس شخص میں یہ علامتیں پائی جائیں وہ مقبول ہے اور کامل ہے اس کے پاس جائیے اور اس کی صحبت سے مستفیض ہوجیے اور اس کی ضرورت نہیں کہ آپ اس سے بیعت ہو جائیں کیونکہ پیری مریدی کی حقیقت مقصود ہے اور وہ یہی ہے جو مذکور ہوئی اس کی صورت مقصود نہیں ہے، جیسے آج کل کہ وہ محض رسم کے طور پر رہ گئی ہے جیسے کہ بعض جگہ نکاح ایک رسم سمجھ کر کیا جاتا ہے گو عنین ہی ہو۔ ایسے ہی بطور رسم کے مرید بھی ہوتے ہیں۔ ہاں اگر قلب میں نہایت تقاضا پیدا ہو تو مرید ہونے میں بھی مضائقہ نہیں لیکن مرید ہونے کے لیے سخت جانچ کی ضرورت ہے ہر کسی کے ہاتھ میں ہاتھ نہ دینا چاہیے۔ یہ سات علامتیں جو اوپر مذکور ہوئیں ضرور دیکھ لے۔ مولانا روم علیہ الرحمۃ نے ان کو دو لفظوں میں ادا کر دیا ہے فرماتے ہیں ؎

کارِ مرداں روشنی و گرمی ست
کارِ دوناں حیلہ و بے شرمی ست

ایک دوسرے مقام پر فرماتے ہیں کہ ؎

اے بسا ابلیس آدم روی ہست
پس بہر دستے نباید داد دست

نیک صحبت کے آداب

البتہ صحبت کے کچھ آداب بھی ہیں بدون ان کے صحبت نافع نہیں۔ منجملہ ان آداب صحبت کے ایک یہ بھی ہے کہ ان کے پاس جاکر دنیا کی باتیں نہ بنائیے جیسے کہ اکثر لوگوں کی عادت ہے کہ بزرگوں کے پاس جا

کر بھی دنیا بھر کے قصے جھگڑے، اخبار کے واقعات ذکر کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

نیز حتی الوسع بزرگوں کو تعویذ گنڈوں کی تکلیف بھی نہ دینی چاہیئے ان حضرات سے تعویذ گنڈے لینا ایسا ہے جیسا کہ سنار کے پاس کھرپا یا کلہاڑی بنوانا بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جو شخص ہاتھ میں ہاتھ لیتا ہے وہ اللہ میاں کا نعوذ باللہ رشتہ دار ہو جاتا ہے کہ جو کام بھی اس سے کہا جائے وہ اللہ میاں سے ضرور پورا کرا دیتا ہے حالانکہ ایسا مختار سمجھنا خلاف توحید ہے کسی کی کیا مجال ہے کہ بجز عرض کے ذرا کچھ دخل دے سکے۔

مولانا فضل الرحمٰن صاحب کے پاس ایک شخص آیا اور کہا کہ میرا مقدمہ ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ دعا کروں گا۔ اس نے کہا کہ دعا کرانے نہیں آیا۔ یہ تو میں بھی کر سکتا ہوں۔ یوں کہہ دیجئے کہ میں نے یہ کام پورا کر دیا۔ مولانا ناخوش ہوئے۔

پیلی بھیت میں ایک بزرگ کے پاس ایک بڑھیا آئی اور کچھ عرض کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فضل کرے۔ اس نے سنا نہیں۔ ایک شخص اور بیٹھے تھے انہوں نے حکایت کے طور پر اس سے کہا کہ یوں فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فضل کرے گا۔ وہ بزرگ سخت برہم ہوئے اور کہا کہ مجھ کو کیا خبر کہ فضل کرے گا یا نہ کرے گا۔ تم نے اپنی طرف سے گا کیسے بڑھایا اسی طرح تعویذوں کی فرمائش بھی ان حضرات کے مذاق کے بالکل خلاف ہے بھلا جس نے عمر بھر طالب علمی اور اللہ اللہ کیا ہو وہ کیا جانے کہ تعویذ کیا ہوتے ہیں اور ان کو کس طرح لکھا جاتا ہے اور پھر لطف یہ کہ تعویذ بھی دنیا کے نرالے کاموں کے لئے۔

بمبئی سے ایک پہلوان کا خط آیا کہ میری کشتی ہونے والی ہے۔ مجھے ایک تعویذ لکھ دو کہ میں جیت جاؤں۔ میں نے لکھا کہ اگر تمہارا مقابل بھی کسی سے تعویذ لکھالے تو کیا ہوگا۔ پھر تعویذ تعویذ میں کشتی ہوگا۔ عجب نہیں کہ لوگ چند روز میں مردوں کے بچہ پیدا ہونے کے لئے بھی تعویذ ہی لکھوا لیا کریں جس میں نکاح ہی کی ضرورت نہ رہے کیونکہ جب تعویذ میں ایسا اثر ہے کہ وہ ہر ایک کام میں کام آسکتا ہے تو مردوں کے بچہ پیدا ہونے میں بھی ضرور کام آنا چاہیئے۔ صاحبو! اہل اللہ کے پاس اللہ کا نام دریافت کرنے کے لئے جاؤ۔

خلاصہ اس سب تقریر کا یہ ہے کہ اپنی اولاد کے لئے اہل اللہ کی صحبت طویلہ کو تجویز کرو۔ یہ تو مردوں اور تندرستوں کے لئے ہے۔

صحبتِ نیک کا بدل

اور جو اپاہج یا عورتیں ہوں تو ان کے لئے صحبت کا بدل یہ ہے کہ ایسے بزرگوں کے ملفوظات دیکھا کریں یا سنا کریں۔ ان کے توکل، صبر و شکر تقوی طہارت کی حکایتیں دیکھنا، سننا ہی صحبت کے قائم مقام ہو جاتا ہے ان دونوں کے متعلق کسی نے خوب کہا ہے۔ صحبت کے متعلق تو کسی کا قول ہے ؎

مقام امن و مے بیغش و رفیق شفیق
گرت مدام میسر شود زہے توفیق

اور ان کے حکایات و ارشادات کے متعلق کسی کا شعر ہے ؎

دریں زمانہ رفیقے کہ خالی از خلل ست
صراحیِ مئے ناب و سفینۂ غزل ست

مگر یہ وصیت کرتا ہوں کہ مثنوی اور دیوانِ حافظ یعنی علوم مکاشفہ اور اہل حال کا کلام نہ دیکھیں کیونکہ اکثر اوقات ان کی بدولت ہلاک ہوتے ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

نکتہا چوں تیغ فولاد ست تیز　　چوں نداری تو سپر واپس گریز
پیش ایں الماس بے اسپر میا　　کز بریدن تیغ را نبود حیا

اور جب اہل حال صادق کے کلام میں اس قدر احتمال مضرت ہے تو جو جاہل بے شرع بد لگام ہیں ان کا کلام تو کس درجہ مضر ہوگا۔ ان لوگوں کے متعلق فرماتے ہیں ؎

ظالم آں قومے کہ چشماں دوختند
از سخنہا عالمے را سوختند

اسی طرح جو لوگ محض بزرگوں کے کلاموں کی نقل بے سمجھے کیا کرتے ہیں ان کی تحریر و تقریر سے بھی بوجہ اس کے اصل سے بدلی ہوئی ہوتی ہے کچھ نفع نہیں ہوتا۔ ایسوں کی نسبت فرماتے ہیں ؎

حرفِ درویشاں بدزدد مردِ دوں
تا بہ پیشِ جاہلاں خواند فسوں

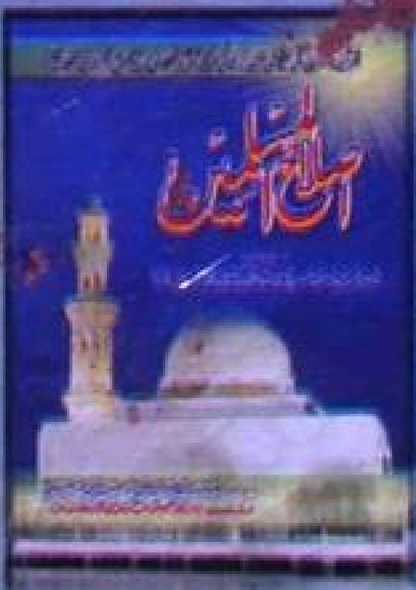
ہاں احیاء العلوم کا ترجمہ دیکھو، اربعین کا ترجمہ دیکھو۔ انشاء اللہ تعالیٰ ہر طرح کا فائدہ ہوگا۔ یہ بیان ختم ہو چکا۔ اس بیان میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ خدا تعالیٰ نے وہ نسخہ بتلایا ہے کہ اس میں نہ معاش کا حرج ہے نہ کوئی نقصان ہے اور مسلمانوں کو اس کی بڑی ضرورت ہے۔

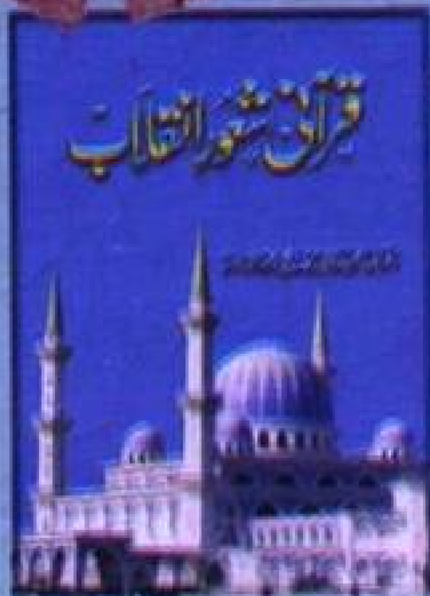
اس آیت میں اسی کے متعلق ارشاد ہے نَسْمَعُ میں تقلید اور نَعْقِلُ میں تحقیق کا ذکر فرمایا ہے پس معلوم ہوا کہ دوزخ سے بچنے کے

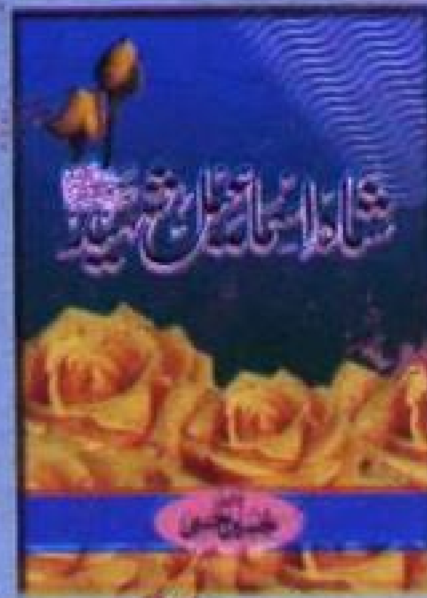
دو طریق ہیں یا تقلید ہو یا تحقیق ہو۔

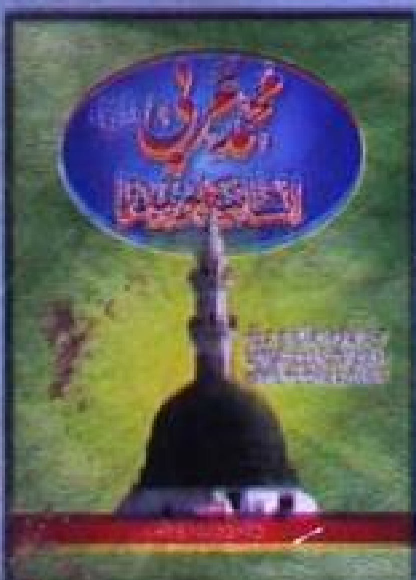
اب خدا تعالیٰ سے دعا کیجیے کہ وہ توفیق عمل عطا فرمائیں۔ یہ بھی دُعا کیجیے کہ یہاں مدرسہ ہو جائے کہ اس کے بہانے سے پھر آنا ہو۔

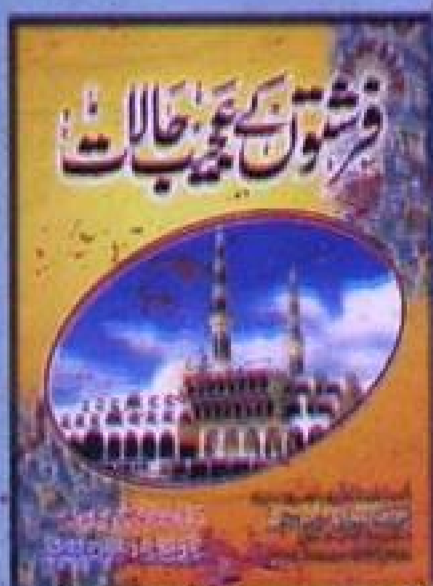
آمین یا رب العالمین۔

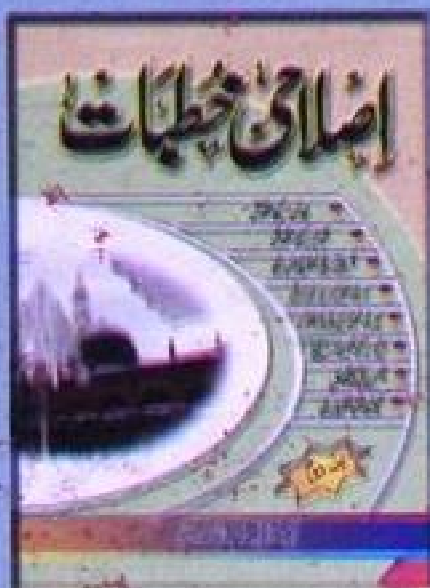


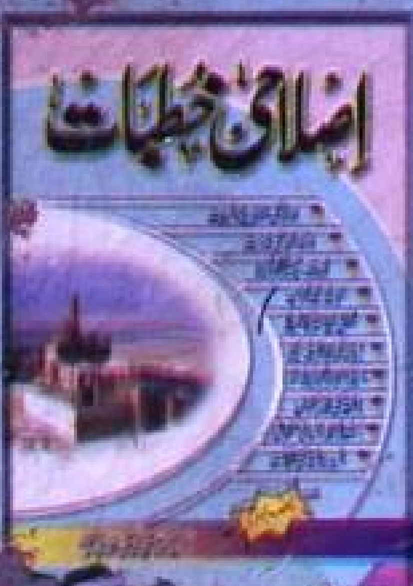


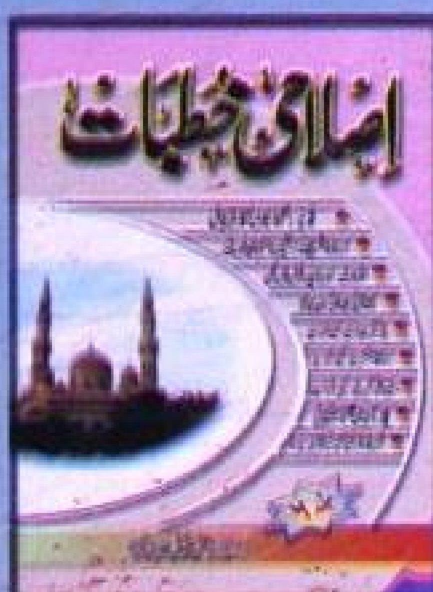


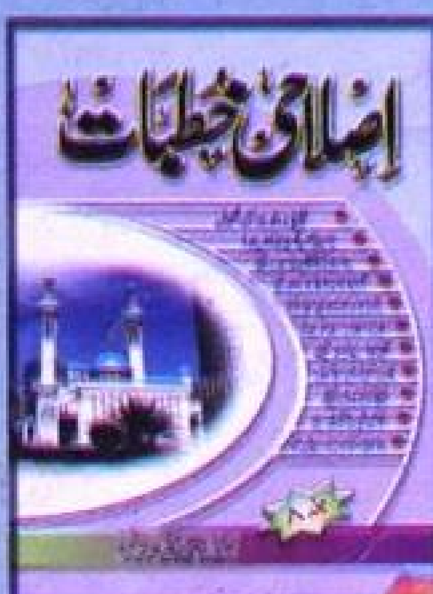












s.175/-

فرید بُک ڈپو (پرائیویٹ) لمٹیڈ

FARID BOOK DEPOT (Pvt.) Ltd.

Corp. Off.: 2158, M.P Street, Pataudi House, Darya Ganj, N. Delhi - 2
Phones : 23289786, 23289159 Fax : 23279998 Res.: 23262436
E-mail : farid@ndf.vsnl.net.in Websites : faridexport.com, faridbook.com